کاروانِ احرار

جلد دوم

تاریخ

آزادی برصغیر

جانباز مرزا

کاروانِ احرار

جلد دوم

تاریخِ آزادیٔ برّصغیر

گزشتہ نصف صدی کی تاریخ حرّیت
مجلسِ احرار، مسلم لیگ، کانگریس اور جمعیۃ علمائے ہند کی
جدوجہد آزادی کے پس منظر میں

(یکم جولائی ۱۹۳۴ء تا یکم اپریل ۱۹۳۶ء)

جانباز مرزا

ناشر ——— مکتبہ تبصرہ، لاہور
طبع ——— چٹان پریس لاہور
اشاعت اوّل ——— ایک ہزار
کتابت ——— مقصود احمد۔ لاہور
تاریخ اشاعت ——— جون۔ ۱۹۷۷ء
صفحات ——— پانچ سو بارہ

قیمت - - - - - - - - - ۳۰ روپے

فہرست

جلد دوم کے ترتیب دینے اور اخبارات کے فائل دیکھنے میں جن اداروں نے تعاون کیا ان میں ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان اور عجائب گھر لائبریری کے منتظمین خاص طور پر شکریہ کے مستحق ہیں۔ نیز ڈاکٹر محمد جہانگیر ڈائریکٹر ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان اور ان کے عملہ کا بھی ممنون ہوں کہ ان کے مفید مشورے اکثر میری رہنمائی کرتے رہے۔ ان کے علاوہ حسب ذیل کتب تاریخ رواں میں میرے لیے کارآمد ثابت ہوئیں۔

کتاب	مصنف
۱۔ شاہراہِ پاکستان	مصنف چودھری خلیق الزمان
۲۔ نامۂ اعمال حصہ اوّل	" سر محمد یامین خاں
۳۔ ایک خوفناک سازش	" مولانا مظہر علی اظہر
۴۔ تاریخ مدح صحابہ	" مولانا مظہر علی اظہر
۵۔ رئیس الاحرار	" مولانا عزیز الرحمن جامعی
۶۔ تحریک پاکستان۔ دستور اسلامی جمہوریہ	" محمد شفیع چودھری
۷۔ ڈاکٹر اقبال کے آخری دو سال	" عاشق حسین بٹالوی
۸۔ مارشل لاء سے مارشل لاء تک	" سید نور احمد

اور دیگر

کچھ حکائتیں کچھ شکائتیں

الحمد للہ کہ کاروانِ احرار کی جلد دوم مکمل ہو کر قارئین تک پہنچ چکی۔ زمانہ جس تیزی سے اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہے۔ ماضی کے واقعات اسی قدر وقت کی گرد و غبار میں لپیٹے جا رہے ہیں۔ کھنڈرات کی دیواروں نے انہیں اور گہرے گڑھے میں دبا دیا ہے نہ تو حالات مہلت دے رہے ہیں اور نہ قلم اس بوجھ کا متحمل ہے۔ اس پر بھی گمشدہ اوراق کی تلاش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

غیر ملکی حکمرانوں نے جن ہاتھوں میں قلم دیا ان کی حرکت پر نظر رہی اور اس کے نتیجے میں حقیقت افسانے میں ڈھل کر رہ گئی۔ ہزاروں میل تجسس کے باوجود سنگ میل دکھائی نہیں دیتا کہ منزل کی راہ سجھائی دے۔ آخر اس راہ کا مسافر جی ہار کر بیٹھ جاتا ہے۔ لیکن ایک میں ہوں کہ بے سر و سامانی کے باوجود آرزوؤں کی کدال لیے کھنڈرات کی ایک ایک اینٹ الٹ پلٹ کر تاریخ کہنہ ڈھونڈ رہا ہوں۔ کہیں ناکردہ گناہ انسانوں کا خون بکھرا پڑا ہے کہیں لاشوں کے ڈھیر ہیں۔ کہیں تمنائیں تڑپ رہی ہیں اور کہیں حسرتیں ماتم کناں۔ ان سب کو جوڑ کر تاریخ ماضی کا ایک ہیولیٰ تعمیر کر رہا ہوں، خدا اگر کامیاب کر دے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ کتاب ہذا کا نقشِ اوّل آپ کی اوزانِ خواہشات پر پورا اترا ہے یا نہیں۔ ہاں یہ درست ہے کہ آئندہ مورخ کو اپنا اثاثہ حیات جمع کرنے پر دقت نہیں ہوگی۔

۱۹۷۵ء کے اکتوبر میں پہلی جلد مارکیٹ میں آئی تو عوام کے ساتھ ملکی صحافت نے بھی اس کا خیر مقدم کیا اور اسے تاریخ کا اہم جزو قرار دے کر اس کی مزید ضرورت کا احساس دلایا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ ادارے جو عوام تک ایسا لٹریچر پہنچانے کے مدعی ہیں اور اس ضرورت کے لیے حکومت سے لاکھوں روپے وصول کرتے ہیں، کاروانِ احرار (جلد اوّل) کی پذیرائی کرتے۔ مگر انہوں نے اس سے بے اعتنائی کا پورا مظاہرہ کیا۔ محض اس لیے کہ اس حمام میں

وہ بری طرح ننگے تھے۔ اس آئینے میں ان کے خدوخال واضح تھے۔ انہیں یہ ڈر رہا کہ آئندہ نسلیں ان کی راکھ تک جلا دیں گے۔ اس خوف وہراس کی وجہ سے انہوں نے کاروان احرار کو اپنی دہلیز سے باہر رکھا۔ لیکن تابکے۔؟

عام طور پر پاکستان نیشنل سنٹر اور نیشنل بک سنٹر لاہور نئی کتب کی افتتاحی تقریب کے لیے مقرر ہیں۔ ان اداروں کے منتظمین سے جب کاروان احرار (جلد اوّل) کی افتتاحی تقریب کے لیے کہا گیا تو انہوں نے کتاب کا مطالعہ کیے بغیر تقریب کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ تاریخ کسی کی طرفدار نہیں ہوتی لیکن محض لفظ احرار پر ان کا خون خشک ہو گیا اور ان عوامی اداروں نے یہ کہہ کر تقریب کی اجازت دینے سے انکار کر دیا کہ یہ سرکاری ادارے ہیں۔ ان میں سیاسی کتب کی تقریب کی گنجائش نہیں۔

خیر ..... ناخدا جن کا نہ ہوان کا خدا ہوتا ہے۔

میں عوام اور ملک کے جرائد کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے کاروان احرار جلد اوّل کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا۔

اُمید ہے کتاب ہذا جلد دوم بھی اپنے معیار پر پُوری اترے گی۔

آپ کا جانباز مرزا

۴ جون ۷۷ء

کتاب سے پہلے صاحبِ کتاب کا سمجھنا ضروری ہے۔

ہے۔

کہانی میری رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

(۲)

ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ ہم ڈیرہ اسماعیل سے لاہور پہنچے۔
کاروانِ زندگی ۱۹۲۹ء تک انہیں راہوں سے گذر رہا تھا کہ میری ازدواجی زندگی کے منصوبے ازسرِنو باندھے جانے لگے۔ انسانی فطرت کا تقاضہ بھی تھا کہ شادی کر لی جائے۔ بچپنا، جوانی کی سرحدوں پر چھوڑ کر رخصت ہو چکا تھا۔ گو مجھے اس دور کی آمد کا احساس نہیں تھا تاہم بہار کے دنوں نافۂ فطرت سے خوشبو اپنا رنگ دکھائے بغیر نہیں رہتی۔ یہ خیال بھی تھا کہ جس خارزار وادی سے میں گذر رہا ہوں، نو آموز رفیقِ سفر اس کا متحمّل ہوگا؟۔ نیز زندگی جس کھیل تماشے میں مصروف ہے۔ اس میں ذاتی کردار کی پختگی خشتِ اول ہے۔ ازدواجی بندھنوں کے بغیر اس میں پائیداری کا آنا مشکل ہے۔ جبکہ ہر موڑ پر ہزاروں فتنے راستہ روکے کھڑے ہوں۔ ایسے میں دل و نظر کا سفینہ سنبھالنا دشوار ہے اور ساحل تک پہنچنے کے لیے ہزاروں طوفانوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ پھر مسلمان قوم کی رہنمائی جس کی انگلیاں خواہ مخواہ اٹھنے کی عادی ہوں۔ اس دنیاوی رسم و راہ سے گذرے بغیر گذارہ نہیں۔
اس پر میں نے مہینوں غور کیا۔ آخر ضلع ہوشیارپور کے ایک غیر مسلم نے اپنی لڑکی کا رشتہ دینا منظور کر لیا۔ یہ لڑکی اس کی مسلمان بیوی کے بطن سے تھی جس نے اپنا مذہب تبدیل کر کے غیر مسلم سے شادی کر لی تھی۔ لیکن مذکورہ لڑکی ہنوز اپنے ایمان پر قائم تھی۔ اس کے سوتیلے باپ کی خواہش پر یہ رشتہ منظور کر لیا گیا۔ ابتدائی رسم قریباً ختم ہو چکی تھی کہ اس کی اطلاع برادرِ اکبر سمیت برادری تک پہنچ گئی۔ وہ سب بگڑ گئے۔ آخر یہ رشتہ پروان چڑھے بغیر ٹوٹ گیا۔

اس موقعہ پر میں اعتراف کرتا ہوں کہ میرے ایسا آزاد منش جو برطانوی سلطنت کی غلامی سے وطن کو آزاد کرانے کا عزم کیے ہوئے ہے۔ وہ برادری کے بندھنوں کو نہ توڑ سکا۔

رسم و رواج: قوموں کے عروج و زوال کی داستان تاریخ کے اوراق پر بکھری پڑی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو غارت گری کے اسباب میں قوموں کے مصنوعی رسم و رواج بھی ایک حیثیت رکھتے ہیں۔ امرتسر کے مسلمان رؤسا کی کہانی اس باب کی عظیم المیہ کہانی ہے۔ یہ لوگ کبھی سارے شہر کے مالک تھے لیکن دنیاوی رسم و رواج میں ایسے الجھے کہ آخر کو انہیں شہری آبادی سے دور اپنے ٹھکانے تلاش کرنے پڑے۔ ان کی جائیدادوں کی وارث ہمسایہ قوم بن گئی اور یہ یوسف بے کارواں ہو کر اپنی کھوئی ہوئی عظمت پھر کبھی حاصل نہ کر سکے۔

پیدائش سے موت تک انسانی زندگی میں جس قدر غمی اور خوشی کے موڑ آتے ہیں امرتسر کی کشمیری برادری خصوصاً ان مواقع پر آپے سے باہر ہو کر خرچ کرتی۔ اس کے لیے مکان ہندو کے ہاں رہن رکھنے پڑتے۔ جو سود در سود کی رقم سے آخر انہیں کے ہو جاتے۔ لیکن بھائی چارے میں ناک اونچی رہتی۔

میرے ایسا آدمی جس نے ہمیشہ ان برائیوں سے منع کیا تھا اور راستے کی روک بنا رہا۔ اپنے لیے عمل کا وقت آیا تو ساری حقیقت کرکری ہو گئی۔ میرا فعل میرے قول کے خلاف نکلا۔

فروری ۱۹۳۹ء کو میری شادی اوسط درجے کے ایک راجپوت گھرانے میں ہونا قرار پائی۔ سسرال والوں کی خواہش تھی کہ برات کے ساتھ باجا اور دولہا گھوڑے پر سوار ہو۔ میرا مؤقف اس کے برعکس تھا۔ گھر میں برادر اکبر میرے ہم آہنگ تھے۔ مگر بھاوجہ سسرال والوں کی ہم نوا تھیں۔ یہ جھگڑا چار دن گھر میں وجہ نزاع بنا رہا۔ آخر سسرال والوں کی بات رہ گئی۔ مجھے اپنے ارادوں میں شکست ہو گئی۔ جماعتی دوست برات میں شرکت کے لیے آئے مگر اس فیصلہ کی وجہ سے ناراض ہو کر چلے گئے۔ اس کے باعث برات کی رونق ضائع ہو گئی۔ نتیجہ میں میں نے پھر کبھی عوام کو ان کے رسم و رواج پر ٹوکنے کی گفتگو نہیں کی۔

گھر کا ماحول سکون بخش ہو تو اس جیسی جنّت کوئی نہیں۔ مگر اس کا انحصار بیوی کی محبت پر ہے۔ اگر اس میں خاوند کی اطاعت کے ساتھ صبر و تحمّل کا مادہ ہے تو سمجھو زندگی نفع بخش رہی۔ ورنہ دو مختلف طبیعتوں کا ملاپ جہنم سے کم نہیں ہوتا۔ میری نئی رفیقہ حیات سیرت کے لحاظ سے فرشتہ صفت ثابت ہوئی۔ میرے ایسے آوارہ مزاج آدمی کے لیے ایسی بیوی کا ملنا میرے خالق کا مجھ پر انعام تھا۔ اس کے آتے ہی کتاب زندگی کا نیا باب شروع ہوا۔ خانگی نشیب و فراز گھریلو ذمہ داریاں اور عزیز و اقارب کی قرابت داری حاصل ہوئی۔

یہ تمام میری پیشتر کی زندگی میں اجنبی چیزیں تھیں۔ میری طبیعت نے یہاں سے نئی کروٹ لی۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا، جیسے میں یکایک کسی نئی راہ پر آنکلا ہوں۔ نئے سفر نے نئی نئی راہیں سجھائیں۔ اضطرابی زندگی میں ٹھہراؤ پیدا ہوا۔ شب و روز میں تغیر آیا۔ گھر سے باہر کے کام مختصر کرنے کی عادت پڑ گئی۔ البتہ نئے سفر میں زادِ راہ کی کمی بری طرح کھٹکنے لگی۔ تہی دامنی نے نئی شادی کے رکھ رکھاؤ اور اس خوشی کی عمر بہت مختصر کر دی۔

<u>بھائی سے علیحدگی</u> : دلہن کا لباس ہنوز اجلا تھا کہ اس کا چہرہ میلا ہونے لگا۔ مانگ کا سیندور پھیلا پڑ گیا۔ جوانی کی ابھرتی ہوئی تمناؤں پر اوس پڑنے لگی۔ آرزوؤں کی ابتدائی عمارت کے آثار گرنے لگے۔ یہ سارا کچھ بھائی اور بھاوجہ کی بے رخی کے سبب تھا۔

عورت بہو ہو کر ساس، نند ہو کر بھاوج۔ ایک جنس ہونے پر بھی ایک جگہ امن سے نہیں رہ سکتی۔ بلاشبہ عورت فطرت کے نگار خانے کا ایک حسین شاہکار ہے۔ اس میں ماں، بیٹی بہن اور بیوی کے مختلف روپ شامل ہیں۔ مگر جب یہ تصویر اپنا رخ بدلتی ہے تو اس کے تمام روپ ماند پڑ جاتے ہیں۔ اس وقت یہ صرف عورت رہ جاتی ہے اور بس۔ اور اس روپ میں جب وہ انتقام پر اترتی ہے تو الامان الحفیظ۔

نہ جانے بھاوجہ نے اندر خانے بھائی کو کیا سکھایا پڑھایا کہ وہ بھی مجھے پرائی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ حالانکہ مجھے شادی سے زیادہ اگر کوئی مسرت تھی تو یہ کہ دونوں بھائی مدت کے بعد ایک جگہ بیٹھ کر دکھ سکھ کے ساجھی ہوں گے۔ دونوں ماں جائے خون کی سانجھ سے بیگانگی کے سارے راستے مسدود کر دیتے۔ مگر اس خوشی میں ایسا زہر گھول دیا گیا کہ اس کا ہر گھونٹ حلق

سے اترتے ہی جسم میں آگ لگاتا چلا گیا۔

بھائی کا رشتہ ایک ایسا رشتہ ہے، جس میں ماں کے دودھ اور باپ کے خون کی ملاوٹ ہوتی ہے۔ ان دونوں چیزوں نے اس رشتے میں ایسی گرہ دے رکھی ہے کہ اگر اس میں ذراسی دراڑ آجائے تو ایسا لگتا ہے، جیسے ایک بازو میں زخم آگیا ہو۔ اور کہیں اگر نصیب دشمناں بھائی بھائی کے مابین ملکیر آجائے تو جیسے دونوں بازو جسم سے ٹوٹ کر گر گئے ہوں۔ بھائی، بھائی کی پشت پناہ ہوتا ہے ان کی علیحدگی سے وہ دیوار گر جاتی ہے، جو ایک دوسرے کو سہارا دیئے ہوئے ہوتی ہے۔ دشمن یہیں سے حملہ آور ہوتا ہے اور اپنے ارادوں کی تکمیل میں دور تک چلا جاتا ہے۔

مگر آہ! میری سوچ کے یہ سائے بہت جلد ڈھل گئے ع

آ کے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے

میری بہار کی عمر مختصر نکلی۔ خزاں نے تمام پھول پتیاں بکھیر دیں اور باد سموم نے ایسا جھاڑ و پھیرا کہ چمن میں ویرانی کے سوا باقی کچھ نہ رہا۔ ؎

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے

دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

تنگ دستی ہو تو جھگڑے کے ہزار بہانے مل جاتے ہیں۔ پریشان حالی کے باعث پہلے تو عورتوں میں باہم تکرار ہوئی۔ آخر گھر میں مستقل فساد رہنے لگا۔ بھاوجہ کی طبیعت شروع سے تیز تھی۔ نئی دلہن بھی آخر عورت ٹھہری۔ سمجھانے کے باوجود کسی بات کا جواب دینا ہی پڑ جاتا۔ اسی بات کا بتنگڑ بنتا۔ آخر نوبت بایں جا رسید کہ ہم دونوں بھائی ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ اگرچہ اس سانحہ پر سے برس ہا برس گزر چکے ہیں۔ لیکن زخم کی کسک ہنوز باقی ہے۔

آٹھویں گرفتاری۔ ایک مخلص مسلمان قومی کارکن کی زندگی کس طرح آگے بڑھتی ہے۔ وہ کیونکر گزر بسر کرتا ہے۔ یہ سوال واقعی جواب طلب ہے۔ مگر جواب کون دے؟ زندہ قوموں کے ورکر جب میدان کارزار سے گزرتے ہیں تو ان پر دل نچھاور ہوتے ہیں۔ ان کی بلائیں لی جاتی ہیں۔ ان کے قدم جب تاج شاہی کو روندتے ہوئے بڑھتے ہیں تو دنیا ء سلطنت خاک ہو کر ان کے پاؤں سے چمٹ جاتا ہے۔ لیکن مردہ قومیں اور بے ضمیر افراد ایسی دولت کی توقیر نہیں

سمجھتے۔ ان کی ناسمجھی سے یہ گنجہائے گراں مایہ مٹی کے تول تل جاتا ہے۔ اور اگر کوئی اس سودے سے رہ جائے تو اس کی ساری زندگی اپنے آنسوؤں میں بھیگ کے رہ جاتی ہے۔ بھائی کے روٹھ جانے سے شب و روز ابتر ہوتے چلے گئے۔ جس آشیانے کی بنیاد تنکوں پر رکھی تھی اس کا سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ حادثاتِ روزگار کے باعث ہر گھڑی دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ پیٹ کا مسئلہ تو تھا ہی گھریلو ضروریات کی خرید بھی دردِ سر بن گئی۔ جیسے کیسے ہو سکا حالات سے لڑ جھگڑ کر تعمیرِ آشیانہ کے لیے بہر طور مزید تنکے فراہم کیے۔ ایسے میں شبِ عروسی کے خوبصورت لمحات بے مزہ ہو کر رہ گئے۔

مجلسِ احرار غریبوں کی جماعت تھی۔ یہاں خلوص، قربانی کے سوا کوئی شے نہیں تھی۔ ویسے بھی میرے مسلک کے خلاف تھا کہ میں کسی کے سامنے دستِ سوال بڑھاؤں۔ اگر کہیں کبھی ایسا ارادہ کیا بھی تو حیا مانع رہی۔

دلہن جو کھاتے پیتے گھرانے سے آئی تھی، میرے گھر سے اسے ایک وقت کی روٹی بھی دشوار ہو گئی۔ ان دنوں امرتسر میں چودھری افضل حق کانگریس کے مقابل انتخاب لڑ رہے تھے۔ یہ ضمنی الیکشن تھا۔ ڈاکٹر کچلو کے خلاف یونینسٹ پارٹی کے شیخ محمد صادق نے عذرداری جیت لی تھی۔ اب کی دفعہ جماعت نے اس سیٹ پر شیخ حسام الدین کی بجائے چودھری صاحب کو اپنا نمائندہ نامزد کیا۔ دوسری طرف ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو پنجاب کانگریس نے ٹکٹ دے دیا۔ یونینسٹ پارٹی کے امیدوار سے مقابلہ تھا۔ (ایک ہی سیاسی عقیدے کے دو مسلمان باہم کیوں ٹکرائے اس کی تفصیل آئندہ اوراق میں دیکھیے) یہ دن امرتسر میں ہی نہیں پنجاب بھر کیلئے کشمکش کے دن تھے۔ جماعتی مصروفیت کی وجہ سے ہر صبح دفترِ احرار میں چلا جاتا اور رات گئے واپس آتا۔ بیوی میرے انتظار میں بیٹھی رہتی۔ میرے آنے پر رکھی سوکھی کھا کر ہم میاں بیوی سو رہتے۔ دن یوں ہی بیتتے رہے۔

۲۶۔ نومبر ۱۹۳۹ء الیکشن کا آخری دن تھا کہ مجھے امرتسر کوتوالی کے سامنے گرفتار کر لیا گیا۔

رفیقۂ حیات کو عمر میں پہلی بار اس صدمہ سے دوچار ہونا پڑا۔ اس پر ستم یہ کہ وہ عنقریب بچہ کی ماں بننے والی تھی۔ یہ خوف مجھے ہر گھڑی ستانے لگا کہ کہیں اس صدمے سے بچے یا اس کی اپنی جان کو نقصان نہ پہنچے۔ اس خیال میں ایک رات اور دو دن گذرے تھے کہ بیوی اپنی والدہ کے ساتھ

ڈسٹرکٹ جیل میں ملاقات کے لیے آئی۔ اس کا چہرہ میری گرفتاری کے تاثر سے خالی نہیں تھا۔ اڑی اڑی سی رنگت پریشان حالی کی غماز تھی ۔ بظاہر اسے دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔ مگر اندر سے دل بیٹھا جا رہا تھا۔ بہت دیر تک ہم دونوں میں گفتگو رہی۔ اس دوران نہ تو اس نے اپنے فاقوں کا شکوہ کیا اور نہ مجھے ہمت ہوئی کہ اس سے پوچھوں کہ تم نے یہ دن کیسے گذارے۔ گو اس کی نظریں بار بار سوال کرتی رہیں مگر میرا دل اس کے سوال کے جواب پر شرمندہ تھا۔ آخر میری خوشدامن سے نہ رہا گیا اور یہ بات اس کے منہ سے نکل ہی گئی کہ گھر میں اللہ کے سوا کوئی شے نہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ اس پر رفیقہ حیات والدہ پر ناراض ہوئیں، کہ آپ نے ایسا کیوں کہہ دیا میرے پاس خدا کا اور ان کا دیا بہت کچھ ہے۔ مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ آپ پریشان نہ ہوں۔

خدا والی بات تو درست تھی اور جہاں تک میرے دینے کا سوال تھا، اس حقیقت کا خود مجھے علم تھا۔ ان کے چلے جانے کے بعد میں نے اپنے خالق سے گڑگڑا کر دعا مانگی۔ اے جہانوں کے پالن ہار! میں نے اپنے کو صرف تیری خوشنودی کے لیے مشکلات میں ڈال دیا ہے۔ میرے پائے ثبات میں لغزش نہ آنے پائے۔ میری حفاظت کرنا۔ دوسرے دن خواجہ عبدالرحیم عاجز ملاقات کے لیے آئے تو ان سے عرض کیا کہ خدا کے بعد میں گھر کی نگہداشت آپ کے سپرد کرتا ہوں۔

انہوں نے ایک روز جیل میں آ کر کہا۔ کل میں نے امرتسر چھڑہ منڈی میں تیرے گھر کے لیے ایک دوست سے تعاون کی درخواست کی۔ اس نے کہا، جانباز کے پاس تو کافی دولت ہے۔ اس کا حساب تو بنک میں ہے۔ میں نے جب اپنے متعلق یہ سنا تو عاجز صاحب سے کہا کہ اب کسی کے پاس مت جائیے، تاکہ یہ بھرم بھاؤ بنا رہے۔

ایک ہفتہ کے بعد مقدمہ عدالت میں پیش ہوا۔ میری فرد جرم میں ایک جلوس کی رہنمائی کا الزام تھا جس میں فوجی بھرتی کے خلاف نعرے لگائے گئے تھے۔ حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ انتخاب کے دنوں نہ تو کوئی جلوس نکلا اور نہ میں نے کسی جلوس کی رہنمائی کی۔ حکومت کا یہ افسانہ چار ماہ تک بحث کا موضوع رہا۔ آخر مارچ ۱۹۴۰ء کے تیسرے ہفتے سرکاری وکیل کے کہنے پر عدالت نے مقدمہ واپس لے لیا۔

طاہرہ کی پیدائش۔ سوا اس کے کہ بیوی کی صحت میں فرق آیا ہو۔ جیل سے واپسی پر گھر کے

ماحول میں کوئی تبدیلی نظر نہ آئی۔ تبدیلی آتی بھی کیا۔ گھر میں رکھا ہی کیا تھا جو تبدیل ہو جاتا۔ البتہ بیوی کی صحت برباد ہو گئی اور یہ اثرات تا زیست رہے۔

رہائی کے کچھ دنوں بعد گوجرہ ضلع لائلپور جماعتی حکم کے تحت مقامی میونسپل انتخابات کے لیے جانا پڑا۔ تیسرے دن گھر سے اطلاع آئی کہ میرے ہاں لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ یہ مارچ کا آخری دن تھا۔ یہ خبر سن کر مجھ پر اداسی سی پڑ گئی اور آنکھوں نے ساون بھادوں کا سماں باندھ دیا۔ میں دل برداشتہ ہو گیا۔ میرے آنسو لڑکی کی پیدائش پر نہیں، بلکہ لڑکی کی جو ذمہ داری مجھ پر آن پڑی تھی اس سے میرا دل کانپ اٹھا۔ میں خدا کے خوف سے رویا تھا۔ سفر سے واپسی پر بچی کو گود میں لیا اور خدا سے دعا مانگی کہ

"اے میرے پالن ہار! اس بچی کی صحت، آبرو سب تیرے سپرد ہیں۔"

اور اس کا نام طاہرہ رکھا۔

ایامِ مفروری۔ دوسری جنگِ عظیم کے بڑھتے ہوئے شعلے یورپ سمیت ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ کو اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے۔ جرمن کے بمبار طیارے لندن پر آگ برسا رہے تھے۔ برطانوی حکومت اتحادی طاقتوں کی معیت میں اس لڑائی میں شامل تھی۔ اپنی غلام رعایا کو بھی اس نے اس آگ میں جھونکنا چاہا۔ ان کے انکار پر تمام ایسے ہندوستانی عناصر کو ۱۹۳۹ء کے آخری دنوں جیل خانوں میں بند کر دیا گیا۔

مجلسِ احرار نے اپنی قرارداد میں برطانیہ سے ترکِ تعاون کا اعلان کیا۔ جس پر اس کے تمام رہنما اور کارکن جیلوں میں ڈال دیے گئے۔ مجلسِ احرار کے نزدیک ہندوستان کی نجات کے لیے اس سے بہتر کوئی موقعہ نہیں تھا۔ نازی ازم کے سیلاب نے یورپ میں انگریزی وقار کا مستقبل مخدوش کر دیا تھا۔ ان حالات میں جب صیاد کا دامن اس کے اپنے گل بوٹوں کے خارزاروں سے الجھا ہوا ہو، گلچیں کا قفس کی تیلیاں توڑ کر نکہتِ بادِ بہاری کی راہ لینا کوئی دشوار نہیں تھا۔

میرے تمام ہمسفر وقت کا تقاضا پورا کرتے ہوئے مجھ سے کوسوں دور جا چکے تھے۔

اسیرانِ افرنگ کی صدائیں بار بار مجھے میری ذمہ داریوں کا احساس دلا رہی تھیں۔ کہ

دوڑو! زمانہ چال قیامت کی چل گیا۔

خود تاریخ مجھے پکارتی کہ لوہا گرم ہے۔ اٹھو تم بھی ایک ضرب لگاؤ۔ شاید تمہاری قربانی سے اس اندھیرے میں نکھار آجائے۔ لیکن خانگی حالات نے میرے پاؤں بری طرح جکڑے ہوئے تھے۔ میں کسی کروٹ سنبھلنے کے قابل نہیں تھا۔ میں جن راہوں پر سفر کر چکا تھا اس کی تھکان ہنوز باقی تھی۔ پاؤں کے تلوے لہولہان ہو رہے تھے۔ اس پر بھی دلِ مضطر کی صدا تھی۔ کہ جانباز! وطن عزیز اس جنگ کے بعد آزاد ہو جائے گا۔ تیرے ہمراہی فاتحانہ نغمے الاپتے جب گھروں کو لوٹیں گے، تو تیرا ماضی تجھے شرمندہ کرے گا۔

ان دنوں مولانا عبدالکریم مباہلہ نے امرتسر سے ایک ماہنامہ جاری کر رکھا تھا۔ یہ شعبہ تبلیغ مجلس احرار کا ارگن تھا۔ میں نے تین سو روپے ماہوار پر اس ادارہ میں ملازمت اختیار کر لی۔ جنگ کے دنوں ہر چیز گراں تھی۔ یہ قلیل تنخواہ میرے لیے ناکافی تھی۔ تاہم بادلِ نخواستہ اسے قبول کر لیا۔ پنجاب کے مختلف شہروں میں دن بھر رسالہ مذکور کے لیے خریدار فراہم کرتا اور رات کو جنگ کے خلاف لوگوں کو بغاوت پر ابھارتا۔ مگر یہ سلسلہ زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔ کیونکہ جنگ کے دنوں فوجی بھرتی کے خلاف عوام کو اکسانا سلطنتِ وقت کا مجرم ہونا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خوشاب (ضلع سرگودھا) اور نکودر (ضلع جالندھر) سے گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو گئے۔ اس پر پنجاب پولیس نے میری تلاش شروع کر دی۔ مجھے اس کی اطلاع جالندھر اور امرتسر کے درمیان سفر کرتے ہوئے ملی۔ چنانچہ احباب کے مشورہ پر پنجاب کو چھوڑنا پڑا اور میں یوپی چلا گیا۔ جماعتی پالیسی کے مطابق سہارنپور سے دہلی، آگرہ، بنارس، بریلی، علی گڑھ، مرادآباد اس طرح سارے صوبے میں قریباً پچاس اجلاسوں میں شمولیت کی اور عوام سے نظم و نثر میں خطاب کیا۔

<u>ایک دلچسپ واقعہ</u>۔ یوپی میں دورہ کے دوران ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔

حضرت غالب سے کسی نے پوچھا، آپ کا آموں کے متعلق کیا خیال ہے جواب میں کہنے لگے۔ بہت زیادہ ہوں اور بہت میٹھے ہوں۔ اپنا بھی یہی ایمان ہے۔ ویسے بھی آم جنت کے میوہ جات میں شامل ہے۔ جب یہ موسم آتا ہے تو کوئل کی میٹھی آواز اس میں مزید رس بھر دیتی ہے۔ ساون کے برسنے بادل جوان تمناؤں میں عجیب کیفیت پیدا کرتے ہیں

مغرب سے اُٹھتی ہوئی گھٹائیں زلفِ یار کی طرح بل کھاتی ہوئی باغوں میں پڑے ہوئے جھولنوں کو ہوا دیتی ہیں تو برسات کا یہ موسم دو آتشہ ہو جاتا ہے۔

یو پی کی مسلسل دھوڑ دھوپ سے تھک ہار کر کچھ دیر سستانے کو جی چاہا تو میں دیو بند چلا آیا۔ علمی مرکز بھی ہے اور آموں کی فصل بھی یہاں وافر ہوتی ہے۔ ملیح آباد کے بعد ضلع سہارنپور اس فصل کا مرکز ہے۔ شہر کی جامع مسجد میں نمازِ جمعہ کی تیاری ہو رہی تھی کہ میں مسجد میں پہنچا۔ وضو سے فارغ ہو کر سنتیں نیت رہا تھا کہ ایک آواز نے چونکا دیا۔

"حضرات! آپ کو سن کر خوشی ہوگی کہ ہندوستان کے انقلابی شاعر جانباز مرزا مسجد میں موجود ہیں۔ وہ نماز کے بعد اپنا کلام سنائیں گے"

یہ تھے مولانا ضیاء الدین (مولانا مفتی نعیم لدھیانوی کے فرزند اکبر) میرا ان سے زندگی میں پہلی بار آمنا سامنا ہو رہا تھا۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر اعلان کر دیا۔ اڑتے اڑتے یہ خبر شہر اور پھر مدرسہ میں جا پہنچی۔ ناآشناؤں سے بھی تعارف ہوا۔ مدرسہ ہذا کے اساتذہ کی خدمت میں حاضری دی۔ مدرسہ کی عمارات اور دوسری تاریخی یادگاریں بھی دیکھیں۔ طلباء سے ملاقات ہوئی۔ ہر روز دعوتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ آموں کی محفلیں بھی لگیں۔ اسی طرح دو ہفتے گزر گئے۔ اب چلنے کا ارادہ تھا کہ طلباء نے دارالحدیث میں آخری مرتبہ مجھ سے میرا کلام سننے کی خواہش کی اس لیے خاصہ اہتمام کیا گیا۔ نمازِ عشاء کے بعد یہ نشست تھی۔

یو پی میں عام طور پر مشاعرہ بیٹھ کر پڑھنے کا رواج ہے۔ اس رسم کے مطابق میں نے ابھی مصرعہ اٹھایا ہی تھا کہ دارالحدیث کی تمام بتیاں گل کر دی گئیں۔ اس قدر شور ہوا کہ کوئی بات سمجھ میں نہ آئی۔ ایک کونے سے ہم نہیں سنیں گے، دوسری طرف سے ہم ضرور سنیں گے۔ ان آوازوں کے باہم تصادم کے پس منظر میں مدرسہ کی دیرینہ سیاسی کشمکش کارفرما تھی جس سے میں ناواقف تھا۔ بنگالی اور یو پی کے طلباء کا ایک گروہ تھا۔ پنجابی اور پٹھان دوسری طرف تھے۔ آخر ہاتھا پائی کی نوبت آنے سے پیشتر یہ محفل میرے اعلان پر برخاست ہوگئی کہ میں اپنا کلام نہیں سناؤں گا۔

رات پریشانی میں کٹی۔ دیو بند میں میرے قیام کے دوران میرے لیے اپنی نوعیت کا

یہ پہلا واقعہ تھا۔

میرے سیاسی افکار ڈھکی چھپی بات نہیں تھے جس پر طلبا مشتعل ہوتے اور پھر جب کہ گذشتہ نیدھواڑہ میں اس قسم کی کئی محفلوں میں شریک ہو چکا تھا پھر یکایکی طلبا کی طبیعتوں میں انقلاب کیسا؟ صبح کی نماز کے بعد ناشتہ کا دسترخوان آراستہ ہو رہا تھا کہ حضرت مولانا اعجاز علی تشریف لائے اور مجھے بے نقط گالیاں دینے لگے۔

مولانا اعجاز علی مدرسہ ہذا کے اساتذہ میں جلالی طبیعت رکھتے ہیں۔ اس پر احباب کا تقاضہ ہوا کہ میں خاموش رہوں۔ چنانچہ وہ غصہ نکال کر چلے گئے۔ پتہ چلا کہ انہیں رپورٹ دی گئی تھی کہ

"ایک داڑھی مونڈے نے رات حضرت شیخ کی مسند پر بیٹھ کر سگریٹ پیے اور قوالی کی"

ظاہر ہے کہ اس پر غصہ آنا چاہیے تھا۔ مگر حقیقت یہ نہیں تھی۔ نہ تو میں سگریٹ کا عادی ہوں اور نہ ہی مجھے علم تھا کہ یہ شیخ کی مسند ہے۔ جہاں بیٹھ کر حضرت شیخ الہند مولانا حسین احمد مدنی طلبا کو حدیث پڑھاتے ہیں۔ اس پر ستم یہ کہ مولانا اعجاز علی سے میرا تعارف نہیں کرایا گیا تھا۔

اس حادثہ کے بعد احباب نے رائے دی کہ مجھے مولانا قاری محمد طیب ناظم دارالعلوم دیوبند اور مولانا شبیر احمد عثمانی سے ملاقات کرنی چاہیے۔ کہیں یہ افسانہ حقیقت نہ بن جائے۔ اس تجویز پر میں قاری طیب صاحب کے ہاں حاضر ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی قاری صاحب ازراہ شفقت اپنی جگہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ مصافحہ اور معانقہ کے بعد فرمایا۔

"مجھے رات اور صبح کی ساری رپورٹ مل گئی ہے۔ اچھا ہوا کہ تم آ گئے۔ ورنہ یہ بات آگے بڑھ جاتی"

اتنے میں چائے آ گئی۔ جب میں چلنے لگا تو کہا "جانے سے پہلے حضرت عثمانی صاحب سے ملتے جانا۔ نیز مناسب ہو تو رات حضرت مدنی دورے سے واپس تشریف لا رہے ہیں ان سے ملنا نہایت اہم ہوگا۔

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی سے ملا تو آپ اس وقت مطالعہ میں مصروف تھے میں نے اپنا تعارف کرایا تو جلدی سے مجھے گلے لگا لیا اور پیشانی کا بوسہ لیا "رات ایک اطلاع ملی تھی، کہیں وہ تمہارے متعلق تو نہیں؟ مگر تم نے سگریٹوں کا سلسلہ کب سے شروع کیا ہے مراد آباد کی ملاقات میں تو تم نے کہا تھا کہ مجھے یہ عادت نہیں۔"

حضرت یہ سارا کچھ آپ سے غلط کہا گیا۔ میں اب بھی منشیات سے نفرت کرتا ہوں۔"

"اچھا تو اب ٹھہرنے کا ارادہ ہے؟" "نہیں! حضرت میں آج جانا چاہتا تھا" میری بات کاٹ کر حضرت عثمانی نے فرمایا "رات شیخ واپس پہنچ رہے ہیں اگر ان سے مل جاؤ تو بہتر ہے۔"

بڑے لوگوں کی باتیں بڑی ہوتی ہیں۔

مجلس احرار پھگواڑہ (ریاست کپور تھلہ) کے کارکن مولوی برکت اللہ (آجکل رحیم یار خاں میں قیام کرتے ہیں) ان دنوں مدرسہ دیوبند کے محاسب تھے۔ ان کے سپرد کیا گیا کہ وہ رات اسٹیشن پر پہنچ جائیں اور جیسے ہی حضرت گاڑی سے اتریں، تمام واقعہ ان کی خدمت میں عرض کر دیا جائے۔ چنانچہ ایسے ہی ہوا۔ میں خدمت میں حاضر ہوا تو اپنے اخلاقِ عالیہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے معانقہ کیا اور فرمایا "تم احرار والے جہاں جاؤ گے فساد ہی کراؤ گے"۔۔۔ خیر صبح چائے میرے ساتھ پی لینا۔ مگر یہ چائے لیڈروں کی سی نہیں ہوگی" حضرت میں جیسی چاہوں گا مجھے ملے گی۔"

نمازِ فجر کے بعد حضرت کے در دولت پر حاضری دی تو شہر کے معززین کا اچھا خاصا ہجوم تھا۔ اس میں مقامی کانگریس کے صدر، مدرسہ کے اساتذہ اور قومی کارکن شامل تھے۔

یہ محض مجلس احرار کے ایک کارکن کی عزت افزائی تھی یا اس داغ کو دھونا تھا، جو بعض ناعاقبت اندیش طلبا نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مہمان کے دامن پر لگایا تھا۔ نیز دار العلوم کے استاد سے جو غلطی ہوئی تھی۔ بہر حال کچھ بھی ہو۔ میں اسے حضرت شیخ الہند کی عالی ظرفی کے سوا کچھ نہیں سمجھتا۔ ع

جن کے رتبے ہیں سوا

ناشتے میں یو۔پی کا انداز تکلف پوری طرح شامل تھا۔ اس سے فارغ ہوتے تو میں

نے جانے کی اجازت چاہی - فرمایا "ابھی نہیں تمہیں میرے ساتھ مدرسے چلنا ہے" چنانچہ مہمانوں کو رخصت کرنے کے بعد میں حضرت کی معیّت میں مدرسے پہنچا اور حضرت شیخ نے مجھے اپنے ساتھ مسند پر بیٹھنے کا حکم کیا اور خود طلبا کو پڑھانے لگے - تھوڑی دیر بعد فرمایا - طلبا بار بار اشارے کر رہے ہیں - غالباً یہ تم سے کچھ سننا چاہتے ہوں گے - لہٰذا کچھ سنا دو" میں نے تعمیل ارشاد پر گزشتہ رات کی ادھوری نظم سنائی - حضرت اور طلبا بہت محظوظ ہوئے - اس کے بعد فرمایا "اب تمہیں اجازت ہے" خود دروازے تک چھوڑنے آئے مصافحہ اور معانقہ کے بعد کان میں فرمایا "دل میں کوئی مَیل لے کر نہ جانا"

اس واقعہ سے مقصود میری پذیرائی نہیں - بلکہ مجلس احرار کے مؤقف کا احترام تھا یا ہے ان لوگوں کے ذاتی کردار کی بلند حوصلگی کہیے -

یہ دور میرے پختہ شعور سے ماورا ہی تھا - لیکن حضرت شیخ الہند مولانا حسین احمد مدنی مولانا شبیر احمد عثمانی اور قاری طیّب نے مجھے جو اعزاز بخشا وہ تمغۂ افتخار ہے، جو ہمیشہ میرے دل کی گہرائیوں میں آویزاں رہا -

سرحد کا دورہ - یوپی کے بعد میں شمال مغربی صوبہ سرحد چلا گیا - پہلا مقام ایبٹ آباد تھا - سرحد کا یہ پہاڑی علاقہ موسم گرما کے لیے بہترین فضائی مقام ہے - دو ایک روز دوستوں سے ملاقات رہی - مقامی جماعت نے جلسے کا اعلان کر دیا - عوامی اجتماع کے لیے جامع مسجد کے بعد کمپنی باغ موزوں ترین جگہ ہے - عام پبلک جلسے میں ہوتے ہیں - جلسے کی صدارت حکیم عبدالسلام نے کی - آپ سرحد کے ممتاز رہنما تھے - مرزائیت کے خلاف میری نظموں نے جھوٹی نبوّت کی عمارت ریزہ ریزہ کر دی - اس وقت عوام کے جذبات میں طوفان تھا اگر ان کا بس چلتا تو جھوٹی خلافت کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتے - صحیح اطلاع ملی کہ مقامی حکام کی نیّت میرے متعلق درست نہیں - چنانچہ یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں - نیز واپسی کے لیے لاری کا سفر بھی مخدوش سمجھا گیا - بہتر ہے کہ حویلیاں ریلوے اسٹیشن تک پہاڑی راستہ اختیار کیا جائے - چنانچہ عربی مدارس کے دو طالب علم میرے ساتھ کر دیے گئے - حکیم صاحب دو میل تک راستے کی نشاندہی کے لیے خود ساتھ آئے - یہ سفر پچیس (۲۴) میل کا تھا - پہاڑی راستے

کے باعث منزل پر پہنچنا تکلیف دہ تھا۔ ہمراہی خود اس سفر کے عادی نہیں تھے۔ صبح ستاروں کی لو میں ہم سفر پر روانہ ہوئے۔ دن کے گیارہ بجے ایک گاؤں پہنچے۔ بھوک اور پیاس سے جان پر بن رہی تھی۔ ایک راہ گیر سے عرض کیا، جو اسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ وہ اپنے گھر لے گیا۔ باجرے کی روٹی، شلجم کا اچار لسی کے ساتھ پیش کیا۔ گو میں اس خوراک کا عادی نہیں تھا لیکن بھوک کی شدت اور میزبان کے خلوص نے ایسا مزہ دیا کہ آج تک اس لذت کی حلاوت محسوس ہو رہی ہے۔ دوپہر ڈھل رہی تھی۔ خشک پہاڑوں کے چہروں پر آہستہ آہستہ رات کی سیاہی کے نشان ابھرنے لگے۔ یہ سنگلاخ زمین جسے میں صبح سے روندتا چلا آ رہا تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ سے کبھی کبھار ایسے لگنے لگا، جیسے اس کا دامن میرے لیے سکڑنے لگا ہو۔ کہیں ندی نالے راستے کی روک بنتے۔ لیکن میرا عزم دیکھتے ہی اپنی راہ لیتے۔ اب آسمان پر ستارے چمکنے لگے۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا، جیسے فرنگی آئین کے محافظ بہت سے چراغ لے کر میرے تعاقب میں آ نکلے ہیں۔ پہاڑوں کی بلندیاں میرا محاصرہ کر رہی ہیں۔ انجانی راہوں پر چلتے ہوئے مجھے سولہ گھنٹے بیت چکے تھے۔ جواں ہمت اور صحت کی موجودگی نے اس سفر کی تھکان کا احساس نہ ہونے دیا۔ سامنے حویلیاں کا ریلوے سٹیشن دکھائی دیا تو جان میں جان آئی۔ یہاں میری ملاقات ملک خدا بخش سے ہوئی۔ یہ سرحد اسمبلی کے سپیکر تھے۔ میری ان سے یہ دوسری ملاقات تھی۔ پیشتر ازیں ہم کوہاٹ کے ایک مشاعرہ میں مل چکے تھے۔ ملک صاحب گو آئینی وضع کے آدمی تھے مگر آزادی پسند عناصر سے انہیں محبت تھی۔ اس صوبہ میں ان کا وجود بڑا ہی غنیمت تھا۔ میری اچانک ملاقات پر بہت خوش ہوئے۔ کھانا کھایا اور اپنے صوبے کی سیاسیات پر بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ رات یہیں ریلوے ریسٹورنٹ میں گذاری اور دوسری صبح میں پشاور چلا گیا۔

اسی رات چوک یادگار میں جلسہ ہوا۔ ان دنوں متحدہ ہندوستان میں فوجی بھرتی کے خلاف مجلس احرار کی تحریک زوروں پر تھی۔ مفتی سرحد مولانا عبدالقیوم پوپلزئی اس جلسہ کے صدر تھے میری سیاسی نظمیں دوسرے کارکنوں کو ازبر تھیں۔ اس وجہ سے عوام میں میرا تعارف تھا۔ لیکن صدر جلسہ نے میرا تعارف پرتکلف انداز میں کرایا۔ نظمیں پڑھیں تو مجمع میں ایک قسم کی بغاوت

کے آثار ابھرنے لگے۔

دوسرے روز صوبے کے دیگر شہروں کے لیے روانہ ہوا۔ کوہاٹ میری دوسری منزل تھی۔ یہاں کے دوستوں نے سنا تو والہانہ دوڑے آئے۔ شیخ ابراہیم پراچہ، سید مخدوم شاہ نوری اور میر بلالی معروف کارکن آکر ملے۔ ایک رات اور دو دن یہاں قیام رہا۔ پھر بنوں چلا گیا۔ ان دنوں مشہور تھا کہ آزاد قبائل مسافروں کا مال و اسباب لوٹ لیتے ہیں۔ اس بنا پر شام سے پہلے پہلے روانہ ہو جانا چاہیے۔ چنانچہ دن کے دوسرے پہر دوستوں سے اجازت چاہی اور لاری کے ذریعے بنوں پہنچ گیا۔ شہر میں نووارد کی حیثیت سے کسی سے آشنا نہیں تھا۔ رات کو چونکہ یہاں ٹھہرنا تھا۔ لہذا کھوج شروع کی کہ کوئی ٹھکانا ملے کہ شہر کے ایک بڑے چوک میں جلسہ کا اہتمام ہو رہا تھا۔ لوگ جمع تھے۔ میں بند دکان کے ایک تختے پر بیٹھ گیا۔ جلسے کی کارروائی شروع ہوئی۔ مقررین نے جی بھر کر حکومت کے خلاف آگ برسائی۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے صدر جلسہ کو رقعہ لکھا کہ میں بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں اور نیچے اپنا نام لکھ دیا۔ نام پڑھتے ہی صدر صاحب خود مجھے تلاش کرنے لگے۔ لوگ حیران تھے کہ ماجرا کیا ہے۔ انہیں اپنی تلاش میں آتے دیکھ کر میں بھی کھڑا ہو گیا۔ وہ مجھے اسٹیج پر لے گئے۔ میرے تعارف میں وہ بڑی دیر عوام سے گفتگو کرتے رہے۔ آخر میں میں نے فوجی بھرتی کے خلاف جماعتی مؤقف پیش کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب میں اگلے روز صبح بنوں کی فوجی چھاؤنی میں ایک غیر مسلم دوست سے جو ملٹری اکاؤنٹس کے دفتر میں ملازم تھا، ملنے گیا تو گیٹ پر روک لیا گیا اور اسی وقت ایریا کمانڈر کے پیش کیا گیا۔

"آپ یہاں کیوں آئے ہیں"؟

"میرا ایک دوست پنڈت ہری ناتھ یہاں ہے۔ اسے ملنا چاہتا ہوں"۔

چنانچہ مجھے بٹھا دیا گیا اور اسی وقت پنڈت جی کو بلوایا۔ ایریا کمانڈر نے ان سے چند سوال کیے۔ ہم تھوڑی دیر ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے اور میں واپس چلا آیا۔

کئی دنوں بعد مجھے جالندھر جیل میں اطلاع ملی کہ پنڈت جی کو میری دوستی کے جرم میں ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا ہے۔

بنوں سے اسی روز ڈیرہ اسماعیل خاں پہنچ گیا۔ یہاں کے عوام سے خاصی جان پہچان تھی میری آمد پر جماعتی احباب نے فوراً جلسے کا اہتمام کر لیا۔ شہر کی مسجد میں نمازِ عشاء کے بعد خاصے لوگ جمع ہو گئے۔ مجلسِ احرار کی موجودہ پالیسی پر قریباً ایک گھنٹہ عوام سے گفتگو کی۔ دوسرے روز براستہ دریا خان پنجاب پہنچ گیا۔ یہاں آ کر معلوم ہوا کہ انگریزی قانون کے محافظ شکاری کتوں کی طرح میری تلاش میں ہیں۔ اس کے باوجود میں بچوں کی خیریت دریافت کرنے امرتسر گیا۔ مختصر وقت گھر ٹھہر کر لاہور واپس آ گیا۔ احباب سے دیگر باتوں کے علاوہ میری گرفتاری پر بھی بحث ہوئی۔ مفروری کے دوران اکثر مقام پر پولیس سے مڈ بھیڑ ہوئی۔ مگر کسی نہ کسی طرح میں بچتا رہا۔ ایک دفعہ امرتسر میں ایک مشاعرے میں شامل ہوا کہ پولیس آن پہنچی۔ اب گرفتاری یقینی تھی۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر جو ان دنوں امرتسر ایم۔ اے۔ او کالج کے پرنسپل تھے، مشاعرے کی صدارت کر رہے تھے۔ جیسے ہی پولیس میری گرفتاری کے لیے آگے بڑھی۔ تاثیر صاحب نے اسے ایسی ڈانٹ پلائی کہ وہ اپنا سا منہ لے کے رہ گئی۔ اس موقعہ پر محفل میں جو بھگدڑ مچی میں اس میں غائب ہو گیا۔ پولیس دروازے پر کھڑی میرا انتظار کرتی رہی۔ مگر میں ہال کے برابر گندے نالے سے ہوتا ہوا اسٹیشن پر اور وہاں سے گاڑی پر لاہور پہنچ گیا۔

ان دنوں رانا جہانداد خاں امرتسر پولیس کے سٹی انسپکٹر تھے۔ میرے اور ان کے مابین شیخ حسام الدین کی وساطت سے ایک معاہدہ طے پایا کہ میں مفروری کے دوران اگر کبھی گھر آنا چاہوں تو رات کی سیاہ چادر میں چھپ کر اور صبح کے سفید دامن پر میرا سایہ ابھرنے نہ پائے اس معاہدے پر کافی دیر عمل ہوتا رہا۔

چودھری افضل حق کی وفات۔ پنجاب کی یونینسٹ گورنمنٹ نے چودھری افضل حق کو ان کی بیماری کے باعث میعادِ اسیری سے قبل رہا کر دیا تھا۔ یہ سرما کا موسم تھا۔ ان دنوں دمہ کا مرض اپنے مریض پر شدید حملہ آور ہوتا ہے۔ چودھری صاحب اس مرض میں مدت سے مبتلا تھے۔ جاڑے کے دن اپنے شباب پر تھے کہ ۲۸ جنوری ۴۲ء کو نصف رات گئے چودھری صاحب دفتر مجلسِ احرار لاہور کی بالائی منزل پر اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس وقت چودھری صاحب کی فیملی کے علاوہ ڈاکٹر عبدالقوی لقمان اور راقم موجود تھے۔

ہم دونوں نے مرحوم کے جسم کو ان کے آخری سفر کے لیے تیار کیا۔ یہ سعادت تھی جو مجھے اس مردِ مومن کے قریب رہ کر حاصل ہوئی۔

مرحوم اپنے وقت کے صاحب فکر لوگوں میں سے تھے۔ سیاسیات کے جوار بھاٹا ان کے ہمیشہ مرہون منت رہے۔ اپنے سیاسی حریف کی رائے کا چودھری صاحب وزن کرتے اور اسے اپنے سے کبھی کمزور نہ خیال کرتے۔ میاں سر فضل حسین سے چودھری صاحب کو زندگی بھر سیاسی اختلاف رہا۔ لیکن جب ان کی موت کی خبر ایک رضاکار نے مسکراتے ہوئے سنائی تو چودھری صاحب نے رضاکار کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا۔ اور خود تیزی سے ٹہلنے لگے۔ میں تقریباً گیارہ برس چودھری صاحب کے قریب رہا ہوں لیکن اس قدر غصے اور افسوس میں اس سے پیشتر کبھی نہیں دیکھا، جتنا انہیں اس روز دیکھا۔

دوسری جنگ عظیم کی خبر سنتے ہی مرحوم چودھری صاحب بچوں کی طرح ناچنے لگ گئے۔ ارد گرد کے لوگ حیران تھے کہ اچھی بھلی باتیں کرتے ہوئے انہیں یکایک کیا ہوا۔ جب اس پر سوال کیا گیا تو فرمایا کہ اس لڑائی کا انجام خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو لیکن اب ہندوستان غلام نہیں رہ سکتا۔

آپ کی رہنمائی میں مجلس احرار نے جو فیصلے کیے وہ ماضی کی تاریخ میں مستقبل کیلئے سنگِ میل کی طرح آج بھی راستہ دکھا رہے ہیں۔ کاش سالار قافلہ کی وفات کے بعد قافلے کے لوگ تھک ہار کر بیٹھ نہ جاتے۔

چودھری صاحب میرے ایسے کارکنوں کے روحانی باپ تھے۔ وہ ہر ساعت کارکنوں کی نگہداشت کرتے۔ جلسہ میں ان سے تقریریں سن کر خوش ہوتے۔ مگر دفتر پہنچ کر ان کا محاسبہ کرتے کہ یہ تم نے کیا کہا۔ اس کا اثر یہ ہوگا۔ فلاں بات جو تم نے کہی آئندہ اسے یوں مت کہنا۔ بلکہ یوں کہنا۔ حالانکہ مقرر جلسہ میں عوام سے بڑی داد لے کر آتا تھا۔ لیکن چودھری صاحب کے نزدیک سیاسی اعتبار سے اس میں کمزوری تھی۔ اس محاسبہ سے کارکنوں کا حوصلہ بڑھتا۔ افسوس کہ ان کی موت کے بعد جماعت میں اس کا فقدان رہا۔

ادب کی دنیا میں ان کی شخصیت اپنا جواب آپ تھی۔ ان کی تصانیف نے نوجوانوں کو زندگی کی نئی راہیں دکھائیں۔ آپ ہمیشہ اپنے ساتھیوں کو کچھ نہ کچھ لکھتے رہنے کی تلقین فرمایا کرتے۔

۱۹۲۹ء میں مجھے امرتسر جیل میں کچھ وقت ان کی خدمت میں رہنے کا موقعہ ملا۔ نقطہ یہ اسی کا اثر ہے کہ میں کبھی کبھار چند الٹے سیدھے حروف لکھ لیتا ہوں۔

میری ایک تصنیف پر بحث کرتے ہوئے روزنامہ "امروز" نے لکھا تھا۔

"جانباز مرزا کی تحریر پر چودھری افضل حق کی چھاپ نظر آتی ہے"

یہ حقیقت ہے کہ میں چودھری صاحب مرحوم کی تحریر سے متاثر ہوں میرے ہر موضوع کی اٹھان انہی کے طرزِ نگارش پہ ہے۔ حالانکہ مجھے امرتسر جیل میں ان کی رفاقت کے صرف چند ماہ میسر آئے۔

میری ایک کتاب تھی (اور میں سنتا چلا گیا) جو میں نے ۱۹۴۱ء کو راولپنڈی جیل میں لکھی تھی۔ رہائی کے بعد جب اس کا مسودہ چودھری صاحب کی خدمت میں پیش کیا تو بڑے خوش ہوئے اور فرمایا کہ میں اس پر دیباچہ لکھوں گا۔ مگر افسوس کہ زندگی نے انہیں مہلت نہ دی نویں(۹) گرفتاری۔ ڈیڑھ برس کی مسلسل بھاگ دوڑ کے بعد آخر مجھے لاہور جمعیت علماء ہند کے سالانہ اجلاس کے موقعہ پر گرفتار کر لیا گیا۔ تاریخ یاد نہیں۔ شاید یہ وہی دن تھے جب جرمن اور جاپان کی فوجیں یورپ اور ایشیا کو اپنے فاتحانہ اقدام سے روندتی ہوئیں آگے بڑھ رہی تھیں۔ غالباً مارچ ۱۹۴۲ء کا ذکر ہے کہ پولیس کے زیرِ حراست مجھے جالندھر جیل بھیجا گیا۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ مقدمہ کی بنا ننکودر (ضلع جالندھر) کی کوئی پرانی تقریر ہے۔

جالندھر جیل۔ جالندھر میرا آبائی وطن ہے۔ دادا مرحوم کے چار بیٹے تھے۔ میرے والد سب سے چھوٹے اور لاڈلے تھے۔ یتیمی کا داغ ان کے دامن پر بھی بچپنے میں ہی لگ گیا تھا۔ میں سے چاروں بھائی الگ الگ ہو گئے۔ ایک کو پہلوانی کا شوق تھا۔ وہ ریاست بروداہیں مہاراجہ کے ہاں ملازم ہو گئے۔ ان کا نام بوٹا پہلوان تھا اور وہیں فوت ہوئے۔ ان سے چھوٹے فتح دین تھے جو احمد آباد میں کپڑے کا کاروبار کرتے رہے اور بعد میں حلوائی کا کام بھی کرنے لگے۔ انہوں نے وہاں کافی روپیہ پیدا کیا اور اپنی زندگی کے آخری دن جالندھر آ کر گذارے۔ تا آنکہ۔ ؎

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔

ان سے چھوٹے حاجی کریم بخش تھے، جو والد صاحب کے ساتھ امرتسر آ گئے - اور یہیں ایک رنگریز کے ہاں ملازمت کر لی۔ محلہ چوڑ بھیری میں ان کا ذاتی مکان بھی تھا جو ان کی وفات کے بعد ہم دونوں بھائیوں کے حصے میں آیا - ان سے چھوٹے میرے والد صاحب تھے، جن کے ہاں چھ بیٹے پیدا ہوئے - چار راقم کی پیدائش سے پہلے فوت ہو گئے - اور برادر بزرگ (مرزا محمد عبداللہ) ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد کراچی میں فوت ہوئے - اس طرح سے میرا رشتہ جالندھر سے وابستہ ہے - آج بھی آباؤ اجداد کی ہڈیاں جالندھر کی خاک سے پیوست ہیں

پولیس مجھے جالندھر کی کچہری میں لے کر پہنچی تو بہت سے قریبی عزیز سرِ راہ مل گئے۔ لیکن میرے جرم کی نوعیت جان کر اپنے مستقبل کے پیشِ نظر ان سرکاری ملازم رشتے داروں نے میرے ایسے باغی کو منہ لگانا نامناسب سمجھا - ایسے دوست بھی تھے جو اب وکیل بن چکے تھے۔ ان کی تلاش بھی کی - مگر کون سنتا ہے - عدالت کی ابتدائی کارروائی کے بعد مجھے مقامی جیل میں بھیج دیا گیا - اس جیل میں میں آج پہلی مرتبہ لایا گیا تھا - جیسے ہی بڑے دروازے میں داخل ہوا سامنے دیوار پر لکھا تھا،

جب تک سانس تب تک آس!

قیدی کے لیے یہ کس قدر مایوس کن الفاظ تھے - نہ جانے میری نظریں بار بار اس مصرعے سے کیوں ٹکراتی رہیں - جیسے مجھے کوئی کہہ رہا ہو کہ سازِ زندگی کے تار ڈھیلے نہ ہونے پائیں زندگی کا دوسرا نام آس ہے - تمام عمارت اسی ایک لفظ پر تعمیر ہے - ذرا سی لغزش سے ساری عمارت متزلزل ہو جائے گی -

اس جیل میں چند کمیونسٹ قیدی بھی تھے، جن سے اکثر مذہبی چھیڑ چھاڑ رہتی - یہ سب کے سب بظاہر سکھ مذہب کے پیرو تھے - لیکن یہ فریب تھا -

انہی دنوں لندن سے سر سٹیفورڈ کرپس برطانوی حکومت کی طرف سے چند شرائط پر ہندوستان سے آزادی کا سودا کرنے آئے تھے -

ایوانِ افرنگ کو یقین تھا کہ ان کی بیڑیاں اب ٹوٹ جائیں گی - مارچ سے جون تک نشستے کھیلتے وقت گزر گیا - آخر چار ماہ کی عدالتی کارروائی کے بعد مجھے چھ ماہ قید با مشقت کی سزا [illegible]

دیا گیا۔

جالندھر سے روانگی۔ مجھ سے سیاسی اختلاف رکھنے والے کمیونسٹ قیدی خوش تھے کہ یہ کانٹا بھی نکل گیا۔ کیونکہ جب تک میں یہاں رہا یہ دوسرے لوگوں پر اپنا جادو نہ چلا سکے۔ یہی وجہ تھی کہ میری ان کی اکثر مڈبھیڑ رہتی۔ سزا کے بعد مقامی حکام نے مجھے لائلپور جیل تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا۔ چند سپاہیوں کی معیت میں ہتھکڑی اور بیڑیاں پہن کر جب میں جیل سے باہر نکلا تو میری نظریں اس مصرعہ سے آخری بار ٹکرائیں۔ ع

جب تک سانس تب تک آس

لوہے کی بوجھل بیڑیاں اور کمزور پاؤں۔ اس پر ستم یہ کہ ریلوے اسٹیشن تک پیدل چلنا ہوگا۔ راہ چلتی نگاہوں نے نہ جانے کن خیالات سے دیکھا۔ پا بجولاں، موٹا گاڑھے کا کرتہ، پولیس کے نرغے میں جب میں جالندھر کے بازاروں سے گذرا تو کسی نے کہا چور ہوگا، کسی نے کہا مسلمانوں کی اولاد ایسی بدمعاشیوں میں پکڑی جاتی ہے، کسی نے گرہ کٹ سمجھا۔ بچے تماشہ سمجھ کر ساتھ ہو لیے۔ آشناؤں نے دانستہ منہ پھیر لیا۔ عزیزوں نے راستہ کاٹ کر دوسری طرف رخ کر لیا۔ راہگیروں نے آوازے کسے۔ البتہ چند دوست جو واقف حال تھے۔ گاڑی چھوٹنے سے پہلے اسٹیشن پر ملے۔ ان میں منور غوری بھی تھے۔ (اگر یہ جواں مرگ نہ ہو جاتے تو شاید دوسرے افضل حق ہوتے) بڑے سمجھدار اور مخلص نوجوان تھے۔ کاش موت انہیں کچھ دن زندگی کی مہلت دیتی۔ گاڑی میں سوار ہوتے وقت احساس ہوا کہ پاؤں میں بیڑیوں کے باعث زخم آ چکے ہیں۔ اور ان سے خون بہہ رہا ہے۔ آج اس واقعہ پر سے کئی برس بیت چکے۔ لیکن زخموں کے نشان پر جب نظر پڑتی ہے تو یوں محسوس ہوتا، جیسے یہ پھر تازہ ہو رہے ہیں۔ گاڑی لاہور پہنچی یہاں سے لائلپور کے لیے دوسری گاڑی تبدیل کرنا تھی۔ اس دوران فرصت کے چند لمحات مل گئے۔ مرکزی دفتر احرار میں خواجہ عبدالرحیم عاجز کو پیغام بھیجا تو وہ آتی دفعہ اپنے ساتھ کچھ آم لیتے آئے۔ یہ پھل مجھے بڑا مرغوب ہے۔

کچھ اور لوگ بھی ملنے آ گئے۔ اتنے میں گاڑی کی روانگی کا وقت ہو چکا تھا۔ اور ملنے والے ایک لمبے عرصہ کے لیے جدا ہو گئے۔

لائلپور جیل ۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ شہر کے لوگ کاروبار سے فارغ ہو کر گھروں کو جا چکے تھے، جب ہم لائلپور گھنٹہ گھر تک پہنچے

بھوانہ بازار سے گذرتے وقت عید باغ میں کچھ بھیڑ دیکھی تو معلوم ہوا مسٹر فاروق سرحدی آج مقامی جیل سے رہا ہوئے ہیں۔ یہ ان کے اعزاز میں جلسہ ہو رہا ہے۔ چند لمحے ٹھہر کر آدمی بھیجا کہ انہیں بلا لائیے۔ یہ خبر سارے جلسے میں پھیل گئی اور تمام ہجوم میری طرف امڈ آیا۔ مسٹر فاروق نے بتایا کہ مقامی جیل کا انتظام بہت گندہ ہے۔ افسرانِ جیل بڑی بے اعتنائی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ خیر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !

تاروں بھری رات پورے شباب پر تھی۔ جب میں لائلپور جیل میں داخل ہوا۔ یہ ایسا وقت تھا، جب قیدی اپنی محدود دنیا کو چھوڑ کر خواب کے سہانے مزے لے رہا ہوتا ہے۔ اس وقت کسی حکومت کا آئین آڑے نہیں آ سکتا۔

"آپ کو بستر تو نہیں چاہیئے"، یہ سوال ساڑھے چھ فٹ لمبے ایک سیاہ فام وارڈر نے کیا۔ جب، وہ میری کوٹھڑی کا دروازہ بند کر چکا۔ مگر میرے پاس اس سوال کا جواب کیا تھا۔ اچھا ہوا کہ اس نے اس کا انتظار بھی نہیں کیا۔ اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد مجھے معلوم ہوا کہ ؎

یہاں اب میرے رازداں اور بھی ہیں

اس احساس نے میری تنہائی کی ساری عمارت کو توڑ پھوڑ دیا۔ ہم مشرب قیدیوں نے میرا استقبال قومی نعروں سے کیا۔ رات کے سناٹے میں یہ نعرے واقعی آرام طلب قیدیوں کی برہمی کا باعث ہوئے ہوں گے۔ لیکن خیر۔ یہ گناہ بھی میرے ہی دامن میں باندھ دیجئے۔

جس کمرے میں ہم مقفل تھے۔ اس کا رقبہ چھ مربع فٹ تھا۔ اندھیرے میں بہت سے سوال و جواب ہوئے۔ جن کا تعلق جیل حکام کی بے اعتنائی سے تھا۔ اس مختصر کمرے میں اٹھارہ پولیٹیکل قیدی تھے۔ اس پر جون کی گرمی۔ کمرے کی کھڑکیاں اس ڈھب سے بنائی گئی تھیں کہ اگر کہیں ہوا کا گذر ہو بھی تو غریب قیدی استفادہ نہ کر سکیں۔ اس رات گرمی کا یہ عالم تھا کہ حشرات الارض اپنی بلوں سے باہر نکل آئے تھے۔ سانپ کی

تشریف آوری مزید تکلیف کا باعث بنی ۔ آخر خدا خدا کر کے صبح ہوئی ۔ صورتوں کی جان پہچان اور تعارف کے بعد باہر آ گئے ۔ احاطہ دیکھا جہاں ہماری کوٹھڑی تھی ۔ یہاں ایک بھی تو درخت نہیں تھا ۔ حالانکہ عام طور پر جیلوں میں درخت ہوتے ہیں ، تاکہ مشقت سے فارغ ہو کر قیدی کچھ دیر سستا سکیں ۔ لیکن لائلپور کی جیل شاید ہمارے ہی دم قدم سے آباد کرنے کی تجویز تھی ۔ پانی کا نل اس قدر ناقص کہ گھنٹوں انتظار کے بعد کہیں چلو بھر پانی میسر آتا ۔ ان مشکلات کے پیشِ نظر جیل حکام کو توجہ دلائی اور مسلسل درخواستیں کیں کہ خدارا ، ایک دفعہ معائنہ کر لیجئے کہ اتنے آدمیوں کے رہنے کی گنجائش اس کمرے میں ہے ؟ لیکن کون سنتا ہے " طوطی کی صدا نقار خانے میں " ۔

برابر ایک ہفتے کی صدائے بے ہنگام کے باعث ہم نے جیل انتظامیہ کے خلاف ایک ایسا فیصلہ کیا ، جس کے لیے ہم تیار نہیں تھے ۔ کیونکہ ہمارا یہ قدم موت کی طرف لے جانے والا تھا ۔ یعنی ہم نے بھوک ہڑتال سے اپنے کو ختم کرنے کا عزم کر لیا ۔ جب ہمارے اس فیصلے کی اطلاع جیل حکام کو پہنچی تو وہ اس قدر برہم ہوئے کہ ہمارے احاطے کا دروازہ جو کبھی کبھار کھلتا تھا اس کی آس بھی جاتی رہی ۔ آخر چار دن کے بعد پانی کے گھڑے بھی چھین لیے گئے ۔ کون اندازہ کر سکتا ہے کہ موسم گرما اور پھر لائلپور ۔ ہم مردوں کی طرح ایک دوسرے پر پڑے رہتے تھے ۔ ہفتہ بھر کی بھوک ہڑتال کے بعد ہم میں سے اکثر جو میرے ایسے نحیف جسم کے مالک تھے ۔ قریباً ختم ہو چکے تھے ۔ نبض کی رفتار مدھم پڑ چکی تھی ۔ قوت گویائی بھی سلب ہو چکی تھی ۔ جب نوبت یہاں تک پہنچی تو حکام کو بھی اپنی جان کے لالے پڑے ۔ انہوں نے اپنے فیصلے پر غور کیا ۔ اکڑی ہوئی گردنیں ، ہمارے عزم کے دروازے پر جھک گئیں ۔ ہم چاہتے تھے کہ اس سارے واقعہ کو ایک مقدمہ کی شکل میں عدالت تک لے جائیں کہ جیل حکام انسانیت کے کس قدر مجرم ہیں ۔ جنہوں نے اٹھارہ آدمیوں کو چھ فٹ مربع کوٹھڑی میں جانوروں سے بدتر جان کر بند کیا ہوا ہے ۔ مگر ہماری یہ تجویز کامیاب نہ ہو سکی ۔ البتہ بارہ دن کی بھوک ہڑتال کے بعد ہمیں ایک بہت بڑی بیرک دے دی گئی ۔ یہ ایسے لوگوں کے لیے مخصوص تھی ، جن کے ورثا جیل سپرنٹنڈنٹ سے بالا بالا فیصلہ کر لیا کرتے ۔ ان

طرح کا سلسلہ پنجاب کی اکثر جیلوں میں رائج ہے۔

ہماری نئی بیرک چکر کے بالکل ملحق تھی، جس سے ریڈیو کی آواز اکثر سنائی دیا کرتی۔ یہ ریڈیو جیل سدھار کمیٹی کی طرف سے قیدیوں کی تفریح طبع کے لیے لگایا گیا تھا۔

ہماری اس تحریک کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم سب قیدی ایک ماہ کے بعد پنجاب کی مختلف جیلوں میں تبدیل کر دیے گئے۔

شاہ پور جیل - ابھی میری سابقہ سزا کے کچھ دن باقی تھے اور یقین تھا کہ اس دوران دوسرے مقدمہ کے لیے مجھے بلا لیا جائے گا، تاکہ سزا ایک ساتھ شروع ہو۔ حالانکہ اسی غرض سے لائلپور سے شاہ پور جیل میں تبدیل کیا گیا تھا۔ مگر یہاں پہنچ کر معلوم ہوا، کہ حکام جیل کے پاس اس قسم کی کوئی اطلاع نہیں۔

شاہ پور جیل کے متعلق مشہور ہے کہ یہاں گذشتہ صدی اللہ کے کسی نیک بندے کی بیٹھک رہی ہے۔ گاؤں والوں نے عقیدت کے طور پر ایک کنواں کھدوا دیا۔ چونکہ اس علاقے کی زمین نمکین واقع ہوئی ہے، لہٰذا پانی نمکین نکلا۔ جب اس کا پتہ مذکورہ درویش کو ہوا تو اس نے اللہ سے دعا مانگی اور کنویں کا پانی میٹھا ہو گیا۔ نہ جانے یہ کب کی بات ہے۔ لیکن پانی اچھا اور میٹھا دیکھ کر پنجاب گورنمنٹ نے بیمار قیدیوں کے لیے بطور ہسپتال یہ جیل کے لیے منتخب کر لی۔

واقعی اس جیل کا پانی میٹھا اور زود ہضم ہے۔ جب مجھے یہاں لایا گیا تو مجھے ایسے لگا کہ میں کسی بڑے باغیچے میں آ گیا ہوں۔ شاید ہی آپ یقین نہ کریں لیکن یہ حقیقت ہے کہ آج تک اس جیسی جیل پنجاب میں کوئی نہیں۔ یہاں پہنچ کر میری صحت چند دنوں میں اچھی ہو گئی۔ ان دنوں کانگریس کی تحریک "ہندوستان چھوڑ دو" کا آغاز ہو چکا تھا۔ پنجاب کے تمام سیاسی راہنما اسی جیل میں نظر بند تھے۔ رات "گیارہ" بجے مجھے یہاں لایا گیا تھا۔ صبح ہوتے ہی تمام قیدیوں سے الگ مجھے کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ دو دن کی بحث کے بعد باقی سیاسی قیدیوں میں مجھے شامل کر دیا گیا۔

لالہ بھیم سین سچر، ڈاکٹر گوپی چند بھارگو اور میں ایک کیمپ میں تھے۔ مولانا داؤد غزنوی، مہاراج کرشن مالک روزنامہ "پرتاپ" لاہور اور دیوان ... صاحبزادے برابر کے کیمپ ...

اس طرح پانچ صد ⁵⁰⁰ کے قریب سیاسی راہنما یہاں نظر بند تھے۔ حکام جیل سے ہر روز کسی نہ کسی بات پر نوک جھونک رہتی۔ ڈاکٹر مظہر حسین سپرنٹنڈنٹ جیل بہت حد تک شریف آدمی تھے لیکن سیاسی قیدیوں کی مسلسل آمد اور ان کی بعض ناجائز ضروریات نے ان کے دماغ کو چڑچڑا کر دیا تھا۔ گذشتہ جیلوں میں مجھے سرکاری طور پر (Writing) لکھنے پڑھنے کی اجازت تھی۔ مگر ان دنوں سیاسی قیدیوں پر پابندی کے باعث مجھ سے یہ مراعات چھین لی گئیں۔ اب میں صرف پڑھ سکتا تھا لکھ نہیں سکتا تھا۔ جیل قانون کے مطابق کسی قیدی کو خواہ وہ سیاسی ہو یا غیر سیاسی جیل حکام کی اجازت کے بغیر کسی قسم کی تحریر کا حق حاصل نہیں۔

گو گھر کے حالات پریشان کن تھے تاہم برادر اکبر کے ایک خط نے ڈھارس بندھائی کہ گھر کے حالات کی کوئی فکر نہ کریں۔ بہر حال بڑے لوگوں کی سنگت میں ایام اسیری گذرتے محسوس نہ ہوئے اتنے میں دوسرے مقدمے کی اطلاع بھی آن پہنچی اور اس کی کارروائی بھی شروع ہو گئی۔

خوشاب۔ اس شہر کی تاریخ تو معلوم نہیں لیکن سرگودہا سے دور دریائے راوی کے کنارے واقع ہے۔ جیسے کہ نام سے ظاہر ہے (خوش آب) یہاں کا پانی اچھا ہے اور خاص طور پر مٹی کے برتن مثلاً صراحی اور گھڑے تو امراء عموماً موسم گرما میں یہیں سے منگواتے ہیں۔ شہر صاف ستھرا اور ریلوے اسٹیشن سے تھوڑی دور چل کر آبادی شروع ہو جاتی ہے۔ دریا کے کنارے تک ایک ہی بازار چلا جاتا ہے۔ مکانوں کی ساخت پرانی وضع کی ہے۔

۱۹۴۰ء فروری کے دنوں یہاں ایک تقریر کر گیا تھا۔ نیا مقدمہ اس زمانے کی صدائے بازگشت تھی۔ جب روز اول بطور مجرم یہاں لایا گیا تو تمام احرار دوست ملنے آئے۔ اور مقدمے میں مجھے اعانت کا یقین دلایا۔ اگرچہ یہ علاقہ انگریزی سلطنت کی کھاد سمجھا جاتا ہے۔ س لیے میرے ایسے کے لیے ان کے دل میں کیا عزت ہو سکتی تھی۔ تاہم غریب دوستوں ے ساتھ دیا۔ ایک وکیل سے بھی بات طے ہو گئی، محنتانہ بھی ادا کر دیا۔ تاہم اس نے مقدمے ، پیروی میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ آخری فیصلے کی تاریخ سرگودھا کی عدالت میں تھی۔ وکیل نے نہ آنا ما نہ آیا۔ اس کی انتظار میں وقت ضائع کرنا مناسب نہ جان کر میں نے خود اپنے مقدمے پر نث کی۔ تقریباً گھنٹہ بھر مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرتا رہا۔

سیاسی مقدمے کی نوعیت چاہے کچھ ہو۔ قانون اسے مجرم قرار دیتا ہو یا نہ، حکومت کی پالیسی بہرطور سیاسی ورکر کو جیل بھیجنے کی ہوتی ہے۔ اور عدالت اس ضابطے کی پابند ہوتے ہوئے قانونی پہلوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے ملزم کو مجرم قرار دے دیتی ہے۔ مجھے اس پیشی پر اڑھائی سال قید سخت کا حکم ہوا۔ میں نے عدالت کا شکریہ ادا کیا اور اسی وقت شاہ پور جیل واپس آگیا۔ یہاں سے چند دنوں کے بعد دیگر قیدیوں کے ساتھ اولڈ سنٹرل جیل ملتان تبدیل کر دیا گیا۔

لاہور اور ساہیوال کے بعد پنجاب میں اولڈ سنٹرل جیل ملتان عادی مجرموں کے لیے معروف اور سخت جیل سمجھی جاتی تھی۔ اس جیل کے افسانے عام لوگوں کی زبانی اکثر سننے میں آیا کرتے تھے۔ دسمبر ۱۹۴۲ء کے شروع میں تو یہاں کافی تعداد میں سیاسی قیدی موجود تھے۔ جیل لار کے مطابق مجھے اس روز تنہائی کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ جاڑے کا موسم تھا۔ تمام دن کوٹھڑی میں تنہا رہتے گذر جاتا۔ بدقسمتی سے اس جیل کے حکام دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ سیاسی قیدی بھی ان کے جال میں الجھے ہوئے تھے۔ ۲۶ جنوری کا یوم آزادی اس جھگڑے کا عملی آغاز تھا۔ ایک فریق سپرنٹنڈنٹ جیل سردار رام سنگھ کی طرفداری میں تھا، جبکہ دوسرا داروغہ جیل مسٹر منی لال کالیہ کے ساتھ تھا۔ یوم آزادی پر جھنڈا لہرانے کی رسم کے وقت کچھ کمیونسٹ نظریے کے لوگ سپرنٹنڈنٹ جیل کے معاون تھے۔ صبح آٹھ بجے احاطہ نمبر ۳ میں مہاشا خوشحال چند فورسند مالک روزنامہ "ملاپ" لاہور کے فرزند مسٹر لیش پال نے پرچم کشائی کی رسم ادا کرنا چاہی کہ جیل کے قیدی نمبردار اور وارڈن بمعہ افسروں کے لاٹھیاں لے کر ان پر ٹوٹ پڑے۔ تمام جیل میں ہاہاکار مچ گئی۔ ہر بیرک کے سیاسی قیدی خواہ ان کا تعلق اس رسم سے تھا یا نہیں سب کو بلاامتیاز تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ اس مار پیٹ سے راقم کو بھی چوٹیں آئیں۔ میرے علاوہ سینکڑوں سیاسی قیدی زخمی ہوئے۔ نیز طبی امداد کے بغیر انہیں بیرکوں میں بند کر دیا گیا۔ سردی کے موسم میں اس قدر چوٹیں کھانے کے بعد ہم سب کو دھوپ تاپنے سے محروم کر دیا گیا۔ یہ عمل ایک ماہ تک رہا۔ اس دوران کپڑوں میں جوئیں پڑ گئیں۔ زخموں سے بو آنے لگ پڑی۔ معمولی چوٹیں بھی خاصے زخم بن گئے۔ ان حالات میں تمام قیدیوں نے فیصلہ کیا کہ اس ظلم کے خلاف بطور احتجاج آج سے ایک وقت کا کھانا ترک کر دیا جائے۔ چنانچہ اس تحریک کا بھی میری صحت پر

برا اثر پڑا۔

جیل افسران اور قیدیوں کے مابین کھینچا تانی کا یہ سلسلہ مسلسل تین ماہ تک رہا۔ پنجاب کے اخبارات میں جب اس ظلم وجور کی کہانی شائع ہوئی تو بالآخر پنجاب گورنمنٹ نے تمام متعلقہ افسران کو اس جیل سے تبدیل کر دیا۔ ان کی جگہ نئے افسران نے سنبھال لی۔ ان میں بطور سپرنٹنڈنٹ کے ڈاکٹر مظہر حسین شاہ بوروا سے بھی تھے جہاں ان کا برتاؤ پولیٹیکل قیدیوں کے ساتھ نہایت اچھا رہا۔

حلال اور جھٹکا۔ اس سال پنجاب کی یونینسٹ گورنمنٹ نے سکھوں کا یہ مطالبہ منظور کر لیا کہ سکھ پولیٹیکل قیدیوں کو جیل خانوں میں جھٹکے کا گوشت دیا جائے۔ چنانچہ کانگریس کی ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کے پولیٹیکل قیدیوں کو ملتان سنٹرل جیل میں اکٹھا کر دیا گیا۔ ان کی کل تعداد غالباً پندرہ کے قریب تھی۔ اس کے مقابل مسلمان پولیٹیکل قیدیوں کی تعداد جو کانگریس کے تحت آئے تھے قریباً تیس اور چالیس کے درمیان تھی۔ ان میں شہزادہ آزاد ممبر یالوی سوشلسٹ لیڈر منشی احمد دین کے بھائی، کامریڈ غلام احمد اور اسی طرح کے دوسرے معروف لوگ تھے۔ راقم مجلس احرار کا واحد قیدی تھا۔ اب یہاں سوال پیدا ہوا کہ واقعی جیل میں جھٹکے کا گوشت دیا جائے یا نہ۔ یہی سوال سپرنٹنڈنٹ نے مجھ سے کیا۔ کیوں بھئی جانباز! سکھوں کا مطالبہ ہے کہ انہیں جھٹکے کا گوشت مہیا کیا جائے۔ حکومت پنجاب نے بھی اس کی اجازت دے رکھی ہے۔ آپ لوگوں (مسلمانوں) کو اس پر اعتراض تو نہیں۔؟

گورنمنٹ کے فیصلے کے باوجود سپرنٹنڈنٹ جیل کا یہ سوال انتظامی نوعیت کا تھا۔ اس پر میں نے سپرنٹنڈنٹ سے کہا "ہمیں اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ اپنے منہ سے چاہے کوئی گندگی کھائے"۔ اس جواب پر سکھوں نے میرے خلاف ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ لیکن اس کی نوعیت اہم نہ ہوئی۔

بیف (BEAF)۔ یوں تو ملتان جیل کے واقعات اس قدر اہم ہیں کہ انہیں زمانہ گذشتہ کی سیاسیات کا آئینہ دار بھی کہا جا سکتا ہے۔ جیل خانہ ایک ایسا مقام ہے کہ یہاں انسان فطرتاً ننگا ہو کر پورا ہے میں آکھڑا ہوتا ہے، جس سے اس کے اندرونی خدوخال صاف اور واضح نظر آنے لگتے ہیں۔

جھٹکے کے سوال پر کچھ ہندوؤں نے بھی سکھوں کا ساتھ دیا۔ مجھے حیرت ہوئی لیکن ہم مسلمان قیدی وقت کے انتظار میں خاموش رہے۔ نتیجتہً جیل حکام ہمارے رویے سے متاثر ہوئے تاآخر ہمیں بھی انتقام کی سوجھی۔ روہتک کے چودھری محمد حسین میرے ہم نوا تھے۔ باہم مشورے سے ہم نے سپرنٹنڈنٹ جیل سے درخواست کی کہ آپ بحیثیت مسلمان جانتے ہیں کہ مسلمان سال میں ایک بار اپنا ایمان تازہ کرنے کے لیے گائے کا گوشت کھاتے ہیں۔ لہٰذا ہماری مذہبی ضرورت کے پیش نظر ہمیں باہر سے گائے کا گوشت منگوانے کی اجازت دی جائے۔

ہماری اس درخواست پر حکام جیل نے جس طرح جھٹکے کے معاملے میں ہم سے مشورہ کرنا بہتر سمجھا تھا اسی طرح ہماری درخواست کے جواب میں غیر مسلموں سے بھی سوال ہوا لیکن بجائے جواب دینے کے سب کے سب میرے دشمن بن گئے۔ "یہاں فرقہ وارانہ فساد ہو جائے گا اور اس کی تمام تر ذمہ داری تم پر ہوگی۔" یہ جواب بگڑے ہوئے تیوروں کے ساتھ کچھ ہندوؤں اور تمام سکھ نوجوانوں نے دیا۔ ہم نے کہا کہ "اس میں فرقہ وارانہ فساد کا کیا سوال ہے۔ یہ تو ہمارے ایمان کی بات ہے اور مذہبی ضرورت کا تقاضہ بھی ہے"۔

ایمان کی تازگی کا یہ سوال ایک ہفتہ بحث کا موضوع بنا رہا۔ اس پر بہت لے دے ہوئی۔ آخر بات یہاں ٹھہری کہ اگر سکھ جھٹکا بند کر دیں تو مسلمان اپنا مطالبہ چھوڑ دیں گے؟

ہم نے کہا کہ "ہمارا مطالبہ ضد کی بنا پر نہیں بلکہ ایک مذہبی فریضہ ہے، جس کی ادائیگی میں ہم کوتاہی نہیں کر سکتے"۔

ہمیں معلوم تھا کہ یہ ایک سازش ہے، جس کی بنا پر ہم سے ایسا کہا جا رہا ہے۔ اگر ہم ذرا سی ٹھوکر کھا جاتے تو سارا معاملہ ہی چوپٹ ہو جاتا۔ مگر ہم اپنے مطالبے پر اڑے رہے جھٹکے پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ آخر لالہ کیدار ناتھ سہگل اور سپرنٹنڈنٹ جیل ڈاکٹر منظر حسین نے فیصلہ کیا کہ جیل میں آئندہ کوئی ایسی چیز نہیں آ سکے گی، جس سے کسی فرقے کے مذہبی جذبات کو ٹھیس لگے۔

بہت اچھا صاحب۔ ——— اگر آپ حضرات کی یہی مرضی ہے تو ہم امسال ایمان تازہ نہیں کرتے۔ آئندہ سال سہی۔ لیکن آپ کے فیصلے پر پھول ضرور چڑھائیں گے۔ اس طرح

ہم نے یہ مورچہ فتح کر لیا۔

غازی علم الدین اور شردھانند۔ جیسا کہ سطور بالا سے ظاہر ہو چکا کہ ان دنوں ملتان جیل میں ایک ہزار کے قریب پولیٹیکل قیدی تھے۔ ان میں کانگریسی سوشلسٹ، کمیونسٹ اور اکالی۔ مجلس احرار کی طرف سے صرف میں ہی ایک قیدی تھا۔ میرے متعلق ان سب میں مشہور تھا کہ میں فرقہ پرست ہوں۔ حالانکہ تاریخ گواہ ہے کہ میں عمر بھر فرقہ پرستی کے خلاف جنگ آزما رہا ہوں۔ لیکن جیل میں میرے دامن پر یہ داغ بھی لگ گیا۔

ملتان سنٹرل جیل میں عام رواج تھا کہ دوپہر کے بعد تمام سیاسی قیدی اور نظر بند ایک دوسرے سے ملاقات کے لیے ایک دوسرے احاطوں میں آجا سکتے تھے۔ چنانچہ ایک دن کا ذکر ہے کہ حسب معمول میں احاطہ نمبر چار کے دوسرے کمرے میں پہنچا تو دیکھتا ہوں کہ سامنے سیاہ تختی پر یہ اعلان لکھا ہے کہ آج شام کو سوامی شردھانند ڈے منایا جائے گا۔

سوامی شردھانند کو دہلی میں غازی عبدالرشید نے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کرنے پر قتل کر دیا۔

یہ اعلان اگرچہ کوئی برا نہیں تھا۔ ہر شخص کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کی یاد منائے لیکن یہ مقام اس کے لیے موزوں نہیں تھا۔ کیونکہ یہاں سب کے سب آزادئ وطن کے لیے قید و بند کے مصائب جھیل رہے تھے۔ خیر ..... میں نے واپس آکر اپنی بیرک کے سیاہ بورڈ پر غازی علم الدین ڈے منانے کا اعلان لکھ دیا۔ بس پھر کیا تھا، تمام جیل میں ہلڑ مچ گیا۔ ہندو اور سکھ بار بار میری بیرک میں آتے۔ آخر یہ بات سپرنٹنڈنٹ جیل تک جا پہنچی۔ وہ بھی آ دھمکے "دیکھوں بھئی جانباز! آج یہ نئی شرارت کیا سوجھی"؟ میں نے سپرنٹنڈنٹ کا ہاتھ پکڑا اور انہیں بیرک نمبر چار میں لے گیا۔ جیل کے ہندو، سکھ بھی اس بیرک میں جمع ہو گئے۔ سپرنٹنڈنٹ نے بیرک والوں سے سوال کیا کہ سوامی شردھانند ڈے کا اعلان کس نے لکھا ہے۔ اس کی ذمہ داری کسی نے قبول نہ کی۔ جب اس تحریر کا کوئی وارث نہ بنا تو وہ تحریر مٹا دی گئی۔ میں نے اپنی بیرک میں پہنچ کر اپنا تحریر کردہ اعلان مٹا دیا۔ اس واقعہ کے بعد جیل میں گو میرے خلاف ہندوؤں سکھوں میں اچھی خاصی نفرت پھیل گئی۔ تاہم کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا، جس سے انتقام کا

جذبہ پیدا ہوتا۔

کرشن کا جنم دن۔ جیل میں ہر فرقہ کے لوگ اپنے مذہبی بزرگوں کا تہوار مناتے۔ گورونانک کے جنم دن پر مسلمان اور ہندو اپنا تمام راشن سکھوں کے حوالے کر دیتے۔ اسی طرح مسلمانوں کے کسی تہوار پر اپنا راشن مسلمانوں کو دے دیتے۔ دن بھر جلسے اور کھانے پینے کی ہنگامہ آرائی میں گذر جاتا۔ اس طرح قیدی ایک میلہ سا مناتے۔ چنانچہ کرشن جی کا جنم دن بھی آیا۔ اس موقعہ پر باہر سے مٹھائی اور پھلوں کا انتظام بھی کیا گیا۔ اس جلسہ میں راقم کو بھی دعوت تھی۔ میں نے بہت کہا کہ مجھے نہ بلائیں۔ اور کئی مسلمان قیدی بھی تو یہاں ہیں۔ وہ مجھ سے کہیں زیادہ قابل ہیں۔ لیکن وہ بضد رہے۔

ان دنوں میں قرآن کریم اور فارسی پڑھ رہا تھا۔ ابوالفضل فیضی کی گیتا میرے فارسی سبق میں تھی۔ جیسے جیسے میں نے گیتا کا مطالعہ کیا۔ مہاراج کرشن کی زندگی میرے سامنے آتی گئی۔ اس سے پیشتر میں نے کرشن کو ایسی تصویروں میں دیکھا تھا جو پنواڑی کی دکان پر آویزاں ہوتیں۔ لیکن گیتا کے کرشن اور تصویروں میں نمایاں فرق تھا۔

میں نے ہندو قوم کے سمجھدار طبقے کو خطاب کرتے ہوئے کہا: "آپ ہی بتلائیں کہ کسی اوتار کی زندگی ایسی ہو سکتی ہے کہ تالاب میں عورتیں نہارہی ہوں اور ان کے کپڑے اٹھا کر کرشن جی مہاراج درخت پر بیٹھ کر بانسری بجائیں۔ کوئی سطحی درجے کا آدمی بھی ایسی غیر شریفانہ حرکت نہیں کر سکتا۔ لہٰذا ایسی تصویریں بنانے والے مہاراج کرشن کی توہین کے مرتکب ہوتے ہیں۔ میں نے ہندو نوجوانوں سے اپیل کی کہ آپ راہ گزر جہاں کہیں ایسی تصویریں دیکھیں انہیں ضائع کر دیں۔"

اس تقریر کا فوری اثر یہ ہوا کہ سناتن دھرمی اور آریہ سماجیوں میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ کیونکہ آریہ مورتی کھنڈن (توڑنا) کے حامی ہیں۔ اور سناتنی مورتی پوجا کے قائل۔ ان دونوں میں خوب جھگڑا رہنے لگا۔ اگر ایک گروہ میری تعریف کرتا تو دوسرے کے خیال میں میں مجرم تھا۔

مختصراً یہ قضیہ دیر تک چلتا رہا۔ اور دونوں گروہ ایک دوسرے کے دشمن رہے۔

اس طرح کے اکثر واقعات ان دنوں رونما ہوئے کہ میں دل برداشتہ ہو کر جیل سے نکلا۔ مجھے سیاسیات سے کچھ نفرت سی ہونے لگی تھی۔ یہاں جو باتیں سننے اور دیکھنے میں آئیں وہ جیل سے باہر نہیں تھیں۔

(جاری)
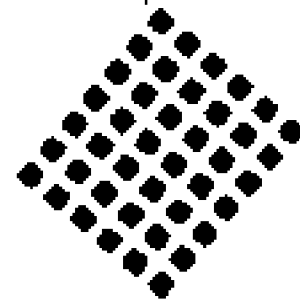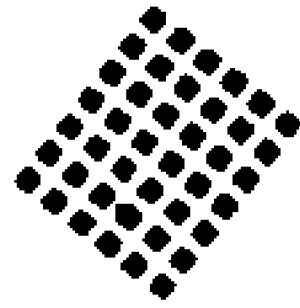
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میرا اور آپ کا تاریخِ ماضی سے متعلق سلسلہ کلام جون ۱۹۳۴ء کے اختتام پر منقطع ہوا تھا۔ آئیے اس نشست میں گفتگو کو آگے بڑھائیں۔

ہندوستان کی متحارب اور ہم آہنگ سیاسی جماعتیں ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نفاذ سے پیشتر اپنی جگہ بطور ریہرسل امسال انتخاب میں مصروف تھیں۔ گو اس اکھاڑے میں کوئی جماعت براہِ راست اپنے لیبل سے شامل نہیں تھی تاہم ان کا وجود اس بات کا غماز تھا کہ وہ گزشتہ جدوجہد سے تھک ہار کر کچھ دیر کے لیے سستانا چاہتی ہیں۔ یہاں تک کہ مجلس احرار نے بھی سنٹرل اسمبلی کی ایک سیٹ کے لیے اپنا امیدوار (مسٹر خالد لطیف گابا) نامزد کر دیا۔ مگر اس پر بھی وہ ریاست کپورتھلہ کی تحریک آزادی میں برابر شریک رہی۔ چنانچہ ۳-جولائی ۱۹۳۴ء کو امرتسر میں مرکزی احرار ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں ۱۴-جولائی کو یوم کپورتھلہ منانے کا فیصلہ کیا۔ نیز اس اجلاس میں چودھری عبدالعزیز پر جو گزشتہ ہفتہ سے بھوک ہڑتال پر تھے اعتماد کا اظہار کیا گیا اور مہاراجہ کپورتھلہ پر پیرس میں برقی پیغام کے ذریعے زور دیا گیا کہ وہ فوراً وطن پہنچ کر ریاست کے حالات پر قابو پائیں۔

ہٹلر پر قاتلانہ حملہ

جرمن میں ہٹلر کی سیاسی اور فوجی قوت نے لندن کی حکمران پارٹی کی پریشانیوں میں اضافہ کر دیا۔ ہر روز کا آفتاب برطانیہ میں کسی نئے انقلاب کی اطلاع دیتا۔ اقوامِ یورپ نازی سیلاب سے بے خبر یا غافل نہیں تھیں۔ جیسے ۷-جولائی ۱۹۳۴ء لندن کے اخبارات نے جن میں لندن ٹائمز بھی شامل ہے یہ خبر جلی عنوان سے شائع کی:

"ہٹلر کے خلاف بغاوت اور اسے قتل کرنے کی سازش زور پکڑ رہی ہے۔

جرمن کی کمیونسٹ پارٹی کو اس سازش کا سرغنہ قرار دیا جا رہا ہے۔ اس سے پیشتر ۲۔ جولائی کی ایک اطلاع میں کہا گیا تھا کہ برلن کی سیاہ پوش فوج کے طوفانی دستوں نے شہر کے مختلف مقامات پر اچانک چھاپے مار کر نازی پارٹی کے بعض ذمہ دار افراد کو گرفتار کر کے انہیں سر عام گولی مار دی گئی۔ ان پر پارٹی ڈسپلن کی خلاف ورزی کا الزام تھا۔

لندن میں ہٹلر کے خلاف یہ پراپیگنڈہ عام کیا جا رہا تھا کہ وہ ولیم قیصر کو دوبارہ جرمن کا بادشاہ بنا رہا ہے۔

حالانکہ ہٹلر متعدد بار اس کی تردید کر چکا ہے، اگر جرمن عوام کو ہٹلر کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا جا رہا ہے۔

اس پر ۱۸۔ جولائی کو ہٹلر نے اپنے ایک بیان میں کہا:

"میری طوفانی فوج نے جن افراد کو قتل کیا ہے ان میں کچھ یہودی اور بالشویک حالات کو خراب کر رہے تھے۔ انہیں عین موقعہ پر جبکہ وہ بغاوت اور انقلاب کا علم بلند کرنے والے تھے، بجلی کی سی تیزی سے جا لیا اور ان کے تمام سرغنہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔"

کانگریس کو احرار کا جواب

سیاست یورپ کی ہو کہ ایشیا کی اپنے طریق کار میں کوئی اختلاف نہیں رکھتی۔ اس کے اصولوں میں ہے کہ اپنے حریف کے خلاف جھوٹ کی نیو ایسے اٹھاؤ کہ عمارت کے مکمل ہونے تک اس کی سچائی پر شبہ نہ ہو سکے۔ ہندوستان کی تاریخ میں ایسی سیاست کو ماضی میں بڑا دخل رہا ہے خصوصاً ہندو اس فن سیاست میں ماہر تھا۔

۱۲۔ جولائی کے اخبار روزنامہ "ملاپ" نے اپنے اداریتی کالموں میں قارئین کو یہ تاثر دیا کہ:

"پنجاب کے کانگرسیوں کی ایک جماعت مجلس احرار کے ساتھ درپردہ سازش کر رہی ہے کہ احرار کو سیٹوں کا لالچ دے کر اس پر آمادہ کیا جائے کہ اگر وہ کانگرس کے ساتھ مل جائیں تو انہیں پنجاب میں سیٹیں اور دوسرے عہدے دئیے جائینگے۔"

اس سلسلہ میں اور بھی بہت سی باتیں بیان کی گئیں۔ جس کے جواب میں احرار کے جنرل سیکرٹری مولانا مظہر علی اظہر نے ایک واضح پریس بیان دیا:

"میں عوام کی اطلاع کے لیے صاف صاف اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ مجلس احرار اپنا کوئی نمائندہ موجودہ انتخاب اسمبلی یا آئندہ انتخاب کونسل میں کانگریس کے ٹکٹ پر بھیجنے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ وہ اس بات کو اپنی توہین سمجھتی ہے کہ کوئی کانگریسی اسے کسی قسم کا کوئی لالچ دے کر خرید سکے۔

اخبار "ملاپ" کے نامہ نگار کو معلوم ہونا چاہیے کہ احرار کارکن نہ تو کسی عہدے کے بھوکے ہیں اور نہ انہیں کسی دوسرے لالچ سے مرعوب کیا جا سکتا ہے۔ انہیں صرف اپنے خدا پر بھروسہ رہا ہے اور اب بھی ہے۔ مجلس احرار ایسی باوقار جماعت کی طرف ایسی باتیں منسوب کرنا ذلیل ترین حرکت ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ ایک طرف تو کانگریس پر مہا سبھائی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ اس لیے مہا سبھا کے اصولوں سے ہمدردی رکھنے والے نام نہاد کانگریسی ایسے کانگریسی امیدوار کا منتخب ہونا پسند نہیں کرتے جو مہا سبھا سے تھوڑا بہت بھی اختلاف رکھتے ہوں۔ دوسری طرف وہ مسلمان ہیں جو محض ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے اپنی قوم پرستی کا ثبوت دیتے ہیں۔ انہیں خوف ہے کہ کہیں احرار کثیر تعداد میں آکر ان کی پوزیشن کو کمزور نہ کر دیں۔

مہا سبھائی کانگریسی اور ہندو نواز مسلمانوں کو یقین رہنا چاہیے کہ مجلس احرار کانگریس کی سیاست میں الجھنا پسند نہیں کرتی۔ لہٰذا انہیں کوئی خطرہ محسوس نہیں کرنا چاہیے۔ احرار کارکن کو فقط مجلس احرار کا کارکن ہونا ہی اس کی بڑی عزت ہے وہ کانگریس کا فارم پر کر کے کوئی اعزاز حاصل کرنا پسند نہیں کرتے۔ نہ ہی اس کی کوئی ضرورت سمجھتے ہیں۔"

گاندھی جی کے نام خط

ان دنوں کانگریسی رہنما مہاتما گاندھی لاہور میں تھے مجلس احرار کی طرف سے آئندہ الیکشن میں سنٹرل اسمبلی کے امیدوار

مسٹر خالد لطیف گابا نے انہیں ۱۵ جولائی کو ایک خط لکھا۔

"پیارے مہاتما جی!

آداب عرض۔ میں اس سے پیشتر ۹۔ مئی ۱۹۳۳ء کو بھی ایک گذارش کر چکا ہوں کہ اگر آپ اچھوتوں کا احترام چاہتے ہیں تو اس کے لیے اسلام کے بغیر دوسری کوئی جگہ نہیں۔"

آپ کا

خالد لطیف گابا۔ ایڈووکیٹ لاہور

گاندھی جی نے گزشتہ سال سے اچھوتوں کو ہندو جاتی کے برابر سیاسی مقام کے لیے تحریک شروع کر رکھی تھی۔ لیکن ہندوؤں کا ایک طبقہ (سناتن دھرمی) اس کے سخت خلاف تھا۔ وہ گاندھی جی کی تمام مساعی کے باوجود اچھوتوں کو نہ تو اپنے کنوؤں سے پانی بھرنے دیتا اور نہ ان پر بھگوان کے درشنوں کے لیے مندروں کے دروازے کھولتا۔

چھ کروڑ کے قریب ہندوستان میں اچھوتوں کی آبادی گاندھی کی تحریک اچھوت ادھار اور اس پر ہندوؤں کے طرز عمل سے پریشان تھی۔ درپردہ یہ سیاسی تحریک تھی جس سے ہندو ووٹروں کی تعداد میں اضافہ مقصود تھا۔ اس دور میں بندوں کو تولا نہیں گنا جاتا ہے۔

مجلس احرار نے ان دنوں گاندھی کی اس تحریک کے مقابل تبلیغ اسلام کی ملک گیر کانفرنسیں شروع کر رکھی تھیں۔ خالد لطیف گابا کا گاندھی کے نام خط اس سلسلے کی اہم کڑی تھی۔

گاندھی جی نے گو اس خط کا جواب نفی میں دیا۔ مگر ان دنوں کے اخبارات نے مجلس احرار اور گابا کے خط کو بڑی اہمیت دی۔

وزیر اعظم کی علیحدگی کا مطالبہ

ہندوستانی ریاستوں میں شخصی وقار کے مسئلے نے راعی اور رعایا کے مابین ایسے قضیے کو جنم دیا کہ اس آگ میں راج سنگھاسن اور فقیر کی جھونپڑی ایک ساتھ جلنے لگے۔ نشاط انگیز زندگی گزارنے والے راجواڑوں کے رئیس مفلوک الحال رعایا کے معاشی حالات سے اس قدر غافل تھے جس قدر انہیں اپنی ملوکانہ زندگی کا علم تھا۔

کشمیر اور الور کے بعد ریاست کپورتھلہ کے عوام بھی اپنے پیدائشی حقوق کے حصول میں

گزشتہ دو سال سے مصائب جھیل رہے تھے۔ فرمانروائے ریاست سال کا تین چوتھائی پیرس میں گذارتا اور ریاست کا نظم و نسق ان کے وزیر اعظم دیوان سر عبدالحمید کے حوالے رہتا۔ برطانوی خطاب یافتہ کی حیثیت سے سر عبدالحمید ریاستی پالیسی کو انگریز کی خواہش اور نیت پر چلاتے۔ انہیں نہ تو ریاست کے امن کا پاس تھا اور نہ رعایا کی تکلیف کا احساس یہی وجہ تھی کہ مہاراجہ نے اگر کبھی رعایا کو مطمئن کرنا چاہا، تو وزیر اعظم نے محض اپنے وقار کا مسئلہ بنا کر سارے نقشے پر سیاہی پھیر دی۔

چودھری عبدالعزیز اور ان کے رفقاء کا بار بار جیل خانوں میں ڈالے جانا اس کے سوا کوئی بنیادی بات نہیں تھی کہ چودھری عبدالعزیز ایسے لوگ جیل میں بالآخر بھوک ہڑتال پر مجبور ہوتے ان واقعات کی موجودگی میں صدر آل انڈیا مجلس احرار مولانا حبیب الرحمٰن نے ۱۳- جولائی ۱۹۳۴ء کو برقی پیغام کے ذریعے مہاراجہ کو پیرس میں مطلع کیا کہ۔

"چودھری عبدالعزیز کے ساتھ جیل میں جو سلوک کیا جا رہا ہے اس کے پیش نظر انہیں تمام دن دھوپ میں کھڑا رکھا جاتا ہے۔ کھڑی ہتھکڑی، پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی گئی ہیں۔ پھر جبکہ وہ کئی دنوں سے بھوک ہڑتال کیے ہوئے ہیں۔ یہ سارا کچھ وزیر اعظم کپورتھلہ اپنے ذاتی انتقام کی بنیاد پر کر رہے ہیں۔

اگر چودھری عبدالعزیز کی موت جیل میں واقع ہو گئی تو اس کی تمام تر ذمہ داری مہاراجہ کے سر ہو گی۔ نیز ریاست کے حالات میں مزید ہیجان پھیل جانے کا خطرہ ہے۔ براہ نوازش اس پر فوراً توجہ دیں۔ نیز وزیر اعظم کپورتھلہ کو ان کی موجودہ ریاستی ذمہ داریوں سے فوراً الگ کر دیا جائے اور چودھری عبدالعزیز کو فوراً رہا کیا جائے۔"

اس کی ایک نقل تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ وزیر اعظم کپورتھلہ کو بھیجی گئی۔ جو حسب ذیل ہے۔

"چودھری صاحب کے ساتھ جیل میں سخت انسانیت سوز سلوک کو مسلمانان ہند اضطراب انگیز نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ یہ سلوک مسلمانان ہند کے لیے سخت ناقابل برداشت ہے۔"

عام طور پر اس سلوک کی وجہ یہ بیان کی جا رہی ہے جو آپ کو چودھری صاحب کے خاندان سے ذاتی طور پر ہے۔ آپ اسی دشمنی کی بنا پر ان سے انتقام لے رہے ہیں۔ ایسے حالات میں انہیں دھوپ میں کھڑی ہتھکڑی لگا کر تمام دن کھڑا رکھا جا رہا ہے۔ نیز ان کے عزیز و اقارب کو ان سے ملاقات کی اجازت بھی نہیں دے رہے ہے۔ اس طرح تحریک کے دوسرے قیدیوں سے بھی جیل خانوں میں بہت برا سلوک کیا جا رہا ہے۔ ان کو اٹھارہ سیر گندم پیسنے کو دی جاتی ہے اور انہیں تنہائی کوٹھڑی میں رکھا جا رہا ہے۔ ان حالات و واقعات میں اگر کوئی جان ضائع ہوئی تو آپ اور آپ کی کونسل کی ذمہ داری ہوگی۔"

یوم کپورتھلہ ۱۴۔ جولائی کو ملک بھر میں مجلس احرار نے یوم کپورتھلہ منایا۔ اسی دن لاہور کے ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے چودھری افضل حق نے کہا:

"مجلس احرار کانگریس کی طرح کوئی امیر جماعت نہیں۔ پریس والوں کی حالت یہ ہے کہ ہمارے اشتہار تک شائع کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ ایسی حالت میں مجلس احرار کی مجبوریوں کا آپ خود ہی اندازہ کریں۔ حالانکہ سلطان پور کا واقعہ، جلیانوالہ باغ کے بعد دوسرا عظیم حادثہ ہے۔ لیکن ایک آدھ مسلم پریس کے علاوہ کسی کو توفیق نہیں ہو سکی کہ اس پر احتجاج کرے۔ ایسے حالات میں غریب جماعتیں کیا کریں۔ اس کے باوجود ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ انتہائی مجبوریوں سے بھی کپورتھلہ کی مظلوم رعایا کو انصاف دلانے کے لیے مسلسل جدوجہد کی جائیگی۔ مجلس احرار کے نمائندے ۲۱-۲۲ جولائی کو امرتسر میں اکٹھے ہوں گے۔ امید ہے وہاں مستقل پروگرام وضع کیا جائے گا۔"

گاندھی جی کا اعتراف ایک ہفتہ لاہور میں قیام کے بعد گاندھی جی نے ۱۵۔ جولائی ۱۹۳۴ء کو روانگی کے وقت اخباری نمائندوں سے گفتگو کے دوران اس بات کا واضح اقرار کیا کہ:

"کمیونل ایوارڈ کی تنسیخ مسلمانوں کے تعاون کے بغیر مشکل ہے۔ اس سے پہلے

قرطاس ابیض کو مسترد کرنا ممکن نہیں۔"

جیل وارڈر کی علیحدگی

تحریک کے دنوں کپورتھلہ سنٹرل جیل کے ارد گرد سرکاری طور پر سخت انتظامات تھے۔ ایک فرلانگ تک خاردار تاروں کا جنگلا اور فوج متعین تھی تاکہ جیل میں سیاسی قیدیوں پر سختی کی کوئی خبر باہر نہ جا سکے اور نہ ہی باہر کی کوئی اطلاع جیل میں پہنچے۔ عزیز و اقارب سے ملاقات کے تمام حقوق چھین لیے گئے تھے ایسے سخت ماحول میں سنٹرل جیل کے ہیڈ وارڈر محمد علی نے بڑی جرأت کا مظاہرہ کیا۔ وہ چودھری عبدالعزیز کا ایک خط قرآن کریم میں چھپا کر باہر لے آیا۔ جس میں وہ تمام واقعات درج تھے جس کی بنیاد پر صدر احرار نے مہاراجہ کو پیرس میں اطلاع دی اور وزیر اعظم کی علیحدگی کا مطالبہ کیا۔

یہ راز کسی طرح فاش ہو گیا اور ۱۶۔ جولائی کو ہیڈ وارڈر محمد علی کو ملازمت سے الگ کر دیا گیا۔

سر آغا خاں کا مطالبہ

انسان پر یہ الزام روز آفرینش سے عائد رہا ہے کہ اقتدار کی ہوس نے اسے اکثر بلندیوں سے گرا دیا ہے۔ بادشاہوں کو اگر سلطنت کی ہوس رہی ہے تو ان کے خواجہ تاش بھی اپنے پاؤں چادر سے باہر تک پھیلانے میں کمی نہیں کرتے رہے۔

غیر ملکی اقتدار نے اپنی ہوس کے جھولنے میں ایسے افراد کی ہمیشہ پالنا کی جنہوں نے ہندوستان کے علاوہ ملت اسلامیہ کے مفاد اور ضرورت کو اپنی اغراض کے تابع رکھنا چاہا۔ غیر ملکی غلامی کے دو صد سال ایسے عناصر کی نشاندہی میں بخیل نہیں ہیں، جن کے سر تخت فرنگی کے پائے بنتے رہے۔

سر آغا خاں مرحوم گزشتہ صدی کی مسلم سیاست میں نمایاں حیثیت کے مالک رہے۔ لیکن ان کا راستہ کبھی بھی غیر ملکی حکمرانوں سے جدا نہیں ہوئی۔ خصوصاً مسلم لیگ کی ساری سیاست (محمد علی جناح قائد اعظم کی آمد سے پیشتر تک) انہی کی آبائے برطانیہ سے وابستہ رہی۔

دنیاوی جاہ و جلال کے سورج نے زندگی سے موت تک ان کا گھر ہمہ اقسام آرائش سے مزین رکھا اس پر بھی بحیثیت انسان انہیں اقتدار کی ہوس باقی رہی۔

۱۸۔ جولائی ۱۹۳۴ء کی شملہ سے آمدہ اس خبر کو ۲۰۔ جولائی کے روزنامہ "انقلاب" لاہور نے اس طرح شائع کیا۔

"شملہ اسمبلی میں ایک سوال کے دوران مسٹر گیا پرشاد نے فارن سیکرٹری سے دریافت کیا۔ آیا اس بات میں کوئی حقیقت ہے کہ سر آغاخان نے حکومت برطانیہ سے درخواست کی ہے کہ مجھے (سر آغاخاں) ہندوستان کا کچھ علاقہ مرحمت فرمایا جائے۔ کہ میں اپنی (برطانوی) خدمات کے صدقے میں اس پر حکومت کروں۔"

اس کے جواب میں مسٹر مٹکاف فارن سیکرٹری نے کہا۔

"ہز ہائی نس سر آغاخاں کی طرف سے ایک خفیہ مکتوب برآمد ہوا تھا لیکن حکومت اس کی تفصیل بتانے سے معذور ہے۔"

اس ضمن میں سر محمد یامین کی کتاب "نامۂ اعمال" کے حصہ اوّل کے ص۱۴۵ کی یہ عبارت بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔

"۲۰۔ جولائی (۱۹۳۴ء) اسمبلی میں یہ دن بڑا مزیدار دن تھا (یعنی غیر سرکاری ریزولیشن کا دن تھا) بحث کرتے ہوئے لال چند نول رائے ممبر سندھ نے سوال اٹھایا کہ سندھ کو صوبہ بمبئی سے جدا نہ کیا جائے۔ اور کیا یہ افواہ گرم ہے کہ سر آغاخاں کو سندھ کا بادشاہ بنایا جا رہا ہے اس سے سندھ میں بے چینی پھیل گئی ہے۔ اس لیے کسی حصہ صوبہ کو اس سے جدا نہ کیا جائے۔

اس کا جواب سر محمد یعقوب نے دیا۔ کہ آغاخاں کا نام کیوں لیا اور اس کو بدتمیزی بتایا۔"

مندرجہ بالا خبروں سے یہ حقیقت واضح ہو رہی ہے کہ رازداران افرنگ ملے اسی سن میں ہواؤں کے رُخ بھانپ لیے تھے کہ آج نہیں تو کل غیر ملکی آقا متحدہ ہندوستان سے اپنا لپستارہ اٹھا کر رخصت ہونے والے ہیں کیوں نہ اپنی محنت کا پھل مانگ لیا جائے۔ ع

پھر خدا جانے انہیں دھیان رہے یا نہ رہے

مسلم لیگ اور ملّتِ اسلامیہ کے عنوان پر سر آغاخاں نے گزشتہ ربع صدی تک مسلمانوں کے لیے بظاہر جو کام انجام دیا اگر اس میں حقیقت ہوتی تو سر آغاخاں برطانیہ سے اسے اپنی خدمات سمجھ کر اس کا صلہ نہ مانگتے یا پھر بجائے اپنے اقتدار کے انگریزوں سے متحدہ ہندوستان

کا کوئی خطہ زمین مسلمانوں کے لیے حاصل کرتے یا کم از کم محمد علی جناح کی ہاں میں ہاں ملاتے
مگر ذاتی اقتدار کی خواہش نے انہیں اجتماعی نیکی سے محروم رکھا۔

مہاراجہ کا جواب

صدر مجلس احرار نے ۱۲۔ جولائی مہاراجہ کپورتھلہ کو ریاستی تحریک اور چودھری عبدالعزیز سے متعلق جو تار پیرس میں دیا تھا اس کا جواب ۱۹۔ جولائی کے مسلم اخبارات نے شائع کیا۔

"مہاراجہ نے اپنے حکام کو ہدایت کی ہے کہ چودھری عبدالعزیز کو جیل میں عام قیدیوں کی طرح رکھا جائے اور ان پر سختی کی جائے کیونکہ انہوں نے گزشتہ دو سال سے ریاست میں جو انقلابی تحریک شروع کی ہوئی ہے۔ اس کی وجہ سے ریاست کے وقار کو سخت نقصان پہنچا ہے۔"

آل انڈیا احرار ورکنگ کمیٹی کا اجلاس

مہاراجہ کا جواب کسی فرمانروا کا جواب معلوم نہیں دیتا۔ ان الفاظ میں غصہ اور انتقام کی بو تھی۔ حکمران رعایا سے ذات کے لیے نہیں اصول پر جھگڑتے ہیں۔ احرار کو اس پر شبہ تھا کہ یہ جواب پیرس سے نہیں بلکہ خود ساختہ ہے اور اس خبر کا مرکز کپورتھلہ ہے۔ چنانچہ احرار ورکنگ کمیٹی کے سامنے سب سے اہم یہی مشتبہ خط تھا جس کی اشاعت گزشتہ روز کے اخبارات میں کی گئی تھی۔

امرتسر منعقدہ اجلاس کی صدارت مولانا حبیب الرحمٰن نے کی۔ اس اجلاس میں پہلے آئندہ سال کے لیے عہدیداروں کا انتخاب عمل میں لایا گیا۔

صدر۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ۔ نائب صدر چودھری افضل حق اور چودھری عبدالعزیز۔ سیکرٹریز۔ مولانا محمد داؤد غزنوی اور مولانا مظہر علی اظہر۔ خازن۔ ڈاکٹر عبدالقوی (لاہور)۔ سالار جیوش احرار۔ شیخ حسام الدین منتخب ہوتے۔

اس اجلاس میں احرار کی آل انڈیا حیثیت کو مزید وسعت دی گئی۔

پنجاب: ماسٹر محمد شفیع (لاہور)۔ میاں محمد عمر چھرا سوداگر چرم (امرتسر) رانا فیروز الدین ایڈووکیٹ (ہوشیار پور) مولانا عبدالغفار غزنوی (امرتسر) خان مظہر نواز خان رئیس (ملتان)

ماسٹر تاج الدین انصاری میونسپل کمشنر (لدھیانہ) حکیم نور الدین، میر عبد القیوم ایڈووکیٹ (لائلپور)، حکیم احمد علی (فیروزپور) مولانا عبد الکریم اور حاجی عبد الغنی رئیس بٹالہ (ضلع گورداسپور) حضرت مولانا احمد علی (لاہوری) چودھری عبد الغنی (روہتک ضلع حصار) نوابزادہ نصر اللہ خاں بی اے (ضلع مظفر گڑھ) خواجہ احمد الدین، مولانا بشیر احمد، صاحبزادہ فیض الحسن (ضلع سیالکوٹ) سردار محمد شفیع، چودھری محمد عاشق (قصور ضلع لاہور)

صوبہ یوپی: محمود علی خاں رئیس کیلاش پور (سہارنپور) محمد کامل الکمل ایڈیٹر ہفت روزہ افضل (سہارنپور) غازی منے خاں (لکھنو) ایم۔ایم۔بشیر (علیگڑھ) حکیم آفتاب احمد خان جامی (امروہا) مولانا محمد اسماعیل ذبیح، مولانا عبد القیوم، جناب عبد الحفیظ اور مولانا عبد اللہ فاروقی (کانپور) سید محمد احمد کاظمی ایڈووکیٹ (الہ آباد ہائیکورٹ) چودھری عبد الستار، مولانا عبد الجبار (دہلی) میر احمد حسن (شملہ)

بمبئی: حافظ علی بہادر ایڈیٹر روزنامہ الہلال (بمبئی)

کلکتہ: خاں عبد العزیز رئیس، سید بدر الدجیٰ (میئر کلکتہ کارپوریشن) مسٹر ہمایوں کبیر ایم۔اے۔

شمال مغربی سرحدی صوبہ: مفتی سرحد مولانا عبد القیوم پوپلزئی (پشاور) سید احمد شاہ بیرسٹر (چارسدہ) حکیم عبد السلام (ضلع ہزارہ)

سندھ: ڈاکٹر محمد عمر (سکھر) حافظ عزیز الرحمٰن (کراچی)

موجودہ اجلاس میں سابقہ اجلاسوں سے زیادہ نمائندگی تھی۔ ہندوستان بھر کے دانشور اور سیاستدان اس میں شامل تھے۔ دونوں اجلاسوں کی مسلسل بیٹھک قریباً اٹھارہ گھنٹے رہی۔ بند کمرے کے اجلاس میں پریس تک کو داخلے کی اجازت نہیں تھی۔

تحریک کپورتھلہ آئندہ ملکی انتخاب، مرزائیت کی بڑھتی ہوئی سیاسی اور مذہبی سرگرمیاں اجلاس کے زیر غور تھیں۔ بائیس[۲۲] جولائی شام کو حسب ذیل قراردادیں پریس کے حوالے کی گئیں۔

قرارداد ا: مجلس احرار کا یہ جنرل اجلاس واقعہ سلطان پور کے متعلق اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ سانحہ سلطان پور، جلیانوالہ باغ کے قتل عام سے کسی طرح کم نہیں

لہٰذا یہ اجلاس ملک کی اسلامی مجالس سے امید رکھتا ہے کہ کپورتھلہ کی مظلوم رعایا کو انصاف دلانے میں ہر اسلامی انجمن کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرے گی۔ نیز ہر اسلامی انجمن جلسے جلوس اور ہمدردی کی قراردادیں منظور کرے۔

قرارداد ۲ : مجلس احرار کا یہ جنرل اجلاس واقعہ سلطان پور کے متعلق ماتحت مجالس کے ذمہ دار عہدے داروں کو ہدایت کرتا ہے کہ مظالم کپورتھلہ اور لوگوں کے مطالبات کے متعلق ایک ہفتہ کے اندر اندر ایک مفصل بیان تمام اخبارات کو بھیجیں نیز ماتحت اور دوسری اسلامی مجالس کو آئندہ پروگرام کے متعلق مطلع کریں۔

یہ اجلاس تمام ماتحت مجالس کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ رضاکاروں کی بھرتی کو فوراً تیز تر کر دیں اور فنڈ جمع کریں۔ چنانچہ اس سلسلے میں جماعت کے دوسرے حکم کے منتظر رہیں۔

قرارداد ۳ : یہ اجلاس کپورتھلہ کے مطالبات یعنی ریاست میں ذمہ دار اسمبلی کا قیام اور مالیہ کی کمی کی پوری تائید کرتا ہے۔ واقعہ حالیہ سلطان پور اور اس کے بعد رتھاؤں سے منتقمانہ کاروائیوں، جائیدادوں کی ضبطی، معصوم نہتے انسانوں پر لاٹھی چارج وغیرہ خلافِ انسانیت واقعات کی روشنی میں اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ مذکورہ صدر مطالبات حصول کے لیے جو پرامن تحریک چودھری عبدالعزیز نے ریاست میں شروع کر رکھی ہے جس سے ریاستی عوام میں بیداری کی زندگی پیدا ہو رہی ہے۔ حکامِ کپورتھلہ نے دراصل اس زندگی کو کچلنے کے لیے ایسے مظالم پر عمل کیا ہے دریں حالات مجلس مرکزیہ اس پالیسی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے اعلان کر دینا چاہتی ہے کہ مظلوم رعایا کے جائز مطالبات جبر و تعدی سے ختم نہیں کیے جا سکتے۔ بالآخر ریاستی نظام کو بدلنا پڑے گا۔ لہٰذا ریاست کا امن اس بات کا مقتضی ہے کہ رعایا کے فطرتی اور جائز مطالبات کو جلد تسلیم کر لیا جائے اور تمام اسیران کو فی الفور رہا کیا جائے۔

قرارداد ۴ : یہ اجلاس اپنی اس رائے اور مطالبے کا صاف طور پر اعلان کرتا ہے کہ

دیوان سر عبدالحمید کا وجود ہندو مسلم سکھ باشندگان کپور تھلہ اور والئی کپور تھلہ کے لیے سخت نقصان دہ ثابت ہو رہا ہے۔

دریں حالات مفادِ عامہ اور مفادِ ریاست کو مدنظر رکھتے ہوئے مہاراجہ بہادر سے پرزور مطالبہ کرتا ہے کہ وہ وزیر اعظم کو فوراً ملازمت سے سبکدوش کر دیں ورنہ دوسری صورت میں اس کے تمام تر نتائج کی ذمہ داری مہاراجہ پر ہوگی۔

قرارداد ۵: یہ اجلاس چودھری عبدالعزیز کی ذات گرامی پر اپنے پورے اعتماد کا اظہار کرتا ہے۔ نیز اعلان کرتا ہے کہ چودھری صاحب موصوف اور ان کے ساتھیوں پر وزیر اعظم نے اپنے ذاتی غیض و غضب کی وجہ سے وحشیانہ مظالم روا رکھے ہیں۔ حقیقتاً چودھری صاحب موصوف نے کوئی ایسا جرم نہیں کیا کہ انہیں ایسی خوفناک سزا دی جائے۔

قرارداد ۶: یہ اجلاس مہاراجہ کپور تھلہ کے اس حکم پر کہ چودھری عبدالعزیز اور ان کے رفقاء کو طوقِ سلاسل میں جکڑ رکھا جائے تعجب اور افسوس کا اظہار کرتا ہے۔ مجلسِ احرار یہ قیاس نہیں کر سکتی کہ کوئی والئی ریاست ان منتقمانہ اور پست جذبات کا اظہار کر سکتا ہے اس لیے یہ اجلاس مہاراجہ سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ فی الفور اس کی تردید کرے یا کم از کم اس بارے میں کوئی سرکاری اعلان شائع کرے تاکہ معلوم ہو سکے کہ حکم کی نوعیت کیا ہے ۔ یہ قرارداد بذریعہ تار مہاراجہ کو ارسال کی گئی۔

قرارداد ۷: یہ اجلاس حکومت کپور تھلہ سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ سٹی مجسٹریٹ عبدالمجید قادیانی کو جو مسلمانانِ ریاست کے لیے مصیبت کا باعث ہے۔ جس کی خفیہ ریشہ دوانیاں ریاست کے امن کو بحال نہیں ہونے دیتیں فوراً ریاست کی ملازمت سے علیحدہ کیا جائے۔

اس اجلاس میں سرحد کے سرخپوشوں پر پابندی کے خلاف احتجاج کیا گیا اور ریاست جیند کے مہاراجہ کے مسلم آزار رویے پر اظہار ناراضگی کیا گیا۔

شعبہ تبلیغ کا قیام

۱۸۵۷ء کے بعد غیر ملکی اقتدار نے مسلمان کو تعلیم اور ملازمت سے آگے سوچنے کی مہلت ہی نہیں دی۔ سکول، کالج اور دفتر گزشتہ صدی تک مسلمان کا محور رہے۔ غیر مرئی طور پر اگر کہیں ملکی سیاست کی بات ذہن سے گزری تو فرنگی ضابطے نے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر اسے روک دیا تاکہ یہ آزار دلوں میں نہ اتر جائے۔ مآل کار مسلمان من حیث القوم دفتروں کے کلرک یا بابو بن کر رہ گئے۔ جذبات میں اگر کبھی ہیجان پیدا ہوا تو یہ لڑائی محض کرسی کی حفاظت تک رہی اور اس سے ہمسایہ قوم سے تلخی پیدا ہوئی۔ کلرکوں اور بابوؤں کی یہ جنگ دفاتر سے نکل کر سیاسی طالع آزماؤں کے لیے ان کے اپنے مستقبل کے کام آئی اور بس ــــ مگر عملی سیاست میں جہاں انگریز سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ اس وضع کا مسلمان متعدی امراض کی طرح اس سے کوسوں دور رہا۔

مجلس احرار نے ملازم پیشہ مسلمان کی اس بنیادی کمزوری کو بھانپ کر سیاست سے الگ رہ کر شعبہ تبلیغ کی بنیاد ڈالی۔ تاکہ غیر سیاسی کام کرنے والے لوگ مجلس احرار کے اس شعبہ میں کام کریں۔ ان کی سرکاری ذمہ داریاں بھی زخمی نہ ہوں اور دین کا کام بھی ہوتا رہے چنانچہ ۲۱-۲۲ جولائی کے اجلاس میں شعبہ تبلیغ کی باقاعدہ بنیاد رکھی گئی۔ اس کے اغراض و مقاصد اس طرح طے پائے۔

۱۔ شعبہ تبلیغ مجلس احرار اسلام خالص مذہبی شعبہ ہے۔ سیاسیات ملکی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔

۲۔ ارتداد و دہریت کی روک تھام کے پیش نظر مسئلہ ختم نبوت کی ہر ممکن حفاظت کرنا۔

۳۔ مسلمانوں میں تبلیغ اسلام کا شوق پیدا کرنا اور اس کے لیے مبلغوں کی ایک سرگرم جماعت تیار کرنا۔

۴۔ ہندوستان اور بیرون ہند میں اسلام کی اشاعت کرنا۔

۵۔ خدمت خلق اور اسلامی اخلاق کی عملی کیفیت پیدا کرنا۔

شعبہ تبلیغ کے حسب ذیل عہدیدار منتخب ہوئے۔

صدر: میاں قمر الدین رئیس اچھرہ (لاہور)

نمبر کتاب 303 　　　 نمبر رسید 16915

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

واعدوا لهم ما استطعتم من قوة

شعبہ تبلیغ مجلس مرکزیہ احرار اسلام ہند (لاہور)

تاریخ ۷ اگست ۱۹۳۵ء

ازجناب مولانا عبدالغنی صاحب سکرٹری مجلس احرار [illegible]

بمد [illegible] مبلغ پانچ روپے بصد شکریہ وصول پائے

دستخط وصول کنندہ [illegible] 　　 دستخط ناظم مالیات [illegible]

SHOBA-I-TABLIGH,

MAJLIS-I-AHRAR-I-ISLAM HIND,

صدر دفتر شعبہ تبلیغ احرارِ اسلام امرتسر (انڈیا)

No. 1218

AMRITSAR 2/ ۷/ 19

(مرکزی لیٹر فارم)

نائب صدر: چودھری افضل حق ایم۔ایل۔سی (ممبر پنجاب کونسل)

جنرل سیکرٹری: مولانا عبدالکریم۔ ایڈیٹر ہفت روزہ "مباہلہ" لاہور

اس کا صدر دفتر اچھرہ میں قائم کیا گیا۔

گو قادیان میں احرار کا دفتر فروری ۱۹۳۴ء میں قائم کیا جا چکا تھا اور اس کے ساتھ ہی مدرسہ جامعہ محمدیہ کا قیام بھی عمل میں آ چکا تھا۔ لیکن شعبہ تبلیغ کے قیام نے مرزائیوں میں ہیجان اور مسلمانوں میں تبلیغ دین کی ایک نئی روح پھونک دی۔

تیسرا محاذ

کانگریس کے مقابل مسلمانوں میں انگریز کے خلاف نفرت اور جذبۂ حریت کو فروغ دینے کا نام مجلس احرار ہے۔ احرار اور انگریز کے درمیان لڑائی وقتی اور جذباتی نہیں بلکہ فطرتی جنگ تھی۔ احرار بحیثیت مسلمان انگریز کے خلاف بغاوت کو اپنا پیدائشی حق سمجھتے اور اس کے لیے بہانے تلاش کرتے۔ دوسری طرف انگریز احرار کو اپنے اقتدار کی بحالی کے لیے ہر موڑ پر تشدد کا نشانہ بناتا۔ یہ آنکھ مچولی جاری تھی کہ ہندوستانی ریاستوں میں مسلمان رعایا سے خصوصاً ناانصافی کو بھانپ کر احرار نے انسانی احیاء و بقا کے لیے اپنے خلاف دوسرا محاذ قائم کر لیا۔ راج گدیوں کے وارث اپنے خصوصی معاون برطانوی سامراج کے سہارے دانہ ودام سے لیس ہو کر سازشوں کے پس منظر میں احرار کے خلاف نکل کھڑے ہوئے تھے۔ کہ قادیان میں احرار کا تیسرا محاذ قائم ہو گیا۔ جس میں احرار مسئلہ ختم نبوت کی حفاظت اور کفر و ارتداد کی بیخ کنی کے لیے اپنی بے سروسامانی کے باوجود ایمانی عزم کے ساتھ آموجود ہوئے۔

قادیانی مذہب دیکھنے کو مختصر اور سمجھنے کو حقیر سی ٹولی تھی۔ مگر دریائے بیاس کے اس پار اس غیر آئینی ریاست کا وجود انگریز کا حفاظتی دستہ اور اسلام کے خلاف مضبوط حصار تھا۔ مرزائیت کے مذہبی اصولوں میں انگریز کو اولی الامر قرار دے کر اس کی اطاعت مسلمان پر مذہباً واجب قرار دی گئی تھی۔ اسی بنا پر پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کی انگریزوں کے ہاتھوں شکست اور برطانیہ کی فتح پر قادیان میں گھی کے چراغ جلائے گئے اور اس خوشی میں مرزائیوں نے پنجاب کے انگریز گورنر مائیکل اڈوائر کو (جس کے حکم پر ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو امرتسر جلیانوالا باغ

میں گولی چلی تھی) لاہور میں سپاسنامہ پیش کیا۔ احرار کے نزدیک انگریز کے اس اطاعت گزار گروہ کو، جس نے بظاہر مسلمانوں کی سی شکل و صورت بنا رکھی تھی، مٹانا ضروری تھا۔ جبکہ تمام کا تمام ہندوستان فرنگی حکمرانوں سے آزادئ وطن کے لیے لڑائی لڑ رہا تھا۔ ایسے منافق ٹولے سے جنگ نہایت ہی اہم اور ضروری تھی۔ گو احرار کے لیے اپنے خلاف یہ تیسرا محاذ کھولنا دشوار تر تھا۔ مگر ؏

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے!

گو شعبہ تبلیغ کے مقاصد میں ملکی سیاست کو دخل نہیں تھا تاہم اس تنظیم پر احرار کی پوری گرفت تھی۔ اس شعبہ کا ہر فیصلہ احرار زعماء کے مشورے سے طے پاتا۔ شعبہ کے اکثر کارکن تنخواہ دار تھے۔ اور ایسے ورکرز کو اس تنظیم میں داخلے کی اجازت تھی جسے اسلام سے پوری واقفیت ہو۔ نیز وہ مرزائی اور عیسائیوں سے گفتگو کرنے پر قادر ہو۔

شعبہ تبلیغ اسلام کی رکنیت کا فارم

مورخہ　　　نمبر ۷۸۶

شعبہ تبلیغ مجلس احرار اسلام قادیان صدر دفتر

توضیح
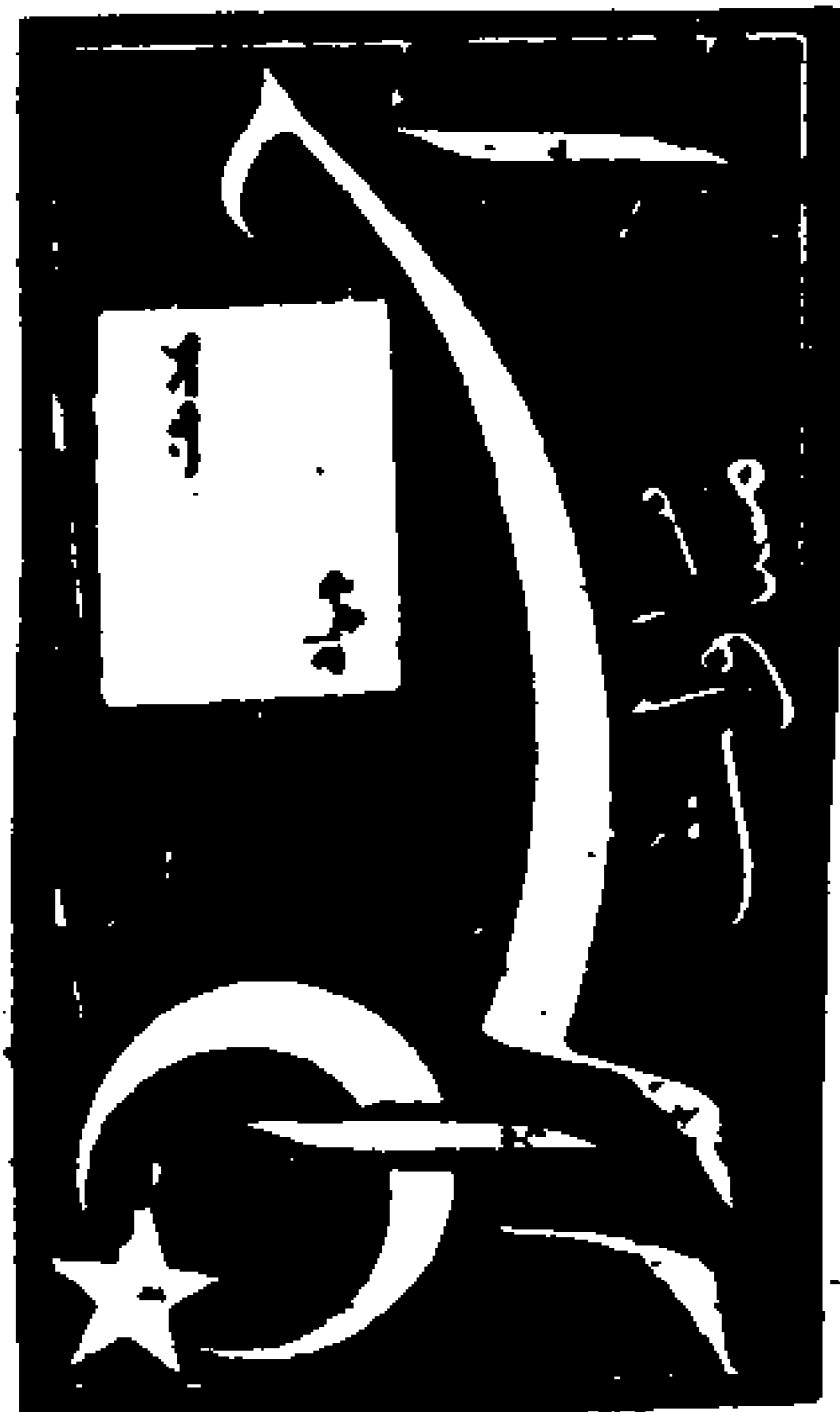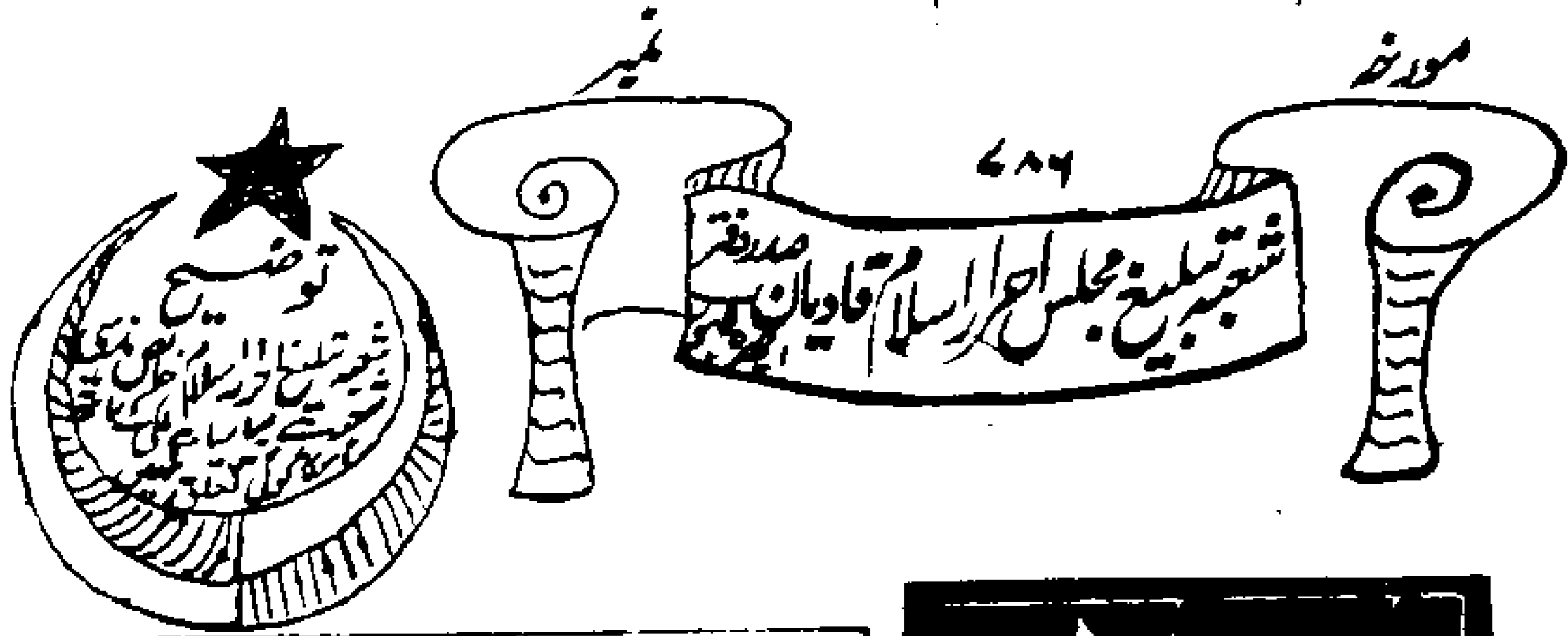
مقاصد شعبہ تبلیغ

۱۔ ارتداد و دہریت کی روک تھام کے پیش نظر عقیدہ ختم نبوت کی مدد کرنا
۲۔ مسلمانوں میں تبلیغ اسلام کا شوق پیدا کرنا اور مبلغوں کی ایک سرگرم کارکن جماعت تیار کرنا۔
۳۔ ہندوستان و بیرون ہند اسلام کی اشاعت کرنا۔
۴۔ خدمت خلق اور اسلامی اخلاق کی عملی کیفیت پیدا کرنا۔

عملی پروگرام

۱۔ شعبہ کے زیر اہتمام اس وقت ایک مدرسہ دینیات قادیان میں جاری ہے جس میں اردو، حساب، تاریخ کی تعلیم کا بھی انتظام ہے۔
۲۔ مسجد شیخاں میں روزانہ درس قرآن شریف و خطبہ جمعہ کا سلسلہ نہایت کامیابی سے جاری ہے
۳۔ گرد و نواح قادیان و دیگر شہروں و قصبات میں بہترین مبلغ تبلیغ اسلام میں مصروف ہیں
۴۔ غریب و نادار طلباء کی مفت تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے۔

مسٹر خالد لطیف گابا کو سنٹرل اسمبلی کے لیے منتخب کرانا بھی سیاست سے زیادہ احرار کے تبلیغی مشن کا اہم جزو تھا۔ کیونکہ ان دنوں ہندو مہاسبھا کی طرف سے شدھی کی تحریک زوروں پر تھی اور دوسری طرف مہاتما گاندھی اچھوتوں کو ہندوؤں کے برابر سیاسی حقوق دلانے میں مصروف تھے۔ مقابل میں مسلمانوں کی تمام مذہبی اور سیاسی جماعتیں آئندہ انتخاب میں الجھی ہوئی تھیں۔ یہاں تک کہ انبالہ کے ڈاکٹر غلام بھیک نیرنگ جن کی جماعت تبلیغ اسلام کے لیے مصروف تھی اپنے حلقے سے الیکشن کے لیے ڈنڑ پیل رہے تھے۔ البتہ احرار اس مشن سے غافل نہیں تھے۔ چنانچہ ایک نومسلم (خالد لطیف گابا) کی حمایت کا فیصلہ کر کے احرار نے مسلم اکثریت کی توجہ اپنی طرف کر لی۔ اور ساتھ ہی شعبہ تبلیغ کے کارکنوں کو ہدایت کی کہ وہ تمام پروگرام ملتوی کر کے مسٹر گابا کے حلقہ میں پہنچ جائیں۔ اس ضمن میں چودھری افضل حق نائب صدر شعبہ تبلیغ کا ایک خط درج ذیل ہے۔

برادرم مکرم سیکرٹری شعبہ تبلیغ دسوہہ (ضلع ہشیارپور)

السلام علیکم۔ معلوم نہیں آپ کے مبلغ مسٹر گابا کے لیے بھی کچھ کوشش کر رہے ہیں یا نہیں۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ان تین مہینوں کے لیے اپنے تمام مبلغوں کو ضلع امرتسر، لاہور، گورداسپور اور فیروزپور بھیج دیں۔ خصوصاً دیہات میں کہ وہ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا کر مسٹر گابا کی حمایت پر آمادہ کریں۔

یاد رکھنا چاہیے کہ اس انتخاب کا تبلیغی پہلو ایسا نمایاں ہے جسے شعبہ تبلیغ نظر انداز نہیں کر سکتا۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس خط کا جواب دے کر مشکور فرمائیں گے۔

ملک فیروز خاں نون ان دنوں امرتسر آ رہے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شاید وہ عوام کو بلا کر ہمارے امیدوار (مسٹر گابا) کے خلاف اکسائیں۔ میری گزارش ہے کہ اس کا خاص خیال رکھا جائے۔ مخالفین کی نقل و حرکت کی پوری اطلاع رکھنا ضروری ہے۔ والسلام

افضل حق۔ ۲۵-۲-۴

وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل

جیسے جیسے موجودہ اسمبلی کی میعاد اختتام کو پہنچ رہی تھی۔ سیاسی دل و دماغ نئے نئے زاویوں سے انتخاب کے میدان سوچ رہے تھے۔ ان دنوں پنجاب کے میاں سر فضل حسین وائسرائے ہند کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر تھے کچھ دنوں کے لیے وہ رخصت پر گئے اور بعد میں اس ذمہ داری سے مستعفی ہو کر پنجاب کی سیاست میں دخیل ہو گئے۔ اب ان کی جگہ وائسرائے کی کونسل میں ان کا جانشین کون ہو؟ یہ سوال پنجاب سے نکل کر دوسرے صوبوں تک بھی پہنچا۔ لیکن نواب چھتاری، سر سکندر حیات اور چودھری سر ظفر اللہ (مرزائی) کے نام خصوصیت سے سننے میں آ رہے تھے۔

احرار اوّل الذکر دونوں مسلمانوں کے لیے معترض نہیں تھی۔ اُسے سر ظفر اللہ پر اعتراض تھا کیونکہ یہ سیٹ مسلمان کی تھی۔ اس پر غیر مسلم کی تقرری احرار کے نزدیک سیاسی اور مذہبی گناہ تھا۔ چنانچہ ۲۹۔ اگست ۱۹۳۴ء کو اس خطرہ کو محسوس کرتے ہوئے مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی صدر مجلس احرار نے حسب ذیل بیان پریس کو دیا۔

"عام افواہ ہے کہ چودھری ظفر اللہ قادیانی کو جو کہ مرزا غلام احمد قادیانی کا مرید ہے اور مرزائی مذہب رکھتا ہے، سر فضل حسین کی جگہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا ممبر بنایا جا رہا ہے۔

مرزائی اپنے مذہبی عقیدے کی بنا پر نہ کسی مسلمان کا جنازہ پڑھتے ہیں نہ کسی مسلمان امام کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں اور نہ ہی وہ خود کو مسلمانوں میں شامل سمجھتے ہیں۔ بدیں وجہ تمام دنیا کے علما ان کو خارج از اسلام سمجھتے ہیں۔ اس لیے چودھری سر ظفر اللہ کو وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا ممبر بنانا مسلمانوں کے حقوق پر صریح ظلم ہے۔"

اسی بیان میں مولانا نے مسلمانانِ ہند کو مشورہ دیا کہ وہ وائسرائے کو اپنے دستخطوں سے مطلع کریں کہ کسی مرزائی کو مسلمانوں کے نام پر کوئی عہدہ اور ملازمت نہ دیں۔

"کیونکہ کوئی قادیانی برطانیہ کے سوا کسی دوسرے ملک یا مذہب کا وفادار نہیں ہو سکتا۔ میرا یہ چالیس سالہ تجربہ ہے اور بقول علامہ سر اقبال مرزائی ہونا اس بات

کی ضمانت ہے کہ وہ انگریز کا سچا وفادار ہے۔"

سندھ اور پاکستان

۱۹۳۰ء کا ذکر ہے کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال نے الٰہ آباد میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کے دوران متحدہ ہندوستان کے مسلم اکثریتی صوبوں کو باقی ہندوستان سے علیحدگی کا مطالبہ کیا۔ دوسری گول میز کانفرنس کے موقعہ پر چودھری رحمت علی نامی شخص نے انگریزی میں ایک پمفلٹ تقسیم کیا۔ جس میں ہندوستان سے مسلم اکثریت کے صوبوں کو علیحدگی کے بعد پاکستان کا نام دیا گیا تھا۔

۱۹۳۴ء کے آخر تک مزید کہیں پاکستان کا ذکر نہیں۔ لیکن سندھ کے سرکاری وڈیروں نے نہ جانے اچانک اس انجانی حقیقت کے جنم لینے سے پیشتر کیوں اور کیسے جان لیا کہ ایسا ہوگا اور قبل از وقت مرگ واویلا شروع کر دیا۔

۳۱۔ جولائی ۱۹۳۴ء کے روزنامہ انقلاب لاہور میں یہ خبر شائع ہوئی۔

"۲۸۔ جولائی (کراچی) سندھ آزاد کانفرنس کا دوسرا اجلاس سر غلام حسین ہدایت اللہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں سر موصوف نے کہا کہ

مسلمانانِ سندھ، پنجاب، سرحد، بلوچستان کو ملا کر ایک بڑا اسلامی صوبہ پاکستان ہرگز بنانا نہیں چاہتے۔

مسلمانانِ سندھ، پنجاب میں جہاں (پنجابی) مسلمانوں کی اکثریت ہے مدغم ہونا نہیں چاہتے۔

سندھ کی علیحدگی سے ہمارا صرف یہ منشا ہے کہ ہم اپنے گھر (سندھ) کے خود مالک ہوں۔ اس کے سوا ہمارا کوئی مخالفانہ مقصد نہیں۔"

متذکرہ بالا خبر سے شبہ گزرتا ہے کہ اس تجویز کا محرک چونکہ برطانیہ کا با اعتماد اور قریب ترین آدمی تھا لہٰذا اسے سرکاری ذرائع سے اس سن میں یہ معلوم ہو چکا تھا کہ آگے چل کر ایسا ہوگا۔ یہاں تک تو درست ہے کہ ۱۹۳۵ء ایکٹ کے تحت سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر کے ایک صوبہ قرار دیا جا رہا تھا۔ لیکن جہاں "پاکستان بنے گا" ہنوز کوئی ذکر نہیں تھا۔ مگر سر غلام حسین ہدایت اللہ کو یہ اندر کی بات کیسے معلوم ہوئی؟ دوسرا شبہ یہ گذرتا ہے کہ سندھ کے

غیر مسلموں کی شہ پر آزاد کانفرنس کی اس تجویز نے جنم لیا تھا۔ بہرحال آئندہ چل کر اس حقیقت کا انکشاف ہو جائے گا۔

کمیونسٹ پارٹی آدمی جب مذہب کے مروجہ اصولوں سے انحراف کرتا ہے، تو اس کے لیے کئی حیلے تراشتا ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ ان ذمہ داریوں سے جی چراتا ہے جو مذہب نے اس پر عائد کی ہیں۔

ہو سکتا ہے روس میں کمیونسٹ پارٹی کے کوئی اصول ہوں لیکن برصغیر میں زیادہ تر اس پارٹی (کمیونسٹ) کا وجود مذہب سے بغاوت کے اصولوں پر قائم ہوا۔ ورنہ جس ملک کے ہر گھر کا طاقچہ بتوں سے بھرا ہو۔ وہاں کے عوام ایسی کوئی تحریک کیوں کر قبول کرنے لگے جس کی بنیاد مذہب پر نہ ہو۔

۱۹۱۷ء میں جب روس میں انقلاب آیا اور زارشاہی کی جگہ وہاں کے عوام نے سنبھالی تو اس کی صدائے بازگشت برصغیر میں بھی سنی جانے لگی۔ ۱۹۱۹ء میں جلیانوالہ باغ کا حادثہ، خلافت و ترکِ موالات کی تحریکات پر برطانوی حکومت کا اپنی غلام رعایا پر بے پناہ تشدد یہاں کے عوام کو اس موڑ پر لے آیا کہ غیر ملکی غلامی سے نجات کے لیے وہ طریق کار بے معنی ہے جسے کانگریس یا دوسری سیاسی جماعتوں نے اپنایا ہے۔ برطانوی سامراج سے نجات کے لیے عدم تشدد کی پالیسی بے کار ہے اور اس کے ذریعہ ہندوستان آزاد نہیں ہو سکتا جب تک یہاں برابر کی فوجی قوت نہ ہو۔ لیکن اس سے پیشتر کے متعدد ایسے تجربات سے ہندوستانی رہنما مایوس ہو چکے تھے۔ خصوصاً ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی "کاما گاٹا مارو"[۱] جہاز کی سازش اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کی تحریک پر مولانا عبیداللہ سندھی کا افغانستان پہنچ کر روس اور ترکی سے سازش کر کے

---

[۱] یہ ایک جہاز کا نام تھا جسے ہندوستان سے باہر کے محب وطن ہندوستانیوں نے جاپان سے خرید کر اس وقت کے انقلابی رہنما سردار گوردت سنگھ کے سپرد کیا تھا۔ اس جہاز میں سوار انقلابی سکھ نوجوانوں کی اکثریت تھی۔ غیر ملکی اسلحہ بھی اس میں تھا۔ اس سازش کا علم برطانوی حکومت کو جہاز کے ہندوستان پہنچنے سے پیشتر ہو چکا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی یہ جہاز بج بج گھاٹ پہنچا، گورا فوج نے ساحل سے فائرنگ شروع کر دی۔ مقابل میں جہاز سے بھی فائرنگ ہوئی۔ جہاز پر سوار انقلابی مارے گئے۔ بچ رہے انہیں گرفتار کر لیا گیا اور یہ لوگ بیس بیس سال کے لیے جیل خانوں میں بند کر دیئے گئے۔ اس طرح یہ سازش ناکام ہو گئی۔

ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرانا، نیز تحریک ریشمی رومال کی ناکامی نے ثابت کر دیا تھا کہ ہندوستان میں تشدد کی کوئی تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی۔ تاہم کانگریس کی بڑھتی ہوئی تحریک میں کچھ عناصر ایسا آشامل ہوا جو روسی انقلاب سے بالواسطہ متاثر تھا۔ آہستہ آہستہ اور اندر ہی اندر یہ لوگ نوجوانوں کو اکساتے رہے کہ مذہب ایک افیون ہے جو انسانی جذبات کو مضمحل کر دیتا ہے۔ اس سے دوری حاصل کرنا؟ انسانیت کی معراج ہے اور یہ آزادی وطن کے راستے میں بھی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

جیسے جیسے یہ زہر نوجوان خون میں سرایت کرتا گیا متحدہ ہندوستان میں کمیونسٹ تحریک کو تقویت حاصل ہوتی رہی۔

روس کے بعد ہندوستان میں ۱۹۲۱ء میں کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی گئی۔ بمبئی، پونا اور احمد آباد میں سب سے پہلے اس کے دفاتر قائم ہوئے۔ کامریڈ مظفر احمد اور کامریڈ گھاٹے (مرہٹہ) اس کے رہنما تھے۔

کمیونسٹ پارٹی کے خلاف قانون (UNLAW FULL) قرار دیے جانے کے بعد بظاہر یہ لوگ کانگریس سے وابستہ رہے۔ مگر (UNDER GROUND) (در پردہ) کام کرتے رہے۔ اس تحریک کو زیادہ تر بنگالی نوجوانوں نے قبول کیا۔ متحدہ ہندوستان میں دہشت پسند تحریکیں زیادہ تر اسی صوبے میں پروان چڑھیں۔ چنانچہ ۱۹۲۶ء کو کانپور میں پہلی کسان مزدور کانفرنس ہوئی جس میں یہ لوگ (کمیونسٹ) کھل کر سامنے آئے۔ اس کانفرنس کے ایک اجلاس کی صدارت مولانا حسرت موہانی نے کی۔

اس طرح کانگریس کے اندر نئے خیالات نے جنم لیا۔ اور یہ گروہ اندر خانے اپنا کام کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ۱۹۳۲ء میں اس گروہ کے متعدد افراد میرٹھ سازش کیس میں گرفتار ہوئے۔ پنجاب میں اس سے پیشتر نوجوان بھارت سبھا قائم ہو چکی تھی۔ جس کے رہنما سردار بھگت سنگھ تھے۔ جنہیں ۲۳۔ مارچ ۱۹۳۱ء کو لاہور سنٹرل جیل (موجودہ شادمان کالونی) میں پھانسی دیا گیا تھا۔ میرٹھ کیس ختم ہوتے ہی یہ لوگ پھر انڈر گراؤنڈ چلے گئے۔ آخر ۲۴۔ جولائی ۱۹۳۴ء کو ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی کو باضابطہ خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔ اس کے باوجود

یہ لوگ اندر ہی اندر کام کرتے رہے۔ ان دنوں کامریڈ پورن چند راس پارٹی کے جنرل سیکرٹری تھے۔

اہلحدیث لیگ

ہندوستان کی سیاسی سرگرمیاں ہنوز آئندہ الیکشن تک محدود تھیں۔ ہر پارٹی اور گروہ اس تگ و دو میں تھا کہ اپنی اپنی قوم اور فرقہ میں اپنی پوزیشن واضح کرے۔ انہی دنوں بنارس اہلحدیث کے جنرل سیکرٹری ایم اے۔ سعید نے بنارس سے ۲۔ اگست کے اخبارات میں ۲۰۔ جون کی اس خبر کی تردید کی کہ مشترکہ انتخاب کی تجویز بنارس اہلحدیث لیگ نے پیش کی ہے بلکہ یہ تجویز آل انڈیا اہلحدیث کی تجویز ہے۔

احرار سے سمجھوتہ

اخبارات میں احرار سے متعلق یہ خبر شائع ہوئی کہ جالندھر ڈویژن سے مولانا غلام بھیک نیرنگ کے مقابل احرار نے فیروزالدین (ہوشیارپور) ایڈووکیٹ کو اپنا نمائندہ منتخب کر رہی ہے۔ مگر چند دنوں کی باہمی گفتگو کے بعد یہ طے پایا ہے کہ احرار اس حلقہ سے مولانا غلام بھیک نیرنگ کے مقابل اپنا نمائندہ واپس لے لے اب احرار صرف خالد لطیف گابا کی حمایت کرے گی۔ یہ اعلان ۲۔ اگست ۱۹۳۴ء کے اخبارات میں کیا گیا۔

وائسرائے ہند کا اعلان

۱۰۔ اگست ۱۹۳۴ء کو وائسرائے ہند لارڈ ولنگڈن نے اعلان کیا:

"۳۱۔ دسمبر ۱۹۳۴ء کو موجودہ اسمبلی ختم کر دی جائے گی۔"

اس اعلان سے انتخابی سرگرمیاں تیز تر ہو گئیں۔ کانگریس نے سنٹرل پارلیمنٹ بورڈ قائم کر لیا۔ ہندو مہاسبھا بھائی پرمانند کی قیادت میں پر تولنے لگی۔ پنڈت مدن موہن مالوی نیشنلسٹ پارٹی کو مضبوط کرنے لگے۔ ۱۲۔ اگست کو شملہ میں مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ کا مشترک اجلاس ہوا۔ سکھوں نے اپنی صوبہ جاتی یونین قائم کر لی۔ اس طرح حالات نے نئے سرے سے کروٹ لی اور ماند پڑی ہوئی انتخابی تحریک میں جان آنے لگی۔

۱۲۔ اگست کا اجلاس

شملہ میں مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس کے مشترک اجلاس میں پارلیمانی بورڈ کے قیام کے علاوہ، برطانیہ کے فرقہ وارانہ اعلان کو کلیتہً قبول کر لیا گیا۔

چونکہ مسٹر محمد علی جناح ان دنوں لندن میں تھے۔ لہٰذا ان کی جگہ اجلاس کی صدارت آنریبل سر رضا علی نے کی۔ اس پر اعتراض اٹھایا گیا کہ مسلم لیگ کا یہ اجلاس غیر آئینی ہے۔ چونکہ صدر یہاں نہیں ہیں لہٰذا ہم اس کو نمائندہ اجلاس تسلیم نہ کرتے ہوئے واک آوٹ کرتے ہیں۔ ان میں عبدالمتین چودھری اور مسٹر اظہر علی قابل ذکر ہیں۔

شملہ ان دنوں مسلم سیاست کا سرگرم مرکز تھا۔ ۱۲-اگست کے بعد ۱۴-اگست کو نواب چھتاری، خان بہادر حافظ ہدایت حسین، انور شید علی خاں اور اسی طرح کے دوسرے رہنما جمع ہوئے۔ جنہوں نے آل انڈیا کونسل مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس کا اجلاس منعقد کیا۔ اور اپنا الگ پارلیمانی بورڈ بنا لیا۔ نیز اسی اجلاس میں آئندہ انتخاب میں جداگانہ طریق انتخاب کی تائید کی گئی۔ اس اجلاس کے خاتمے پر لندن سے سر آغا خان نے نواب چھتاری کو مبارک باد کا تار دیا۔ (یہ اجلاس مقابل کی مسلم لیگ نے مسٹر جناح کی غیر حاضری میں کیا تھا) اسی اجلاس میں الہ آباد کے نامزد امیدوار مسٹر لطیف کا بالمقابل خان بہادر حاجی رحیم بخش کو مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ کا مشترک نمائندہ ٹکٹ دیا گیا۔ سر آغا خان نے لندن سے اس کی تائید کی۔ اس کے ساتھ ہی نواب چھتاری، بیگم شاہنواز، میر مقبول نے بھی خان بہادر حاجی رحیم بخش کی حمایت میں بیان دیا۔

۱۹-اگست کو کلکتہ سے نیشنلسٹ پارٹی کے لیڈر پنڈت مالوی نے ایک بیان کے ذریعے اعلان کیا:

> "نیشنلسٹ پارٹی کا ممبر وہی ہو سکتا ہے، جو کانگریس کا ممبر ہو گا۔ کیونکہ یہ پارٹی کانگریس سے علیحدہ نہیں۔ اس جماعت کے مقاصد میں اول یہ بات ہے کہ کونسلوں سے باہر قرطاس ابیض اور فرقہ وارانہ نیابت کو مسترد کرنے کی کوشش کرے گی۔"

ہٹلر جرمن کا صدر منتخب ہو گیا

دنیائے پالیٹکس سے ہندوستان کے سیاسی حالات گو مختلف تھے لیکن یورپ کے پالیٹکس میں اس کا برابر ذکر تھا۔ برطانوی غلام ہونے کے باوجود متحدہ ہندوستان کے اندرونی حالات

انگریزوں کے لیے ساز گار نہیں تھے۔ برصغیر ایوان برطانیہ کے لیے سردردی کا باعث تھا اور خصوصاً جرمن کے بدلتے ہوئے حالات اور آئے دن کے واقعات نے فرنگی سیاستدانوں کو ہندوستان کی طرف سے متفکر کر رکھا تھا۔ ہر شام آسمان پر شفق کے بدلتے ہوئے رنگ برطانوی دانشوروں کے چہروں کی غمازی کرتے اور ڈھلتے ہوئے ستاروں کے ساتھ نہ جانے کتنی نبضیں ڈوب جاتی تھیں۔

۱۹۔ اگست ۱۹۳۴ء کو جب اڈولف ہٹلر جرمن کا مستقل صدر عوام کے ووٹوں سے منتخب ہوا تو برطانوی سامراج کے رہے سہے حواس جاتے رہے۔ اس سے ایک ہفتہ قبل ۹ اگست کے "ڈیلی میل" لندن میں ہٹلر کا ایک بیان شائع ہوا۔

"ہم اس وقت تک انگلستان سے نبرد آزما نہیں ہوں گے جب تک کہ وہ ہم پر حملہ نہیں کرے گا۔ اسی بیان میں آگے چل کر ہٹلر نے کہا جب وہ یہ کہتے ہیں کہ انگلستان کی مدافعانہ سرحد دریائے رائن کا کنارا ہے تو ہمارا حق ہے کہ ہم اپنے ملک کی سرحد کے اندر اپنی حفاظت کا انتظام کریں۔ ہم انگلستان سے کوئی نوآبادی بھی نہیں چاہتے۔ ہیں ایک جرمن نوجوان کی جان بھی اس کام کے لیے قربان کرنے کو تیار نہیں اور نہ ہی ہم آسٹریلیا پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ البتہ آسٹریلیا ہم سے دوستی کے تعلقات قائم کیے ہوئے ہے۔

اگر جرمن کو مجبور کیا گیا تو وہ تمام دنیا کی خام اجناس سے بے نیاز اور خود مختار ہو جائے گا۔ دو تین سال کے اندر دنیا دیکھے گی کہ جرمن کس طرح اپنا لوہا منواتا ہے۔"

صدارتی انتخاب میں نوے فیصد جرمن عوام نے ہٹلر کو ووٹ دیے لیکن اس پر بھی ہٹلر کو یقین تھا اور اسی یقین کی بنا پر اس نے کہا:

"وقت آئے گا کہ دس فیصد جرمن مجبور ہو جائیں گے کہ میرا ساتھ دیں۔ جرمن کا ہر آدمی نازی پارٹی کا حامی بن جائے گا اور آئندہ بھی میرا اسی طرح ساتھ دیں گے جس طرح گزشتہ واقعات میں میرا ساتھ دے کر انہوں نے وفاداری کا ثبوت دیا ہے۔"

صدارتی انتخاب کے ایک ہفتہ بعد ۲۷ - اگست ۱۹۳۴ء کو ہٹلر نے کہا:

"اگر کوئی غیر قوم ہم پر حملہ آور ہوئی تو اس کی وجہ محض یہ ہوگی کہ ہم اپنے وطن کے مفاد کا تحفظ نہیں کر سکتے یا پھر بین الاقوامی جماعت کے مخصوص لوگ ہمیں نقصان پہنچائیں گے۔ لیکن میں ان لوگوں کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم کسی طاقت کے سامنے جھکنے کو تیار نہیں ہیں۔

یہودی اور کمیونسٹوں کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اگر انہوں نے مذہب کی آڑ لے کر جرمن قوم یا نازی پارٹی کی مخالفت کی تو ہم ہر ممکن ذرائع سے ان کا مقابلہ کریں گے۔"

جرمن کا اقتدار سنبھالنے کے بعد ہٹلر نے مسلسل تقریروں میں جو لہجہ اختیار کیا اس نے یونین جیک کی اڑانوں کے ساتھ برطانوی دانشوروں کی پیشانیاں بھی شکن آلود کر دیں ایسے میں برٹش ایمپائر دوہری مشکلات میں الجھ گئی۔ ہندوستانی ایک طرف اپنی آزادی کی آگ کو ہوا دے رہے تھے تو جرمن دوسری طرف پہلی جنگِ عظیم کی شکست کا انتقام لینے کی تدبیروں میں تھے۔ انہی دنوں وائسرائے ہند نے ۳۱ دسمبر کی بجائے ۲۹ اگست کو آئندہ انتخاب تک کے لیے اسمبلی برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

اس عجلت کے ساتھ اسمبلی برخاست کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی جبکہ ۴ اگست کو وائسرائے خود اعلان کر چکے تھے کہ وہ ۳۱ - دسمبر ۱۹۳۴ء کو موجودہ اسمبلی برخاست کریں گے۔ پھر ۲۹ اگست کو یکایک یہ قدم کیوں اٹھایا گیا؟ ہندوستان میں برطانوی نمائندے کا اپنے وعدے سے یہ انحراف بساطِ سیاست پر ایک نئے مہرے کی چال تھی۔

ہٹلر کی مسلسل حالیہ تقریروں نے برطانوی سیاستدانوں کو بے کل کر دیا تھا اور اس موقعہ پر وہ ہندوستانی سیاستدانوں کا باہم ایک جدید تماشہ دیکھنا چاہتے تھے تاکہ برطانیہ یکسوئی کے ساتھ جرمن کے بدلتے ہوئے حالات پر غور کر سکے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

نئی افراتفری

۱۔ ۲۱ اگست (۱۹۳۴ء) مسلم یونیٹی بورڈ لکھنؤ کے اجلاس میں آخری روز جمعیتہ علمائے ہند کے نمائندوں نے واک آؤٹ کیا ان کا موقف یہ تھا۔

"چونکہ مسلم یونیٹی بورڈ سے ہمارا اشتراک صرف ان شرائط پر تھا کہ آئندہ انتخاب میں ہم ایسے نمائندوں کی امداد کریں گے جو اسمبلی میں مذہبی امور کے سلسلے میں جمعیتہ کے فیصلوں کے مطابق کام کریں۔ لیکن یونیٹی بورڈ نے ہماری شرائط پوری نہیں کیں۔ لہٰذا ان حالات میں ہم آئندہ انتخاب میں مسلم یونیٹی بورڈ کی حمایت نہیں کریں گے۔ تاہم جمعیتہ علمائے ہند ان حالات میں بھی بورڈ کا ایک نمایاں گروپ رہے گا۔

مولانا احمد سعید ناظم اعلیٰ جمعیتہ علمائے ہند کا یہ بیان ۲۲۔اگست کے اخبارات میں شائع ہوا۔

۲۔ ۲۴۔اگست کو مہاتما گاندھی نے پنڈت مالویہ کے بیان کی تردید میں کہا:

"یہ بات غلط ہے کہ کوئی کانگریسی نیشنلسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑ سکتا ہے۔"

گاندھی جی نے کہا کہ

"صرف کانگریس پارٹی کو یہ حق حاصل ہے کہ انتخاب لڑے۔ صرف اپنے پارلیمانی بورڈ پر اور کانگریسی صرف اسی نام سے الیکشن میں حصہ لے سکتا ہے۔"

۳۔ عین انہی دنوں موضع پلول تحصیل ریواڑی کے ہسپتال کے ایک غیر مسلم ڈاکٹر نے اپنے گدھے کا نام احمد رکھا، جس پر سارے ہندوستان میں رنج و غم کا انتشار پیدا ہوگیا۔

۱۹۲۷ء سے ہندو مہاسبھا اور آریہ سماج نے تحریک شاتم رسول شروع کر رکھی تھی کہ وہ مسلمانوں کی دل آزاری کے لیے سرور کائنات صلعم کی ہر ممکن طریق سے اہانت کریں گے۔ چنانچہ لاہور میں راجپال کا قتل، دہلی میں شردھانند کا قتل، قصور میں بالارام کا قتل، کراچی میں نتھورام کا قتل، جہلم میں ایک سکھ کا قتل اسی سلسلے کی کڑیاں تھیں۔

یہ حقیقت ہے کہ احرار بالخصوص سید عطاءاللہ شاہ بخاری (رحمۃ اللہ علیہ) اگر اس موقعہ پر سدِّ راہ یعنی دیوار نہ بن جاتے تو شاید باطل کی زبانیں بند نہ ہوتیں۔ وہ مسلمان نوجوان

بھی قابلِ داد ہیں، جنہوں نے جان کا نذرانہ دے کر خاتم الانبیاء علیہ السلام کی عزت کو محفوظ کیا۔
پلول کے حادثے کو بھی یہی عنوان دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس میں بھی شاتم رسول کا پہلو واضح تھا۔
انتخاب کے دن تھے۔ تمام ملک اسی میں مصروف تھا۔ غیر مسلم تو غیر مسلم ٹھہرے۔ مسلمان
بھی اس واقعہ پر چپ سادھ کر رہ گئے۔ گو احرار بھی فارغ نہیں تھے تاہم اخبارات نے پلول کا گدھا
کے عنوان سے سارے مسلم جذبات کو آگ دے رکھی تھی۔ ایسے میں صرف مجلس احرار نے قدم اٹھایا
کہ ۲۵ اگست کو چودھری افضل حق نے وزیر زراعت پنجاب کو ایک خط کے ذریعے اس طرف
متوجہ کیا۔

ڈاکٹر شفاخانہ حیوانات پلول کے خلاف اس بنیاد پر کہ اس نے ایک گدھے کا
نام پیغمبر اسلام صلعم کے نام پر احمد رکھا ہوا ہے۔ ڈاکٹر کی اس حرکت پر سارے ملک
میں احتجاج ہو رہا ہے مگر متعلقہ محکمہ اس پر خاموش ہے۔ آخر کیوں۔ بہ مہربانی
کر کے اس کی فوری تحقیقات کر کے جواب دیں۔

آپکا افضل حق۔ ایم ایل اے
نائب صدر مجلس احرار اسلام ہند

اس خط کے جواب میں ۲۸ اگست کو وزیر زراعت نے چودھری افضل حق کو تحریر کیا۔

شملہ ریسٹ ہاؤس
۲۸۔ اگست ۱۹۳۴ء

مکرمی چودھری صاحب!

مجھے کامل یقین ہے کہ آپ کو پتہ چل گیا ہوگا کہ گدھے کے نام کے متعلق بڑی
غلط فہمی تھی۔ دراصل گدھے کا نام احمق تھا۔ تاہم اس پر بھی اس کا یہ نام تبدیل
کر کے بہادر رکھ دیا گیا ہے۔

آپ کا۔
جوگندر سنگھ۔ وزیر زراعت پنجاب

اسی روز ڈاکٹر حیوانات پلول کا ایک بیان اخبارات میں شائع ہوا۔
"میری ذرا سی غلطی سے مسلمان بھائیوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچی ہے میں
اس پر معذرت خواہ ہوں۔ آئندہ ایسی کوئی غلطی نہیں ہوگی۔"

مہاراجہ جیند کے نام

۱۹۳۱ء سے ہندوستان کی غیر مسلم ریاستوں میں مسلمان رعایا کے ساتھ ظلم وستم کا ایک دور چل رہا ہے۔ اس پر ہندو اخبارات نے جو جانبدارانہ رویہ اپنا لیا تھا۔ ماضی قریب کے واقعات سے آشنا لوگ اس سے غافل نہیں کیے جا سکتے۔

کانگریس اور مسلم لیگ سمیت ریاستی مسلمانوں کے ساتھ مسلمان جماعتوں نے جس بے اعتنائی کا مظاہرہ کیا، تاریخ اس سے بیگانہ نہیں۔ یہ کریڈٹ صرف مجلس احرار کے لیے وقف رہنا چاہیے کہ اس کے رہنماؤں نے کشمیر، الور، کپورتھلہ اور جیند جیسی ریاستوں کے حاکموں سے ٹکرا کر وہاں کے مسلمانوں کو ان کے پیدائشی اور جائز حقوق دلائے۔ اور اس ضمن میں اپنے کو مصائب میں ڈالا۔

۳۱ اگست ۱۹۴۳ء کا صدر مرکزیہ احرار کا یہ بیان اس ضمن میں آتا ہے۔ اس میں انہوں نے مہاراجہ جیند کو ان کی مسلم رعایا کے متعلق چند مطالبات کا ذکر کیا ہے۔

"ملکی حالات پارلیمانی انداز سے گذر رہے ہیں اور تمام مسلمان جماعتیں آئندہ الیکشن کے لیے سوچ رہی ہیں۔ مجلس احرار ان دنوں اس فکر میں ہے کہ ریاست جیند کے مسلمانوں پر مہاراجہ جیند کے ظلم وستم بڑھتے جا رہے ہیں، لہٰذا میں مناسب سمجھتا ہوں کہ مہاراجہ کو ان پر توجہ دلاؤں۔

تقریباً ڈیڑھ سال سے ریاست جیند کے ہندو حکام نے مسلمانان جیند پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ شاہی مسجد ریاستی حکام نے اپنے قبضے میں کر رکھی ہے۔ باقی مساجد میں سؤر کا گوشت پھینکا گیا۔ اس سے ریاست کے مسلمانوں نے بطور احتجاج عید کی نماز ترک کر دی۔ عیدالاضحیٰ کے دن ہمیشہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر مسلمانوں کو بکرے اور دنبے کی قربانی سے بھی باز رکھا جا رہا ہے مسلمانوں کے قاتلوں کو ہندو عدالتیں صاف بری کر دیتی ہیں۔

ان حالات میں وہاں کے مسلمانوں نے گزشتہ ایک ماہ سے جمعہ کے دن پرامن جلوس نکالے، جن پر مولانا عبدالعزیز فاضل دیوبند خطیب جامعہ مسجد جیند نے امن پر قائم رہتے ہوئے ریاستی حکام کے سامنے چند مطالبات پیش کیے۔ حکام نے بجائے بات سننے اور سمجھنے کے مولانا عبدالعزیز اور ان کے رفقاء کو گرفتار

کر لیا اور انہیں بیڑیاں ڈال کر جیل میں بند کر دیا گیا۔

ہندو ریاستوں میں عموماً مسلمانوں کے مذہبی، معاشرتی اور شہری حقوق متعصّب ہندو حکام فنا کر رہے ہیں۔ پنجاب کا ہندو پریس اور مہاسبھائی لیڈر ان کی پشت پر ہیں۔ جب مسلمان تنگ آکر اپنی مذہبی آزادی، شہری حقوق کے لیے پرامن جدوجہد کرتا ہے، تو انہیں جیل بھیج دیا جاتا ہے۔ وہاں ان پر بے پناہ مظالم ہوتے ہیں۔ ہندو پریس اور ہندو لیڈران بے گناہ مسلمانوں کو باغی، بدمعاش یا لفنگے کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ نیز حکام کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ ان باغی مسلمانوں کو ایسی سزا دی جائے کہ عمر بھر یاد کریں۔ ان حالات سے ریاستی مسلمان کے لیے اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں رہتا کہ وہ باعزت زندگی کے لیے حاکم وقت سے برسرپیکار ہو جائے۔ لیکن اس طرح راعی اور رعایا کے درمیان نفرت بڑھتی رہتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ مہاراجہ جیند ایک اچھے آدمی ہیں۔ ان کی نیت اپنی رعایا کے حق میں بری نہیں۔ اس کے برعکس ریاست میں جو کچھ ہو رہا ہے یا آئندہ ہوگا اس کی تمام تر ذمہ داری اس ہندو پر ہے جس کے سپرد مہاراجہ نے وزارت عظمیٰ کا عہدہ کیا ہوا ہے۔

وزیر اعظم ریاست میں فساد کرا کر خود چھٹی لے کر لندن کی سیر کے لیے روانہ ہو چکا ہے اور اپنے قائم مقاموں کو مسلمانوں پر تشدد کی کھلی چھٹی دے دی گئی۔

ایسے میں مہاراجہ جیند اور ان کے ولی عہد کا فرض ہے کہ اپنی ریاست کو تباہی سے بچائیں۔ ورنہ بیرونی حکام ہمیشہ کے لیے آپ کی ریاست کو فنا کر دیں گے۔ آپ کی مسلمان رعایا کے صرف اس قدر مطالبات ہیں کہ:

۱۔ عید کے دن ان کو بکرے اور دنبے کی قربانی سے نہ روکا جائے۔

۲۔ شاہی مسجد مسلمانوں کے حوالے کر دی جائے۔

۳۔ جن مساجد میں سور کا گوشت پھینک کر انہیں ناپاک کیا گیا ہے، ریاست کے ان حکام کو اس جرم کی سزا دی جائے۔

۴: مسلمانوں کے جن قاتلوں کو بری کر دیا گیا ہے انہیں قتل کا مجرم قرار دے کر سزا دی جائے۔

کیا مہاراجہ اور ولی عہد کے نزدیک مسلمانوں کے یہ مطالبات قابل توجہ نہیں؟ اگر ہیں تو ریاست کے امن کا تقاضہ ہے کہ ان پر غور کیا جائے اور تمام گرفتار شدگان کو فوراً رہا کر دیا جائے۔"

اس کے ساتھ ہی صدر مرکزیہ نے روہتک مجلس احرار کو خصوصی توجہ دلائی کر وہ ریاست جیند کے مسلمانوں کے ساتھ پوری ہمدردی کا اظہار کرے۔ نیز آئینی طریق پر ان کی ہر طرح امداد کرے۔

غلاموں کے باہم الجھاؤ اور مندرجہ بالا واقعات نے غیر ملکی آقاؤں کو وقتی سہارا دیا اور وہ ہٹلر کے ارادوں کا دلجمعی سے جائزہ لینے لگے۔

پنجاب کا مسلم پریس

سیاسیات میں کوئی بات حرفِ آخر نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کے فیصلوں میں کسی قسم کی پختگی کا امکان ہوتا ہے۔ اس کے وعدے بھی مٹی کے کھلونوں کی طرح ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔ نہ تو دوستوں کو دشمن بننے میں مدت لگتی ہے اور نہ ہی دشمنی دوستی میں ڈھلتے کوئی وقت لیتی ہے۔ اس پگڈنڈی پر رواں دواں لوگ ہر گھڑی راستہ بدلتے رہتے ہیں۔

پنجاب کا مسلم پریس جو گذرے ہوئے کل مجلس احرار کی تعریف سے اپنے اخبارات کو رونق دے رہا تھا، اپنے کالموں میں اس جماعت کے گیت گا رہا۔ یکایک الیکشن کے دنوں وہ احرار میں کیڑے نکالنے لگا اور نو مسلم خان لطیف کا، جسے مجلس احرار کی حمایت حاصل تھی کے مخالف خاں بہادر حاجی رحیم بخش کی حمایت میں آل انڈیا مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس کی تعریف پر اتر آیا۔

یکم ستمبر ۱۹۳۴ء کے مدیر مسلم جرائد کی پالیسی حیران کن تھی کہ سب نے اسی پراداری نوٹ لکھے۔ خصوصاً روزنامہ "آفتاب" نے اپنی پالیسی اسی عنوان پر قائم کی۔ (یہ اخبار الیکشن کے بعد پھر دیکھنے میں نہیں آیا) حالانکہ اسلامی ہمدردی کا تقاضا تھا کہ انگریز کے خطاب یافتہ کی بجائے نو مسلم کی حمایت کی جاتی تاکہ آئندہ غیر مسلموں پر اس کا اثر رہتا۔ لیکن بڑا ہو دنیاوی ضرورت کا کہ صراطِ مستقیم

سے ہٹتے انسان کو دیر نہیں لگتی۔

مجلس احرار کا اس سے زیادہ کوئی قصور نہیں تھا کہ اس نے ایک نو مسلم کو آئندہ انتخاب میں اپنا نمائندہ منتخب کیا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی سیاسی مقصد نہیں تھا۔ اس پر بھی سیاسی طالع آزما سرڈل اور خان بہادروں کا ٹولہ احرار کے خلاف ہم آہنگ ہو کر اکھاڑے میں اتر آیا۔ دراصل اس کے پس منظر میں بھی انگریز دشمنی اور دوستی کارفرما تھی۔ فرنگی حکمرانوں کا وفادار گروہ ذاتی جاہ و حشمت کے لیے اسلام سے ہمیشہ برسرِ پیکار رہا ہے۔ ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

مولانا ظفر علیخاں خاکساروں سے جا ملے

کائنات عالم میں بعض انسانی وجود اس انداز سے داخل ہوتے ہیں کہ ان کا کوئی نقش یا کسی منزل کی نشاندہی نہیں کرتا۔ اسی طرح وہ سنگِ میل بننے کی بجائے گم کردہ راہ مسافر بن کر رہ جاتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنی تقدیر کے چراغوں کو تدبیر سے روشن کرتے ہیں۔ لیکن یہ روشنی دیرپا نہیں ہوتی۔ وقت اور حالات کا دامن انہیں ایک ہی ہوا کے جھونکے سے گل کر دیتا ہے۔

برصغیر کی متحدہ سیاست میں مولانا ظفر علیخاں کا وجود ان کے کسی محور کی نشاندہی نہیں کرتا۔ یہ درست ہے کہ انفرادیت میں وہ بڑی شخصیت تھے۔ لیکن نہ تو وہ سالارِ کارواں بن سکے اور نہ غبارِ کارواں کہ پھیل کر اندھیرے اور اجالوں کو سمیٹ لیتے۔ وہ اپنی ذات میں ایک مستقل انجمن تھے جس کے صدر، خازن اور ورکنگ کمیٹی بھی خود ہی تھے۔

روزنامہ "زمیندار" ان کے قلم کا مرہونِ منت تھا۔ وہ جب تک صحافت کے آسمان پر رہا، ان کی انفرادیت رہی اور جیسے ہی مولانا ظفر علیخاں ابدی نیند سو گئے یہ ادارہ اسی طرح دم توڑ گیا جیسے اس کا وجود تھا ہی نہیں۔ یہ کیوں؟ ربع صدی تک ہندوستان سے باہر تک جو اخبار صدائے جرس رہا۔ کفر کے دل دہل جاتے رہے لیکن آج تلاش پر بھی اس کا ایک ورق دستیاب نہیں۔ کیوں؟ یہ اس سیمابی طبیعت کا نتیجہ ہے ؎

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

مولانا موصوف ہر صبح ایک جماعت کی تشکیل کرتے اور غروب آفتاب کے ساتھ اسے اپنے ہاتھوں دفن کر دیتے۔ ہاں! فرنگی حکمرانوں کے خلاف اور مرزائیت سے ان کی جنگ خلوص پر مبنی تھی۔ اس میں انہوں نے کبھی ہار قبول نہیں کی۔ اس راہ میں مصائب آئے تو انہیں قبول کیا۔ مگر اس میدان میں بھی یک و تنہا رہے۔ ان کے مجموعۂ کلام (گلستان اور بہارستان) ان کی تلون مزاج طبیعت کے زندہ گواہ ہیں۔ ایک صفحہ پر اگر کسی کی تعریف ہے تو دوسرے پر اس کی ہجو موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ناشران آج بھی ان کی اشاعت سے جی چراتے ہیں۔ اور اگر کسی نے یہ جرأت کی بھی تو اس کے سرائے کو دیمک نے چاٹ لیا۔

۲ستمبر ۱۹۴۱ء کے زمیندار میں یہ خبر شائع ہوئی کہ حضرت مولانا ظفر علیخاں خاکسار تحریک میں شامل ہو گئے۔ اس کی تفصیل میں روزنامہ زمیندار لکھتا ہے کہ:

"پچیس خاکساروں کا ایک قافلہ میکلوڈ روڈ پر مولانا ظفر علیخاں کی خدمت میں سلامی کے لیے حاضر ہوا۔ تو مولانا دفتر زمیندار سے نکل کر سرِ قد سڑک پر کھڑے ہو گئے۔ گیارہ گولوں کی سلامی دی گئی۔ سالار قافلہ نے آگے بڑھ کر مولانا کی خدمت میں بیلچہ پیش کیا۔ اس کے دوسرے سالار نے تحریک خاکسار کے دستور العمل کی ایک کاپی پیش کی۔ اس کے بعد علامہ مشرقی نے مولانا کے بازو پر اخوت کا نشان لگایا۔ ازاں بعد مولانا نے قلعہ گوجر سنگھ تک خاکساروں کے ساتھ پریڈ کی۔"

اس واقعہ پر سے کئی سال گذر گئے۔ یہ سوال معمہ بنا رہا کہ مولانا ظفر علیخاں یکایک خاکسار میں کیسے شریک ہو گئے؟

۲۲دسمبر ۱۹۷۰ء کو مصنف کی ملاقات خاکسار تحریک کے سرگرم رکن مسٹر صفدر سلیمی سے ان کے دفتر واقع شاہ عالم مارکیٹ لاہور میں ہوئی۔ گفتگو کے دوران صفدر سلیمی نے کہا کہ مولانا ظفر علیخاں خاکسار تحریک میں اس لیے شامل ہوتے تھے کہ مولانا ظفر علیخاں اپنی ذات

کے منفرد آدمی تھے۔ کانگریس اور احرار سے جب ان کا بھانہ ہوسکا تو انہوں نے مسلم لیگ کی طرف توجہ دی جو ان دنوں مسلم عوام میں نئی تنظیم کے تحت ابھر رہی تھی۔ لیکن قائداعظم محمد علی جناح نے جو مولانا ظفر علی خاں کی تلون مزاج طبیعت سے واقف تھے اس پر آمادہ نہ ہوئے تب انہوں نے خاکسار رہنما علامہ مشرقی سے رابطہ قائم کیا اور اس طرح وہ اس تحریک میں شامل ہوگئے۔
نوٹ: تحریک خاکسار کیا ہے؟ اس کے متعلق آئندہ اوراق میں پڑھیں۔

ایک تجبر

متحدہ ہندوستان میں مہاتما گاندھی کی شخصیت بھی بڑی دلچسپ رہی کانگریس کے ابتدائی ممبر نہ ہوتے ہوئے بھی وہ اس جماعت کے لیے مہاآتما (بمعنی روح) تھے۔ سیاسیات کے سفر میں جہاں کہیں انہیں اپنی ذات کے لیے خوف پیدا ہوا یا خطرے کا کوئی موڑ آتا۔ فوراً مرن برت رکھنے کا اعلان کر دیتے۔ اس سے ہندو جاتی کا دل اس مہاپرش کے لیے ہل جاتا اور وہ ان کی کسی غلط روش کو بھول کر ان کے چرن چھونے لگتی۔

کانگریس اور سوراج پارٹی کے مابین کشمکش ہوتے ہوئے پنڈت مالوی کے ساتھ بھی گاندھی کا اختلاف کھل کر سامنے آگیا تھا۔ دوسری طرف پنڈت مالوی نے اپنی نیشنلسٹ پارٹی کا الحاق در پردہ ہندو مہا سبھا سے کر لیا تھا۔ اس سہ رخی لڑائی میں گاندھی جی کو اپنی پوزیشن کو قدرے نقصان کا احتمال نظر آنے لگا۔ ایسے خطرے کو بھانپ کر پہلے تو انہوں نے مرن برت رکھنے کا اعلان کیا اور پھر ۵ ستمبر ۱۹۳۴ء کو اخبارات میں ایک بیان کے ذریعے کہا کہ وہ کانگریس سے علیحدگی پر غور کر رہے ہیں۔

۱۱ ستمبر کو حکومت پنجاب نے نوجوان بھارت سبھا، کرتی کسان پارٹی، کسان لیگ اور ڈسٹرکٹ کسان سبھا کو خلاف قانون قرار دے دیا۔ ان سب کے دفاتر سربمہر کر دیے گئے اور ان کے رہنما سردار گوردت سنگھ اور فیروز دین منصور کے مکانوں کی تلاشیاں لی گئیں۔

اس واقعہ کے بعد خلاف قانون جماعتوں کے ورکر بظاہر کانگریس سے مل کر کام کرنے لگے اور انہی لوگوں نے آگے بڑھ کر گاندھی جی کو ان کے ارادوں سے باز رکھا۔

ہندو مسلم اتحاد کا جدید نعرہ

احرار اور دیگر نیشنلسٹ مسلمانوں کو محض اس جرم میں مسلم عوام نے مجرم ٹھہرایا کہ یہ ہندوؤں سے مل کر

مسلم مفاد کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ حالانکہ نیشنلسٹ مسلمانوں کے نزدیک ہندو مسلم اتحاد محض انگریز کو ہندوستان سے نکالنے کے لیے اہم اور ضروری طریق کار تھا کیونکہ اس کے بغیر ایشیا اور مڈل ایسٹ کا مسلمان برطانیہ سے آزاد نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن فرنگی کے خطاب یافتہ خصوصی مسلمان گروہ نے ان لوگوں کی رسوائی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی لیکن اپنی سیاسی اور ذاتی اغراض کے تحت خود بھی اسی جرم کے مرتکب ہوئے۔

نواب سر اکبر حیدری وزیر مالیات حکومت حیدر آباد دکن نے بمبئی میں مسلمانوں کی تعلیمی کانفرنس میں اپنے خطبۂ صدارت میں ہندو مسلم اتحاد کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

" یہ فسادات کہلانے کو تو مذہبی کہلاتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مذہب سے ان کو بعید سے بعید تعلق بھی نہیں ہوتا۔ اس قسم کے فسادات مسلمان بادشاہوں، ہندو راجاؤں، برہمن پیشواؤں اور غرض کہ کسی عہد میں بھی نہیں ہوئے۔ کیونکہ خود پیشواؤں کی حکومت میں مساجد کا احترام کیا جاتا تھا ان کے سامنے باجا نہیں بجایا جاتا تھا اور مسلمانوں کے مقدس مقامات کی بے حرمتی ہرگز نہیں کی جاتی تھی۔ (آگے چل کر آپ نے ان شر انگیز کتب تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے کہا، جو اسکولوں اور کالجوں میں پڑھائی جاتی ہیں)

ان شر انگیز کتب کے باعث نہ صرف ہم اپنی تاریخ سے بے خبر رہتے ہیں، بلکہ مختلف قوموں کے درمیان فساد اور منافرت کی تخم ریزی بھی ہوتی ہے اس کے لیے ایسی کتابوں کو جلد سے جلد تعلیمی اداروں سے خارج کر کے ان کی جگہ ایسی کتب کو ذریعہ تعلیم قرار دینا چاہیے جن کے مطالعہ سے ہندو اور مسلمانوں میں حسین تعلقات پیدا ہوں۔ اور وہ اپنی تاریخ صحیحہ سے بھی واقف ہوں۔

——— (خطبہ کے آخری حصہ میں انہوں نے کہا)

جو قومیں دوسری قوموں کو قربان کر کے خود طاقت حاصل کرنا چاہتی ہیں وہ خودکشی کی مرتکب ہوتی ہیں۔ کیونکہ قوموں کا وجود اقتصادی، سیاسی اور معاشرتی اعتبار سے باہم ایک دوسرے سے وابستہ ہوتا ہے۔"

(روزنامہ انقلاب ۱۵ ستمبر ۱۹۲۴ء)

اگر یہ اجلاس مشترک طلبا، کا ہوتا تو یہ بات سمجھ میں آسکتی تھی کہ سر اکبر حیدری نے مصلحتاً ہندو مسلم اتحاد کی بات کہی ہوگی۔ لیکن یہ تعلیمی کانفرنس صرف اور صرف مسلم طلباء کی تھی اس میں ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ کیا معنے رکھتا ہے؟

تحریک شاتم رسول کی صدائے بازگشت

ہندوستان کی متحدہ پارلیمانی سیاست ماہِ رواں میں ایک ایسے موڑ پر آئی کہ حالات کا تانا بانا از سر نو بکھر گیا۔ ہندو مہاسبھا اور آریہ سماج کے بغیر ہر سیاسی جماعت نئے انتخاب کی تیاریوں میں تھی۔ ان دنوں ۱۸ ستمبر (۱۹۳۴ء) کو قصور ضلع لاہور کے مسلمان نوجوان محمد صدیق نے پالارام نامی ہندو کو جب کہ وہ عدالت میں اپنے مقدمے کی پیروی کے لیے حاضر تھا، قتل کر دیا۔ مقتول پر اسلام اور داعی اسلام صلعم کی توہین کا الزام تھا۔ قاتل گرفتار کر لیا گیا۔ اس سے پیشتر ۲ ستمبر کو کراچی میں مہاراج نتھورام کو عبدالقیوم نے سیشن جج کے روبرو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ (نتھورام نے بھی حضور کی توہین کی تھی اور اس جرم میں نتھورام کو صرف آٹھ ماہ کی سزا ہوئی تھی۔ جس پر مجرم نے سیشن جج کی عدالت میں اس سزا کے خلاف اپیل دائر کر رکھی تھی)۔ عبدالقیوم کو گرفتار کر لیا گیا اور اس نے اپنا جرم مان لیا۔

ان واقعات نے تحریک شاتم رسول کی بھولی بسری یاد از سر نو تازہ کر دی۔ شدھی اور سنگٹھن کی تحریک کے دوران ۱۹۲۷ء میں آریہ سماج اور ہندو مہاسبھا نے خاتم النبیینؐ کی توہین کرنے کا فیصلہ کیا تھا اس پر لاہور کے غازی علم الدین نے راجپال کو قتل کیا تھا جس نے رنگیلا رسول (نعوذ باللہ) نامی کتاب شائع کی تھی۔

ہندوؤں کی ان تازہ اشتعال انگیز حرکات نے نیشنلسٹ مسلمانوں پر بھی اثر کیا چنانچہ دہلی جمعیتہ علمائے ہند، اور کانپور جمعیتہ علماء ہند نے اپنے جزوی اختلاف ختم کر کے ان فتنہ انگیزیوں کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

۲۴ ستمبر کو مراد آباد کے اجلاس میں مسلم یونیٹی بورڈ نے جمعیتہ علمائے ہند (دہلی) کا یہ مطالبہ تسلیم کر لیا کہ بورڈ شریعت کے معاملات میں جمعیتہ کا مشورہ قبول کرے گا۔ اس پر جمعیتہ نے ۳ ستمبر کا ریزولیوشن واپس لے لیا۔ مگر کانپور جمعیتہ علماء کے سیکرٹری مولانا مظہر الدین نے اس کی

تردید کردی۔ اور ساتھ ہی اپنی جمعیۃ کا اجلاس طلب کر لیا۔ جس میں مولانا عنایت اللہ فرنگی محل، مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا شاہ محمد سلیمان، ڈاکٹر سر محمد اقبال، خان بہادر حافظ ہدایت حسین (سابق صدر مسلم لیگ)، ڈاکٹر شفاعت احمد الہ آبادی، مولانا شفیع داؤدی (مدراس)، مولانا غلام رسول مہر (ایڈیٹر روزنامہ انقلاب لاہور) مولانا سید حبیب (ایڈیٹر روزنامہ سیاست لاہور) کو شرکت کی دعوت دی گئی۔

اس اجلاس میں مسلم یونیٹی بورڈ کی حمایت کا فیصلہ ہوا۔ مگر جمعیۃ علمائے ہند (دہلی) سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔

اگر علماء کے یہ دونوں (بریلوی اور دیوبندی) گروہ ایک ساتھ رہ کر اس وقت کی فرقہ وارانہ سیاست میں دشمنانِ ملت کا سامنا کرتے تو ان شہداء کی ارواح مسرور ہوتیں جنہوں نے شاتمِ رسول کو قتل کر کے شہادت پائی تھی۔ نیز کفر الگ پریشان رہتا۔ لیکن تن آسان اور رجعت پسند وڈیروں نے غیر ملکی حکومت کے اشارہ پر اس عمارت کا انہدام ضروری سمجھا حالانکہ اس اتحاد کی بنیاد انگریز دشمنی پر نہیں انہدام سے تبرا آزما ہونے پر تھی۔ مگر برطانیہ کے لیے یہ اتحاد بھی گراں گذرا اور اس نے اپنے دلالوں کے ذریعے بنا بنایا سودا بگاڑ دیا اور یہی بگاڑ آئندہ کی سیاست پر بھی اثر انداز ہوا۔

سر ظفر اللہ کا تقرر

میاں سر فضل حسین پنجاب کے زیرک سیاستدان تھے۔ وہ جب تک سرکاری طور پر سیاسی میدان میں رہے، ہندو آفیسروں سے ان کی ٹھنی رہی۔ بلاشبہ وہ مسلمانوں کے ہمدرد تھے لیکن انگریز کے مفاد تک۔ اس سے آگے وہ اپنی ذات کے وفادار تھے۔ مذہب سے زیادہ سیاسی بساط کے کھلاڑی تھے۔ ہر مہرہ سوچ اور فکر سے اٹھاتے۔ ایک دفعہ کی چال کے بعد اس پر غور کرنا ان کی توہین تھی۔ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل سے علیحدگی کے بعد انہوں نے سر ظفر اللہ کو اپنا جانشین منتخب کرنا چاہا۔ برطانوی مفاد کے نگہدار کی حیثیت سے سر فضل حسین پنجاب میں سرفہرست تھے۔ لہٰذا ان کی تجویز پر وائسرائے نے سر ظفر اللہ کو اپنی کونسل میں لینا منظور کر لیا۔

پیشتر ازیں جب یہ خبر مجلس احرار تک پہنچی کہ سر ظفر اللہ کو مسلمان نمائندہ کی حیثیت سے وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں نمائندگی دی جا رہی ہے تو اس پر بڑی لے دے ہوئی۔

ملک بھر میں قراردادیں پاس ہوئیں، جلوس نکالے گئے کہ یہ سیٹ مسلمان کی ہے! اسے مسلمان کے سپرد کیا جائے۔ مگر نہ تو سر فضل حسین نے اس تجویز پر نظرثانی کی اور نہ انگریز حاکم نے اس پر توجہ مناسب سمجھی۔ اس ضمن میں احرار کا ایک وفد وائسرائے سے ملا، جس میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، میر احمد حسین شملہ اور الہ آباد ہائیکورٹ کے وکیل مسٹر محمد احمد کاظمی شامل تھے۔ وائسرائے نے وفد کے جواب میں کہا کہ:

"آپ ظفر اللہ کو مسلمان قرار نہیں دیتے لیکن وہ مسلمانوں کے ووٹ سے منتخب ہو کر آیا ہے۔"

سر ظفر اللہ کو دوہری حمایت حاصل تھی۔ ایک طرف سر فضل حسین تھے تو دوسری طرف ان کی تائید پر قادیانیوں کی برطانوی وفاداری کارفرما تھی۔

آخر ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۴ء کے اخبارات میں سرکاری اعلان کے ذریعہ چودھری سر ظفر اللہ کو وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا رکن نامزد کر دیا گیا۔

گاندھی کا کانگریس سے استعفیٰ

آخر وہی ہوا، جس کا ڈر تھا۔ مہاتما گاندھی نے ۱۵ اکتوبر کو اپنے بیان میں کہا:

"چونکہ کانگریس میرے پروگرام کے مطابق کھدر پہننے، سوت کاتنے اور پرامن جدوجہد پر یقین نہیں رکھتی۔ لہٰذا میں آل انڈیا کانگریس کے اجلاس سے فارغ ہو کر کانگریس سے مستعفی ہو جاؤں گا۔"

گاندھی جی کی یہ سیاسی دھمکی وقتی طور پر کارگر رہی اور آخر کو کانگریس ورکنگ کمیٹی نے گاندھی جی کے چرن چھو لیے۔

لیگ اور مسلم کانفرنس کے امیدوار

سال رواں کی روئداد گواہ ہے کہ ہندوستان کی سیاسی پارٹیوں نے اس سال کوئی غیر آئینی لڑائی نہیں لڑی۔ یہ سال صرف پارلیمانی بحث میں بیت گیا۔ ہر جماعت خواہ اس کا دائرہ کار محدود تھا یا وسیع، اپنی اپنی حدود میں آئندہ الیکشن کے لیے ہاتھ پاؤں مارتی رہی۔ جیسے جیسے انتخاب کے دن قریب آتے گئے جماعتیں نکھر کر سامنے آتی گئیں۔ چنانچہ سب سے پہلے ۹ اکتوبر کے اخبارات

میں یہ خبر شائع ہوئی کہ مسٹر محمد علی جناح بمبئی کے شہری حلقہ سے انتخاب لڑیں گے۔ (یاد رہے کہ ہنوز قائداعظم لندن میں قیام رکھتے تھے۔)

۱۷ اکتوبر ۱۹۳۴ء کو علیگڑھ سے مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس کے مشترک پارلیمنٹری بورڈ نے حسب ذیل حضرات کو الیکشن میں اسمبلی کے امیدوار منتخب کیا۔

۱۔ ایم۔ اے۔ جناح	۲۔ سیٹھ عبداللہ ہارون	۳۔ نواب سر سید مہر شاہ
۴۔ ڈاکٹر غلام بھیک نیرنگ	۵ مخدوم سید راجن بخش	۶۔ میجر طالب مہدی خاں
۷۔ خاں بہادر حاجی رحیم بخش	۸۔ سر محمد یعقوب	۹۔ خاں بہادر وجیہہ الدین
۱۰۔ اسے۔ ایچ۔ غزنوی وغیرہ		

اسی روز ۱۷۔ اکتوبر کو لاہوری مرزائیوں نے اپنے اجلاس میں مندرجہ بالا امیدواروں کی حمایت میں مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ کی ہمنوائی کا اعلان کر دیا۔

قادیاں احرار کانفرنس

قادیان میں مرزائیوں نے اپنی اکثریت کے زعم میں انسانیت پر جو ظلم روا رکھا اور اس قصبہ کی غیر مرزائی آبادی کو جس طرح پریشان کیا تاریخ اس کا جواب مہیا نہیں کرتی۔ رائج الوقت قانون کی موجودگی میں خلیفہ قادیاں کے گھر یلو آئین، دن کی روشنی میں اپنے مخالفوں کا قتل عام، مسلمان اور غیر مسلموں سے اقتصادی مناظرہ معصوم عصمتوں کی ہلاکت، قصر خلافت میں اخلاق سوز حرکات کا ارتکاب۔

برطانوی حکومت مرزائیوں کے ان جرائم سے تنگ آ چکی تھی۔ بین الاقوامی طور پر اس کی اپنی شہرت کو نقصان پہنچ رہا تھا۔ لیکن قادیانیوں کی تاریخی وفاداریوں کے باعث ان کے خلاف قانون کو حرکت میں لانا مشکل تھا۔ لیکن جیسے ہی مجلس احرار نے ۲۱-۲۲-۲۳ اکتوبر ۱۹۳۴ء کو قادیان میں احرار کانفرنس کرنے کا اعلان کیا۔ حکومت کو موقعہ مل گیا کہ وہ اس والدین کی طرح جو کبھی کبھار اپنے لاڈلے بیٹے کو سزا کے طور پر غیروں سے پٹواتے ہیں احرار کو قادیاں میں کانفرنس کرنے کی اجازت دے دی اور ساتھ ہی ۱۸۔ اکتوبر کو پولیس نے قادیانیوں کی خانہ تلاشی لی تو ان کے قبضے سے کافی مقدار میں برچھے، کلہاڑیاں اور اسی قسم کا دوسرا اسلحہ برآمد ہوا۔

۱۹۔ اکتوبر کے اخبار ”سول اینڈ ملٹری گزٹ“ لاہور کے نامہ نگار کی اطلاع کے مطابق حکومت پنجاب

نے قادیان میں احرار کانفرنس کی تیاریوں کے پیش نظر قادیان کے گردو نواح میں دفعہ ۱۴۴ کے تحت مندرجہ ذیل احکام نافذ کیے۔

۱۔ کانفرنس میں شامل ہونے والے حضرات لاٹھیاں یا تیز دھار کی کوئی ایسی چیز لے کر شہر میں نہ پھریں۔

۲۔ کانفرنس کے دوران قادیانی اپنا کوئی اجتماع منعقد نہ کریں۔ جس سے فساد کا خطرہ ہو۔ اگر ایسا ہوا تو وہ خلافِ قانون تصور ہوگا۔

۳۔ اسی طرح احرار کو بھی انتباہ کر دیا گیا کہ وہ اپنے ساتھ کوئی ہتھیار یا لاٹھی وغیرہ نہ لائیں۔

۴۔ کانفرنس کے منتخب صدر کے جلوس کی اجازت بھی نہیں دی گئی۔

۵۔ مرزا بشیر الدین محمود کو نوٹس کے ذریعے کہا گیا کہ وہ باہر سے قادیانی نہ منگوائے۔

احرار کانفرنس شہر سے ایک میل باہر ڈی۔ اے۔ وی ہائی سکول کے احاطہ اور گراؤنڈ میں ہوگی چار سو سے زائد پولیس کی نفری قادیان میں پہنچ چکی ہے۔ مزید ایک دو دنوں میں پہنچا دی جائیگی۔
اپنے طور پر انتظام کے لیے انسپکٹر جنرل پولیس اپنے دیگر عملے کے ساتھ قادیان پہنچا اور اس نے حالات کا معائنہ کیا۔

۲۰ اکتوبر کی اطلاع ہے کہ اس وقت تک سینکڑوں کی تعداد میں احرار رضا کار کانفرنس میں شمولیت کے لیے قادیان پہنچ چکے ہیں۔ ان کی سرخ وردیاں عجیب بہار دکھا رہی ہیں۔ پولیس کے عملہ، مجسٹریٹ اور دوسرے اعلیٰ افسروں نے کانفرنس کے پنڈال کے قریب ڈیرہ جما لیا ہے۔ کانفرنس کے لیے بازار لگ رہا ہے اور دکانیں بنائی جا رہی ہیں۔

ان حالات کے پیش نظر ریلوے حکام نے اعلان کیا کہ لدھیانہ اور لاہور سے خاص گاڑیاں قادیان کانفرنس میں شامل ہونے والے عوام کی سہولت کے لیے چلائی جائیں گی۔ یہ گاڑیاں امرتسر ریلوے اسٹیشن تک کے لیے ہوں گی۔ یہاں سے ۲۱ اکتوبر صبح گیارہ بجے سپیشل ٹرین چلے گی جو تمام مسافروں کو لے کر براستہ بٹالہ قادیان ریلوے اسٹیشن پر پہنچے گی۔

چنانچہ پشاور سے گوجرانوالہ تک کے لوگ لاہور سے سوار ہوئے۔ دہلی کے لوگ لدھیانہ ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ جہاں سے وہ امرتسر پہنچے۔ اس طرح تقریباً چالیس ڈبوں پر مشتمل

احرار سپیشل ٹرین ۲۱۔اکتوبر صبح گیارہ بجے امرتسر اسٹیشن سے روانہ ہوئی۔ اس میں کانفرنس کے منتخب صدر امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور ہزاروں سرخپوش احرار رضا کار سوار تھے۔ ٹرین کے دونوں جانب انجن تک احرار کے سرخ پرچم لہرا رہے تھے۔ احرار پرچم کی اڑانوں نے قادیانیوں کے چہروں کی رنگت اڑادی تھی۔ قصرِ خلافت کے مینار ایڑیوں کے بل اچھل اچھل کر احرار سپیشل ٹرین کا نظارہ کر رہے تھے۔ قادیان کا سومنات احرار غزنوی کے قدموں میں ڈھیر ہو رہا تھا۔ قادیان کے مسلمان، سکھ اور ہندو اس دن کو یوم نجات کہہ کر خوشی منا رہے تھے۔

کفر اپنی تمام حشر سامانیوں کے باوجود لرزہ براندام تھا کہ ٹھیک ڈیڑھ بجے احرار سپیشل ٹرین

امیر شریعت قادیان ریلوے اسٹیشن پر
مولانا عبدالکریم مباہلہ مولانا لال حسین اختر عبدالرحیم عاجز
نمایاں دکھائی دے رہے ہیں
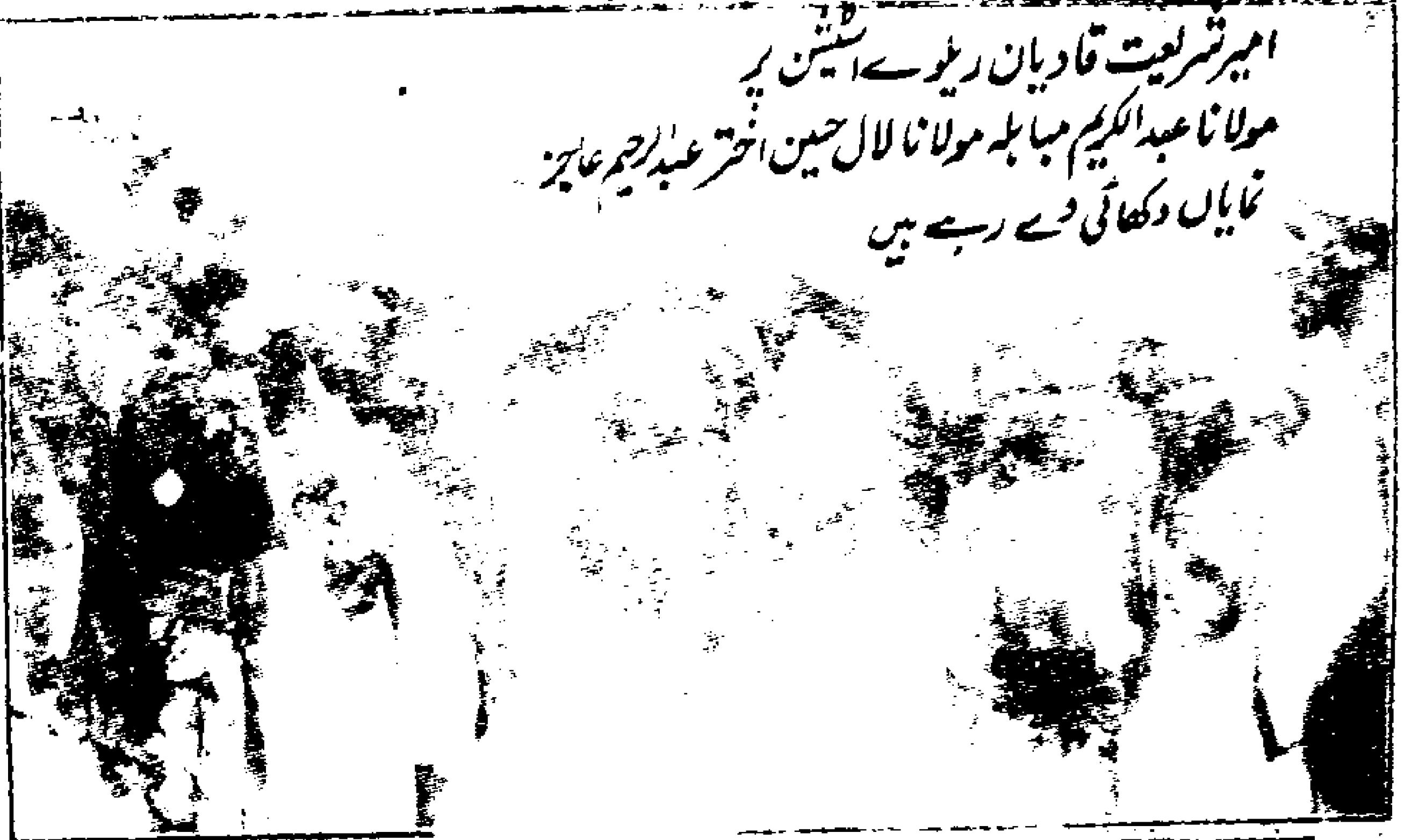
امیر شریعت رضا کاروں کے جلاؤ میں
پنڈال کی طرف جا رہے ہیں۔

احرار قادیان کانفرنس

احرار رضا کار
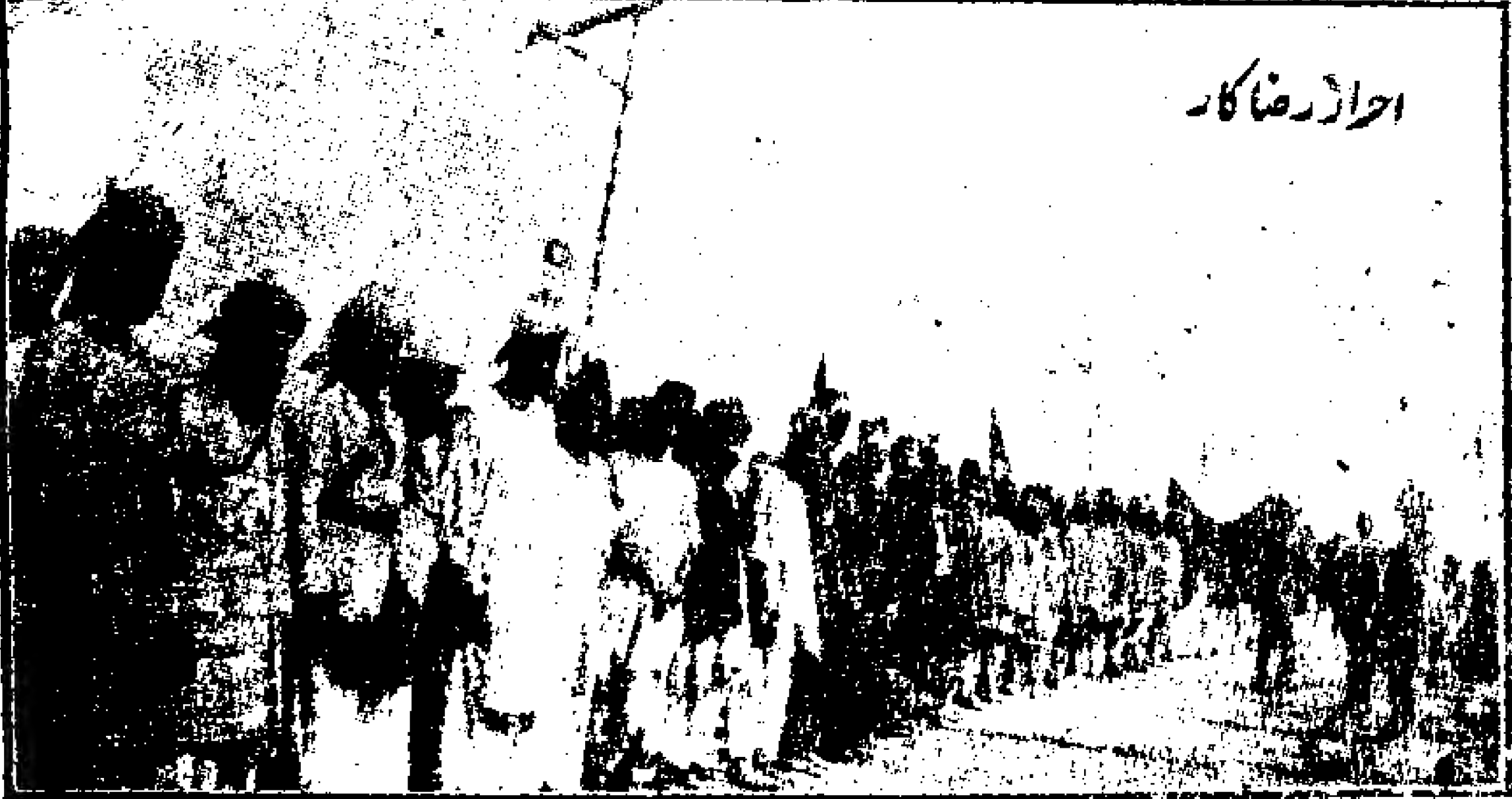
ریلوے ٹرین کا ایک منظر قادیان روانگی سے
امرتسر ریلوے اسٹیشن پر

قادیان ریلوے اسٹیشن پر پہنچی۔ رضاکاروں کے علاوہ سینکڑوں انسانوں کا سمندر امیر شریعت کے استقبال کے لیے اُمڈ آیا۔ دیہاتی اور شہری عوام نے صدر کانفرنس کو اپنے جلوس میں لے لیا۔ مولانا عبدالکریم مباہلہ جن کے مکان ۱۹۳۰ء میں جلا دیے گئے تھے اور وہ خاندان سمیت قادیان سے ہجرت پر مجبور ہو گئے تھے، جب امیر شریعت کی راہنمائی میں قادیان کی طرف رواں ہوئے تو یوں لگتا جیسے کوئی فاتح، مفتوح کے ملک میں داخل ہو رہا ہے۔ اسٹیشن سے کانفرنس کے پنڈال تک دو میل کا راستہ احرار رضاکاروں کے چاق و چوبند دستوں میں عجب رونق دے رہا تھا۔

۱۹۲۵ء میں پہلی مرتبہ جب امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور بشیرالدین محمود کا امرتسر میں آمنا سامنا ہوا تھا، تو کفر اس دن بھی شکست کھا گیا تھا۔ اور آج نو سال کے بعد حق و باطل میں پھر معرکہ آرائی ہو رہی ہے۔

قافلہ سالار، افواجِ ایمان کے ساتھ قادیان کے لات و ہبل پر حملہ آور ہیں۔ نمازِ ظہر پنڈال میں ادا کی گئی۔

دیگر مہمانوں کے علاوہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی (دیوبند) مفتی کفایت اللہ (دہلی) مولانا ثناء اللہ (امرتسر) مولانا ظفر علیخاں (لاہور) حکیم نورالدین (لائلپور) مولانا ابوالوفا شاہجہانپوری مولانا عبدالرحیم پوپلزئی (مفتی سرحد) مولانا احمد علی لاہوری قابل ذکر ہیں۔

پنڈال سے باہر مٹھائی کی دکانیں، کھانے کے ہوٹل اور موسم کی دوسری اشیاء موجود تھیں۔

کانفرنس کا پہلا اجلاس نمازِ عشا کے بعد شروع ہوا۔ صدارت کی تحریک مولانا حبیب الرحمٰن نے کی۔ ان کی تائید میں بہت سی تقریریں ہوئیں۔ ازاں بعد حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے کرسی صدارت سنبھالی۔ قرآن کریم کی تلاوت کے بعد راقم (جانباز مرزا) اور خواجہ عبدالرحیم عاجز نے اپنے کلام سے موسم سرما میں گرمی کی سی حدت پیدا کر دی۔ آسمانوں کے ستارے زہرہ اور مشتری کو ساتھ لیے رات کے اندھیرے میں منہ چھپائے منتظر تھے۔ بھیگی ہوئی رات کا دامن کانفرنس کے مہمانوں کو اپنی پناہ دیے ہوئے سکڑ رہا تھا۔ پنڈال میں روشن چراغ اپنی لَو دور تک دیکھ رہے تھے کہ قصرِ باطل کی ایک ایک اینٹ میں سینکڑوں دراڑ آ چکے ہیں۔ صدر کانفرنس نے اپنا خطبہ شروع کیا۔ انسانوں کے دل گوش بر آواز ہو گئے یکایک

جاگ اٹھیں۔انسان سوچ و فکر میں ڈوب گئے۔فضا ساکت ہو گئی کہ بخاری بول رہا ہے۔
رات یوں ہی بیت گئی۔صبح صادق نمودار ہوئی۔ستارے جمائیاں لینے لگے۔کہ دور
سے موذن نے پکارا۔اللہ اکبر۔اللہ اکبر

(عبد الکریم مباہلہ کا وہ مکان جسے ۱۹۳۰ء میں مرزائیوں نے جلا دیا تھا)

رات گیارہ بجے سے صبح چار بجے تک اس پنڈال میں شاہ جی نے کیا کہا۔(یہ پوری تقریر
مصنف کی دوسری کتاب حیات امیر شریعت میں شائع ہو چکی ہے۔)
کانفرنس کے آخری اجلاس ۲۳۔اکتوبر ۱۹۳۴ء میں حسب ذیل قراردادیں منظور ہوئیں۔
قرارداد نمبر ا۔چونکہ مرزا غلام احمد قادیانی نے صاف الفاظ میں یہ اعلان کیا ہے کہ جو شخص
مجھے نبی تسلیم نہ کرے،وہ اسلام سے خارج ہے۔اور تمام دنیائے اسلام کے
علماء مرزا غلام احمد قادیانی کو اس کے دعویٰ نبوت اور دیگر دعاوی و عقاید کفریہ
کی بنا پر اسلام سے خارج اور مرتد سمجھتے ہیں اس لیے یہ کانفرنس حکومت سے

مطالبہ کرتی ہے کہ تمام مرزائیوں کو مردم شماری میں مسلمانوں سے الگ کر دیا جائے۔
(محرک) مولانا ظفر علیخاں

(موئید) مولانا ابوالوفا شاہجہانپوری۔ مولانا محمد مسعود ایڈیٹر۔ مولانا محمد مسلم فاضل دیوبند۔

قرارداد نمبر ۲۔ "چوہدری ظفر اللہ خاں کے تقرر کے خلاف احتجاج"

تبلیغ کانفرنس کا یہ نمائندہ اجلاس آٹھ کروڑ مسلمانان ہند کے مسلسل احتجاج کے باوجود ظفر اللہ خاں قادیانی کو جو اپنے عقیدے کی رو سے، تمام مسلمانوں کو کافر سمجھتا ہے اور جس کو تمام مسلمان قادیانی عقائد کی وجہ سے کافر اور دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔ وائسرائے کی مجلس منتظمہ میں اسلام کے نام پر رکن مقرر کیے جانے کو انتہائی رنج اور نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔

اس کانفرنس کی رائے میں حکومت نے متفقہ صدائے انتباہ کو جو مسلسل دو ماہ سے بلند ہو رہی ہے، ٹھکرا کر ثابت کر دیا ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات و احساسات سے بے اعتنائی حکومت کا شیوہ ہو گیا ہے اور وہ مسلمانوں کو مجبور کر رہی ہے کہ وہ یہ اعلان کر دیں کہ حکومت اپنے سیاسی مسلک کی تکمیل کے لیے قادیانیت کو فروغ دے رہی ہے اور قادیانی عقاید کو اپنی قوت سے مسلمانوں کا سرکاری مذہب بنانا چاہتی ہے۔ جس کو مسلمانوں کی تمام مذہبی جماعتیں اسلام کے لیے ایک ہولناک خطرہ تصور کرتی ہیں۔

مسلمانان ہند کا یہ اجتماع اپنے اس عزم بالجزم کا اعلان کرتا ہے کہ جب تک حکومت چوہدری ظفر اللہ خاں کے تقرر کو منسوخ کر کے اپنی قادیانیت نواز پالیسی میں تبدیلی نہیں کرتی، مسلمانان ہند اپنے احتجاج کے سلسلہ کو برابر جاری رکھیں گے۔

اس کانفرنس کی رائے میں حکومت کے اس فیصلہ میں کہ وائسرائے کی "مجلس منتظمہ" میں مسلمانانِ ہند کے شدید احتجاج کے باوجود چوہدری ظفر اللہ خاں کو مقرر کیا جائے، سر فضل حسین کے مشورہ اور مساعی کو بہت بڑا دخل ہے۔ جو اسلام

کے ساتھ کھلی ہوئی غداری ہے۔ یہ کانفرنس سر فضل حسین کے اس فعل کو نہایت نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے اور اس کے خلاف اپنے عدم اعتماد کا اظہار کرتی ہے"۔

(محرک) مولانا حسین احمد مدنی مدرس دارالعلوم دیوبند۔

(موئیدین) مولانا پیر محمد مظہر قیوم سجادہ نشین۔ مکان شریف۔ ضلع گورداسپور۔ مولانا ظہور الحق شاہ۔ کرنال۔ گورداسپور۔ مولانا حکیم نورالدین لائلپوری۔ مولانا ظہور احمد بگوی۔ مولانا محمد بخش خطیب جامع مسجد راولپنڈی۔ چوہدری عبدالرحمٰن ایم۔ ایل۔ سی۔ راہوں۔

(روزنامہ "زمیندار" لاہور۔ ۲۴۔ اکتوبر ۱۹۳۴ء)

(مولانا عبدالکریم مباہلہ ایڈیٹر ہفت روزہ "مباہلہ"

(فتنہ مرزائیت کی سرزمین قادیان میں مجلس احرار کا روح پرور پنڈال)

کفر ویسے بھی بزدل ہوتا ہے۔ تاہم قانونی پابندیوں کے باعث کانفرنس کے دنوں کسی قادیانی کو گھر سے باہر نکلنے کی جرأت نہ ہوئی اور نہ اجازت تھی۔ ان دنوں تمام قادیان ویران دکھائی دیتا تھا۔ مرزائیوں کی بڑھتی ہوئی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے حکومت خود پریشان تھی۔ بنابریں قادیان میں کانفرنس کی اجازت دینے میں حکومت نے کوئی خاص پابندی نہیں لگائی احرار اس موقعہ کو غنیمت جان کر گنر پر چڑھ دوڑے۔

اس کانفرنس کے بعد قادیانیوں اور مسلمانوں کے درمیان ایک لمبی لکیر کھینچ گئی اور اس طرح احرار کا قادیانیوں پر یہ پہلا بھرپور حملہ تھا۔

سانپ اگر ایک دفعہ زخم کھا جائے تو پھر چیونٹیاں بھی اسے چین نہیں لینے دیتیں۔ یہاں تک کہ اس کا اپنا زہر ہی اس کی موت کا سبب بن جاتا ہے۔

مجلس احرار سے چوٹ کھا کر مرزا بشیر الدین محمود نے زخمی سانپ کی طرح اپنے زخم چاٹتے ہوئے کہا:

"پس جب تک ان افسران کو جنہوں نے ہم پر ظلم کئے ہیں انہیں سزا نہیں

دی جاتی یا وہ معافی نہیں مانگ لیتے۔ ہماری حکومت سے صلح نہیں ہو سکتی۔

میں نے کانگریس کی تحریک کو خوب غور سے دیکھا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ کانگریس ایک ایسی سکیم تیار کر رہی ہے جس سے گو بظاہر یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ میدان سے ہٹ گئی ہے۔ مگر عنقریب وہ گورنمنٹ (برطانیہ) کو ایسی مشکلات میں ڈال دے گی جس سے پھر اسے وفاداروں کی ضرورت محسوس ہوگی اور ہم پھر اپنے جھگڑے کو ایک طرف رکھ کر اس کی مدد کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ مگر حکومت نے (قادیان میں احرار کانفرنس) کی اجازت دے کر ہمیں سبق دیا ہے کہ اس سے سودا کیے بغیر تعلق نہیں رکھنا چاہیے۔ ہم خود بھی آئندہ حکومت سے سودا کریں گے اور دوسروں کو بھی سودا کا سبق پڑھائیں گے۔

سوائے اس صورت کے کہ حکومت کی طرف سے ہم پر جو ظلم ہوا ہے۔ اسے دور کر دے اب ہمارے تعلقات پہلے کی طرح ہو جائیں گے۔ لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو ہماری مدد سودا کرنے کے بعد ہوگی۔ اور ہم اپنی خدمات کا معاوضہ طلب کریں گے اور اس جھگڑے کے خاتمے پر پھر اپنی ہتک کا سوال گورنمنٹ کے سامنے رکھیں گے اور اس سے مطالبہ کریں گے کہ وہ ہمارے ہتک کا ازالہ کرے اور یہ جھگڑا اس وقت تک جاری رہے گا، جب تک گورنمنٹ سے اپنا حق نہ لے لیں گے۔

(مرزا محمود۔ اخبار "الفضل" ۲۱۔ نومبر ۱۹۳۴ء)

مرزائی لیڈر کو یہ باتیں کہنے کا حق پہنچتا ہے۔ کیونکہ ۱۸۵۷ء سے تا آن اس گروہ نے اسلام اور ہندوستان سے غداری کرتے ہوئے انگریز کی جو خدمات انجام دیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ قادیان میں ان کی بادشاہت قائم کر دی جاتی۔ الٹا احرار کے ہاتھوں اس گروہ کی گوشمالی کرا دی۔ لیکن وہ بھی فرنگی تھا۔ خوب جانتا تھا کہ غدار بہرحال غدار ہے۔ اگر یہ اپنے ملک اور مذہب کے نہیں بنے تو ہمارے کب ہو سکتے ہیں

کانگریس ہائی کمان میں تبدیلی

احرار رہنما قادیان کانفرنس سے فارغ ہوئے تو اخبارات میں دو نئی خبریں دیکھنے میں آئیں۔ اول یہ کہ مسٹر محمد علی جناح بمبئی کی شہری سیٹ سے بلا مقابلہ سنٹرل اسمبلی کیلئے کامیاب ہو گئے (خود ہنوز لندن میں تھے)

دوسری خبر یہ تھی کہ گاندھی جی کانگریس سے علیحدہ ہو گئے ہیں۔ انہوں نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کے روبرو بیان دیتے ہوئے ۲۲۔اکتوبر ۱۹۳۴ء کو کہا:

"ہندوستان کے لیے کامل سوراج کے حصول اور سول نافرمانی کے لیے میرے نزدیک جن ذرائع کی ضرورت ہے وہ آپ کے نزدیک ضروری نہیں۔ مثلاً آپ اس بات کو اچھی طرح باور نہیں کرتے کہ چرخہ کاتنے سے اس طاقت میں کس طرح اضافہ ہوگا جو حصولِ سوراج کے لیے ضروری ہے۔

میں ان مسائل پر بحث کرنا نہیں چاہتا۔ لہٰذا کانگریس سے علیحدہ ہوتا ہوں۔ اس لیے نہیں کہ میں تھک گیا ہوں یا مایوس ہو چکا ہوں۔ بلکہ اس لیے علیحدہ ہو رہا ہوں تاکہ میں دیکھ سکوں کہ میری علیحدگی کے بعد میری اور آپ کی پوزیشن کیا ہے؟ اس سے میری مراد یہ نہیں کہ میں کوئی نئی پارٹی بنانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ چھیاسٹھ سال کی عمر میں اب میں یہ کام کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔"

کانگریس میں غیر سیاسی عناصر کی آمد نے مہاتما گاندھی کے سیاسی اور عدم تشدد کی پالیسی کو سخت متاثر کیا تھا۔ مہاسبھائی ذہن نے بھی کانگریس کو نقصان پہنچایا۔ سوشلسٹ پارٹی نے کانگریس میں شامل ہو کر اسے اپنی ڈگر پر چلانا چاہا۔ کمیونسٹ الگ کمین گاہوں سے اس پر وار کر رہے تھے۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے گاندھی جی نے ہر کانگریسی پر یہ شرط عائد کی کہ روزانہ ایک ہزار گز سوت کات کر اپنے صحیح کانگریسی ہونے کا ثبوت دے۔ آخر الذکر گروہ گاندھی جی کی عدم تشدد پالیسی سے پہلے ہی بیزار تھا۔ اس پر ہزار گز سوت کاتنے کی پابندی مزید گراں گذری جس سے کانگریس ہائی کمان میں گاندھی جی کے خلاف بغاوت کے آثار ابھرنے لگے۔ لہٰذا انہوں نے ہوا کا رخ دیکھ کر کانگریس سے علیحدگی بہتر سمجھی

آئندہ چل کر ایکٹ ۱۹۲۵ء کے تحت ملک میں نئے انتخاب بھی ہو رہے تھے۔ لیکن گاندھی جی اس پر بھی آمادہ نہیں تھے۔ اگر تھے تو با دلِ نخواستہ۔

آخر ۲۶ سے ۲۸۔اکتوبر (۱۹۳۴ء) تک بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا سالانہ اجلاس ہوا۔ لیکن اس اکھاڑے میں گاندھی جی کی غیر موجودگی سے یہ اجلاس نہایت بے رونق سمجھا گیا۔

تاہم اس اجلاس میں ورکنگ کمیٹی نے چند اہم تبدیلیاں کیں۔
"مہاتما گاندھی کی جگہ راجہ راجگوپال اچاریہ کو لیا گیا۔ پنجاب سے ڈاکٹر محمد عالم کی جگہ خاں عبدالغفار خاں کو منتخب کیا گیا۔
بنگال کے ڈاکٹر جے۔ ایم۔ سین گپتا کی بجائے۔ ڈاکٹر بیدھان چندر رائے کو چنا گیا۔
اسی اجلاس میں کانگریس کے آئندہ صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد مقرر ہوئے "

تحریک کپور تھلہ

مہاراجہ کپور تھلہ ہنوز پیرس میں تھے اور تحریک کے رہنما چودھری عبدالعزیز کپور تھلہ سنٹرل جیل میں۔ انہی دنوں ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۴ء کو سکھ لیڈر بابا کھڑک سنگھ نے ہندو سکھ کانفرنس میں تقریر کے دوران کہا:
"ریاست میں مخلوط انتخاب سے یہاں کی اقلیتوں کو سخت نقصان پہنچے گا کیونکہ یہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے "
اس کانفرنس میں قرارداد کے ذریعے سلطان پور کے حادثہ کی تحقیقات کو غیر جانبدارانہ قرار دے کر
"میجر کوٹھے والا اور کپتان روپ سنگھ کی حمایت کی گئی۔ نیز ان کی تمام کارروائی کو جو انہوں نے سلطان پور میں (مسلمانوں پر گولی چلا کر) کی تھی جائز قرار دیا گیا "
حالانکہ ریاست کی اپنی مقرر کردہ سرکاری تحقیقاتی کمیٹی میجر کوٹھے والا اور سردار روپ سنگھ کو مجرم قرار دے چکی تھی۔
اس تاریخ کو اخبارات میں فرمانروائے کپور تھلہ کی پیرس سے واپسی کی اطلاع شائع ہوئی۔ اس پر مولانا حبیب الرحمٰن صدر آل انڈیا مجلس احرار نے ۴ نومبر کو بمبئی میں مہاراجہ کے سیکرٹری کو برقی پیغام بھیجا کہ،
"مہاراجہ دہلی پہنچنے پر مجھے ملاقات کی اجازت اور وقت دے کر تار کے ذریعہ مطلع کریں "
مہاراجہ کے وزیر خارجہ کے سیکرٹری نے مولانا حبیب الرحمٰن کو اطلاع دی کہ:

"مہاراجہ صاحب ۵۔نومبر کو پیرس سے بمبئی پہنچیں گے اور ۹۔نومبر کو دہلی پہنچ جائیں گے۔چونکہ دہلی میں ان کا قیام مختصر ہوگا لہٰذا وہ کپور تھلہ پہنچ کر آپ کو ملاقات کی اطلاع دیں گے۔"

کانگریس اور ریاستیں

احرار اور مہاراجہ کپور تھلہ کے درمیان ملاقات کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ ۷۔نومبر ۱۹۳۴ء کو آل انڈیا کانگریس کے منتخب صدر بابو راجندر پرشاد نے ہندوستانی ریاستوں سے متعلق کانگریس کی پالیسی کا واضح اعلان کرتے ہوئے کہا

"ہندوستانی ریاستوں کے سلسلے میں کانگریس کی پالیسی کے متعلق سوال کیا جا رہا ہے۔چنانچہ اس ضمن میں گذارش ہے کہ کانگریس ۱۹۲۸ء میں کلکتہ کے اجلاس میں یہ واضح کر چکی ہے یعنی:

کانگریس والیان ریاستہائے ہند سے درخواست کرتی ہے کہ وہ ریاستوں میں نمائندہ ادارت کے ذریعہ ذمہ دار حکومت قائم کریں اور فوری اس کے متعلق اعلان کریں۔نیز ریاست میں ایسے قوانین نافذ کریں جو شہریت کے ابتدائی حقوق، مثلاً اجتماعی آزادی، تحریر و تقریر کی آزادی اور حفاظتِ مال و جان ہونی چاہیے۔

کانگریس، ریاستوں کے باشندوں کو یقین دلاتی ہے کہ کامل آزادی اور ذمہ دار حکومت کے حصول میں ان سے پر امن اور جائز جدوجہد میں پوری ہمدردی رکھتی ہے اور انہیں حمایت کا یقین دلاتی ہے۔

احرار پر ابتلاء کا آغاز

سیاسی زندگی میں سانس لینا کانٹوں پر سفر کرنے کے برابر ہے یہ سنگلاخ راستہ مصائب و آلام کی کئی پگڈنڈیوں سے ہو کر گزرتا ہے۔آبلہ پائی کے ساتھ دل و دماغ بھی لہولہان ہو جاتے ہیں۔وقت اور بخت ہمنوا ہوں تو دوسری بات ہے ورنہ پت جھڑ کے موسم کی طرح اپنے بھی پرائی نظروں سے دیکھنے میں تساہل نہیں کرتے۔سیاسی جماعتوں کا مزاج بھی اسی مٹی سے پروان چڑھتا ہے۔دلوں کا یہ کھیل تماشہ اگر معصوم بچے کی طرح پسندیدہ نہ ہو تو اس کی عمر بھی مختصر ہوتی ہے۔

مجلس احرار جن طور و اطوار سے گذرتی چلی آرہی ہے، مستقبل اس کی پذیرائی کے راستے سنوار رہا ہے۔ حالات پھولوں کے گجرے لیے واقعات کی قطاریں آگے بڑھ رہے ہیں لیکن دزدیدہ نگاہیں بھی غافل نہیں کہ بوریہ نشینوں کا یہ قافلہ صحراؤں سے اٹھ کر صحنِ گلستان پر قبضہ جمانے کی دوڑ میں مصروف ہے۔ ہوسکتا ہے آنے والے کل کی بہاریں ان کے قدم لیں لہٰذا بادِ سموم سے کہوا ان کا راستہ روک لے۔ پہاڑ ان کے راہوں کی دیواریں بن جائیں سمندروں کے پانی اچھل کر طوفان بپا کر دیں تاکہ ہُدیٰ خوانوں کا یہ قافلہ بے راہرو ہو جائے۔ راستہ کھو جانا اور بات ہے۔ مگر راستے کا چھوڑ دینا الگ چیز ہے۔ جن مسافروں نے بادِ سموم کی آندھیوں سے خوف کھا کر اپنا راستہ بدل لیا وہ نہ منزل پر پہنچ سکے اور نہ منزل ان کے قریب آئی۔ البتہ وہ لوگ مر کر بھی کامیاب و کامران نکلے جنہوں نے خزاں میں کانٹوں سے پیار کیا اور بہار کے ان پھولوں سے نفرت کی جن کی پتیوں میں وفا کی بو نہیں تھی۔

یکم نومبر ۴۶ء کو ہندوستان کے جنرل الیکشن شروع ہوئے۔ اسی روز مجلس احرار کے امیدوار مسٹر خالد لطیف گابا کے لاہور میں ووٹ پڑنے تھے۔ باغبانپورہ کے پولنگ اسٹیشن پر بیگم شاہنواز، خان بہادر رحیم بخش کے حق میں اپنا ووٹ استعمال کرنے آئیں تو انہوں نے برقعہ اوڑھ رکھا تھا۔ اس پر احرار کارکنوں نے اعتراض اٹھایا کہ یہ بیگم صاحبہ نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ ہمیشہ بے پردہ رہی ہیں۔ لہٰذا ہمیں شبہ ہے کہ کوئی دوسری عورت ان کی جگہ ووٹ ڈالنے آئی ہے۔ اس پر فریقین میں ہنگامہ ہو گیا۔

حقیقت یہی ہے کہ بیگم شاہنواز شاہی دربار سے عوامی اجتماعات تک ہمیشہ ساڑھی باندھے یا کبھی کبھار دوپٹہ اوڑھے شریک ہونے کی عادی تھیں۔ بڑے گھرانے کی عورت تھیں یہ لباس ان کی روزمرہ زندگی میں شامل تھا جبکہ ان کے والد محترم سر میاں محمد شفیع نئی اصلاحات کے ضمن میں کسی حد تک انتہا پسند ہو گئے تھے اور انہوں نے گھر کی خواتین کا رائج الوقت پردہ کی روایات سے آزاد ہونا پسند کیا تھا۔ (نوائے وقت ۱۰۔جنوری ۱۹۷۶ء) لیکن انتخاب کے موقعہ پر ایسی کون سی وجہ تھی کہ وہ برقعہ اوڑھ کر آئیں۔ بنا بریں باغبانپورہ کے احرار کارکنوں کا اعتراض غلط نہیں تھا۔ لیکن یار لوگوں نے اس حقیقت کو ایسا فسانہ بنایا کہ ۱۵۔نومبر

کے روزنامہ "انقلاب" لاہور نے حسب ذیل ادارتی نوٹ کے ساتھ ایک تجویز پیش کر دی:

• کیا احرار کے لیے یہ چیز باعثِ فخر ہے، کہ ان کے حلقے میں ایسے ایسے لوگ موجود ہوں، جن کی زبان درازی شرفاء کے لیے باعثِ شرم ہو؟

ہم جو کچھ عرض کر رہے ہیں اس لیے نہیں کہ احرار کی مخالفت کے لیے کوئی نیا میدان آراستہ کیا جائے بلکہ اس کی غرض یہ ہے کہ ہم احرار کے اس فعل کو ملت کے نقطۂ نظر کے تحت افسوسناک سمجھتے ہیں۔

نوٹ: قارئین انڈر لائن عبارت کو ذہن میں رکھیں۔

خالد لطیف گابا کی کامیابی

۱۵- نومبر کو حکومت نے اعلان کیا کہ اسمبلی کے انتخاب میں خان بہادر حاجی رحیم بخش کے مقابل خالد لطیف گابا نو سو ستانوے ووٹ زیادہ لے کر کامیاب ہو گئے ہیں۔

خالد لطیف گابا کی کامیابی کے بعد مجلس احرار کی پارلیمانی حیثیت حسب ذیل ہے۔

• سنٹرل اسمبلی میں مولانا محمد احمد کاظمی ایڈووکیٹ الٰہ آباد ہائیکورٹ (یوپی)۔
• مسٹر خالد لطیف گابا بیرسٹر ہائیکورٹ لاہور (پنجاب)۔

پنجاب کونسل میں۔

• چودھری افضل حق (ہوشیارپور)۔
• چودھری عبدالرحمٰن راہوں والے ضلع ہوشیارپور۔
• مولانا مظہر علی اظہر۔ لاہور۔

وزیر اعظم کپورتھلہ کی علیحدگی

مہاراجہ کپورتھلہ نے پیرس سے واپسی پر ۲۰ نومبر ۱۹۳۶ء کو حسب ذیل اعلان جاری کیا۔

"میرے یورپ جانے سے قبل میرے وزیر اعظم سر عبدالحمید نے خواہش کی تھی کہ وہ ریاستی ذمہ داریوں سے علیحدہ ہو جائیں۔ لیکن میرے کہنے پر انہوں نے میری غیر حاضری میں بہر طور کام کو نبھایا۔ اب پھر انہوں نے اپنی درخواست کا اعادہ کیا اور نہایت مخلصانہ طور پر التجا کی کہ میں ان کی اس درخواست کو قبول کروں۔ میں

نہایت رنج اور افسوس سے ان کی یہ درخواست قبول کرتا ہوں۔

سر موصوف نے بیس سال تک میری اور میری ریاست کی نہایت اخلاص سے خدمت کی اور وفادار رہے۔ اس کے لیے ان کا بے حد مشکور ہوں۔ ان کی علیحدگی میرے لیے رنج کا باعث ہے۔

اصولی طور پر یہ آئینی تبدیلی جنوری ۱۹۳۵ء کے آغاز میں عمل میں آجائے گی۔

دوسرا اعلان در ریاست میں نظم و نسق اور بحالی امن و قانون کی خاطر میں سیاسی نوعیت کے تمام جلوسوں اور جلسوں کی مخالفت کا اعلان کرتا ہوں صرف انہیں جلسوں اور جلوسوں کی اجازت دی جائے گی جو سراسر مذہبی حیثیت رکھتے ہوں۔ ان احکام کی خلاف ورزی کی صورت میں انسپکٹر جنرل پولیس خلاف ورزی کرنے والے لوگوں سے مناسب اور ضروری کارروائی کرے گا۔

جنرل انتخاب کے نتائج ۲۸۔ نومبر ۱۹۳۴ء کے حالیہ انتخابات کے نتائج مختلف انداز میں پیش کیے۔

۱۔ جمعیتہ علمائے ہند دہلی ———— ″ ″

۲۔ مجلس احرار ———— ۲ نشست

۳۔ بہار کی امارۃ شرعیہ ———— ″ ″

۴۔ یوپی یونیٹی بورڈ ———— ۲ نشست

۵۔ مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس د مشترک پارلیمانی بورڈ نے اسی فیصد کامیابی حاصل کی۔ کل تیس مسلم نشستیں اور بیس کامیاب ہوئے۔

۶۔ کانگریس کو غیر مسلموں میں خاصی کامیابی حاصل ہوئی۔ کل تعداد ایک سو پینتالیس حاصل شدہ سالم

۷۔ پنڈت مالویہ کی نیشلسٹ پارٹی نے بارہ نشستیں حاصل کیں۔

سیکرٹری مسلم لیگ نوابزادہ خورشید علی کا تفصیلی بیان ———— کل تیس مسلم نشستوں کے لیے مسلم نمائندوں کو ٹکٹ دیے گئے تھے، جس میں بیس کامیاب ہوئے۔

۱۔ مسٹر محمد علی جناح۔ ۲۔ سیٹھ عبداللہ ہارون۔ ۳۔ مسٹر شاہنواز بھٹو۔ ۴۔ سر غلام حسین ہدایت اللہ

۵۔غلام بھیک نیرنگ ۔۶۔سید راجن شاہ ۔۷۔سر مہر شاہ ۔۸۔حافظ محمد عبداللہ ۔۹۔شیخ فضل حق پراچہ
۱۰۔مولوی سر محمد یعقوب ۔۱۱۔ڈاکٹر ضیاء الدین احمد ۔۱۲۔مسٹر اے ایچ غزنوی ۔۱۳۔مسٹر اے کے فضل حق
۱۴۔سر عبداللہ سہروردی ۔۱۵۔مولوی شفیع داؤدی ۔۱۶۔سر عبدالقیوم وغیرہ ۔

جائنٹ سیلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ

اسمبلی کے ان نتائج سے پیشتر ۲۲۔نومبر کے اخبارات میں جائنٹ سیلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ کا مختصر خاکہ پیش کیا گیا۔لیکن ہنوز اس پر لندن برطانوی پارلیمنٹ میں وزیر اعظم مسٹر رمزلے میکڈانلڈ اور ٹوڈی پارٹی کے لیڈر مسٹر چرچل کے درمیان کافی بحث چل رہی تھی ۔اپوزیشن کا دعویٰ تھا کہ موجودہ سکیم کے تحت ہندوستان کو بہت زیادہ حقوق دے دیئے گئے ہیں ۔مگر کانگریس اس پر بھی مطمئن نہیں اور حالیہ الیکشن میں اس کی کامیابی اس کی مخالفت کی بناء پر ہے۔اس بحث کے دوران جوائنٹ سیلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ منظر عام پر آگئی ۔

۱۔مرکز اور صوبہ جات میں اختیار کی تقسیم وائٹ پیپر کی سفارشات کے مطابق رہیں گی ۔
۲۔باقی اختیارات گورنر جنرل کے پاس ہوں گے۔
۳۔سندھ اور اڑیسہ علیحدہ صوبے بنائے جائیں گے ۔
۴۔صوبوں میں دوعملی کی تنسیخ ۔
۵۔غیر مشروط اکثریت گورنر کے راستے میں حائل نہیں ہوگی ۔
۶۔مالیات اور قانون سازی میں گورنر کے خاص اختیارات ہوں گے ۔
۷۔قانون دان وزراء کی تحویل میں رہیں گے لیکن پولیس اور خفیہ پولیس کے متعلق گورنر کو خاص اختیارات ہوں گے ۔
۸۔ووٹروں کی تعداد ستر لاکھ سے بڑھا کر ساڑھے تین کروڑ کر دی گئی ۔
۹۔فرقہ وارانہ فیصلے اور پونا پیکٹ میں تبدیلی نہیں ہوگی ۔
۱۰۔فیڈریشن کے قیام کے لیے ریاستوں کی کل آبادی سے کم از کم نصف حصے کا شمول ضروری ہے ۔
۱۱۔گورنر جنرل زیادہ سے زیادہ تین مشیروں کی امداد سے شعبہ جات فوج ،معاملات خارجہ ،مذہبی معاملات اور برطانوی بلوچستان کا انتظام کریں گے (خاص ذمہ داریاں ان کے علاوہ ہیں)

۱۲- فیڈرل مجلس قانون ساز میں بالواسطہ انتخاب۔

۱۳- فیڈرل کورٹ کا قیام۔

۱۴- برما کے متعلق وائٹ پیپر کی تجاویز سے متعلق اتفاق اور دستور کی ترتیب۔

۱۵- لیبر ارکان کا اختلافی نوٹ جو نہایت ضروری ہے۔

لندن پارلیمنٹ کے علاوہ مندرجہ بالا رپورٹ عالمی بحث کا موضوع بھی بنی۔ چنانچہ جن اخبارات نے اس پر ملے جلے جذبات کا اظہار کیا۔ ان کے نام حسب ذیل ہیں۔

لندن: ڈیلی ٹیلیگراف۔ لندن ٹائمز۔ نیوز کرانیکل۔ ڈیلی میل۔ فنانشل نیوز۔ فنانشل ٹائمز۔ مانچسٹر گارڈین۔

آئرلینڈ: آئرش ٹائمز۔

ہندوستانی پریس: لیڈر (الٰہ آباد) فارورڈ (کلکتہ) امرت بازار پتریکا۔ انند بازار پتریکا۔ ہندوستان ٹائمز۔ نیشنل کال۔ مدراس میل (مدراس) روزنامہ سن (برما)۔

اخبارات کے علاوہ جن مسلمان رہنماؤں نے اس رپورٹ کی حمایت کی۔

۱- ڈاکٹر سر محمد اقبال لاہور۔ ۲- عبداللہ یوسف علی بمبئی۔ ۳- مسٹر پیر بخش پشاور۔ ۴- مسٹر ایچ۔ اے۔ غزنوی کلکتہ۔ ۵- ڈاکٹر شفاعت احمد الٰہ آباد۔ ۶- سر سلطان احمد پٹنہ۔ ۷- سر ظفر اللہ (مرزائی) ۸- سر عبدالرحیم۔ ۹- سر عبدالقیوم۔

ہندو رہنما۔ ۱- ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور (شانتی نیکتن) ۲- سر تیج بہادر سپرو۔ ۳- بابو راجندر پرشاد صدر کانگریس کمیٹی۔ ۴- این۔ سی۔ کالکو (پونا) ۵- اچاریہ کرپالانی (سندھ)۔ ۶- سر شادی لال (سابق چیف جسٹس لاہور ہائیکورٹ۔ مسٹر ستیہ مورتی مدراس۔ سر کشور سنگھ پٹنہ۔

۲۵- نومبر کو برطانیہ کی پارلیمنٹ میں مندرجہ بالا رپورٹ کو ٹوڈی پارٹی نے بنیادی طور پر مسترد کر دیا۔

لندن میں خوف وہراس ہندوستان کے متعلق انگریز مطمئن تھا کہ اس نے قریباً ڈیڑھ صدی سے اپنے غلاموں کے درمیان منافرت کی جو تخم ریزی

کی ہے اس پودے کے برگ و بار اپنی بہار پر ہیں اور جوائنٹ سیلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ کا مسترد کر دینا اس یقین کا مزید ثبوت ہے۔ برطانیہ کو سب سے بڑی مشکل ہٹلر کے ارادوں نے پیدا کی کہ اس کے بڑھتے ہوئے قدم دوسری جنگِ عظیم کو قریب تر کر رہے تھے۔ اس ذہن سے مسٹر چرچل کی یہ تقریر قابلِ غور ہے جو انہوں نے ۲۹ نومبر ۱۹۳۴ء کو دارالعوام میں کی۔

"میں ایوان کو توجہ دلاؤں گا کہ ہمارے پاس فوجی تحفظ کے انتظامات کافی ہیں۔ اس وقت دنیا کی نگاہیں جرمن پر لگی ہوئی ہیں کہ وہ اپنی بحری فوج اور اسلحہ میں بہت بڑا اضافہ کر رہا ہے۔ وہ اپنی فضائی قوت کو بھی بڑھا رہا ہے۔ وہ اس قوت سے لندن کو ایک ہی حملے میں تہس نہس کر سکتا ہے۔ جیسا اس نے کہا ہے کہ:

میں آئندہ سالوں میں اپنی فضائی قوت میں اضافہ کروں گا۔ جرمن معاہدہ وارسائی کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنی فضائی طاقت بڑھا رہا ہے۔ جرمنی اپنے اسلحہ میں جو اضافہ کر رہا ہے اس کا معلوم کرنا ضروری ہے۔

۱۹۳۶ء کے اختتام تک جرمن کی فضائی قوت برطانیہ سے پچاس فیصد زیادہ ہو جائے گی اور ۱۹۳۷ء میں یہ طاقت دو چند بڑھ سکے گی۔"

اس سے دو روز پیشتر ۲۶ نومبر کے اخبارات میں فرانس کے ایک وزیر نے انکشاف کیا "روس نے آئندہ جنگ میں فرانس کو جرمن کے مقابل فوجی امداد کی پیشکش کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جرمنوں نے [illegible] پہنچ کر [illegible] ہیں اور موقع [illegible] کے لیے [illegible] فوج کے لیے [illegible] [illegible]

اس اجلاس میں جرمن کے بڑھتے ہوئے اسلحہ کے متعلق [illegible] اظہار کیا گیا۔"

مسٹر چرچل اور فرانس کو اس وجہ سے بھی پریشانی ہوئی کہ لندن کے ایک اخبار [illegible] نے اپنی ۳ نومبر ۱۹۳۴ء کی اشاعت میں یہ انکشاف کیا کہ:

"ہٹلر نے لندن میں نازی پارٹی کے پراپیگنڈے کے لیے دس لاکھ پونڈ

خرچ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کے لیے اس نے اپنے مخصوص آدمی لندن بھیجے ہیں۔"

ان حالات کے پس منظر میں بقول لندن ٹائمز ۳۰۔ نومبر ۱۹۳۴ء:

" حال ہی میں سرکاری گزٹ میں جو قانون شائع ہوا ہے، جس کی رو سے خبروں کی اشاعت کو ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔ لہٰذا بحری افوجی معاملات پر بحث کے دوران بڑی احتیاط سے کام لینا ہوگا۔

اس اعلان کی رو سے کسی قسم کی خبر شائع نہیں ہوگی، جس کی اجازت حکومت نہ دے۔ خاص کر جن خبروں میں فوجی نقل و حرکت یا فضائی نیدرگاہوں کی ترقی اور ترتیب کا ذکر ہو۔"

انہی دنوں یکم دسمبر ۱۹۳۴ء کو پیرس میں ایک تقریر کے دوران فرانسیسی نمائندے نے ہٹلر سے درخواست کی کہ:

" وہ لیگ آف نیشنز میں شامل ہو کر مشرق میں یورپین پالیسی کے ساتھ تعاون کریں۔

فرانسیسی نمائندہ نے گزشتہ دنوں کی اس خبر کو غلط قرار دیا کہ روس اور فرانس کے درمیان کوئی سمجھوتہ ہوا ہے۔"

دُنیا جھکتی ہے مگر قوّت کے سامنے

اقوام یورپ فکر و تدبّر کی بے پناہ صلاحیتیں رکھتی ہیں۔ مستقبل کے فیصلے انہوں نے پیشتر سے کر لیے ہوتے ہیں۔ ان کے سیاستدان ہواؤں کے رخ پر اپنی عمارت کی نیو اٹھاتے ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بادل ہنوز ہواؤں کی تربیت میں تھے لیکن دانشوران افرنگ نے فضاؤں میں اس کی بو سونگھ کر اپنے اندازے اور اندیشوں کے نقشے لکیرنے شروع کر دیے۔

ہندوستان غلام ہونے کے باوجود بھی بڑی قوت کا مالک ہے۔ لیکن برطانوی سامراج

نے اسے پرکاہ کے برابر وقعت نہیں دی اور بڑی جرأت کے ساتھ کنزرویٹو پارٹی کے رہنما مسٹر چرچل نے اپنے ملک کے وزیر اعظم کے فیصلے کو رد کر دیا اس لیے کہ ؎

غلام سے جو بھی ہوگا وعدہ ضرور ناپائیدار ہوگا۔

اور جرمن سے اس لیے خوف زدہ ہیں کہ کل کا آفتاب اس کے عروج کا آفتاب ہوگا۔ حالانکہ ہنوز دلی دور است۔ لیکن ؎

آنے والے کسی طوفان کا رونا رو کر
ناخدا نے مجھے ساحل پہ ڈبونا چاہا

پسند اپنی اپنی | مجوزہ جوائنٹ سیلکٹ کمیٹی کی رپورٹ پر ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کی رائے:

مسلم کانفرنس۔ ۳-دسمبر ۱۹۳۴ء کے اجلاس لاہور میں مسلم کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی نے
"برطانوی تجویز کو ناپسندیدہ قرار دیا۔ جس میں صوبوں کے گورنروں کو بے پناہ اختیار دے دیے گئے ہیں۔ اس طرح صوبوں کی خود مختاری بیکار ہو کے رہ گئی ہے۔ تاہم ورکنگ کمیٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ موجودہ دستور کے ذریعے جو کچھ دیا گیا ہے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے تاکہ آئینی طریقوں سے دستور میں اصلاح کرائی جا سکے۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی: ۶-دسمبر ۱۹۳۴ء کو پٹنہ ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں دو دن کی مسلسل بحث کے بعد سیلکٹ کمیٹی کی رپورٹ کو مسترد کرتے ہوئے کہا:

"کانگریس نے انجام کار انتہائی غور و فکر کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ حکومت ہند کے آئندہ دستور کا جو خاکہ وائٹ پیپر میں پیش کیا گیا ہے اسے مسترد کر دیا جائے اس کے مقابلہ میں قابلِ اطمینان شکل صرف یہی ہے کہ ایک دستوری اسمبلی کے ذریعے جدید نظامِ حکومت ترتیب دیا جائے۔ اسمبلی کے جدید انتخاب میں دستوری اسمبلی کے مطالبے کی نہایت واضح اور جبین الفاظ تائید ہو چکی ہے۔
برطانوی پارلیمنٹری رپورٹ اکثر اعتبار سے وائٹ پیپر کی تجاویز سے بھی

بدتر ہے۔ ہندوستان کی ہر جماعت اسے رجعت پسندانہ اور ناقابل قبول قرار دے چکی ہے۔ پارلیمنٹری رپورٹ کا مقصد چونکہ یہ ہے کہ اجنبی قوم اس ملک کے باشندوں پر مسلط رہے اور نہایت ہی گراں مصارف کے ساتھ اثر انداز ہوتی رہے۔

لہٰذا یہ رائج الوقت دستور سے بھی زیادہ خطرناک اور ضرر رساں ہے۔ اندریں حالات کمیٹی کی یہ رائے ہے کہ اس سکیم کو مسترد کر دیا جائے۔"

چودھری افضل حق: ۱۷- دسمبر ۱۹۳۴ء کو پنجاب کونسل میں بحث کے دوران چودھری افضل حق نے اپنی ایک تجویز پیش کی کہ:

"سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ ہندوستان کی خواہش کو پورا نہیں کرتی اس لیے اس ایوان کی رائے میں اسے مسترد کر دینا چاہیے۔

آپ نے کہا، ملک کی یہ متفقہ رائے ہے کہ رپورٹ کو مسترد کر دیا جائے کیونکہ حکومت اس خیال پر عمل پیرا ہے کہ ہندوستان میں ایک ایسا گروہ موجود ہے جو بُری سے بُری سکیم کو بھی خوش آمدید کہنے کو تیار ہو جائے گا۔ مگر وقت آنے پر حکومت خود اندازہ کر لے گی کہ اس گروہ کی عوام میں کوئی قیمت نہیں۔

لندن کی لیبر پارٹی: ۱۱- دسمبر ۱۹۳۴ء دارالعوام میں بحث کے دوران مسٹر اٹیلے نے کہا:

"جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ غیر تسلی بخش ہے اسے مسترد کر دیا جائے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آئندہ سکیم جو رپورٹ میں درج ہے، موجودہ آئین سے بہرحال کچھ نہ کچھ بہتر ہے، لہٰذا جو چیز بہتر ہے اسے قبول کر لینا چاہیے۔ لیکن ملک کے سامنے یہ سوال نہیں ہے کہ مجوزہ سکیم موجودہ آئین سے کسی قدر بہتر ہے یا نہیں اصل سوال یہ ہے کہ حکومت برطانیہ کی طرف سے جو وعدے وقتاً فوقتاً ہندوستان کے ساتھ کیے گئے تھے آیا وہ وعدے اس رپورٹ سے پورے ہوتے ہیں یا نہیں۔ ۱۹۱۷ء میں حکومت کی طرف سے ذمہ دار اور خود مختار حکومت کا وعدہ دیا گیا تھا اس کے بعد اس بات پر بحث ہوتی رہی کہ آیا ذمہ دار خود مختار حکومت کے معنی درجہ نو آبادیات ہے یا نہیں۔؟

جب سر میلکم ہیلی ہوم ممبر تھے تو انہوں نے اسمبلی میں یہ اعلان کیا تھا کہ اس کے معنی درجہ نوآبادیات کے نہیں ہیں۔ لیکن اس کے بعد لارڈ اردن نے وائسرائے کی حیثیت سے اور مسٹر رمزلے میکڈانلڈ نے وزیر اعظم کی حیثیت سے اس امر کا یقین دلایا کہ ہندوستان کا نصب العین درجہ نوآبادیات ہے۔ لیکن موجودہ رپورٹ میں ان تمام وعدوں کے متعلق بدعہدی کی گئی ہے۔

ہم نے اس ایوان میں سائمن کمیشن کے تقرر کے خلاف بھی آواز بلند کی تھی لیکن ہمارے ماڈریٹ دوستوں نے سائمن کمیشن سے تعاون کیا۔ بعد میں ہر ایکسلنسی نے اس امر کو تسلیم کر لیا کہ سائمن کمیشن کو مقرر کرنا غلطی تھی۔ ممکن ہے کہ اب بھی حکومت اور ماڈریٹ ہماری آواز پر کان نہ دھریں۔ لیکن انہیں یہ ماننا پڑے گا کہ ہندوستان پر موجودہ رپورٹ کی بنا پر ایک آئین کو ٹھونسنا سخت غلطی ہے۔"

اس کے بعد آپ نے مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے متعلق تحفظات پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا:

"رپورٹ میں کوئی ایسا وعدہ بھی موجود نہیں جس میں اس امر کا یقین دلایا گیا ہو کہ آئندہ کسی وقت ان تحفظات کو ہٹا لیا جائے گا۔ آئندہ آئین کے تحت وزراء کی حالت ایسے سوار کی سی ہوگی جس کے گھوڑے کی باگیں دوسرے آدمی کے ہاتھ میں ہوں گی۔"

آخر میں آپ نے ایوان سے اپیل کرتے ہوئے کہا:

"برطانوی حکومت اور برطانوی عوام کا وقار اسی میں ہے کہ اس تجویز کو مسترد کر دیا جائے۔"

سبھاش چندر بوس کو نوٹس غیر ملکی حکومت اس سے نا آشنا نہیں تھی کہ ۱۹۴۳ء میں ہندوستان کو اپنی غلامی کا احساس ہو چکا ہے۔ اور کسی وقت بھی اس چنگاری کے شعلے بلند ہو کر ایوان فرنگی کو خاک کر سکتے ہیں۔ اس بنا پر وہ ایسے عناصر سے غافل نہیں تھی جس کے متعلق اسے ذرا سا بھی شبہ ہو کہ اس کے ارادوں میں بغاوت

پرورش پا رہی ہے۔

بنگال کے بابو سبھاش چندر بوس کانگریسی ہونے کے باوجود مہاتما گاندھی کی عدم تشدد کی پالیسی کے سخت خلاف تھے۔ وہ اندرونِ خانہ دہشت پسند تحریک کے صرف معاون ہی نہیں اس کے حامی بھی تھے۔

دوسری جنگ عظیم سے متعلق جیسے جیسے حکومت کا احساس بڑھتا گیا۔ ہندوستان میں برطانوی پالیسی اسی قدر سخت ہوتی گئی۔ ان دنوں بابو سبھاش چندر یورپ میں تھے انہیں اطلاع ملی کہ ان کے والد بیمار ہیں۔ اس پر ۲۔ دسمبر ۱۹۳۴ء کو کلکتہ پہنچے تو انہیں گھر میں نظر بند کر دیا گیا۔ اس دوران ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ مگر حکومت نے انہیں نہ تو والد کی ارتھی کے ساتھ شمشان بھومی تک جانے دیا۔ اور نہ ہی کسی عزیز و اقارب سے ملنے کی اجازت دی۔ خط و کتابت پر بھی قدغن لگا دی۔

۸۔ دسمبر کو ایک نوٹس کے ذریعے سبھاش بابو کو حکم دیا گیا کہ وہ دو دن ٹھہر کر یورپ واپس چلے جائیں ورنہ انہیں گرفتار کر لیا جائے گا۔ اس کے جواب میں سبھاش بابو نے حکومت سے ۷۔ جنوری ۱۹۳۵ء تک ہندوستان میں رہنے کی اجازت چاہی اور دوسری صورت میں انہوں نے کہا کہ ملک بدر ہونے سے بہتر ہے کہ مجھے جیل بھیج دیا جائے۔

شاہ جی کی گرفتاری

۹۔ دسمبر ۱۹۳۴ء کو حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان پر الزام تھا کہ انہوں نے قادیان کانفرنس کے موقعہ پر تقریر کے دوران حکومت کے دو فرقوں کے درمیان منافرت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ۲۔ دسمبر کو انہیں گورداسپور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ دیوان سکھانند کی عدالت نے ضمانت پر رہا کر دیا۔

ریاستہائے ہند کا اجلاس

اگر انسان کا ضمیر مجرم ہو تو ہزار تحفظ بھی اسے موت سے محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ حکومتِ ہند نے ریاستوں کو ہمیشہ اپنے دامنِ عافیت میں محفوظ رکھا۔ لیکن ہر ریاستی حکمران اپنی رعایا سے خوفزدہ تھا۔ اور یہ خوف کسی وقت بھی ان کی موت کا ذریعہ بن سکتا۔

برطانیہ کی موجودہ سکیم کے تحت فیڈریشن کی صورت میں بھی ریاستوں کی نصف آبادی کو اس میں شمولیت کا حق دیا گیا تھا۔

اس پر بھی ریاستہائے ہند غیر مطمئن رہیں۔ اس سے پیشتر جولائی ۱۹۳۴ء کو مہاراجہ پٹیالہ، نواب آف بہاولپور اور تین دوسرے والیان ریاست کی طرف سے وائٹ پیپر کے پیش نظر حکومت سے تحفظ مانگا گیا تھا۔ اس خط کے جواب میں حکومت نے کہا:

"ہم اپنی جگہ پر آپ کی تائید و حمایت کا یقین دلاتے ہیں کہ تاج برطانیہ کے ساتھ آپ کے معاہدات کے ذریعے آپ کو جو مراعات حاصل ہیں، ان کو غصب کرنے کی کسی کوشش کے مقابلے میں ہم آپ کی اور آپ کے رفقائے کار کی ہر ممکن امداد کریں گے۔"

اس خط کے نیچے ڈیوک آف ونڈسر کے علاوہ مسٹر چرچل اور برطانوی پارلیمنٹ کے تینتالیس ممبروں کے دستخط ثبت تھے۔

یہ خط ہندوستان کے ۳۰۔ دسمبر ۱۹۳۴ء کے اخبارات میں شائع ہوا۔ اس پر بھی ان کا ضمیر مطمئن نہیں تھا کیونکہ انہیں یقین ہو چکا تھا کہ ریاستی نظام کا برطانوی سہارا آج نہیں تو کل ختم ہو جائے گا۔ چنانچہ

"۱۴۔ دسمبر کو بمبئی میں ریاستہائے ہند نے اپنا اجلاس طلب کر لیا۔ مگر بغیر کسی فیصلے کے آئندہ جنوری پر ملتوی کر دیا گیا تاہم انہوں نے اپنے تحفظات کی ضرورت کو سختی سے محسوس کیا اور نئی سکیم میں ریاستہائے ہند کے تحفظ پر زور دیا۔"

قادیاں کانفرنس کا ذکر

پنجاب کونسل کے ۱۸۔ دسمبر ۱۹۳۴ء کے اجلاس میں چودھری افضل حق نے سوال اٹھایا:

"کیا احرار کانفرنس قادیان کے موقعہ پر حکومت نے مرزا بشیر الدین محمود کو کوئی نوٹس دیا تھا؟

جواب: (وزیر خزانہ) ہاں ایک نوٹس زیر دفعہ ۱۴۴۔ اور دوسرا قانون ترمیم ضابطہ فوجداری کے تحت دیا تھا۔

سوال: کیا حکومت کو معلوم ہے کہ اس کے بعد جمعہ کے خطبوں میں مرزا بشیر الدین محمود حکومت سے

مطالبہ کرتا رہا ہے کہ حکومت اس سے معافی مانگے؟

جواب: حکومت ان خطبوں کے معنی نہیں سمجھتی۔

سوال: کیا حکومت نے بشیرالدین محمود سے معافی مانگی ہے؟

جواب: نہیں۔

سوال: کیا حکومت نے اس پر توجہ دی کہ اگر حکومت نے اس سے معافی نہ مانگی تو بشیرالدین محمود اس کے علاوہ کیا کرے گا؟

جواب: نہیں۔

کپورتھلہ کا نیا وزیر اعظم ۲۰۔ دسمبر ۱۹۳۴ء کو مہاراجہ کپورتھلہ نے دو سال کے لیے ایک انگریز کرنل فیشر کو اپنی ریاست کا وزیر اعظم مقرر کر دیا۔ نئے وزیر اعظم نے چارج سنبھالتے ہی ۲۱۔ دسمبر کو چودھری عبدالعزیز کے بھائی کپتان عزیز احمد اور لفٹیننٹ صدیق احمد جنہیں گزشتہ تحریک کے دنوں نظر بند کر دیا گیا تھا۔ ان کی تمام پابندیاں ختم کر کے ان کی جائیداد واگذار کر دی۔ نیز چودھری عبدالعزیز کے بڑے بھائی چودھری عبدالرشید کو کپورتھلہ کا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مقرر کر دیا۔ آپ کو فوجداری کے اختیار سونپے گئے (آپ تحریک سے پیشتر بھی اسی عہدے پر فائز تھے۔)

وائسرائے ہند کی تقریر اخبارات اور رہنمایان ہند کی رائے کے بعد وائسرائے ہند نے ۱۹۔ دسمبر ۱۹۳۴ء کو کلکتہ یورپین ایسوسی ایشن کی دعوت میں، جو ان کے اعزاز میں دی گئی تھی، تقریر کرتے ہوئے کہا:

"میرے سامنے صرف دو متبادل صورتیں ہیں۔ اوّل یہ کہ اس رپورٹ کو قبول کر لیا جائے۔ اس بناء پر کہ اس میں صحیح طریق پر صوبجاتی خود اختیاری حکومت آل انڈیا فیڈریشن اور مرکز میں بڑی حد تک ذمہ داری دی گئی ہے۔

دوسری شکل یہ ہے کہ اس سکیم کو بالکل بے پرواہی کے طور پر مسترد کر دیا جائے، جس کا مقصد یہ ہوگا کہ موجودہ دستور کو غیر معین مدّت تک برداشت کیا جائے۔ اس بات کا یقین ہے کہ اگر ہم نے خلوص کے ساتھ اس پر عمل کیا تو ہمیں

معلوم ہو جائے گا۔ کہ ہندوستانیوں کے لیے لندن میں مکمّل ذمہ داری کی طرف بہت بڑا قدم اٹھایا گیا ہے۔"

معاہدہ وارسائی کو خطرہ

بہادر قومیں اپنی شکست کو زیادہ عمر نہیں دیتیں۔ وہ خزاں میں کملائے ہوئے پھول کی طرح نئی بہار کی منتظر رہتی ہیں۔ زمانہ لاکھ کہے لیکن مورخ تاریخ کے اوراق ان کی فتح کے انتظار تک خالی چھوڑ دیتا ہے۔

۱۱۔ نومبر ۱۹۱۸ء کو جرمن نے اتحادی طاقتوں کے سامنے شکست کھائی اور اس شکست کا معاہدہ وارسا کے مقام پر ہوا۔

وارسا پولینڈ کا مرکزی شہر ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر اس شہر کے کنارے گھنے جنگلوں میں ریل کے ایک ڈبے میں فرانس سمیت باقی اتحادی قوتوں نے جرمنوں سے ذلت آمیز معاہدے پر دستخط لیے تھے۔ یہی معاہدہ تاریخ میں معاہدہ وارسا کہلایا۔ اس معاہدے کے تحت جرمن کو غیر معینہ مدت کے لیے تہی دست کر دیا گیا تھا۔ مگر پچیس سال گزرنے پر ہٹلر نے اٹھ کروڑ جرمن قوم کو اس ذلت کے انتقام پر ابھارا، تو یورپ کے اخبارات چیخ اٹھے۔ ۲۰۔ دسمبر ۱۹۳۴ء کے اخبارات نے ایک سا مضمون شائع کیا، جس کا متن یہ ہے۔

۱۔ معاہدہ وارسائی میں جرمن کو کہا گیا تھا کہ وہ صرف ایک لاکھ فوج رکھ سکتا ہے۔ لیکن اس نے تین لاکھ کر دی ہے۔

۲۔ اسے صرف چار ہزار تک افیسر رکھنے کی اجازت تھی مگر اس نے افیسروں کی تعداد اٹھارہ ہزار کر دی ہے۔

۳۔ جرمن کو اپنے طور پر تنظیم و امن کے لیے پولیس کی معینہ تعداد کی اجازت دی گئی تھی۔ مگر اس نے نہ صرف پولیس کو فوجی ٹریننگ دینی شروع کر دی ہے بلکہ اس کی تعداد ڈیڑھ لاکھ کے قریب کر لی ہے۔ چنانچہ ایک اطلاع کے مطابق اس وقت تک پچاس ہزار افراد فوجی تعلیم حاصل کر چکے ہیں۔ منظم فوج کے علاوہ تین لاکھ کے قریب ٹریننگ حاصل کر رہے ہیں۔

۴۔ پانچ لاکھ افراد لیبر کوروں میں شامل ہیں۔ گو ان کے پاس ہتھیار نہیں تاہم

انہیں پوری فوجی ٹریننگ دی جا چکی ہے۔

ان کے علاوہ تمام جرمن اسلحہ سازی کے کارخانوں میں شب و روز کام کر رہے ہیں۔ ان کارخانوں کے کارکنوں کو تاکید ہے کہ اندر کی کارروائی باہر نہ پہنچے۔

ان حالات کے پیش نظر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس جرمن کو اتحادیوں نے ۱۹۱۸ء میں ناکارہ کر دیا تھا وہ آج کم از کم بارہ لاکھ فوج میدان میں لا سکتا ہے۔ جہاز راں کمپنیاں اس کے علاوہ کام کر رہی ہیں۔ بحریہ کی تنظیم الگ ہو رہی ہے۔ اس کے علاوہ ٹینک تیار کیے جا رہے ہیں۔"

جرمن کی ان جنگی تیاریوں کو یورپین صحافت نے معاہدہ وارسائی کے خلاف ایک منظم سازش قرار دے کر اپنے دانشوروں کو یقین دلانا چاہا کہ جرمن کے اس اقدام سے دوسری جنگ عظیم کے بادل امڈ آنے کا خطرہ بڑھ رہا ہے۔

قائداعظم کی واپسی

برطانوی سکیم اور دوسرے سیاسی حالات نے ہندوستان کے سیاستدانوں کو باہم غور و فکر کی نئی دعوت دی۔ حالیہ انتخاب کے نتائج نے فکر و نظر کی نئی راہیں کشادہ کر دیں۔ انہی دنوں ۲۶۔ دسمبر ۱۹۳۴ء کو مسٹر محمد علی جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ سات ماہ کی غیر حاضری کے بعد ہندوستان پہنچے۔ ان کی غیر حاضری کے دوران بمبئی کی شہری سیٹ سے انہیں اسمبلی کے لیے بلا مقابلہ منتخب کر لیا گیا تھا۔

۱۹۳۵ء

تین سو پینسٹھ دنوں کی مسلسل مسافت کے بعد ۱۹۳۴ء مغرب کی گہرائیوں میں ڈوبنے لگا تو آسمان نے اسے شفق کے دریچوں سے دور تک دیکھا کہ وہ اپنے دامن میں نامرادیوں کے ہزاروں داغ چھپانے کی کوشش میں تھا۔ یہ داغ غلام ہندوستان کی باہم چپقلش کو نمایاں کر رہے تھے۔ رخصت ہونے والے سال نے اپنے پیچھے جن واقعات کو چھوڑا۔ غلامی کی تاریخ میں یہ کشمکش حیات کے درمیان میں گذرنے والے دنوں میں شمار ہوں گے۔ ان دنوں غیر ملکی اقتدار نے غلاموں کو کئی سنہری فریب دیئے اور آئین کے ایسے ایسے خوبصورت جال بنے کہ ہر تار سے فریب سلطنت عیاں تھا۔

ان دنوں برطانوی حکومت کا تازہ شاہکار پارلیمنٹری رپورٹ تھی جسے خود برطانوی صحافت اور مدبر ناپسند کر چکے تھے۔ کانگریس، مسلم لیگ اور مجلس احرار کے علاوہ ہندوستان کا رجعت پسند طبقہ بھی قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔ ریاستہائے ہند کے رؤساجن کے راج سنگھاسن کی ڈور برطانوی کھونٹے سے بندھی تھی۔ انہیں بھی یہ رشتہ ختم ہوتے دکھائی دے رہا تھا کہ ۱۹۳۵ء کی صبح نمودار ہوئی۔ نئے سال کے شاہ خاور نے اپنی کرنوں میں عالم کائنات کو محیط کر لیا۔ زمین و آسمان اُجلے نکھر سے آراستہ دکھائی دینے لگے۔ اس اجالے میں غلاموں کے مقدر نے نئی کروٹ لی۔ ماضی کے بکھرے ہوئے خون شہدائے وطن نے غلامی کے سیاہ داغ اپنی سرخیوں سے ایسے رنگین کیئے کہ ہندوستان کے دانشوروں کے چہروں سے ندامت ٹپکنے لگی۔

ڈوبتے ستاروں اور ابھرتے سورج نے متحدہ ہندوستان کو ایک نیا ولولہ دیا۔ اور اس تازہ جذبات کے طوفان میں غلامی کی زنجیریں ٹوٹتی نظر آئیں۔ ڈیڑھ صدی کے جمے ہوئے غیر ملکی قدم اکھڑتے دکھائی دیئے۔ ایوان برطانیہ بیدار ہندوستان کے احساس سے گھبرا سا گیا۔ اور اس

کی ہر تجویز اس کے اپنے فریب کی آئینہ دار بن گئی۔

۲۶ دسمبر کو مسٹر محمد علی جناح ہندوستان کے ساحل پر اترے اور ۲۸ دسمبر کو انہوں نے اپنے پریس بیان میں کہا (جو یکم جنوری ۱۹۳۵ء کے اخبارات میں شائع ہوا):

"برطانیہ کی یہ اسکیم کامیاب نہیں ہو سکتی۔ برطانوی ہند کا کوئی ذمہ دار سیاستدان اس کی حمایت نہیں کرے گا"

آخر میں آپ نے کہا:

"اس وقت برطانوی حکومت اس پوزیشن میں ہے کہ وہ جس قسم کا دستور چاہے، ہندوستان پر مسلط کر سکتی ہے۔ لیکن ہم اس پر اظہار تاسف کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ حکومت نے ہندوستان کی کمزوری کا پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔

اس سکیم کا مقصد ہندوستان کو حقیقی حکومت خود اختیاری دینا نہیں، بلکہ برطانوی اقتدار کو قائم رکھنا ہے۔ مجھ سے دریافت کیا جا رہا ہے کہ کیا ہندوستان اب بھی کوئی متحدہ اسکیم پیش کر سکتا ہے؟ میرا جواب یہ ہے، کہ اگر یہ ممکن ہو تو سائمن کمیشن کی رپورٹ کی طرح، جائنٹ کمیٹی کی رپورٹ بھی دریا برد کی جا سکتی ہے۔"

چودھری عبدالعزیز کی اپیل

ہم نے سوچا تھا کہ منصف سے کریں گے فریاد
ہائے افسوس کہ وہ بھی تیرا چاہنے والا نکلا!

گزشتہ برسوں سے کپورتھلہ کے عوام جن بنیادی حقوق کے لیے برسر پیکار تھے، انہیں یقین تھا کہ مہاراجہ کی پیرس سے واپسی پر سارے تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ لیکن حکومت بہرطور حکومت ہے، خواہ وہ بہت سے رقبے پر ہو یا چند گز زمین پر۔ اس نشے میں حاکم کا مزاج منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ عروج و زوال کے کلیہ سے بے نیاز جب وہ اس سفر پر نکلتا ہے تو راستے کی ہر چیز سے ماورا ہو کر گزرتا ہے۔

ہندوستان میں اجنبی راج کی طنابیں ٹوٹنے والی [illegible] اور اس کے اقتدار کا سورج انحطاط میں ہے، مگر ریاستی حاکموں کا غرور ہنوز جوان دکھائی دے رہا ہے۔ وہ اپنی رعایا سے انصاف کرنے میں اپنے ضابطے سے بھی انحراف کر رہے ہیں اور دوسری طرف اپنے غیر ملکی آقاؤں سے

اپنی حفاظت کی درخواستوں پر دستخط کرتے نہیں تھکتے۔

مہاراجہ کپورتھلہ نے ریاست میں پہنچ کر اپنے نظام میں جو تبدیلیاں کیں، رعایا کو اس سے کوئی فائدہ نہ پہنچا۔ الٹا اس درد میں اضافہ ہوا۔ البتہ ریاست کے نئے وزیر اعظم نے حالات کو نئی ڈگر پر لانے کی سعی کی ہے۔ دیکھیں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے؟

ریاستی حکام نے گزشتہ تحریک کے سلسلے میں چودھری عبدالعزیز کو پانچ سال قید بامشقت کی سزا دے رکھی ہے۔ بدلتے ہوئے حالات کے تحت جماعت کی اجازت سے چودھری عبدالعزیز کی سزا کے خلاف ۸۔ جنوری کو ریاست کے ہائیکورٹ میں اپیل دائر کی گئی جس کی پیروی لاہور کے میاں عبدالعزیز نے کی۔ انہوں نے بحث کے دوران یہ موقف اختیار کیا۔

"چودھری صاحب کی تحریک مہاراجہ کی ذات کے خلاف نہیں بلکہ ریاستی نظم ونسق میں اصلاح کی تحریک تھی"

بحث سننے کے بعد عدالت نے حکومت کے جواب کے لیے مقدمہ کئی روز کے لیے ملتوی کر دیا۔ اس سے پیشتر ۴۔ جنوری کو کپورتھلہ زمیندارہ کانفرنس میں مہاراجہ سے حسب ذیل مطالبات کیے گئے۔

۱۔ ریاست کے بڑھتے ہوئے افلاس کے پیش نظر مالیہ میں اس حد تک تخفیف کر دی جائے کہ انگریزی علاقہ کے مساوی ہو جائے۔ اگر موجودہ مالیہ میں پچاس فیصد کمی کر دی جائے تو ملحقہ انگریزی علاقے کی اراضی کے برابر ہو جائے گی۔

۲۔ مالیہ کی آئندہ قسط سے بیگاری یا حق الخدمت لینے کا طریقہ ختم کر دیا جائے۔

۳۔ ریاست میں قانون سازی کی ایک مجلس قائم کی جائے۔ جسے ملکی انتظام اور تعزیری اختیارات دیئے جائیں۔ مجلس وضع قانون کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ ماسوائے فوجی اخراجات کے تمام مصارف ملک کی نگرانی میں کرے۔

۴۔ چودھری عبدالعزیز اور دیگر سیاسی قیدیوں کو فوراً رہا کر دیا جائے۔

۵۔ محصولات میں تخفیف کر دی جائے۔

۶۔ سیاسی مجالس کے انعقاد سے پابندی ختم کر دی جائے۔

۷۔ کرنل فشر (وزیر اعظم ریاست) کے زیر نظر ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم کی جائے جو زمینداروں کی شکایات کی تحقیقات کر کے ان کی فلاح اور بہبود کے وسائل بہم پہنچانے کی سفارش کرے۔

۸۔ شہریت کے بنیادی حقوق یعنی آزادی تحریر و تقریر اور آزادی عقاید کا فوراً اعلان کرے نیز آئندہ کے لیے یقین دلایا جائے کہ کسی شخص کو بغیر قانونی انصاف کے اور کھلی عدالت میں سماعت کے سزا نہ دی جائے۔

۹۔ جوائنٹ کمیٹی کی رپورٹ ریاستی باشندوں کے لیے ناقابل قبول ہے۔ کیونکہ یہ ریاستوں کے ملکی مطالبات کو پورا نہیں کر سکتی اور نہ ہی یہ فیڈریشن میں ریاستوں کو کافی نمائندگی دے سکتی ہے۔"

فرانس اور اٹلی میں معاہدہ

حالات جیسے جیسے آگے بڑھ رہے ہیں یورپین سیاستدانوں کے ذہن دوسری بڑی لڑائی کے نقشے لکیر رہے ہیں بظاہر ان کی فکر امن کے لیے ہے لیکن ہوس ملک گیری میں انسانوں کا خون ان کے نزدیک بے قیمت شے ہے۔ سمندر کے پانی اور آسمانوں کے ستارے گواہ ہیں کہ گزری ہوئی جنگ عظیم میں انہی لوگوں نے آدمیت سے باہر رہ کر کیا کردار ادا کیا تھا اور آنے والے کل کو ان کے ارادے کیا ہیں۔

۸ جنوری لندن کے اخبارات کے مطابق اٹلی میں روم کے مقام پر فرانس اور اطالیہ کے معاہدے پر موسولینی اور فرانس کے وزیر خارجہ مسٹر ایم الاول نے مشترک معاہدے پر دستخط کیے ہیں، جن کی اجمالی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ فرانس نے اطالیہ کی اس درخواست کو منظور کر لیا ہے کہ وہ اسے ابی سینیا کے اندر اپنی تجارت کو بڑھانے اور نوآبادیاتی مقصد کو پورا کرنے میں آزادانہ اقدام کی اجازت دے۔

۲۔ تیونس کے اطالوی باشندوں کو دو نسلوں تک اطالوی قومیت قائم رکھنے کی اجازت ہوگی۔

۳۔ اطالیہ، شمالی علاقہ کی ایک پٹی فرانسیسی افریقہ کی سرحدات تک جو آٹھ سو اسی

میل لمبی اور ستّر میل چوڑی ہوگی۔ فرانس کے حوالے کرے گا۔

۴۔ اس کے علاوہ اطالیہ کو فرانسیسی شمالی لینڈ میں بھی ایک علاقہ مل جائے گا جس میں ادیک کی بندرگاہ شامل نہیں ہوگی۔ نیز عدیس ابابا ریلوے کے حصے دو ہزار سے تیس ہزار کے درمیان تک خرید سکے گا۔

فرانس اور لندن کے عوام اس معاہدے پر خوش ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ اس طرح اٹلی جرمن کو تنہا چھوڑ دے گا۔

اسی تاریخ کو ایک نازی آفیسر نے جو ان دنوں ہندوستان آیا ہوا تھا۔ بمبئی کے مشہور اخبار "دی سینٹینل" کے نامہ نگار کو بیان دیتے ہوئے کہا:

"چند ہفتوں تک جرمنی اور جاپان کے درمیان خفیہ طور پر ایک فوجی معاہدہ ہونے والا ہے، جس کے تصور سے یورپین سلطنتوں میں زیادہ پریشانی اور اضطراب بڑھ رہا ہے۔"

نازی افسر نے مزید کہا:

"جرمن اپنی جنگی تیاریوں میں مصروف ہے۔ چنانچہ جرمن پروپیگنڈا وزیر ڈاکٹر گوبلز نے اس سلسلے میں جرمن کے ہر گھر ریڈیو سیٹ پہنچا دیئے ہیں تاکہ ہوائی حملے کے وقت خاص ہدایات جاری کی جا سکیں۔"

اسی ہفتہ ہٹلر کے ہوائی سفر کے دوران جبکہ وہ تشریف لے جا رہا تھا کسی نامعلوم شخص نے ہوائی جہاز کے ذریعے ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ یہ خبر اگرچہ ۹ دسمبر ۱۹۳۴ء کی ہے لیکن جرمن حکام نے مصلحتاً اس خبر کو جنوری کے پہلے ہفتے شائع کیا۔ حملہ آور کی تحقیق نہیں ہو سکی۔ تاہم یہ معلوم ہے کہ یہ کوئی غیر ملکی شخص تھا۔ حملہ کے وقت ہٹلر کے پاس کوئی اسلحہ نہیں تھا۔

ہٹلر کا پیغام سال نو کے دنوں ہٹلر نے نازی پارٹی کے نام ایک پیغام نشر کرتے ہوئے کہا:

"۱۹۳۵ء کے لیے نہایت گرمجوشی کے ساتھ ہماری آرزو ہے کہ جرمن اتحاد

علاقہ اس کو واپس کر دیا جائے جو اپنی صدا نے نوں آشام سے دنیا ئے جہان کے روبرو جرمن کے لیے ذلت کا نشان بنا ہوا ہے۔"

ہٹلر نے آگے چل کر کہا:

"ایک سال قبل جرمنی جس قدر طاقتور تھا آج اس سے کہیں زیادہ طاقتور ہے۔ اور نازی پارٹی جرمن قوم کی سیاسی آرزوں کی آئینہ دار ہے۔ جرمن سب سے زیادہ عزت اور امن کا طالب ہے۔ خدا کا فضل شامل رہا تو ہم اپنی قوم کے لیے روزانہ خوراک بھی حاصل کر سکیں گے۔"

فرانس اور اٹلی کے مابین مصالحت۔ جرمن اور جاپان کا مل بیٹھنا۔ ہٹلر کے ہوائی سفر پر نامعلوم شخص کا حملہ اور ہٹلر کا سال نو کے موقعہ پر اپنی پارٹی کو پیغام۔ ان واقعات کے کے ساتھ ساتھ موجودہ ہندوستان کی سیاسی بے چینی کا اندازہ کرتے ہوئے برطانوی پالیسی پر غور کریں کہ لندن میں لیبر پارٹی کی حکومت کس خوبصورتی سے ہندوستان کے حالات کو سمیٹ رہی ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ برطانیہ ہندوستان کو مراعات دینے میں مخلص ہے بلکہ یورپ کے افق پر جنگ کے بادل جس تیزی کے ساتھ وہاں کی فضا کو مکدر کر رہے ہیں۔ برطانیہ کا حکمران طبقہ مجبور ہے کہ وہ اپنے گھر کے بچاؤ کے لیے ہندوستان کا سیاسی تعاون حاصل کرے۔

سبھاش بابو کی یورپ روانگی

ان حالات کے باوجود کہ ایوانِ فرنگی کی ہر اینٹ جرمن کی بڑھتی ہوئی فوجی طاقت سے خائف ہے حکومت ہند اپنی گرہ کمزور کرنے کو خوشی سے تیار نہیں۔ سبھاش بابو اپنے والد کی بیماری اور پھر انتقال پر یورپ سے کلکتہ آئے تھے۔ ظاہر ہے یہ کوئی سیاسی مقصد نہیں تھا۔ مگر اس پر بھی حکومت نے انہیں والد کی موت کی مذہبی رسوم میں شمولیت کی اجازت نہیں دی۔ نیز انہیں یورپ واپس جانے پر مجبور کر دیا۔ بالآخر انہیں اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔

۸۔ جنوری کو پولیس کی نگرانی میں انہیں یورپ روانہ کر دیا گیا۔ ۱۰۔ جنوری کو وہ ناگپور ریلوے اسٹیشن پر پہنچے اور اخباری نامہ نگاروں سے غیر رسمی گفتگو کے دوران کہا:

"گو میں ہندوستان کی سیاسی صورت حال سے اچھی طرح آگاہ نہیں ہوں اس لیے
میں کوئی قطعی رائے قائم نہیں کر سکتا تاہم یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان
سیاسی طور پر انحطاط کے دور سے گذر رہا ہے۔
اس وقت ملک کے سامنے اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ اس وقت عوام کے
جوش اور ولولہ کو قائم رکھا جائے۔"
(کانگریس کے متعلق) کانگریس کو اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ اس کا
پارلیمنٹری طرز عمل ہی اس کو سوراج کی منزل تک پہنچا دے گا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے
کہ اگر زبردست اور متحدہ رائے عامہ کی حمایت حاصل ہو جائے تو پارلیمنٹری ایجی ٹیشن
سے مقصد براری ہو سکتی ہے۔"

پارلیمنٹری رپورٹ کے متعلق

کسی ہندوستانی کی کسی دائرہ میں خواہ کچھ ہی رائے ہو لیکن اس رپورٹ کو وہ ہرگز
پسند نہیں کر سکتا۔

آل پارٹیز کی ضرورت نہیں

میں آل پارٹیز کانفرنس کے انعقاد کا مخالف ہوں۔ جس زمانہ میں کانگریس نے
سائمن کمیشن کے متعلق لبرلوں سے اتحاد کیا تھا تو گول میز کانفرنس کے اعلان
کے ساتھ ہی لبرلوں نے اپنا رخ پھیر لیا تھا اور کانگریس غریب منہ تکتی رہ گئی تھی۔
اس لیے متحدہ محاذ کا عمل پیش نہ کیا جا سکا۔ ہر شخص اتحادِ عمل کو پسند کرتا ہے۔
لیکن آل پارٹیز سے کسی کو کوئی دلچسپی نہیں۔"

گاندھی جی کے متعلق

میں گاندھی جی کی علیحدگی کو بھی عملی خیال نہیں کرتا اس لیے کہ کانگریس ان کے
مجوزہ پروگرام پر عمل پیرا ہے۔ اس وقت بھی کانگریس کی ایگزیکٹو پر ان کے عقیدت مندوں
کو اقتدار حاصل ہے۔ کانگریس میں ان لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہیں جن کا خلوص
اور جذبۂ حب الوطن تو مسلم ہے لیکن ان کا نقطۂ نظر کانگریس سے ذرا مختلف ہے

اس کے لیے مجھے افسوس ہے۔

میری رائے میں کانگریس کی مجلس عاملہ من حیث الجماعت نمائندہ کہلانے کی حق دار نہیں۔ البتہ انہیں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کانگریسیوں کی نمائندہ جماعت ہے۔"

ہٹلرازم

آپ سے ہٹلر اور ہٹلرازم سے متعلق سوال کیا گیا۔ کہ کیا آپ ہٹلر کے بے حد مداح ہیں؟

"یہ میری معلومات میں اضافہ ہے۔"

یہ درست ہے کہ اس کے نظام میں بے شمار ایسی چیزیں موجود ہیں جو ہندوستان کے لیے ضروری ہیں۔ مثلاً اقتصادی اعتبار سے وہ سرمایہ داروں کی گرفت میں ہے اور جہاں تک معاملات کا تعلق ہے وہ برطانوی نظام کا حامی ہے۔

یورپین سیاست کے متعلق میری رائے ہے کہ ہم کو اس کا بغور مطالعہ کرنا چاہیے۔ میں اس کا قائل نہیں ہوں کہ ہندوستان اندھا دھند فسطائیت یا اشتراکی آئین کو اپنے ہاں رواج دے۔"

شیخ عبدالحمید سندھی کو احرار کی دعوت

زندگی کے سفر میں راستے کا تعین اہم اور ضروری ہے۔ اس کے بغیر آدمی کے لیے منزل پر پہنچنا دشوار ہو جاتا ہے۔ منزل مذہب کی ہو کر سیاسی اقتدار کے حصول کی راس سے غافل رہنے والا مسافر موت تک پہنچتے پہنچتے اکثر موڑوں پر الجھتا ہے۔ یہی عقیدہ ہے جو انسانی عمارت کا بنیادی پتھر ہے۔ اگر اس میں تذبذب ہو تو زندگی کی عمارت کمزور ہو جاتی ہے۔

مجلس احرار کے ادنیٰ کارکن سے لیڈر تک مذہب کے ساتھ اپنے سیاسی عقیدے پر بھی دلجمعی سے قائم رہے۔ ان کے نزدیک ملک کی آزادی دیگر فرد جات سے کہیں زیادہ مقدم تھی۔ وہ ہندو اور انگریز سے اپنے اپنے محاذ پر ہمہ اوقات برسرپیکار رہے ان میں سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ اس لڑائی کے لیے وہ مخلص ساتھیوں کی تلاش میں سرگردان رہتے۔ ان کی

نگاہیں ہمیشہ ایسی شخصیتوں کیلئے وا رہتیں ۔ یہ لوگ بہتر کارکن کے لیے اپنی جگہ چھوڑ دیتے ۔ جبکہ ملک کی دوسری سیاسی اور مذہبی جماعتوں میں یہ رواج نہیں تھا ۔ احرار رہنماؤں کا یہ کردار ہمیشہ زندہ رہے گا۔

سندھ میں ان دنوں جو گھرانے سیاسی فرنٹ پر کام کر رہے تھے ۔ ان میں سر غلام حسین ہدایت اللہ انگریزی اقتدار کے خواہاں تھے ۔ ان کا ہر قدم غیر ملکی اقتدار کے استحکام کے لیے اٹھتا رہا ۔ دوسرے درجے پر جی ایم ۔ سید تھے ۔ یہ اپنی سیمابی طبیعت کے باعث ہمیشہ ٹھکانے بدلتے رہے ۔ ؎

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

سمرو خاندان بھی سندھ کا معروف خاندان ہے ۔ اس کا صوبے کے وڈیروں پر خاصہ اثر ہے ۔ عوام میں بھی ان کی جان پہچان تھی تاہم مستقبل واضح نہیں ۔ اگرچہ محمد ایوب کھوڑو بھی سندھ کے معروف کارکن رہے ہیں لیکن ان کے عروج کا زمانہ مسلم لیگ سے وابستہ رہا ۔
عبدالمجید سندھی صوبہ سندھ کے مرنجاں مرنج سیاسی رہنماؤں میں شمار رہے ۔ یہ ان اوف نہیں بنے ۔ یہی وجہ ہوئی کہ یہ سندھ کی بے راہرو سیاست میں ابھر نہ سکے ۔ احرار رہنماؤں نے سندھ کے ریگزاروں سے اس موتی کو اپنی تسبیح میں پرونا چاہا ۔ چنانچہ یکم جنوری ۱۹۳۵ء کو صدر آل انڈیا مجلس احرار مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی نے شیخ عبدالمجید سندھی کو حسب ذیل خط لکھا ۔

مجلس احرار اسلام ہند

THE MAJLIS-I-AHRAR-I-ISLAM HIND,
LAHORE.

Ref. No. 3-733 Office Copy Date 1-1-1935

مخدومی و مکرمی جناب شیخ عبدالمجید صاحب ایم ایل سی شہر کراچی

السلام علیکم ۔ رسیدہ ۔ کہ آپ خدمت سے موقع ہمیں افسوس ہے کہ آپ اسمبلی کے الیکشن میں ناکام رہے ۔ کانگریس ...
دوسری ۔ ۱۰ ہے ۔ العیاذ بعدہ تو میں ان امید کر لیتا ہوں کہ آپ کی امداد کرتا

مدت سے خیال تھا ۔ کہ آپ کو مجلس احرار اسلام سندھ کے ساتھ شامل ہونے کی دعوت دوں ۔ مگر حالات نے فرصت نہ دی ۔ وقت ہے
مرے دل میں یہ خواہش ہے کہ سندھ، پنجاب، صوبہ سرحد اور بلوچستان اور بنگال کے مسلمانوں کا ایک مرکزی تعلق رہنا چاہیے ۔ تاکہ
ہر مشورہ میں ہم ایک دوسرے کے شریک ہو سکیں ۔ باقی صوبوں کے مسلمانوں کی بھی شرکت ضروری ہے ۔ مگر چاروں شمال مغربی صوبوں کا
مجلس احرار کا دستور اور اس کا کام آپ کے سامنے ہے ۔ اسلئے میں امید کرتا ہوں کہ آپ خود بھی ہمارے ساتھ شریک ہو جائیں گے ۔
اور ہماری ورکنگ کمیٹی کے ممبر ہو جائیں گے ۔ اور کراچی میں آپ جیسے حضرات میں مجلس احرار کا دستور بھی قائم ہو جائے گا ۔ مجلس احرار کا نظام
اور دستور عمل ارسال خدمت ہے ۔

شعبہ تبلیغ مجلس احرار نے جو کام شروع کر رکھا ہے اس سے بھی آپ بے خبر نہ ہوں گے شاہ صاحب ۔ مرحوم شروع
ہو چکا ہے میں امید کرتا ہوں کہ آپ ہمارے ساتھ اس سلسلہ میں کامل شرکت کریں گے ۔ والسلام

دستخط ......

مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی

وڈیروں کی سیاست میں الجھے ہوئے سندھ کے حالات شیخ عبدالمجید سندھی کے درمیان ایسے حائل ہوئے کہ انھوں نے مجلس احرار کی دعوت کو آئینی طور پر قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ البتہ گاہے گاہے مشوروں میں شامل ہوتے رہے۔ آگے چل کر سومرو خاندان احرار کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ جس کی تفصیل آئندہ اوراق میں آئے گی۔

سالِ رواں ہندوستان کی جدید آئینی سیاست کا سال تھا۔ ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت صوبوں کو جو خود مختاری سونپی گئی تھی۔ ملک کی ہر سیاسی جماعت صوبائی اقتدار کے لیے مصروفِ کار تھی۔ بہت حد تک میونسپل انتخاب اس کے لیے ضروری معاون سمجھے گئے۔ پنجاب کے خصوصی حالات تھے، جن کی محرک یونینسٹ پارٹی تھی۔ اس میں شامل ہر سرکاری آدمی میونسپل کمیٹی کے الیکشن میں براہِ راست ملوث تھا۔ ان کے نزدیک شہری سیاست میں کامیابی لازمی تھی۔ چنانچہ ووٹروں کی فہرست اس بنیاد پر بنائی اور لکھوائی جا رہی تھی۔ عورتوں کو بھی اسی سال ووٹروں کی فہرست میں شامل کیا گیا۔ مگر پردہ دار گھرانوں کو آئین کی اس شق سے ناواقف رکھا جا رہا تھا تاکہ اس کمی کو مخصوص عورتوں کے ووٹوں سے پورا کیا جا سکے۔ مجلس احرار کو جب یونینسٹ پارٹی کی اس سازش کا پتہ چلا تو اس نے پنجاب کے مختلف ڈپٹی کمشنروں کو اپنے طور پر ہر سرکلر کے ذریعے مطلع کیا۔ اس ضمن میں

تجویزیں اور افواہیں

یورپ کے حالات اور ہندوستان میں سیاسی بیداری سے برطانوی زوال کے آثار صاف اور واضح دکھائی دے رہے تھے۔ گو برطانوی سیاستدانوں نے ہندوستان کو مات دینے کے لیے پارلیمنٹری رپورٹ کا ایک مہرہ پھینکا۔ مگر ہندوستانی بساط کے کھلاڑیوں نے حکومت کی اس چال کو بھانپ کر ایسی چال چلی کہ برطانوی دانشور اپنی چوکڑی بھول گئے تاہم بجھتے ہوئے چراغ نے اپنی آخری لو میں سنبھالا لینے کی مزید کوشش کی۔
جب ہندوستان کے پالیٹیشنز برطانوی رپورٹ پر اپنی آخری رائے قائم کر رہے تھے۔ عین انہی دنوں مختلف تجاویز اور افواہیں سننے میں آئیں۔ دہلی کے بعض اخبارات نے یہ خبر شائع کی:

> "حکومت کو اس بات کا پختہ یقین ہو چکا ہے کہ آل انڈیا کانگریس ابھی مردہ نہیں ہوئی۔ اس میں زندگی کے آثار باقی ہیں۔ لہٰذا حکومت کے پیش نظر تجویز ہے کہ گاندھی کو لندن بلا کر انہیں کہا جائے کہ وہ فرقہ وارانہ مسئلہ کا حل اپنے ساتھ لائیں اس کے بعد ان کی مرضی کے مطابق مجوزہ انڈیا بل میں چند ترمیمات کر دی جائیں"
>
> (روزنامہ "انقلاب" ۵-۱-۳۵ - ۱۲)

•

> "پنجاب کے ہندو اور سکھوں نے ایک مشترک تجویز دی کہ تقسیم بنگال کی طرح پنجاب کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس تجویز کے مطابق انبالہ ڈویژن کو پنجاب سے الگ کر دیا جائے۔ نیز پنجاب کے وہ اضلاع کہ جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے جدا کر کے انہیں سندھ سے ملا دیا جائے۔ اس طرح پنجاب کے دو حصے ہو جائیں گے"
>
> (روزنامہ انقلاب ۳۵-۱-۱۶)

•

> "پنڈت مدن موہن مالوی نے انٹی کمیونل ایوارڈ کمیٹی بنائی اور اس کے تحت اعلان کیا کہ ۲۷۔جنوری کو ہندوستان میں ہندوؤں کے حقوق کے تحفظ کے لیے جلسے کیے جائیں اور جلوس نکالے جائیں۔

"آل انڈیا مسلم کانفرنس نے اعلان کیا کہ ۲۵۔ جنوری کو نماز جمعہ کے بعد مسلم حقوق کی حفاظت میں جلسے کیے جائیں اور قرار دادیں پاس کی جائیں"۔

اسی طرح سیاسی افواہیں بھی عام تھیں۔

"آئندہ اسمبلی کا صدر کون ہو۔؟

کانگریس مسٹر آصف علی یا تصدق احمد شیروانی کا نام تجویز کر رہی ہے جبکہ مسٹر محمد علی جناح سر عبدالرحیم کی حمایت میں ہیں اور اگر کانگریس اور اسمبلی کے مسلم ارکان میں کوئی بات طے ہو گئی تو پھر کانگریس سر عبدالرحیم کی حمایت کریگی۔

سندھ کے سر غلام حسین جنہیں سرکاری حمایت حاصل ہے صدارت کے امیدوار ہیں۔ بظاہر یہ انڈی پنڈنٹ پارٹی میں شامل ہیں لیکن اسمبلی کی افواہ ہے کہ انڈی پنڈنٹ پارٹی سر عبدالرحیم کی حمایت کر رہی ہے۔ لہٰذا یہ مایوس دکھائی دیتے ہیں"۔ (روزنامہ انقلاب ۳۵-۱-۱۸)

ملکی اخبارات نے ان افواہوں اور تجاویز کو اپنے کالموں میں کافی اچھالا لیکن ہندوستان کی سیاست جس موڑ پر تھی اس کے لیے پلٹ کر دیکھنے کی گنجائش نہیں تھی۔ لہٰذا باد سموم کے تمام جھونکے اپنی آگ میں اپنا دامن جلا کر رہ گئے۔

انڈی پنڈنٹ پارٹی کا قیام

۱۹۔ جنوری کو اسمبلی کے سولہ مسلم ارکان نے ڈاکٹر ضیاءالدین کے مکان پر جمع ہو کر اسمبلی میں انڈی پنڈنٹ پارٹی قائم کی۔ مسٹر محمد علی جناح (قائداعظم) اس پارٹی کے لیڈر منتخب ہوئے۔ مسٹر جناح کے علاوہ سر عبدالرحیم، سر غلام حسین ہدایت اللہ، سر محمد یعقوب، ضیاءالدین احمد، مسٹر عبدالمتین چودھری، مسٹر اظہر علی، مسٹر کے۔ ایل۔ گابا (احمد) مرتضیٰ حسن، سیٹھ عبداللہ ہارون، ڈاکٹر غلام بھیک نیرنگ ایسے لوگ اس اجلاس میں شامل تھے۔

اسی طرح کانگریس کی اسمبلی پارٹی کے پینتیس ارکان نے بمبئی کے مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی کو اسمبلی میں اپنا پارٹی لیڈر منتخب کیا۔

سرکاری پارٹی کے لیڈر سر این ۔این ۔سرکار تھے ۔

اسمبلی کا اجلاس

۱۱۔جنوری ۱۹۳۵ء کو نئی اسمبلی کا پہلا اجلاس شروع ہوا تو کانگریس، انڈی پنڈنٹ پارٹی اور سرکاری پارٹی کے ارکان کو یکے بعد دیگرے نشتیں ملیں ۔پارٹی لیڈر سامنے کی نشستوں پر بیٹھے ۔

اس سے ایک روز پیشتر کانگریس نے اپنے اسمبلی کے ارکان کو تاکید کی کہ وہ گاندھی ٹوپی پہن کر اجلاس میں شریک ہوں ۔ جو لوگ پگڑی باندھتے ہیں، انہیں بھی ہدایت ہوئی کہ وہ پگڑی اتار کر گاندھی ٹوپی پہنیں ۔

کانگریس کی اس انداز سے اسمبلی میں شمولیت نے ایک نیا ادر انوکھا رنگ پیدا کیا کیونکہ اسمبلی کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا واقعہ تھا ۔

کپورتھلہ میں یک روزہ ہڑتال

۱۶۔جنوری کو ریاست کے دیہاتی عوام نے زمیندارہ لیگ کے حکم پر مالیہ کی تخفیف کے مطالبے پر ایک روزہ بھوک ہڑتال کی ۔ان کی ہمدردی میں شہری عوام نے بھی اس روز کھانا نہ کھایا ۔بعض دیہاتوں سے اطلاع ملی کہ ماؤں نے اپنے شیر خوار بچوں کو بھی دودھ نہیں دیا ۔

اس واقعہ کی اطلاع تاروں کے ذریعے وائسرائے ہند، مہاراجہ کپورتھلہ اور پولیٹیکل ایجنٹ کے علاوہ احرار کے مرکزی دفتر کو بھی پہنچائی گئی ۔اس واقعہ سے متاثر ہو کر ۱۷ جنوری کو کپورتھلہ ریاست کے چند غیر جانبدار مسلمانوں کا ایک وفد مہاراجہ کپورتھلہ کو وفد کی صورت میں ملا ۔جنہوں نے مہاراجہ سے مطالبہ کیا ۔

۱۔ سلطان پور کے واقعہ کی غیر جانبدارانہ تحقیقات کی جائے ۔

۲۔ جو لوگ اس واردات میں مجرم ثابت ہوں انہیں قرار واقعی سزا دی جائے ۔

۳۔ ریاست میں بہت جلد ایک ذمہ دار اسمبلی قائم کی جائے ۔جس میں فرقہ وارانہ تناسب سے نشستیں مقرر کی جائیں ۔

۴۔ مالیہ میں فوراً تخفیف کی جائے ۔

مہاراجہ نے وفد کو یقین دلایا کہ کرنل فشر آ جائے تو حالات پر غور کیا جائے گا ۔

اس سے پیشتر ۸۔جنوری کو مہاراجہ کپور تھلہ اعلان کر چکے تھے۔

"ہمیں اپنی رعایا کی خوشحالی کا ہمیشہ خیال رہا۔تاہم کچھ عرصہ سے ریاست کے زمینداروں کا ہم پر گلہ چلا آرہا ہے۔چنانچہ اس کے لیے ہم نے ایک کمیٹی مقرر کر دی ہے کہ وہ دیکھیں کہ زمینداروں کی ضروریات کیا ہیں۔ہماری رپورٹ کے مطابق ریاست میں پیشہ ور اقوام کی مالی حالت درست ہے۔اس کے باوجود کمیٹی مقرر کر دی گئی ہے۔جس کے ارکان کے ناموں کا اعلان آئندہ ماہ کر دیا جائے گا۔تاکہ وہ صورتِ حال سے ہمیں آگاہ کرے۔

(دستخط مہاراجہ بہادر جگجیت سنگھ۔۸۔جنوری ۱۹۳۵ء)

احرار کو ملاقات کی دعوت

۱۰۔جنوری کو مسٹر خالد لطیف گابا ایم۔ایل۔اے کو مہاراجہ کپور تھلہ کے سیکرٹری کا تار ملا۔

"مہاراجہ بہادر احرار کے وفد سے ملنا چاہتے ہیں۔ان کا منشا ہے کہ حال ہی مسلمانوں کی طرف سے چودھری عبدالعزیز بیگھا والہ کی گرفتاری پر مسلمانان ریاست اور بیرونِ ریاست میں جو ایجی ٹیشن ہوا اس کے متعلق مہاراجہ بہادر احرار کے وفد سے ملنا چاہتے ہیں۔یہ ملاقات ۲ فروری کو ہوگی"

دفتر احرار پر پولیس چھاپہ

ان حالات کے باوجود حکومت اپنے کام میں مصروف تھی۔اور ایسے عناصر کی حفاظت اپنا فرض سمجھتی۔جو ان دنوں بھی حکومت کے مفاد سے چمٹے ہوئے ہیں۔گویا انہیں یقین تھا کہ انگریزی اقتدار کی جڑیں کھوکھلی نہیں ہو سکتیں۔حالانکہ اجنبی راج کی بنیادیں اکھڑ چکی تھیں اور یہ محل آج گرا کہ کل۔ اس گروہ میں قادیانی ٹولا پیش پیش تھا۔اپنی دیرینہ وفاؤں کے باعث اس باطل مذہب کے لوگ احرار کی ہلکی سی جنبش بھی گوارہ نہیں کرتے تھے۔احرار کے شاعر احمد یار خاں زری نے اپنی چند پنجابی نظموں کا ایک مجموعہ شائع کیا۔جن میں مرزائیوں کے خلاف ایک نظم شامل اشاعت تھی۔گو اس میں کوئی تلخ بات نہیں تھی۔مگر قادیانی لیڈر نے فوراً آسمان سر پر اٹھا لیا۔اس ہنگامہ آرائی پر پنجاب پولیس نے زری صاحب کا مجموعہ کلام ضبط کر لیا اور

اس کتاب کی تلاش میں پولیس نے لاہور مجلس احرار کے دفتر پر چھاپہ مار کر مطلوبہ کتاب کی چند کاپیاں برآمد کر کے اپنے ساتھ لے لیں۔

یہ ۲۱-جنوری ۱۹۳۵ء کا ذکر ہے۔

نیشنل لیگ کا قیام (قادیانی جماعت)

دوسرے اصولوں کی طرح سیاست کے بھی چند اصول ہیں، جن میں فریب، جھوٹ، دھوکہ، دغا، انکار و فرار نمایاں ہیں۔ اقتدار کے حصول میں انہی الفاظ سے کام لیا جاتا ہے۔ شخصی حکومت کا راج ہو کر جمہور کا۔ سیاست دان اپنی ضرورت کے لیے اس دائرے سے باہر نہیں ہوتے۔ البتہ مذہب کا اپنا ضابطہ ہے، جس میں الفاظ کی گنجائش نہیں اور نہ یہ طریق کار اس دائرے میں واجب قرار دیا جا سکتا ہے۔

غیر ملکی ضرورت نے مذہبی اصولوں کو اپنی خواہشات کے سانچے میں اس انداز سے ڈھالا کہ اسلام ایسا پختہ عقیدے کا مذہب بھی ظاہری نظروں میں داغدار ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اس کی سب سے بڑی ذمہ داری قادیانیوں پر عائد ہوتی ہے۔ کہ انہوں نے سیاسی پارٹی ہوتے ہوئے بھی اپنے اوپر اسلام کا لیبل چسپاں کیے رکھا۔ اور عیسائی حکومت کو اولی الامر تک کہہ دیا۔

۱۹۳۴ء میں مجلس احرار نے ہندوستانی عوام کو اس فریب سے آگاہ کیا وگرنہ علماء کی اکثریت بھی اس ٹولے کو مسلمانوں ہی کا فرقہ خیال کرتی رہی۔

۱۸۵۷ء کی ہنگامی اور انقلابی تحریک میں تشدد اور قتل و غارتگری کے بعد فرنگی حکمرانوں نے اپنے لیے جن تحریکات کو ہندوستان میں مفید پایا۔ قادیانی تحریک ان کے نزدیک زیادہ کارآمد سمجھی گئی اور پھر یہ تحریک کیونکر پروان چڑھی۔ گذشتہ اوراق میں اس کی تفصیل آچکی ہے۔

لڑائی ہتھیاروں سے ہو یا ناخن تدبیر سے دشمن کو شکست دینے کے لیے کئی رخوں سے لڑی جاتی ہے۔ مجلس احرار نے بجائے تبلیغ کے مرزائیوں پر سیاسی رخ سے حملہ کیا اور اس چادر کو اس بری طرح تار تار کیا کہ قادیانیت واشگاف طور پر ننگی ہوگئی۔

سانپ کے بدن سے کینچلی اتری تو اس کی ہر شے نظر آنے لگی۔ کرگسوں سے شاہین کا لباس چھین لیا گیا تو ان کے پروں میں پرواز کی سکت نہ رہی۔ بھیڑ شیر کی کھال اوڑھے ہوئے تھی لیکن جیسے ہی یہ ملمع اترا تو خوف و ہراس کا عالم ختم ہو گیا۔

قادیانی احرار کے اس حملے کو سمجھ گئے اور وہ بھی اسی رخ سے مقابلے میں اترے قادیانی مذہب کے خلیفہ مرزا بشیر الدین محمود نے ۱۹ جنوری جمعہ کے روز اپنی عبارت سے پہلے حسب ذیل تقریر کی:

"میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہر وہ جماعت جو یہ سمجھتی ہے کہ اس کے حالات ایسے ہیں کہ اسے قانونی حد کے اندر رہتے ہوئے حکومت کے پاس اپنا معاملہ پیش کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ اسے لازم ہے کہ وہ موجودہ انجمن سے الگ ایک ایسی انجمن بنائے، جس میں کوئی سرکاری ملازم نہ ہو۔ اس کے بعد جو جماعتیں اس قسم کی درخواست کریں گی۔ میں غور کے بعد ان کو اجازت دے دوں گا"

اس کے بعد بشیر الدین محمود نے کہا:

"میں اس کی اجازت دیتے ہوئے اپنی طبیعت پر ایک بوجھ محسوس کرتا ہوں۔ کیونکہ میں نے جماعت کو سیاسیات سے علیحدہ رکھنے کے لیے اکیس سال کے لمبے عرصے تک سخت جدوجہد کی ہے۔ اور اس کے لیے اپنوں اور بیگانوں سے گالیاں کھائی ہیں۔ مجھے اسی وجہ سے قتل کی دھمکیاں بھی دی گئیں۔ لیکن اب میں مجبور ہو کر اس کی اجازت دے رہا ہوں۔ اس وقت ہماری جانیں، اور ہمارے بیوی بچوں کی جانیں خطرے میں ہیں۔ میں نے اپنی عمر کا ایک حصہ اس کوشش میں صرف کیا ہے کہ حکومت برطانیہ کی نیک نامی میں اضافہ ہو اور وہ مستحکم ہو۔ لیکن چونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ جب وہ لوگ ہم پر حملہ آور ہوئے جن سے ہم اس لیے لڑتے رہے ہیں کہ وہ حکومت کے خلاف منافرت پھیلانے اور اس

کی جڑوں کو کمزور کرنے والی حرکات کرتے تھے۔ تو ہمیں کچھ پتہ نہیں لگتا کہ حکومت کیا کر رہی ہے۔ اس لیے میں مجبور ہوں کہ جماعت کو اجازت دے دوں کہ جس حد تک شریعت، سیاست میں دخل دینے کی اجازت دیتی ہے سلسلے کے اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے فتنہ و فساد کیے بغیر انصاف کو قائم رکھتے ہوئے اور محبت کے جذبات کو کچلے بغیر، خود حفاظتی کے طور پر وہ سیاسیات میں دخل دے سکتی ہے۔"

(الفضل قادیان ۲۵-۱-۲۰)

بعد میں اس جماعت کا نام نیشنل لیگ رکھا گیا۔

اسمبلی کی صدارت کئی دنوں کی بحث اور دوڑ دھوپ کے بعد اسمبلی کی صدارت پر سر عبدالرحیم، مسٹر تصدق احمد شیروانی کے مقابل کامیاب ہو گئے۔ عبدالرحیم کے حق میں ستر اور شیروانی کو باسٹھ ووٹ پڑے۔ مسٹر محمد علی جناح کی انڈیپنڈنٹ پارٹی نے سر عبدالرحیم کی اور کانگرس نے مسٹر تصدق احمد کی حمایت کی۔

وائسرائے کی تقریر جنوری کے تیسرے ہفتے کلکتہ یورپین ایسوسی ایشن کی دعوت کے موقعہ پر وائسرائے ہند نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

"ہندوستان کی اس تاریخ پر نظر ڈالیے، جبکہ برطانیہ کا ہندوستان سے تعلق قائم نہیں تھا۔ ہم اہل برطانیہ، ہندوستان میں امن اور نظم و نسق لائے، اور اس ملک کا سیاسی گلزار ہمارے ہاتھوں سے لگا اور پروان چڑھا اور اسی وجہ سے اس نے ترقی کی۔ آزادی کے نئے خیالات پیدا ہوتے اور ہماری طرف سے ان کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ آل انڈیا فیڈریشن میں مجھے برطانوی کارنامہ سنگ بنیاد نظر آتا ہے۔

تحفظات: خصوصاً حقوق اور تحفظات [illegible] لیجیے۔ ایک طرح پر یہ تحفظات خود مجوزہ ترقی کا ایک جزو ہیں۔ اس کی [illegible] یا سبب مقصد اور نوعیت دونوں کے اعتبار سے انتقال اقتدار ایک حقیقی چیز ہے، جو محتاج تحفظات ہے

تاکہ ہم ایک طریق حکومت سے محفوظ طور پر دوسری طرز حکومت تک پہنچ سکیں
براہ راست انتخاب: (وائسرائے نے کہا) میں ذاتی طور پر اور میری حکومت فیڈرل مجلس آئین ساز میں براہ راست انتخاب کے حامی تھے۔ لیکن دوسری طرف کے دلائل بھی زبردست تھے۔ اور یہ امر واقعہ ہے کہ اگر ہندوستانی رائے کسی قسم کی ترمیم ضروری خیال کرے تو لیجسلیچر اپنی تجاویز پارلیمنٹ کے روبرو پیش کر سکے گا۔ تاکہ ہندوستان کو کسی قسم کی شکایت نہ رہے۔

(آگے چل کر وائسرائے نے کہا) میری ہمیشہ یہ آرزو رہی ہے کہ ہندوستان دولت مشترک برطانیہ کے دیگر ارکان کے مساوی درجہ حاصل کرے۔ کیونکہ ہندوستان کے حالات اور سلطنت کے دیگر اجزاء (نوآبادیات) سے مختلف ہیں اس کا دستور اساسی بھی برطانیہ کے کل اجزاء کے دستور سے مختلف ہو سکتا ہے۔

فیڈریشن وہ راستہ ہے جو ہندوستان کو یقینی طور پر ترقی پر گامزن کر دے گا۔ لہٰذا مجوزہ دستور کی سکیم اس قابل ہے کہ اس پر انتہائی محنت اور جانفشانی کے ساتھ عمل کیا جائے۔

والیانِ ریاست کا اجلاس

۲۲ جنوری۔ نئی دہلی میں والیانِ ریاست کا ملتوی شدہ اجلاس از سر نو شروع ہوا۔ جس کی صدارت مہاراجہ پٹیالہ نے کی۔ اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے وائسرائے ہند نے کہا

"والیانِ ملک کی یہ خواہش ہے کہ تاوقتیکہ مجوزہ دستاویز کا ریاستوں کے متعلق مطالبہ پورا نہ کیا جائے وہ اپنا فیصلہ فی الحال ملتوی رکھیں۔

مجھے ذاتی طور پر یقین ہے کہ ہندوستانی ریاستوں کے لیے بہترین طریق کار یہ ہوگا کہ وہ فیڈرل سکیم کو منظور کریں۔

آپ کو معلوم ہے کہ آپ پر کسی قسم کا جبر نہیں کیا گیا۔ فیڈریشن میں داخل ہونا، نہ ہونا، آپ والیانِ ریاست کی مرضی پر ہے۔ مجھے [illegible] ہے کہ [illegible]
آپ کو اس [illegible] یقین دلا چکا ہوں کہ جب ہندوستان [illegible]

کے تحفظ کے لیے کسی کوشش سے دریغ نہیں کیا۔ میں صدق دل سے توقع رکھتا ہوں کہ والیانِ ریاست اپنے خاص مفاد سے بے پرواہ نہ ہوں گے نیز اس آئینی ترقی میں برطانوی ہند ریاست ہائے ہند اسلطنت کے سیاسی مشیر کو مدد دیں گے۔" آخر میں آپ نے کہا:

"میں آپ کو دو باتیں یاد دلاتا ہوں، جو میں نے گزشتہ اجتماع کے موقع پر کہی تھیں۔ اوّل یہ کہ جن والیانِ ملک نے پہلی گول میز کانفرنس میں اپنا یہ عزمِ صمیم ظاہر کیا تھا کہ وہ برطانوی ہند میں شریک ہو جائیں گے۔ انہوں نے یہ کہہ کر فیڈریشن کو ایک ممکن چیز بنا دیا تھا۔ غالباً میں نے کہا تھا کہ کوئی ریاست جب تک کہ دستاویز پر شرکت کے دستخط نہ کرے گی اس کو آخر فیڈریشن میں داخلے کا ذمہ دار نہ سمجھا جائے گا۔ میرے یہ دونوں ریمارک آج بھی صحیح ہیں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ایسے وقت میں جب کہ دور رس تبدیلیاں ہونے والی ہیں۔ ریاستیں یہ کہیں کہ انہیں اس امر کا یقین دلایا جائے کہ ان کے اہم مفاد کو پس پشت نہ ڈالا جائے گا۔ جہاں تک قابل عمل کا تعلق ہے اس امر کی انتہائی کوشش کی گئی ہے کہ جو ریاستیں، فیڈریشن میں شرکت کا فیصلہ کریں گی، ان کی پوزیشن محفوظ رہے۔"

ریاستوں کی قرارداد

وائسرائے کی تقریر کے بعد مہاراجہ پٹیالہ نے بحیثیت ریاستوں کے چانسلر کے حسبِ ذیل قرارداد پیش کی:

"ایوان والیانِ ریاست اپنے سابقہ اعلان کی دوبارہ تصدیق کرتا ہے کہ:

ریاستیں آل انڈیا فیڈریشن میں شرکت کے لیے تیار ہیں۔ بشرطیکہ وہ ناگزیر شرائط اور ضمانتیں جن پر زور دیا گیا ہے، دستور میں شامل کر دی جائیں لیکن ایوان اس مسئلے کے متعلق اپنی رائے اس وقت تک کے لیے محفوظ رکھے گا۔ جب تک کہ آئین میں اصلاحات کے متعلق پارلیمنٹری بل مجوزہ معاہدہ

شرکت نیز والیانِ ریاست کے نام دستاویز کلیتاً معلوم نہ ہو جائیں اور ان کی جانچ نہ کر لی جائے۔ ایوان اس امر پر بھی زور دینا چاہتا ہے کہ فیڈریشن کا اجرا اور اس کی کامیابی جملہ متعلقہ پارٹیوں کے اعتماد اور اشتراک اور ریاستوں کی سیادت اور معاہدات کے تحت ان کے حقوق کو بلا عذر تسلیم کیے جانے پر منحصر ہے۔

علاوہ بریں ایوان انفرادی طور پر ریاستوں کے تصفیہ طلب مطالبات فیڈریشن میں داخل ہونے سے پیشتر طے ہو جانے کی ضرورت پر زور دیتا ہے۔"

قرارداد کی تائید مہاراجہ بیکانیر نے کی اور یہ قرارداد منظور کر لی گئی۔

اس اجلاس سے ایک روز پیشتر لندن کے اخبار "ڈیلی میل" نے اپنے افتتاحی نوٹ میں لکھا۔

"ہندوستان کے وہ حکام جن کے ہاتھ میں حکومت کا انتظام ہے منت سماجت، چاپلوسی اور جبر سے والیانِ ریاست کو اس امر پر آمادہ کر رہے ہیں کہ وہ سرکاری بل کو منظور کر لیں۔ اگر وہ ازراہِ حماقت ایسا نہ کریں گے تو اپنی قبر آپ کھودیں گے۔"

والیانِ ریاست کو لازم ہے کہ وہ اپنا اور ہندوستان کا تحفظ کر کے ہندوستان میں برطانوی حکومت کی ایک اور نمایاں خدمت انجام دیں۔

(روزنامہ انقلاب ۲۵-۱-۳۴)

سبھاش بابو کی کتاب پر پابندی

۲۵- جنوری کے ہندوستانی اخبارات نے گزٹ آف انڈیا کی ایک غیر معمولی اشاعت میں اعلان کیا، کہ قانون مجریہ ۱۸۷۸ء کے تحت گورنر جنرل باجلاس کونسل کے فیصلہ کے مطابق "وِرٹ اینڈ کو نمبر ۹ جونس سٹریٹ لندن ڈبیوسی نمبر ۴" انگلستان کا کوئی نسخہ برطانوی ہند میں نہ پہنچے۔ نہ ہی اس کتاب کا کوئی ترجمہ، نہ اس کی کوئی نقل، نہ اس کا کوئی اقتباس ہندوستان میں آنے پائے۔

نوٹ: "سبھاش بابو کی اس کتاب کا نام "۱۹۲۴ء سے جہادِ آزادی" تھا۔ یہ کتاب انہوں نے دورۂ یورپ کے دوران انگریزی میں لکھی تھی۔"

یوم احتجاج ۲۶ جنوری کو کانگریس کے صدر بابو راجندر پرشاد نے اعلان کیا کہ ۷ فروری کو سارے ہندوستان میں پارلیمنٹری رپورٹ کے خلاف یوم احتجاج منایا جائے۔ اس روز جلسے کیے جائیں اور جلوس نکالے جائیں۔

حکومت کی خوش فہمی برطانوی حکمت عملی کے تحت پارلیمنٹری رپورٹ ہندوستانیوں کے لیے کسی رخ سے بھی قابل قبول نہیں تھی۔ یہاں تک کہ برطانیہ کا ماڈریٹ گروہ بھی اس رپورٹ سے مطمئن نہیں تھا۔ ہندوستان کے اچھوت جنہیں پونا پیکٹ کے تحت اس رپورٹ میں ہندوؤں کے برابر سیاسی پوزیشن حاصل ہو چکی تھی۔ ان کے رہنما ڈاکٹر امبیڈکر نے بھی اپنے ۱۴ جنوری کے بیان میں جدید دستور کو اچھوتوں کیلئے ناپسند کیا۔ والیان ریاست نے بھی (آئندہ چل کر) برطانیہ پر عدم اعتماد کا اظہار کر دیا۔ حالانکہ ریاستہائے ہند برطانوی اقتدار کا آخری سہارا تھیں۔

اس کے باوجود حکومت اس خوش فہمی میں تھی کہ چونکہ ہندوستان کی اقوام باہم ایک دوسرے پر اعتماد نہیں رکھتیں لہٰذا ہماری بات رہ جائے گی۔ دوسری طرف کانگریس مسٹر محمد علی جناح کی پہلی تجویز پر راضی نہیں تھی اور آخری تجاویز پر ان کا ذہن جناح سے متفق تھا۔ تیسری اور آخری بات کہ اسمبلی میں بھولا بھائی ڈیسائی کی تقریر اجس نے یہ امید دلائی تھی کہ کانگریس اور اسمبلی کے مسلم ارکان کسی موڑ پر جمع ہو سکتے ہیں۔ تاہم حکومت کو یقین تھا کہ کانگریس ہر طرح کی کیمیونل ایوارڈ کی تجویز سے راضی نہیں۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ یہ بیل منڈھے نہ چڑھے۔ اسمبلی کے اندر اور تمام ملک میں ان دنوں یہی افواہ کام کر رہی تھی۔ اخبارات اپنے کالموں میں اسی قسم کی بحث کر رہے تھے۔

مسلم لیگ کا اجلاس ۲۲ جنوری کو مسٹر محمد علی جناح کی صدارت میں مسلم لیگ کا اجلاس نئی دہلی میں ہوا۔ جس میں نواب سر محمد یوسف، سر فیروز خاں نون، عبدالمتین چودھری، راجہ غضنفر علی، ڈاکٹر ضیاءالدین احمد، حافظ ہدایت حسین مسٹر تصدق احمد شیروانی (کانگریس) سید مرتضیٰ حسن، مسٹر خالد لطیف گابا (احرار)، خان بہادر حاجی رحیم بخش، مولانا شوکت علی، میاں احمد یار خاں دولتانہ، مولوی محمد شفیع داؤدی شریک

ہوئے۔ یہ اجلاس دو دن تک جاری رہا۔

آخری دن حسبِ ذیل قرارداد منظور ہوئی۔

"آل انڈیا مسلم لیگ نے جوائنٹ پارلیمنٹری رپورٹ پر نہایت احتیاط اور دیانت کے ساتھ غور کیا ہے۔ اس کی رائے یہ ہے کہ اس میں جو آئینی تجاویز درج ہیں وہ وائٹ پیپر کی ان تجاویز سے بھی زیادہ حد درجہ بے حقیقت ہیں لہٰذا جب تک متعلقہ اقوام کی طرف سے کوئی متفق علیہ بات پیش نہیں کی جاتی مسلم لیگ فرقہ وارانہ برطانوی اعلان کو بہر طور منظور کرتی ہے۔ نیز اس بنیاد پر ہر پارٹی اور جماعت سے تعاون کے لیے تیار ہے، جو اہلِ ہند کے لیے کوئی تسلی بخش دستور مرتب کرنے کا ارادہ رکھتی ہو"

کپورتھلہ فرنچائس کمیٹی کی سفارشات

گزشتہ سال جنوری میں مہاراجہ کپورتھلہ نے حسب ذیل افراد پر مشتمل ایک فرنچائس کمیٹی تشکیل دی تھی۔

۱۔ دیوان بشمبر داس وزیر داخلہ۔ ۲۔ سردار کشن سنگھ چیف جسٹس۔ ۳۔ سردار کپور سنگھ بار ایٹ لاء۔ ۴۔ ڈاکٹر ابو الفضل صدر بار ایسوسی ایشن اور ۵۔ پنڈت کنول نارائن ایڈووکیٹ ان حضرات نے مسلسل ایک سال کی تحقیق کے بعد حسب ذیل تجاویز مرتب کیں۔

۱۔ ارکان اسمبلی کی کل تعداد ۴۵ ہوگی، جن میں ۳۰ براہ راست انتخاب سے آئیں گے اور ۱۵ نامزد ہوں گے۔

۲۔ مختلف تحصیلوں کا تناسب اس طرح طے پایا۔

کپورتھلہ۔ ۹۔ سلطان پور۔ ۷۔ پھگواڑہ ۔ ۷ ۔۔۔۔ ۵ ۔ بنگہ ۔ ا (اس طرح یہ تعداد ۲۹ بنتی ہے لیکن سرکاری رپورٹ میں اسی طرح درج ہے۔)

۳۔ کمیٹی نے کرنل فشر (نئے وزیر اعظم) اور دیوان بشمبر داس کے نام صدر اور نائب صدر کے طور پر پیش کیے۔

۴۔ انتخاب مخلوط ہوگا۔ اقلیتوں کو نشستیں حاصل کرنے کیلئے پاسنگ دیا جائیگا۔

۵۔ اچھوتوں کو خاص نمائندگی کا موقع دیا جائے گا۔

۶۔ حق رائے دہی کے لیے اکیس سال کی عمر اور تین صد روپیہ کی جائیداد اور پندرہ روپے مالیہ اور تعلیمی اعتبار سے میٹرکولیشن کی شرط لگائی گئی ہے۔"

فرنچائس کمیٹی کی رپورٹ شائع ہوتے ہی مہاراجہ نے سابق وزیر اعظم میاں سر عبدالحمید کو حکم دیا کہ جب تک وہ ریاست کا واجب الادا قرض ادا نہ کریں، نیز ریاست کی جو جائیداد ان کے پاس ہے وہ ریاست کو واپس نہ کر دیں۔ انہیں اپنی جائیداد فروخت کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہوگا اور نہ ہی وہ رہن رکھ سکتے ہیں۔

(نوٹ۔ بعد میں مہاراجہ نے یہ حکم واپس لے لیا تھا۔) روزنامہ انقلاب ۳۵-۱-۲۷

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنون میرا

ہندوستان کے آئینی مسائل حل ہو رہے تھے۔ اقوام ہند فرنگی دستور اساسی پر بحث میں مصروف تھیں کہ ایسے میں بھی ہندو، انگریزی شہ پا کر ہندو مہا سبھا کی اوٹ میں مسلمانوں کے جذبات مجروح کرنے سے باز نہیں رہا۔

قصور کے پالا رام اور کراچی کے نتھو رام نے خاتم الانبیا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی توہین کی جس پر غازی محمد صدیق، غازی عبدالقیوم نے انہیں جہنم واصل کیا۔ اس پر غیر ملکی قانون نے ان نوجوانوں کو سزائے موت دی۔

مجلس احرار حالات کے پیش نظر خاموش تھی تاہم اسمبلی میں اس کا نمائندہ مسٹر خالد لطیف گابا جماعتی فیصلے کے مطابق اپنی ذمہ داریاں نبھا رہا تھا۔

۲۸ جنوری کو مسٹر گابا نے اسمبلی میں ہوم ممبر کو چند سوالات کے متعلق نوٹس دیا۔ کیا ہوم ممبر برائے کرم یہ بتائیں گے؟

و۔ کیا حکومت کو مسلم حلقوں کی طرف سے اور اسی باب میں ملک بھر کی جماعتوں کی طرف سے متعدد تاریں موصول ہوئی ہیں کہ غازی عبدالقیوم کی سزا کو جنہیں کراچی عدالت سے موت کی سزا مل چکی ہے، ملتوی کر دیا جائے۔

ب: کیا یہ امر واقعہ نہیں کہ محمد صدیق نامی شخص کو اس جرم میں کہ اس نے قصور

سکے پال لاام کو توہین پیغمبر کی سزا دی، لاہور کی عدالت سے سزائے موت ہوئی ہے۔
ج۔ کیا یہ امر واقعہ نہیں کہ مذکورہ بالا دونوں مقدموں میں ملزمان نے جو کچھ کیا
اعلیٰ مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے کیا ہے؟

اس بنا پر ملک کے کروڑوں مسلمان غازی عبدالقیوم اور غازی محمد صدیق
کی ہمت اور جرأت پر انہیں مبارک باد دے رہے ہیں۔ لہٰذا حکومت کو ان
مقدمات پر توجہ دیتے ہوئے دونوں کی سزائے موت تبدیل کر کے عبور دریائے
شور کی سزا دے دینی چاہیے۔"

چودھری عبدالعزیز کی رہائی

ریاست کپورتھلہ میں گذشتہ سالوں سے جو کچھ ہو رہا ہے تاریخ ان چشم دید واقعات کو اپنے دامن میں گرہ دے چکی ہے۔ ریاست کے حالات جب اس موڑ پر پہنچے کہ راعی اور رعایا حقوق کے بازار میں کھلم کھلا آمنے سامنے اکھڑے ہوئے تو ریاست کے حکمران کی آنکھیں کھلیں۔ اس وقت بغاوت کی آگ راج محل تک پہنچ چکی تھی۔ قریب تھا کہ راج سنگھاسن جل کر راکھ ہو جاتا۔ مہاراجہ کپورتھلہ پیرس سے وطن واپس پہنچے۔

ریاستی حکمرانوں نے محض ذاتی وقار کے لیے گزشتہ ربع صدی سے اپنے عوام سے جو آنکھ مچولی کی اور ظلم و جور کی جس بھٹی میں ریاستی عوام جلے یہ وقت کا عظیم المیہ ہے۔ بالآخر مظلوموں کا خون راج گدیوں کو اپنے طوفان میں تنکے کی طرح بہا کر لے گیا۔

سونے کا تاج پہننے والے سروں پر جب خاک آلود جوتے پڑے تو سر کا ایک ایک بال چیخ اٹھا۔

وطن پہنچ کر والیٔ ریاست نے کپورتھلہ کے حالات کا بغور جائزہ لیا اور اس زنجیر کی ایک ایک کڑی توڑ ڈالی، جس نے ریاستی مظلوموں کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ اپنے باغ سے وہ تمام کانٹے چن کر پھینک دیئے جن کی چبھن سے پھول زخمی ہو رہے تھے۔ اپنے انصاف کے دریچوں سے مظلوم رعایا کی ضرورتوں کو دیکھ کر مہاراجہ کپورتھلہ اپنے انصاف کے ایوان میں آن بیٹھا۔

جنوری کے آخری ہفتے ریاست کے جنرل پولیس انسپکٹر کی معیت میں ریاست کے سب سے بڑے باغی چودھری عبدالعزیز بگیو والیہ کو سنٹرل جیل کپورتھلہ سے اپنے محل میں بلا بھیجا۔

جب وہ محل میں پہنچے۔ مہاراجہ نے سب سے پہلا سوال ان سے یہ کیا۔

"مجھے بتایا گیا ہے کہ مجلس احرار روسی طریق پر جائیدادوں کی تقسیم چاہتی ہے۔ اور مجھے یہ بتایا گیا تھا کہ تم راج گدی کے دشمن ہو؟ اور اشتراکی اصولوں پر ریاست میں انقلاب پیدا کرنا چاہتے ہو"؟

چودھری عبدالعزیز: "میرے خلاف رپورٹیں سرتاپا غلط ہیں۔ اور نہ ہی مجلس احرار تشدّدانہ انقلاب کی حامی ہے۔ میں خود ریاست کا سب سے بڑا زمیندار ہوں میرے متعلق یہ قیاس کہ میں لوگوں کی جائیدادوں کو نقصان پہنچانا چاہتا ہوں بالکل غلط ہے۔

یہ درست ہے کہ مجلس احرار انقلابی جماعت ہے اور میں ریاستی لوگوں کے حقوق کا حامی ہوں۔ غریبوں کی جائز حمایت مذہبی اور اخلاقی فرض سمجھتا ہوں۔ جس ملک کی عام آبادی تکلیف میں ہو اس کا والی قابلِ قدر نہیں۔

میں نے یہ ایجی ٹیشن اس لیے جاری کیا تھا کہ ریاست ایسے آفیسروں اور اہلکاروں سے پاک اور صاف ہو اور رعایا کے جائز حقوق کا خیال رکھا جائے۔"

مہاراجہ: "مجھے کیسے اطمینان ہو کہ تم انقلاب برپا کرنا نہیں چاہتے؟ اور مجلسِ احرار انقلابی جماعت نہیں ہے؟

چودھری صاحب: "میں اس کے متعلق ہر طرح کا یقین دلانا چاہتا ہوں، لیکن جہاں تک پُرامن ذرائع کا تعلق ہے۔ مجلسِ احرار کانگریس کی طرح عوام الناس کے حقوق کی طالب ہے۔"

مہاراجہ: میں آئینی طریق سے اصلاحات حاصل کرنے کا مخالف نہیں، مجھے بہت سی غلط رپورٹیں پہنچائی گئی تھیں کہ تم گدی کے مخالف ہو اور تشدّد کے ذریعے انقلاب پیدا

کرنے کی خواہش رکھتے ہو۔

اس گفتگو کے بعد چودھری صاحب واپس جیل بھیج دیئے گئے اور دوسرے دن تمام سیاسی قیدی چودھری صاحب سمیت ریاست کی جیلوں سے رہا کر دیئے گئے۔

چودھری صاحب رہا ہو کر مکان میں پہنچے تو ہنوز پولیس ان کے مکان کے اردگرد پہرہ دے رہی تھی۔ اتنے میں چودھری افضل حق ایم ایل۔اے، چودھری عبدالرحمٰن راہوں والے ایم۔ایل۔اے ان سے ملنے آئے۔ اس طرح شہر کے دوسرے لوگ بھی ان سے ملاقات کرتے رہے۔

(چوہدری عبدالعزیز بیگووالیہ)

چودھری عبدالعزیز

خالق روزآفرینش سے جن لوگوں کو اپنی مخلوق کی خدمت کے لیے منتخب کرتے ہیں چودھری عبدالعزیز ان میں سے ایک تھے۔ رئیس باپ کا رئیس بیٹا گھر کی تمام آسائشیں چھوڑ ریاست کی مظلوم آبادی کے دکھ درد میں شریک ہو گیا۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۵ء کی ابتدا تک موصوف کو جن مشکلات سے دوچار ہونا پڑا تاریخ اس کی ہمیشہ شاہد رہے گی۔

دل کا غنی اور مال کا غنی برابر نہیں ہوتے۔ اس بازار میں دونوں اپنا اپنا بھاؤ رکھتے ہیں۔ اس منڈی میں تہی دامن ہونا انسان کے لیے عظیم گالی ہے۔ لیکن دولت مند اگر خدا کی راہ میں تہی دامن ہو جائے تو اس کی قیمت سوا ہوتی ہے۔ چودھری عبدالعزیز ریاست کا بڑا زمیندار تھا۔ سینکڑوں مربع اراضی کا مالک ریاستی عوام کے لیے پہلے حکومت کا باغی کہلایا۔

اور جب تمام املاک بحق سرکار ضبط ہو گئی تو بجرم حق گوئی فقیر ہو کر جیل خانے چلا گیا۔ جب

چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا

چودھری عبدالعزیز رہائی کے بعد نہ صرف کپور تھلہ بلکہ ہندوستان میں غیر فانی شہرت کا مالک بن گیا۔ وہ جس شہر پہنچا عوام کو دیدہ دل فرش راہ پایا۔ یہ رونقیں اور یہ ہنگامہ ہائے زندگی جاری و ساری تھے کہ ۲۲۔ اکتوبر ۱۹۴۲ء کو چودھری عبدالعزیز اپنے گاؤں میں انتقال کر گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

چودھری صاحب ۱۸۹۵ء میں اپنے ننھیال ہریانہ ضلع ہوشیار پور میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام چودھری فضل احمد خاں تھا۔ تعلیم میٹرک تک تھی جسے چودھری صاحب نے اپنے ماموں محمد نواب خاں تحصیلدار کے ہاں گجرات اور جہلم میں حاصل کی۔ یہاں سے فارغ ہو کر اپنی زمینوں کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئے۔

یہ ۱۹۳۲ء کا دور تھا۔ ملک میں تحریک کشمیر اور مجلس احرار کے عام چرچے تھے۔ چنانچہ آپ احرار میں شامل ہو گئے۔ اپنی خداداد قابلیت کے باعث بہت جلد آل انڈیا مجلس احرار کی ورکنگ کمیٹی کے رکن منتخب ہو گئے۔

چوہدری صاحب تین بھائی تھے۔ آپ کے بعد چودھری عبدالرشید کپور تھلہ ہائی کورٹ کے جج تھے ان سے چھوٹے عزیز احمد تھے۔ جو ریاست کی طرف سے بحیثیت میجر دوسری جنگ عظیم میں شامل ہوئے۔ لیکن سقوط برما کے بعد آپ انڈین نیشنل آرمی میں شامل ہو گئے۔ یہاں آپ کی حیثیت سبھاش چندر بوس کے بعد دوسرے درجے پر تھی۔ تقسیم ملک کے بعد ۱۹۶۵ء میں ساہیوال میں انتقال کر گئے۔

چودھری عبدالعزیز نرینہ اولاد سے محروم تھے۔ اپنے بھائی چودھری عبدالرشید کے لڑکے سرفراز کو گود لے رکھا تھا۔ آجکل یہ نوجوان ہالینڈ میں ہے۔ باقی خاندان کا موضع ضلع گوجرانوالہ میں ہے۔ البتہ چودھری عبدالرشید سابق جج ہائیکورٹ کپور تھلہ جن کی عمر تادم تحریر اسی سال کے قریب ہے، لگا ہے گا ہے اپنی لاہور کی رہائش گاہ ۶۴۔ مزنگ روڈ پر نظر آتے ہیں۔

اسمبلی کا اکھاڑا جنوری کے حالات سے یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ اسمبلی میں پارلیمنٹری رپورٹ کو مسترد یا ترمیمات کرانے میں دونوں متحارب گروپ (کانگریس اور انڈی پنڈنٹ پارٹی) ایک دوسرے کے قریب آتے جا رہے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ملکی ضرورت انہیں مجبور کر رہی ہے کہ وہ غیر ملکی حکومت کو اس موڑ پر شکست دیں چنانچہ ۲۲ جنوری کو دہلی میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے مکان پر صدر کانگریس بابو راجندر پرشاد اور مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح کے درمیان فرقہ وارانہ مسئلے پر جو گفتگو شروع ہوئی اس نے حالات کو مزید جلا دی اور باہم محبت کے ٹمٹاتے چراغ میں پھر سے روشنی پیدا ہوئی۔

یکم فروری کو بھولا بھائی ڈیسائی نے اسمبلی کو اپنے ساتھیوں کے دستخطوں سے پارلیمنٹری رپورٹ کے متعلق مندرجہ ذیل ترمیم کا نوٹس دیا۔

"اس اسمبلی کی رائے ہے کہ رپورٹ کی مجوزہ سکیم کو برطانوی اقتدار کی توسیع اور اقتصادی مفاد کے جذبے کے تحت مرتب کیا گیا ہے۔ اور اس بناء پر اہل ہند کو کوئی قابل ذکر اختیارات حاصل نہیں ہوتے اور اگر اس سکیم کو قبول کر لیا گیا تو دستورِ ہند میں سیاسی اور اقتصادی ترقی کی بجائے تنزل اور انحطاط رونما ہو جائے گا۔

چنانچہ یہ اسمبلی گورنر جنرل سے سفارش کرتی ہے کہ حکومت ملک معظم کو اس بات کا مشورہ دے کہ وہ کسی ایسے دستور کو منظور نہ کرے جو اس سکیم پر مبنی ہو"

۲۔ فروری کو انڈی پنڈنٹ پارٹی کے لیڈر مسٹر محمد علی جناح (قائد اعظم) نے جائنٹ پارلیمنٹری رپورٹ پر حسب ذیل ترمیم کا نوٹس دیا۔

۱۔ اسمبلی فرقہ وارانہ اعلان کو اس کی موجودہ صورت میں اس وقت تک کے لیے قبول کرتی ہے، جب تک اس کے مقابل کوئی متفق علیہ سمجھوتہ پیش نہ ہو

۲۔ صوبجاتی حکومتوں کی سکیم کے بارے میں اس ایوان کی یہ رائے ہے کہ یہ

نہایت قابلِ اعتراض، غیر تسلی بخش اور مایوس کن ہے۔ کیونکہ اس میں بعض نقائص پائے جاتے ہیں۔ خاص کر دوسرے چیمبر میں گورنروں کو خاص اختیارات فوج اور پولیس کے متعلق دفعات اور صیغہ جات خفیہ سروس۔ ان نقائص کی وجہ سے عہدیداروں اور کونسلوں کا حقیقی ربط اور ان کی ذمہ داری ناکارہ ہو جاتی ہے۔ اس لیے جب تک ان قابلِ اعتراض نقائص کو دور نہ کیا جائے، ہندوستان کے کسی حصے کو بھی تسلی نہ ہوگی۔

۳۔ مرکزی گورنمنٹ آل انڈیا فیڈریشن کی سکیم کے مطابق اس اسمبلی کی صاف الفاظ میں یہ رائے ہے کہ یہ سکیم اصولاً ہی غلط ہے اور برطانوی ہند کے لوگوں کو نامنظور ہے۔ اس لیے حکومت ہند سے سفارش کی جاتی ہے کہ وہ ہز میجسٹی کی حکومت کو مشورہ دے کہ اس سکیم پر مبنی کسی آئین کو پاس نہ کریں اور اس بات کا بھی مطالبہ کیا جاتا ہے کہ فوراً اس بات کو سوچنے کی کوشش کی جائے کہ صرف برطانوی ہند میں کسی طرح حقیقی اور مکمل ذمہ دار گورنمنٹ قائم کی جاسکتی ہے اور اس غرض کے لیے ہندوستانی رائے عامہ کو معلوم کرے بلاتاخیر تمام پوزیشن پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ گورنمنٹ نے قانونی ممبر کی زبانی یہ بتلایا کہ کانگریس جوائنٹ پارلیمنٹری رپورٹ کی تجاویز کو کھلم کھلا رد کرتی ہے تو دفعہ ۲، ۱ میں مندرج ترمیم بھی اتنا ہی اثر رکھتی ہے۔

(تاریخ کانگریس مصنفہ ڈاکٹر بی۔ پٹا بھائی۔ سیتا رامیہ صفحہ ۵۷۵)

۴۔ فروری کو اسمبلی میں پارلیمنٹری رپورٹ پیش کردی گئی۔ دوسری کارروائی کے علاوہ سر این۔ این۔ سرکار نے بحیثیت سرکاری پارٹی کے رپورٹ پر بحث کی تحریک کا آغاز کیا۔ اس پر بنگال کے فضل حق نے اعتراض اٹھایا اور کہا کہ اب اس پر بحث نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ پارلیمنٹری رپورٹ کو برطانوی ایوان میں بل کی شکل میں پیش کیا جاچکا ہے۔

صدر نے کہا یہ اعتراض صحیح نہیں۔ البتہ ارکان اپنی تقریروں میں اسے گورنمنٹ آف انڈیا بل کہہ سکتے ہیں۔ اس کے بعد کانگریس لیڈر کی حیثیت سے مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی نے اپنی

ترمیم پیش کرتے ہوئے چالیس منٹ تقریر کی اور کہا:

"ہم بالکل واضح طور پر بتانا چاہتے ہیں کہ پیش کردہ دستور بے کار ہے۔ اور اس سے ہندوستان قطعاً خوش نہیں ہوگا اور نہ اس سے وہ مقصد پورا ہوگا جو حکومت کے پیش نظر ہے۔ اگر ہمارے پاس وہ طاقت موجود ہوتی جس کی بنا پر ہم حکومت کو اپنے استحقاق یا خواہش کے مطابق عمل پر مجبور کرتے۔ ورنہ ہمارے پاس یقیناً اس قدر خودداری تو موجود ہے کہ جس چیز کی ہمیں ضرورت نہیں اسے واپس کر سکیں اس ترمیم کی تحریک پر میں اپنی ذمہ داری محسوس کر رہا ہوں۔ جیسے کہ سرکار نے کہا ہے یہ تخریبی نہیں۔ اور اگر اسے تخریبی بھی کہا جائے تو حقیقی مقصد تعمیر ہے۔

ایک وقت تھا کہ برطانیہ نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اہل ہند نے اسے خوشنودی اور رضامندی کے ساتھ تسلیم کرتے ہوئے اپنی گردنیں جھکا دیں اس کے بعد تعلیم کا دور شروع ہوا تو اہل ہند نے اہل برطانیہ سے یہ توقع ظاہر کی کہ وہ عدل و انصاف کی بنا پر ہندوستان کو اس کا حق دے دیں گے۔ وہ وقت بھی گذر چکا ہے۔ گذشتہ تیس سال سے ہندوستان میں حالات و واقعات کا ردعمل شروع ہے۔ ہندوستان کو یہ بتلایا گیا ہے کہ برطانیہ جنگ میں محکوم آبادیوں کے استحکام اور بقار کے لیے شریک ہے۔ لیکن اس زمانہ میں جو معاہدات کیے گئے ان کی تکمیل کا کبھی وقت نہ آیا۔ یہ تاریخ انسانیت کا نہایت ہی دردناک باب ہے۔ لہٰذا اب حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر اہل ہند حکومت خود اختیاری کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔"

بہر حال رپورٹ کے مصنفین نے اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ ہم ایسی حکومت چاہتے ہیں، جس کے وزرا منتخب مجلس وضع آئین کے روبرو جواب دہ ہوں۔ آپ نے امریکہ اور سوئٹزرلینڈ کی مثالیں دے کر بتایا کہ وہاں ہر سیاسی، نسلی اور اقتصادی اعتماد کے راستے میں زبان اور نسلی امتیازات حائل نہیں ہوئے۔ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے وہ خدا اور اس کے بندوں

کے درمیان ایک منفرد رشتہ ہے جسے دنیاوی ضروریات اور اغراض کے لیے خراب نہیں کیا جا سکتا۔

اہلِ برطانیہ دوسرے لوگوں کو کیوں اس بات پر مجبور کر رہے ہیں کہ وہ مذہب کے نام پر اپنے آپ کو تقسیم کریں اور ان پر حکومتِ برطانیہ کا اقتدار قائم رہے۔"

اس کے بعد سکھ لیڈر سردار منگل سنگھ نے کہا۔

"اگر دستور اساسی کی ترکیب ملی بنیاد پر رکھی گئی تو سکھ اپنے تمام فوجی مطالبات کو نظر انداز کر دیں گے۔ فرقہ وارانہ فیصلہ خطاب یافتہ مسلمانوں کے لیے مفید ہو سکتا ہے۔ مگر عام مسلمانوں کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔"

مسٹر محمد علی جناح کی تقریر

۶-فروری کو اسمبلی کے اجلاس میں کانگریسی لیڈر کی تقریر کے بعد مسٹر محمد علی جناح نے پارلیمنٹری رپورٹ پر اپنی ترمیم کے سلسلے میں تقریر کے دوران کہا:

"میں اس اہم موقعہ پر اپنی اس غلط فہمی کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جو "اسٹیٹس مین" جیسے ذمہ دار اخبار میں میری روش کے متعلق لکھا گیا۔

اخبار مذکور نے ۲ فروری کو مقالہ افتتاحیہ میں لکھا ہے کہ کانگریس پارٹی کا کارنامہ جذبۂ نسلی منافرت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس پارٹی کو نئے نئے حلیف ملتے رہیں گے۔ آغاز میں مسٹر جناح گول میز کانفرنس کے پر جوش رکن اور فیڈریشن کے حامی تھے۔ اب وہ اس سکیم سے غیر متعلق ہو گئے ہیں اس وجہ سے بعد کے گول میز کانفرنس کے اجلاسوں میں انہیں مدعو نہیں کیا گیا۔

تقریر جاری رکھتے ہوئے مسٹر جناح نے کہا۔

"میں پورے زور سے اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ میرے دل میں نسلی نفرت کا جذبہ نہیں۔ میں آغاز میں بھی گول میز کانفرنس کا پر جوش حامی ہی نہیں بلکہ پر جوش ترین حامی تھا۔ جہاں تک کہ یہ سکیم کامیاب نہ ہوئی اور نہ ہندوستانیوں کو مطمئن

کر سکی۔

مذکورہ اخبار کا آخری حوالہ ایک بیہودگی ہے جس کا ارتکاب کوئی ذمہ دار اخبار نہیں کر سکتا۔ میں (اخبار میں) اعلان کرتا ہوں کہ میں فیڈریشن سکیم کو اس وجہ سے ناتسلی بخش کہتا ہوں کہ گول میز کانفرنس کے آخری اجلاس میں دعوتِ شرکت نہیں دی گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ مجھے آخری اجلاسوں میں اس وجہ سے مدعو نہیں کیا گیا کہ میں زیر غور سکیم کا سخت مخالف تھا"

بھولا بھائی ڈیسائی کی پیش کردہ ترمیم پر بحث کرتے ہوئے مسٹر جناح نے کہا:

"اس کا مطلب تمام سکیموں کی نامنظوری اور فرقہ وارانہ فیصلے کے متعلق غیر جانبداری ہے۔

فرقہ وارانہ فیصلے کے متعلق جہاں تک میرے ذاتی رائے کا تعلق ہے، میرا جذبہ خودداری اس وقت تک مطمئن نہیں ہو سکتا۔ جب تک ہندوستانی مفاہمت کر کے کوئی فیصلہ نہ کریں۔ میں اس فیصلے کو اس لیے تسلیم کرتا ہوں کہ اس کے بغیر کوئی حل کامیاب نہیں ہو سکتا۔

مجھے ڈیسائی کے اس نظریے سے پورا اتفاق ہے کہ مذہب، قومیت اور زبان کو سیاسیات کے دائرہ میں داخل نہیں کرنا چاہیے لیکن اقلیتوں کا مسئلہ ایک سیاسی مسئلہ ہے اور دوسرے ملکوں نے بھی اسے حل کیا ہے۔ میں سیاسی طور پر اقلیت کا تحفظ چاہتا ہوں"

مسٹر ڈیسائی کہتے ہیں۔

"پہلے حاصل کر لو اس کے بعد تقسیم کرو۔ میں کہتا ہوں کہ پھر مہاتما گاندھی نے کیوں پران نیاگ برت دھارن کر کے معاہدہ پونا کیا۔ میں ہندوؤں کو بھی مبارکباد دیتا ہوں کہ انہوں نے یہ معاہدہ کر کے اپنے پسماندہ بھائیوں کو مطمئن کر دیا لیکن کیا انہوں نے تقسیم سے پہلے حصول کا انتظام کیا۔؟ اس جذبے کے ساتھ ہم

سے بھی ہاتھ ملا لیجئے ہم تیار ہیں۔

کانگریس کے متعلق حکومت کے متضاد بیانات!

"حکومت کبھی تو یہ کہتی ہے کہ کانگریس ہندوستان کی نمائندہ ہے۔ اور کبھی یہ اعلان ہوتا ہے کہ مختصر باغی گروہ ہے۔ ان دونوں باتوں سے میں کیا نتیجہ نکالوں؟ لیکن ابنائے وطن کی ایک جماعت پر یوں تو تعزیر لگا رہے ہیں۔ تو آپ اپنے چرچل، لائیڈ، اڈوائر کے متعلق کیا کہتے ہیں۔؟

اگر میں اس طرح گفتگو کا جواب دوں جس طریق کو وہ پیار کرتے ہیں، تو آپ کو فوراً ہندوستان سے نکال دوں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ آپ مرکز کے لیے جو آئین تجویز کر رہے ہیں وہ موجودہ آئین سے بھی بدتر ہے۔ مجوزہ آئین کے معنی تو یہ ہیں کہ برطانیہ، ہند کے لیے وہ کچھ چاہتا ہے کہ جس کے لیے اس نے نصف صدی گذشتہ کام کیا ہے وہ سب قربان کر دیا جائے۔ میں اس موقعہ پر والیانِ ریاست سے بھی دریافت کرنا چاہتا ہوں۔

"کیا یہ ذمہ داری جو انہوں نے مرکز کے لیے تجویز کی ہے۔ اور جس پر وہ فیڈریشن میں شامل ہونے پر آمادہ نہیں ہیں کیا وہ اپنی رعایا کو بھی یہ حقوق دینے کے لیے تیار ہیں۔"؟

ہوم ممبر: مسٹر جناح آپ بحث کو غلط رنگ دے رہے ہیں۔

مسٹر جناح: ہوم ممبر! میرے مطلب کو غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں پھر کہتا ہوں کہ حکومت اس مسئلے پر نظرثانی کرے اور میرے وطن میں ذمہ دار حکومت قائم کی جائے۔

لارڈ ارون نے اعلان کیا تھا کہ آئین ان تجاویز پر مبنی ہوگا، جن پر زیادہ سے زیادہ اتفاق رائے ہوگا۔ لیکن مجوزہ آئین غالباً ان تجاویز پر مبنی ہے، جن پر کنزرویٹو پارٹی کے ارکان کی اکثریت متفق تھی۔ اس میں ہمارے ساتھ کوئی اتفاق رائے نہیں کیا گیا۔

اس بحث کے نتیجے میں جب اسمبلی میں ووٹ لیے تو کانگریس کو کسٹوڈ(؟) اور باقی ایوان

کو بہتر۷۲ ووٹ ملے اس پر مسٹر جناح کی تجویز منظور کرلی گئی۔

تحریک کپور تھلہ کا خاتمہ

غلاموں کا مذہب، سلطنت کی ضرورت اور اس کا منشا ہوتا ہے۔ اس نقشے کو لکیرنے اور اس میں رنگ بھرنے کا طریق بھی وہی لوگ ایجاد کرتے ہیں، جن کے ہاتھوں میں نظام سلطنت کی لاٹھی ہوتی ہے وہ عوام کو جیسے چاہتے ہیں، ہانکتے ہیں۔

متحدہ ہندوستان میں انگریزی راج نے اچھے بھلے مذہبی اصول رکھنے والی اقوام کو اپنی پالیسی اور ضرورت کے لیے اس بری طرح استعمال کیا کہ آئندہ نسلیں انہیں کبھی معاف نہیں کرسکیں گی۔ بینڈ باجوں کی آواز، اینٹوں کے ڈھیر، کاغذ اور بانس کے بنے ہوئے تصوراتی مزار اور درختوں کی ٹہنیاں اور پتوں پر نہ جانے اجنبی راج میں کس قدر انسانوں کا خون ضائع ہوا ہوگا۔

جب وقت کی ضرورت ختم ہوگئی تو عیب و ثواب کوئی عیب و ثواب نہ رہا ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی شغل تھا جو اب ختم ہوگیا۔

سلطان پور لودھی کا قضیہ اصولاً اور مذہباً کوئی اتنا اہم نہیں تھا کہ اس کے لیے انسانی لہو کی ضرورت ہوتی۔ محض تعزیہ داری اور درخت کی چند شاخوں کا رونا تھا۔ مگر اس وقت کے وزیر اعظم نے صرف اپنی ملازمت اور وفاداری کے لیے ناکردہ گناہ، مسلمانوں کا خون بہانا مناسب سمجھا اور آج جب ریاستی حاکموں کی مرضی ہے کہ اس ڈرامے کو بہر طور ختم کرنا ہے، تو یہ ختم ہوگیا۔

ریاست کے نئے وزیر اعظم نے ۲ فروری کو سلطان پور لودھی کا فیصلہ اس طرح سنایا۔

"سلطان پور کے سکھوں اور مسلمانوں کی مشترک کمیٹی تعزیہ کے راستے کی نسبت جھگڑا ختم کرنے میں ناکام رہی ہے۔ لہٰذا میں حکم دیتا ہوں کہ متنازعہ دیوار (گوردوارہ اور کربلا کے درمیان) کو فوراً منہدم کردیا جائے۔ اور اسے یہاں سے چھ فٹ پیچھے تعمیر کیا جائے۔ نیز متنازعہ درخت کے متعلق متعینہ راستہ سے تعزیوں کے گزرنے کی ممانعت کی جاتی ہے۔

میں یہ بھی حکم دیتا ہوں کہ اس راستے کی ممانعت درخت کے متبرک ہونے کی بنا پر نہیں بلکہ امن میں خلل پڑنے کے اندیشے کے باعث ہے۔"

اگر کہیں سے انصاف مل سکے تو سکھوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کے اُن رہنماؤں کو جمع کرو، جنھوں نے تعزیہ کے احترام میں درخت کی ٹہنیاں کٹوانا مناسب سمجھی تھیں، جنھوں نے درخت کو مذہب کا مقدس نشان جان کر تعزیہ کو گذرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔

جنھوں نے درخت کو دیوتا جان کر انسانی خون بہانے کو جائز سمجھا تھا۔

ان سب سے سوال کرو کہ ایک انگریز کے حکم پر تم سب چپ کیوں سادھ گئے۔ تمہارے مذہبی اعتقادات کہاں چلے گئے۔ تمہاری زبانوں پر کس نے سانپ بٹھا دیا کہ تم بولتے نہیں ہو؟ راستہ تبدیل کر دیا گیا۔ دیوار گرا دی گئی۔ درخت کو متبرک ماننے سے انکار کر دیا گیا۔

——— شیعہ کہاں ہیں؟ کہ آج تعزیہ کا راستہ تبدیل کر دیا گیا ہے۔

——— سکھ کہاں ہیں کہ گوردوارہ کی دیوار گرا دی گئی۔

——— ہندو کہاں ہیں کہ بڑ کے درخت سے دیوتا کا لباس چھین لیا گیا ہے۔

مگر اب تابِ سخن کہاں، کہ ضرورتِ ملوکیت ختم ہو چکی ہے۔

اسی تاریخ کو مہاراجہ نے وزیرِ اعظم کے مشورے پر ان تمام افسران کو ملازمت سے سبکدوش کر دیا جنہیں سلطان پور کے حادثہ میں ملوث سمجھا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ریاست کے وزیرِ داخلہ لشمبر داس کو بھی علیحدہ کر دیا گیا اور مالیہ میں بھی قدرے تخفیف کر دی گئی۔

اس کے ساتھ ہی دو سال کی جدوجہد کے بعد تحریک کپورتھلہ ختم ہو گئی۔

آزادیِ وطن کی جدوجہد میں شریک رہ کر بھی احرار ریاست کشمیر، الور اور کپورتھلہ کے عوام کو ان کے انسانی اور پیدائشی حقوق دلانے میں ہمہ تن مصروف رہے۔ آئندہ تاریخ کا مورخ ان کے لیے الگ باب قائم کرے گا۔ حالات کچھ ہی ہوں مگر اس کا اعتراف کرنا پڑے گا۔ کہ چند بوریہ نشینوں نے بادِ مخالف کے باوجود اپنا چراغ روشن کیے رکھا۔

برطانوی سامراج کی بقاء کے لیے ریاستوں کا وجود از بس ضروری تھا اور فرنگی ان سنگھاسنوں

کی پائیداری میں ہر ممکن اعانت کرتا رہا۔ مجلس احرار کے نزدیک ان طنابوں کو توڑنا لازمی تھا جو انگریزی سہارا تھیں غیر ملکی سامراج کا اس آمر سے پر نواب ، راجے اپنی مظلوم رعایا پر ظلم و ستم ڈھانے میں دلیر اور شیر ہوتے جا رہے تھے۔ احرار اس طوفان کے سامنے سینہ سپر ہو گئے اور اپنی قربانیوں سے اس ظلم کے دھارے کا رخ موڑ دیا۔

کشمیر الور اور کپورتھلہ کے عوام اور ان کی آنے والی نسلیں احرار کو ہمیشہ سلام کرتی رہیں گی۔

انڈیا بل پر بحث

جن تاریخوں میں برطانوی رپورٹ پر اسمبلی کے علاوہ سارے ہندوستان میں لے دے ہو رہی تھی۔ انہی دنوں ۷ فروری کو ایوانِ برطانیہ میں انڈیا بل پر بحث جاری تھی۔ سر سموئیل ہور نے مجوزہ بل پر اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا:

"برطانیہ کی پالیسی کے مطابق ہندوستان کا نصب العین درجہ نوآبادیات ہے موجودہ انڈیا بل میں تمہید کے فقدان کا مطلب یہی ہے کہ حکومت سابق معاہدات پر کاربند ہے اور ۱۹۱۹ء ایکٹ کی تشریح کرتے ہوئے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ برطانیہ کے نزدیک ہندوستان کا نصب العین درجہ نوآبادیات ہے۔ موجودہ انڈیا بل درجہ نوآبادیات کو حاصل کرنے کے لیے ایک زینہ ہے اور جب ہندوستان اپنے میں حکومت خود اختیاری کے حصول کی صلاحیت پیدا کر لے گا اس وقت انگلستان اپنے تمام سابقہ وعدوں کی تکمیل کر دیگا۔"

لیبر پارٹی نے کہا:

اس بل پر بحث کے دوران لیبر پارٹی کے ارکین پارلیمنٹ نے کافی ہنگامہ آرائی کی اور کہا:

"ہماری یہ خواہش ہے کہ ہندوستان کو جہاں تک ممکن ہو جلد سے جلد ایسی ترقی دی جائے جیسی کہ انگلستان کو حاصل ہے۔

برطانوی حکومت کے نظم و نسق کی خوبی کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے کروڑوں انسانوں کی زندگی کا معیار کہاں تک درست ہے"

(نوٹ) انگلستان کے تمام اخبارات نے سر سموئیل ہور کی اس تقریر پر انہیں بڑی داد دی کہ یہ تقریر ہندوستان کے حق میں ہے۔

مسٹر جناح کی صدر کانگریس کو دعوت

۲۳-جنوری کو ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے مکان پر کانگریس اور مسلم لیگ کے صدر کے مابین صلح کی جس گفتگو کی ابتدا ہوئی تھی اسمبلی کی کارروائی کے باعث وقتی طور پر اس میں تعطل آگیا۔ جیسے ہی فرصت ملی ۱۰-فروری کو مسٹر جناح نے ایک خط کے ذریعے بابو راجندر پرشاد کو از سرِ نو دعوت دی۔

"اگر ہو سکے تو آپ اسمبلی کے دوران مجھ سے ملاقات کریں"

آپ کا ایم۔اے۔جناح

کانگریس کے صدر نے ۱۲-فروری کو دہلی پہنچنے کا وعدہ کیا۔

سرکاری ممبران کی رائے

۱۴-فروری کو کونسل آف سٹیٹ میں مجوزہ رپورٹ پر بحث ہوئی۔ نامزد ممبر سر محمد یامین نے تجویز پیش کی کہ پارلیمنٹری رپورٹ کو قبول کر لیا جائے۔ یہ تجویز چودہ آراء کے مقابلہ میں بیس آراء سے منظور کر لی گئی راجہ غضنفر علی کی بھی اسی قسم کی تجویز تھی جو پیشتر منظور ہو چکی تھی۔

جناح راجندر گفتگو

اسمبلی میں انڈی پنڈنٹ پارٹی کے لیڈر مسٹر محمد علی جناح اور آل انڈیا کانگریس کے صدر بابو راجندر پرشاد کے درمیان فرقہ وارانہ فیصلے پر ۱۴-فروری کو نئی دہلی میں پھر سے گفتگو کا آغاز ہوا۔ اس ضمن میں راجندر پرشاد نے ہندو مہاسبھا کے رہنما بھائی پرمانند کو بھی اس گفتگو میں شمولیت کی دعوت دی۔ لیکن اس نے انکار کر دیا۔ تاہم راجندر، جناح گفتگو اس موضوع پر تھی۔

۱-مخلوط انتخاب کے ساتھ پنجاب اور بنگال کی آبادی کے اعتبار سے مسلمانوں کے لیے نشستوں کا تعین۔

۲-جن صوبوں میں مسلمانوں کی اقلیت ہے، وہاں مسلم نیابت کا توازن۔

اس گفتگو سے پیشتر اعلان کیا گیا تھا کہ یہ مذاکرات انفرادی ہیں۔ اگر ہم کسی نتیجے پر پہنچے تو اپنی جماعتوں کے ارکان سے مشورہ کریں گے۔

۱۵-فروری کو بھولا بھائی ڈیسائی نے لاہور پہنچ کر سکھ رہنماؤں سے فرقہ وارانہ مسائل پر

بات چیت کرنا چاہی لیکن اس میں بھائی پرمانند کی طرح گیانی کرتار سنگھ نے بھی کانگریسی لیڈر سے ملاقات کے لیے انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا:

"جب تک کانگریس کمیونل ایوارڈ کے متعلق اپنی پالیسی تبدیل نہیں کرتی ان سے بات چیت فضول ہے"

اس طرح پنجاب ہندو مہاسبھا نے بھی اعلان کیا کہ:

"اگر مسلمانوں سے کانگریس کا کوئی سمجھوتہ ہوا تو ہندو مہاسبھا اسے قبول نہیں کرے گی"

اسمبلی کانگریس پارٹی کے لیڈر بھولا بھائی ڈیسائی نے لاہور میں سر منوہر لال، رائے بہادر درگاداس، پنڈت نانک چند، لالہ جگن ناتھ، سر گوکل چند نارنگ، سردار منگل سنگھ، سردار سردول سنگھ کویشر، گوپال سنگھ قومی سے حالات و واقعات پر گفتگو کی۔ لیکن وہ اپنے مشن میں ناکام ہو کر واپس چلے گئے۔

مسلم لیگ کا اجلاس

۱۶۔ فروری کو نئی دہلی میں مسٹر محمد علی جناح کی صدارت میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا۔ جس میں جناح، راجندر گفتگو کے ضمن میں مسٹر جناح نے تمام ممبران سے رازداری پر حلف لیا۔ اور پھر تمام گفتگو جو اس وقت تک ہو چکی تھی انہیں بتائی اس اجلاس میں طے پایا کہ مسلم لیگ کی طرف سے کوئی تجویز پیش نہ کی جائے۔ اگر کانگریس کوئی تجویز پیش کرے تو اس پر غور کرنے سے تامل نہ کرنا چاہیے اور نہ گفتگو میں حصہ لینے سے انکار کرنا چاہیے۔

اس اجلاس میں خان عبدالصمد اچکزئی اور عبدالعزیز کی رہائی کا مطالبہ کیا گیا۔ مندرجہ ذیل حضرات اس اجلاس میں شریک ہوئے۔

سر فیروز خاں نون، سر محمد یعقوب، مولانا غلام بھیک نارنگ، خان بہادر رحیم بخش، عبدالمتین چودھری، نواب احمد یار خاں دولتانہ، راجہ غضنفر علی وغیرہ۔

مسٹر جناح کی تقریر

۱۸۔ فروری عربی کالج دہلی کے ایک سیاسی مباحثہ کی صدارت کے دوران مسٹر محمد علی جناح (قائداعظم) نے کہا۔

"ہندوستان کی بساطِ سیاست پر ایک طرف عظیم الشان ہندو قوم ہے اور دوسری طرف مسلمان۔ ہم نے ہندوؤں کو متعدد بار صلح پر آمادہ کرنا چاہا اور ان کی طرف دستِ تعاون بڑھایا۔ لیکن ہر مرتبہ مسلمانوں کے ساتھ نہایت ہی حقارت آمیز سلوک کیا گیا۔ اور یہ کہنا صحیح نہیں، کہ گول میز کانفرنس میں فرقہ وارانہ گفتگو میں ناکامی کے ذمہ دار مسلمان ہیں۔ مسلمانوں نے دو مرتبہ مخلوط انتخاب پر فرقہ وارانہ سمجھوتہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ہر بار ہماری رائے کو ٹھکرا دیا گیا اور اس کی بڑی وجہ ڈاکٹر مونجے اور مسٹر جیکار جیسے لوگوں پر عائد ہوتی ہے۔ ہم اتنے بیوقوف نہیں کہ اتحاد کی ضرورتوں کا احساس نہ رکھتے ہوں۔ ہم اتحاد چاہتے ہیں اور صرف ملک کے مفاد کی خاطر۔

آپ یقین جانیئے کہ ہندوستان میں کوئی خوددار ہندوستانی ایسا نہ ہوگا جو اتحاد کا خواہاں نہ ہو۔ کیونکہ اتحاد کے بغیر دنیا کی نظروں میں ہم ذلیل و خوار نظر آتے ہیں"

اسمبلی میں اپنی تقریر کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

"میں اتنا کم عقل نہیں ہوں کہ اسمبلی میں جوائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی کی رپورٹ پر جو مباحثہ ہوا اس پر اسمبلی نے جو فیصلہ دیا اس کو میں اپنی ذاتی فتح سمجھ لوں۔ بلکہ یہ تمام ملک کی فتح ہے۔ میں تو اس کی کامیابی کا ایک ذریعہ تھا۔ لیکن یہ فتح کاغذی حیثیت سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔

میں یہ بھی یقین رکھتا ہوں۔ کہ اسمبلی کے فیصلے کے بعد حکومت اپنا سامان اٹھا کر بمبئی سے لندن روانہ ہو جائے گی۔ یقین جانیئے جب تک ہندو مسلم اتحاد نہ ہوگا ہم کوئی چیز حاصل نہ کر سکیں گے۔ میں حصولِ اتحاد کے لیے اپنی انتھک اور انتہائی کوشش صرف کروں گا۔ اگر میں اس میں کامیاب ہو گیا تو یقیناً ہندوستان کی جنگِ آزادی نصف سے زائد کامیاب ہو جائے گی۔"

نمائندہ احرار کا بیان

واقعات شاہد ہیں کہ جب کبھی ہندوستان میں مسلم حقوق کا سوال سامنے آیا۔ مجلس احرار نے اپنی جماعتی حیثیت کو ذرا محسوس کیا۔

لیکن جہاں کہیں اس سلسلے میں کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان بات چلی احرار نے اپنے کو ہمیشہ علیحدہ رکھا۔ اگرچہ اس دور میں مسلم لیگ پر سروں اور خان بہادروں کا قبضہ تھا اور ان عناصر سے مسلم حقوق کی نگہداشت کا گمان کرنا ایک سراب کی حیثیت رکھتا تھا اس پر بھی احرار رہنماؤں نے نتیجے کا انتظار کیے بغیر کسی فیصلے پر رائے زنی سے اعتراض کیا۔

۲۴ جنوری کو جناح، راجندر گفتگو شروع ہوئی اور کچھ دنوں کے لیے ملتوی ہو گئی۔ ۱۰۔ فروری کو یہ سلسلہ دوبارہ شروع ہوا۔ اس پر ۲۰ فروری کو دہلی میں جناح، راجندر گفتگو کے متعلق اخباری نمائندوں نے مجلسِ احرار کی رائے معلوم کرنے کے لیے مسٹر خالد لطیف گابا سے بیان دینے کو کہا۔ انہوں نے کہا:

"ملک کے ہر بہی خواہ کو اس گفتگو کے لیے جناح اور راجندر بابو کا شکرگذار ہونا چاہیے۔ موجودہ حالات میں مسلمانوں کو اکثریت کی طرف سے رواداری کی ضرورت ہے۔ اینٹی کمیونل ایوارڈ کی کوششیں مجوزہ گفتگو کے لیے مفید ثابت نہیں ہو سکتیں اور نہ ہی اس قسم کی دھمکیوں سے مسلمان مرعوب ہو سکتا ہے۔

اگر فریقین نے کوئی قابلِ قبول سمجھوتہ مرتب کر لیا تو احرار کو اس پر بڑی مسرت ہو گی۔"

خالد لطیف گابا نے آگے چل کر کہا:

"اس موقعہ پر اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ میثاقِ لکھنؤ ۱۹۱۶ء کا برطانوی پالیسی پر نہایت گہرا اثر پڑا تھا۔ لہٰذا موجودہ ہندو مسلم میثاق بھی دور رس نتائج کا حامل ہو گا۔"

بنگالی مسلمان

ہندوؤں اور سکھوں کی دیکھا دیکھی بنگال کے مسلمانوں کی طرف سے بنگال مسلم لیگ کے صدر مولوی عبدالکریم ایم۔ایل۔اے نے ۲۰۔ فروری کو جناح، راجندر گفتگو کے دوران مسٹر جناح اور راجندر پرشاد کو تار کے ذریعے مطلع کیا کہ:

"بنگال کے مسلمانوں کو اکاون فیصد نشستیں ملنی چاہییں۔"

اس موقعہ پر چاہیے تو یہ تھا کہ پنجاب کا مسلمان دونوں رہنماؤں کو اپنے صوبے کے تاثرات

بھیجتا لیکن چونکہ پنجاب کے مسلمان پر احرار کا اثر غالب تھا اور احرار کی پالیسی کا اظہار خالد لطیف گابا کر چکے تھے۔ لہٰذا پنجاب خاموش رہا۔

والیانِ ریاست

۲۵۔فروری کو بمبئی پٹیالہ ہاؤس میں والیانِ ریاست کا ملتوی شدہ اجلاس اپنے آخری فیصلے کے لیے مہاراجہ پٹیالہ کی صدارت میں شروع ہوا۔ جس میں چھوٹی بڑی چالیس ریاستوں کے فرمانرواؤں نے شرکت کی۔

اس اجلاس میں برطانوی رپورٹ کے متعلق مہاراجہ پٹیالہ نے ایک قرارداد پیش کی۔ جس کی تائید نواب آف بھوپال اور مہاراجہ بیکانیر نے کی۔ اس قرارداد پر چوبیس گھنٹے بحث رہی۔ آخر میں والیانِ ریاست نے دستورِ اساسی کو نامنظور کرتے ہوئے انڈیا بل اور مجوزہ دستور میں ترمیم کا سختی سے مطالبہ کیا۔

اس قرارداد کے جواب میں ۲۷۔فروری کو دارالعوام لندن میں وزیرِ ہند مسٹر سموئیل ہور نے کہا:

"والیانِ ریاست نے برطانوی حکومت پر الزام لگایا ہے۔ کہ حکومت اپنے وعدوں پر قائم نہیں رہی۔ میں والیانِ ریاست کو صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ان کا یہ الزام غلط ہے۔ اور اگر مسودۂ قانونِ ہند کی ترتیب و تدوین میں مجھ سے کوئی خامی رہ گئی ہے تو میں اس میں مطلوبہ ترمیمات کرنے کو تیار ہوں۔ والیانِ ریاست کا مطالبہ ہے کہ ہندوستان میں بااثر فیڈریشن قائم کی جائے۔

میں خود بھی اس کا حامی ہوں۔ جہاں تک میرا خیال ہے والیانِ ریاست نے فیڈریشن کے متعلق اپنے نظریے میں تبدیلی نہیں کی۔ اگر حکومتِ برطانیہ اور والیانِ ریاست دونوں فیڈریشن کے قیام کے موید ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کے اور ہمارے مابین فیصلہ نہ ہو۔

والیانِ ریاست کے چند مطالبات کا ذکر انڈیا بل میں کیا گیا ہے۔ اس کا تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ ان کے مطالبات منظور کر لیے جائیں گے۔ ہمارے اور والیانِ ریاست کے درمیان کوئی وسیع خلیج حائل نہیں۔"

نئے رفیقِ سفر

موسمی تغیرات کے دن بھی عجیب ہوتے ہیں۔ زمین اودے اودے نیلے نیلے پھول اگلتی ہے۔ شاخیں پھوٹتی ہیں۔ ان پر جوان پتے بہار کی آمد کا اعلان کرتے ہیں۔ کلیاں جوبن کے ابھار سے گل بوٹوں میں نکھار پیدا کرتی ہیں۔ درخت اجلے پیرہنوں سے آراستہ فضاؤں میں رنگِ بہاراں بکھیرتے ہیں، کہ ساری کائنات مسکرا اٹھتی ہے۔ عشاق کے دل انہی دنوں نافۂ آہو کی طرح اپنے جذبات میں رنگ بھرتے ہیں۔ حسن دریاؤں میں لہروں کی طرح دل کی موجوں سے کھیلتا ہے۔ حسن و عشق کے سنگم میں اسی موسم میں نکھار آتا ہے۔ پھر کبھی جھنگ کے بیلے آباد ہوتے ہیں، اور کبھی چناب کے کنارے ساون بھادوں کے انتظار میں رود کوہیاں ریت کے گھروندے بناتی ہیں اور گرا دیتی ہیں۔

فطرت اپنی بوقلمونیوں کا یہ تماشہ دیکھتی ہے۔ آخر آئندہ موسم کے انتظار میں یہ ہیولے فضاؤں میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔

سیاسی تنظیموں کے جوار بھاٹا میں بھی اسی طرح تغیر آتا رہتا ہے۔ نئے ساتھی نئی آرزوؤں کے ساتھ جماعتوں میں شریک ہوتے ہیں تو کارواں کی رونق بڑھتی ہے۔ سالارِ قافلہ اپنی ذمہ داریاں نئے رفیقوں میں تقسیم کر کے پر خوشی محسوس کرتا ہے۔ جوان امنگیں نئے احساس سے جب اس بوجھ کو سنبھالتی ہیں تو جماعتوں میں ترقی کی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ یہی وہ موڑ ہے جہاں سے ملک و ملت کو نئے کارکن میسر آتے ہیں۔ اگر یہ مخلص ہوں تو بڑ کے سائے کی طرح بھلے ہی بہار رہتی ہے ورنہ غیر مخلص لوگوں کا ہجوم ایک بھیڑ ہے اور بس۔

سالِ رواں کے یہی دن تھے جب مجلس احرار میں نوابزادہ نصراللہ خاں رئیس جتوئی (ضلع مظفر گڑھ)، مظہر نواز خاں بی۔ اے ملتان، صاحبزادہ سید فیض الحسن سجادہ نشین آلو مہار شریف ضلع سیالکوٹ، حکیم عبدالسلام ہری پور ہزارہ، خان مہدی زمان خاں کھلا بٹ ضلع ہزارہ۔ عبدالرب نشتر پشاور، غازی محمد حسین ضلع لائلپور، میر عبدالقیوم ایڈووکیٹ لائلپور، خواجہ غلام حسین ایڈووکیٹ لائلپور، چودھری عبدالستار دہلی۔ ایم۔ ایم بشیر علیگڑھ (یو۔ پی)، سردار محمد شفیع رئیس عثمان والہ (ضلع لاہور) شامل ہوئے۔ ان کی آمد سے جماعت میں نئی روشنی، نئے خیالات اور جذبات ابھرے۔ اس کے ساتھ ہی مرکزی ورکنگ کمیٹی میں تبدیلیاں آئیں چنانچہ نوابزادہ

نصراللہ خاں، حکیم عبدالسلام، صاحبزادہ فیض الحسن، سردار محمد شفیع، خاں مہدی زمان، خواجہ عبدالرحیم عاجز اور قاضی احسان احمد کو مرکزی عاملہ میں شامل کر لیا گیا۔

سیاسیات میں اُن جماعتوں کی عمر ڈھلتے آفتاب کی طرح ہوتی ہے، جس کے رہنماؤں میں جوہر قابل کی پہچان نہ ہو سا حرار رہنما جذبات کے ساتھ خلوص کی جانچ پڑتال کرنے میں اپنے دل کے آئینے کو سامنے رکھتے۔ اگر اس میں کوئی میل نہیں تو آنے والے کے خلوص پر بھی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ گو (POLITICAL ORGANISATIONS) میں ہمہ اقسام کے لوگ آتے ہیں اور ان کی پرکھ پر جماعتیں برس ہا برس گذار دیتی ہیں۔ پھر کہیں اعتماد بحال ہوتا ہے۔ لیکن غیر ملکی غلامی کے دنوں جذبہ حریت کارفرما ہونے کی شرط ضروری تھی۔ یہی وجہ تھی کہ احرار رہنما نووارد کو صفِ اوّل میں جگہ دیتے۔ بدیں وجہ مخالفین، احرار کارکنوں سے ناراض رہے۔

جناح، راجندر گفتگو کا خاتمہ

امسال ۲۲۔ جنوری کو مسٹر محمد علی جناح اور بابو راجندر پرشاد کے درمیان جس گفتگو کا آغاز ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے مکان پر ہوا تھا۔ بالآخر یکم مارچ کو دونوں رہنماؤں نے بغیر کسی نتیجے پر پہنچے ایک مشترک اخباری بیان کے ذریعے اس کی ناکامی کا اعلان کر دیا۔

مشترک بیان: نئی دہلی۔ یکم مارچ راجندر پرشاد اور مسٹر جناح کی گفتگو کے متعلق مندرجہ ذیل بیان جاری کیا گیا ہے۔

> "ہم نہایت افسوس اور دیانت کے ساتھ فرقہ وارانہ مسئلے کو اس اسلوب پر حل کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں، جو تمام پارٹیوں کے نزدیک قابل قبول ہو۔ لیکن ہمیں اس بات پر افسوس ہے کہ انتہائی کوشش کے باوجود ہم کوئی فارمولا مرتب نہیں کر سکے۔
>
> ہمیں اس بات کا احساس ہے کہ ملک کی ترقی فرقہ وارانہ اتحاد و اتفاق سے ہی پروان چڑھ سکتی ہے اور بہ حالات موجودہ ہم توقع کر سکتے ہیں کہ بعض ایسے عناصر پیدا ہو جائیں گے جو آئندہ اس طرح کی کوشش کو بار آور کر سکیں۔"

اس پر ایسوسی ایٹڈ پریس نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

جناح راجندر گفتگو کی ناکامی پر

"جناح اور راجندر بابو نے اپنے طویل مذاکرات میں جو اساسی اصول جمع کر لیے تھے۔ اگر بات ان میں رہتی تو یہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے۔ مسلم لیگ اور کانگریس بھی اسے منظور کر لیتیں۔ لیکن انہوں نے چونکہ دوسری پارٹیوں کو بھی رضامند کرنا چاہا اس لیے انہیں اپنی خواہش میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔"

(روزنامہ انقلاب۔ ۳۔ مارچ ۱۹۲۵ء)

سکھوں کا اعلان ۲۔ مارچ کو ماسٹر تارا سنگھ اور گیانی کرتار سنگھ نے مشترکہ پریس بیان میں اعلان کیا کہ

"۱۔ پنجاب میں مسلمانوں کو آئینی اکثریت نہ دی جائے۔

۲۔ رائے دہندگی کے مختلف معیار رائج نہ کیے جائیں۔

۳۔ مرکز میں مسلمانوں کو وہی اقلیتی نیابت دی جائے جسے ان کے نمائندے الہ آباد میں منظور کر چکے ہیں۔"

غازی عبدالقیوم کو پھانسی آئین ۱۹۲۵ء کے نافذالعمل ہونے کے دن جیسے جیسے قریب آتے گئے۔ فرنگی حکمران نئے حیلے بہانے تلاش کرتے رہے تاکہ اقوام ہند کسی طرح متحد نہ ہو سکیں۔ ایک طرف اگر ہندوستانی رہنما اپنی مشترک کوششوں میں مصروف تھے کہ کسی طرح برطانوی آئین کو شکست دے سکیں، تو دوسری طرف حکمران ٹولہ بھی غافل نہیں تھا۔

اوائل ۱۹۲۵ء میں غازی عبدالقیوم نے توہین رسول کے جرم میں لالہ نتھو رام کو کراچی میں قتل کر دیا تھا۔ عبدالقیوم ضلع ہزارہ کی ایک دور افتادہ بستی غازی کا رہنے والا تھا مزدوری کرنے کے لیے کراچی آیا۔ توان دنوں آریہ سماج حیدر آباد سندھ کے سیکرٹری نتھو رام نے "ہسٹری آف اسلام" نامی کتاب شائع کی تھی۔ یہ رنگیلا رسول (نعوذ باللہ) جیسی کتابوں سے ماخوذ مواد پر مشتمل تھی۔ وہ توہین رسول کو برداشت نہ کر سکے اور اس پر اچھا خاصہ ہنگامہ ہوا۔ اگرچہ نتھو رام کو حکومت نے گرفتار کر لیا، لیکن وہ ضمانت پر رہا ہو چکا تھا۔ اس مقدمے

کے حالات بھی وہی رنگ اختیار کر گئے، جو پنجاب میں راجپال کے قتل سے پیدا ہو گئے تھے چنانچہ مقدمہ زیر سماعت تھا۔ ہندو مسلمان بھاری تعداد میں کارروائی سن رہے تھے۔ ایک دن نتھورام اپنے دوستوں کے درمیان کمرہ عدالت میں خوش گپیوں میں مصروف تھا کہ غازی عبدالقیوم نے تیز دھار خنجر سے اسے قتل کر دیا۔

دوران مقدمہ عبدالقیوم نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا۔ اس کے باوجود کارروائی طویل تر ہوتی چلی گئی۔ آخر غازی صاحب کو سزائے موت کا حکم سنا دیا گیا اور تمام عدالتوں سے اپیل خارج ہو گئی ۶۔ مارچ ۱۹۳۵ء کو پھانسی کا دن مقرر ہوا، مگر مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے جوش کے پیش نظر مقررہ کردہ تاریخ ملتوی کر دی گئی۔ نیز اخبارات کو دفعہ ۱۴۴ کے تحت منع کر دیا گیا کہ وہ اس ضمن میں کوئی کارروائی شائع نہ کریں۔ اس سے مسلمان قدرے مطمئن ہو گئے کہ شاید غازی کی سزائے موت عبور دریائے شور میں تبدیل کر دی گئی ہے۔ لیکن ۲۰۔ مارچ کو یکایک بغیر کسی اطلاع کے غازی عبدالقیوم کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا اور ان کی لاش حکام جیل نے خود ہی دفن کر دی۔ مسلمانوں کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے لاش کو نکال کر اس کا جلوس نکالا۔ اس پر کراچی میں خاصہ ہنگامہ ہو گیا اور گورا فوج نے مسلمان ہجوم پر گولی چلا دی۔ اس کے نتیجے میں بقول ہوم سیکرٹری حکومت ہند، جس نے اسمبلی میں احرار کے نمائندہ خالد لطیف گابا کے جواب میں کہا کہ پینتیس ۳۵ مسلمان شہید اور ستر سٹھ کے قریب زخمی ہوئے ہیں۔ تینتیس ۳۳ کے قریب مسلمان ایسے تھے جنھیں معمولی زخم آئے۔

کراچی کے اس واقعہ نے ملک کے سنبھلتے ہوئے فرقہ وارانہ حالات میں از سر نو زہر گھول دیا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی آنکھوں کے ڈورے پھر سرخ دکھائی دینے لگے۔

معاہدہ وارسائی سے ہٹلر کا انکار

یورپ کے سیاستدان اپنی جگہ مطمئن تھے کہ ہٹلر باوجود اپنی فوجی طاقت بڑھانے کے معاہدہ وارسائی سے انحراف نہیں کر سکتا۔ فرانس، برطانیہ کا اتحادی ہونے کے باعث مطمئن تھا۔ لیکن ۱۶ مارچ کو ہٹلر نے معاہدہ وارسائی سے باضابطہ طور پر انکار کر دیا اور ان تمام پابندیوں کی تعمیل سے انکار کر دیا جو تحدید اسلحہ کے بارے میں جرمنی پر لگائی گئی تھیں۔ اور ساتھ ہی ہٹلر نے کھلم کھلا اسلحہ کی دوڑ

شروع کر دی۔ اس پر بھی برطانیہ اور فرانس نے کوئی اہمیت نہ دی۔ کیونکہ ان کے نزدیک جرمنی کے پاس اسلحہ بہت ہی کم ہے اور وہ اتنا زیادہ سامان تیار نہ کر سکے گا جو ان کے لیے پریشانی کا باعث ہو۔

تاہم ہٹلر کے اس اعلان سے برطانوی سیاست دانوں کی بھنویں تن گئیں۔ اور ان کے ذہن کی تمام بساط الٹ گئی۔ فکر کے تمام نقشے بدل گئے، جو وہ جرمن کے متعلق سوچے ہوئے تھے۔ برطانوی دانشوروں کو یقین تھا کہ جرمن حبشہ کے خلاف اٹلی سے تعاون کرتے ہوئے اس لڑائی میں شریک ہو کر اپنی محدود طاقت ضائع کر لے گا۔ اس بنیاد پر فرانس اور برطانیہ اطالیہ اور حبشہ کی جنگ میں فریق نہیں بنے۔ لیکن ہٹلر نے باوجود اٹلی کا حامی ہونے کے نہ صرف خاموشی اختیار کی بلکہ فرانس کے خلاف مہم شروع کی کہ فرانس اور روس کے معاہدہ سے سارے یورپ میں اشتراکیت کو پھیلنے کا موقعہ ملے گا۔ اور اس طرح سارا یورپ سٹالن کی آغوش میں چلا جائے گا۔ لہٰذا اقوام یورپ کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اشتراکیت کے دیو ہیکل سے محفوظ کریں۔ جرمنی اس سلسلے میں ہر ملک سے تعاون کرنے کو تیار ہے۔

یورپ کے قریباً سبھی سرمایہ داران حکومتوں پر غالب تھے۔ ان کے نزدیک روس کا نظام ان کی موت کا پیغام ثابت ہو سکتا تھا اس لیے وہ جرمن پراپیگنڈے سے اس قدر متاثر ہوئے کہ عوام سمیت پورا یورپ اپنے حکمرانوں کے خلاف چیخ اٹھا۔

ان حالات نے یورپ میں دوسری جنگ عظیم کے آثار مزید واضح کر دیے جس سے برطانوی سیاستدانوں کے چہروں کی ہوائیاں اڑنے لگیں۔

ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نفاذ سے ہندوستان بھی برطانیہ سے خوش نہیں تھا۔ ایسے میں برطانوی حکومت دو طرفہ مشکلات میں الجھ گئی۔ اگر یورپ میں دوسری بڑی لڑائی کا کوئی امکان ہے تو برطانیہ کو ہندوستان کے تعاون کی بہرحال ضرورت ہو گی۔ کیونکہ اتحادیوں کو پہلی جنگ عظیم میں فتح کا سہرا غلام ہندوستان نے بندھوایا تھا، اور مستقبل میں بھی یہی کام دے سکتے تھے۔ خصوصاً پنجاب کا صوبہ برطانیہ کی فوجی چھاؤنی سمجھا جاتا تھا اور اس صوبے کا امن حکومت کو اپنی ضرورت کے لیے نہایت اہم تھا۔ لیکن مجلس احرار جو اس راستے میں پہاڑ سے بھی بلند تر تھا۔ جبکہ نئے آئین کے تحت انتخابات قریب آ رہے تھے۔ ان حالات میں حکومت کسی ایسی پارٹی کو پنجاب کی مسند اقتدار

سونپنا پسند نہیں کرتی تھی جو اس کی منشار کے خلاف ہو۔ چنانچہ اس اہم ضرورت اور سیاسی اغراض کے تحت یونینسٹ پارٹی کو آگے بڑھایا گیا۔

یونینسٹ پارٹی

۱۸۵۷ء کے بعد جس طرح انگریز نے تعلیم کے بہانے سر سید کو آگے بڑھا کر مسلم اور غیر مسلم کے درمیان نفرت کی بنیاد ڈالی تھی۔ اسی طرح شہری اور دیہاتی کے درمیان تفریق پیدا کرنے کے لیے ۱۹۲۴ء کو میاں سر فضل حسین سے کام لیا گیا۔ اس دور میں پنجاب کا گورنر سر مالکم ہیلی تھا۔ یہ انگریزی اقتدار کا منجھا ہوا آدمی تھا۔ اس نے جون ۱۹۲۴ء کو اپنے عہدے کا چارج سنبھالتے ہی میاں سر فضل حسین کی حکومتی سرگرمیوں کو ذاتی طور نا پسند کیا۔ یہ چپقلش اصول کی نہیں محض انا کی خاطر تھی۔ گورنر نے سر فضل حسین سے (جو ۱۹۲۳ء میں یونینسٹ پارٹی قائم کر کے سر چھوٹو رام کی ہمراہی میں پنجاب کونسل کے اندر کام کر رہے تھے) خواہ مخواہ لڑائی مول لی۔ اس کے نتیجے میں سر شہاب الدین اور احمد یار خاں دولتانہ کو آگے بڑھایا۔ پھر ان کے مقابل نون اور ٹوانے۔ زمیندار اور زراعت پیشہ لوگوں کے نمائندے بن کر سامنے آگئے۔ آگے چل کر یہی لوگ یونینسٹ پارٹی کہلائے اور ان کے رہنما سر میاں فضل حسین تھے۔

اس دوران میں ملک میں فرقہ وارانہ اور سیاسی تحریکات نے اس پارٹی پر منوں مٹی ڈال دی لیکن ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت ہونے والے الیکشن کے لیے ان گڑھے مردوں کو غیر ملکی ہاتھوں نے پھر سے اکھاڑا۔ اول اس لیے کہ دیہاتی عوام پر ان وڈیروں کا اثر تھا اور فوجی بھرتی کے لیے بھی انہی کا وجود اہمیت رکھتا تھا۔ دوسرا ووٹروں کی اکثریت بھی دیہاتوں میں تھی اور آئندہ انتخاب کا انحصار بھی اسی طبقے پر تھا۔

لہٰذا مجلس احرار اور اس طرح کی انتہا پسند جماعتوں کے خلاف انگریز کا اس محاذ کو منظم کرنا اہم سیاسی چال تھی۔

اس ضمن میں علامہ اقبال اپنی کتاب "حرف اقبال" کے صفحہ ۱۱۹ پر لکھتے ہیں:

"شہری اور دیہاتی مسلمان کی تمیز کے لیے کون ذمہ دار ہے؟ جس کی بدولت مسلمان جماعت دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی اور دیہاتی حصہ خود بہت سے گروہوں میں بٹ گیا جو ہر دم آپس میں برسر پیکار رہتے ہیں۔

سر ہربرٹ ایمرسن پنجابی مسلمانوں کی صحیح قیادت کی عدم موجودگی کا گلہ کرتے ہیں
اے کاش! وہ سمجھ سکتے کہ حکومت کی اس شہری دیہاتی تمیز نے جسے وہ خود غرض
سیاسی حیلہ بازوں کے ذریعے برقرار رکھتی ہے، جماعت کو ناقابل بنا دیا ہے کہ
وہ صحیح رہنما پیدا کر سکے۔ میرے خیال میں اس حربے کا استعمال ہی اس غرض
سے کیا گیا ہے تاکہ کوئی صحیح رہنما پیدا نہ ہو سکے۔"

اسی طرح کمیونسٹ پارٹی کے رہنما سجاد ظہیر (بمبئی) اپنے کتابچہ مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے صفحہ ۸ تا ۱۰ پر لکھتے ہیں:

"۱۹۳۵ء میں میاں سر فضل حسین وائسرائے کی کونسل کی ممبری سے سبکدوش ہونے کے بعد پنجاب واپس آ گئے۔ اس مرتبہ انہوں نے نیا بھیس بدلا اور فرقہ پرستی کے خلاف آواز اٹھانے لگے۔ اس زمانے میں انہوں نے ایک گمنام مفلٹ شائع کرایا اور اس میں پنجاب کی تمام مصیبتوں کا واحد علاج یہ بتایا کہ ایک غیر فرقہ وارانہ پارٹی قائم کی جائے۔ میاں صاحب اس وقت تک فرقہ پرستی کے سب سے بڑے علمبردار تھے۔ ان کی اس تبدیلی کو دیکھ کر لوگ حیران تھے۔ مگر میاں صاحب مرحوم کی کوئی بات مصلحت سے خالی نہیں ہوتی تھی۔ ملک میں عنقریب نیا دستور آنے والا تھا۔ اس دستور نے پہلے کے مقابلہ میں بہت زیادہ لوگوں کو حق رائے دہی عطا کیا تھا۔ رجعت پسندوں کا راج قائم رکھنے کے لیے نئی صوبائی اسمبلیوں میں اکثریت حاصل کرنا ضروری تھا اور اس کی صورت صرف یہ تھی کہ سبھی رجعت پسند کیا مسلمان اور کیا ہندو یا سکھ مل کر زور لگائیں۔ پرانی قانون ساز مجلسوں میں سرکاری اور نامزد کیے ہوئے ممبروں کی تعداد زیادہ ہوا کرتی تھی۔ حق رائے دہندگی بہت محدود تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ وزیروں کو خود گورنر مقرر کیا کرتا تھا اور وہ کونسل کے منتخب ممبروں کے سامنے جواب دہ نہیں ہوتے تھے۔ لیکن نئے دستور میں اب یہ باتیں ممکن نہ تھیں۔ پھر سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ کانگریس نے انتخابوں میں حصہ لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

پنجاب کے مسلمانوں میں جمعیت احرار کو بھی مقبولیت اور ہر دلعزیزی حاصل تھی

یہ لوگ بھی ابتدا میں کانگریسی تھے لیکن آگے چل کر انہوں نے اپنی ایک علیحدہ جماعت قائم کر لی تھی۔ پنجاب کے سکھوں اور نوجوانوں میں کسان سبھا اور نوجوان سبھا کی تحریکیں کافی مضبوط ہو چلی تھیں۔ رجعت پسند لوگ یہ آثار دیکھ کر سہمے جا رہے تھے اس خطرے کا مقابلہ کرنے کی ایک ہی صورت تھی اور وہ یہ کہ ان تمام رجعت پسندوں کو ملا کر ایک مضبوط پارٹی قائم کی جاتی جو کانگریس اور لیگ، احرار اور اکالیوں اور کسانوں اور مزدوروں کی دشمن ہو۔ نوکر شاہی کی بھی یہی خواہش تھی۔ ہندوستان میں محدود قسم کی جمہوریت بھی اس کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہی تھی۔ ہر صوبے کے گورنر اور ان کے سیکرٹریوں کے محکمے بھی طرح طرح کے منصوبے باندھ رہے تھے اور ساز باز کر رہے تھے تاکہ آنے والے انتخابوں میں کسی طرح بھی جمہوری عناصر کو کامیاب نہ ہونے دیا جائے۔ انتخابی حلقوں کی حد بندی کے لیے جو کمیٹیاں مقرر کی گئیں انہوں نے قوم کے ان دشمنوں کے مفاد کا خیال رکھا۔ انتخابی حلقے اس طرح بنائے جا رہے تھے کہ حکومت کے پٹھوؤں اور رجعت پسندوں کو انتخاب لڑنے میں آسانی ہو۔ چنانچہ پنجاب میں میاں سر فضل حسین کے مشورے سے جو انتخابی حلقے بنائے گئے وہ پنجاب کے بڑے بڑے دولتمند زمینداروں کیلئے بے حد موزوں تھے۔

قوم کے تمام رجعت پسند دشمنوں کو ایک جماعت میں لے آنا اور حکومت کے تمام ہتھکنڈوں سے کام لے کر ان کو اسمبلی میں منتخب کرانا ہی یونینسٹ پارٹی کے بانی میاں سر فضل حسین کا سب سے بڑا مقصد تھا لیکن میاں صاحب مرحوم بڑے ہوشیار تھے۔ انہوں نے اتنے پر ہی بس نہیں کیا انہوں نے ترقی پسند جماعتوں کو ایک دوسرے سے لڑانے کی بھی کوشش کی۔ ان کو امید تھی کہ اگر مسلمانوں کی ترقی پسند جماعتوں مثلاً مسلم لیگ، کانگریسی مسلمانوں، اتحاد ملت اور جمعیت احرار میں آپس میں نفاق پیدا ہو جائے اور یہ سب مل کر کانگریس سے متحد نہ ہونے پائیں تو یونینسٹ پارٹی یعنی رجعت پسندوں کی متحدہ پارٹی کی کامیابی بالکل یقینی ہو جائے گی۔ مختصر یہ کہ یونینسٹ پارٹی کی کامیابی چار باتوں پر منحصر تھی۔

پہلی یہ کہ پنجاب کے تمام رجعت پسند عناصر مثلاً بڑے بڑے دولتمند زمیندار، خطاب یافتہ حضرات، وظیفہ یاب فوجی افسر، کپتان، میجر، لفٹینٹ، ذیلدار (گاؤں کا سرپنچ)، نمبردار (گاؤں کا تحصیلدار)، دولتمند مہاجن وغیرہ سب متحد ہو جائیں۔ یہ تمام عناصر برطانوی سامراج کی پیداوار اور اسی کے پروردہ ہیں۔ ان کو صرف اپنے حلوے مانڈے سے مطلب ہے اور حب الوطنی اور جمہوریت سے وہ نفرت کرتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ سامراجی نوکر شاہی کی طاقت سے پورا فائدہ اٹھایا جائے۔ اس کی خاص صورت یہ تھی کہ انتخابی حلقوں کی حد بندی کرنے میں یونینسٹ پارٹی کے ممبروں کی سہولتوں کا خیال رکھا جائے۔ پھر اس کام میں ضلع مجسٹریٹوں، پولیس اور ضلع کے چھوٹے بڑے تمام افسروں کی مدد حاصل کی جائے تاکہ وہ مخالف امیدواروں کو ہر طرح ہراساں اور پریشان کریں اور عوام کو طرح طرح سے مجبور کرکے یونینسٹ ممبروں کو ووٹ دلوائیں۔

تیسرے یہ کہ پنجاب میں چونکہ مسلمانوں کی اکثریت ہے اس لیے اس امر کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ تمام مسلمان ایک ترقی پسند پروگرام کی بنیاد پر آپس میں متحد نہ ہو سکیں۔
چوتھے اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ ترقی پسند مسلمانوں، کانگریسیوں اور اکالیوں کا کوئی متحدہ محاذ قائم نہ ہو سکے۔ ایسا متحدہ محاذ اگر قائم ہو گیا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ پنجاب کے لوگوں کی اکثریت متحد ہو گئی اور اس کا نتیجہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ نوکر شاہی اور اس کے پٹھوؤں کو شکست ہو اور جمہور کامیاب ہوں۔
اس لیے اس خطرے کو کبھی بھولے سے بھی پاس نہیں آنے دینا چاہیے۔
پنجاب کے رجعت پسندوں کے یہی منصوبے تھے اور ان کی پشت پر سامراج کی طاقت تھی۔"

مختصر یہ کہ اسی پالیسی کے تحت ان دنوں پنجاب میں سر فضل حسین کے عام چرچے ہونے لگے۔ سرکاری اور نیم سرکاری لوگ انہیں عام دعوتوں پر مدعو کرتے۔ روزنامہ "انقلاب" لاہور خاص کر اس مشن میں پیش پیش تھا۔ یہاں تک کہ یوم سر فضل حسین منایا گیا۔ مساجد میں ان کی زندگی کی دعائیں

مانگی گئیں۔ بلدیہ لاہور نے انہیں سپاسنامہ پیش کیا۔
یہ سارا کچھ آئندہ الیکشن کی تیاریوں کا پیش خیمہ تھا کیونکہ میاں سر فضل حسین یونینسٹ پارٹی کے سربراہ مقرر ہو رہے تھے۔ اور اس کھیل کو کامیاب بنانے کے لیے سر سکندر حیات کو ریزرو بنک کا ڈپٹی گورنر بنا کر کلکتہ بھیج دیا گیا تھا۔ یہ ۲۰ فروری ۱۹۳۵ء کا واقعہ ہے۔

کیمونل ایوارڈ کانفرنس

۲۴ مارچ۔ دہلی میں نواب ڈھاکہ کی صدارت میں آل انڈیا کیمونل ایوارڈ کانفرنس ہوئی جس میں دیگر رہنماؤں کے علاوہ یہ لوگ بھی خاص طور پر دعوت میں شریک ہوئے۔
نواب آف چھتاری، مولانا شوکت علی، سر اے ایچ۔ غزنوی، سر محمد یعقوب، سر غلام حسین ہدایت اللہ، سر محمد یامین خاں، خواجہ حسن نظامی، سیٹھ عبداللہ ہارون، راجہ غضنفر علی، مولانا شفیع داؤدی، سید غلام بھیک نیرنگ، مسٹر اے۔ کے فضل حق اور نمائندہ احرار مسٹر خالد لطیف گابا ایڈووکیٹ لاہور۔
اس کانفرنس میں حسب ذیل قرارداد منظور ہوئی۔
"کانفرنس کی رائے ہے کہ فرقہ وارانہ فیصلہ مسلمانانِ ہند کے جائز مطالبات سے کلیتاً کم ہے۔ لیکن چونکہ ملک کے سامنے اس سے بہتر کوئی سکیم موجود نہیں جس کو بالاتفاق منظور کر لیا گیا ہو اس لیے مسلمانوں نے یہ عزم کر لیا ہے کہ اسی کو منظور کر لیا جائے۔ اور جب تک فرقہ وارانہ فیصلے کے متعلق کوئی متفقہ فیصلہ منظور نہیں ہو جاتا اسی فارمولا پر عمل کیا جائے۔"

حادثہ کراچی پر احتجاج

۲۰ مارچ کو غازی عبدالقیوم کو پھانسی دینے کے بعد کراچی میں مسلمانوں کے اجتماع پر جو ظلم ہوا۔ مرکزی مجلس احرار نے ۲۴ مارچ کو اس کے خلاف بطور احتجاج لاہور میں چودھری افضل حق ایم ایل سی کی صدارت میں ایک عام اجلاس منعقد کیا، جس میں مولانا حبیب الرحمٰن کی تقریر کے بعد حسب ذیل قرارداد منظور ہوئی۔
۱۔ یہ اجلاس کراچی میں گولی چلانے کے خلاف، جس سے متعدد مسلمان شہید ہوئے ہیں زبردست صدائے احتجاج بلند کرتا ہے اور حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ

اس واقعہ پر غیر جانبدارانہ تحقیقاتی کمیٹی قائم کی جائے۔ نیز اس حادثے میں شہید ہونے والوں کے وُرثا اور مجروحین کی مناسب امداد کی جائے۔"

۲۔ یہ اجلاس مناسب سمجھتا ہے کہ کراچی کے حادثۂ خونی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے لیے انفرادی کوششوں کی بجائے اجتماعی کارروائی کی جائے۔ چنانچہ یہ اجلاس قرار دیتا ہے کہ ۲۹۔ مارچ ۱۹۲۵ء بروز جمعہ تمام جماعتیں کراچی کے حادثہ کے خلاف آواز بلند کریں اور آزادانہ تحقیقات کا مطالبہ کیا جائے۔ نیز شہداء کے پسماندگان کی امداد کے لیے روپیہ فراہم کر کے ریلیف کمیٹی کراچی کو بھیجا جائے۔"

احرار وفد کراچی کو

کراچی کے حادثہ کی تحقیقات کے لیے مجلس احرار مرکز کی طرف سے مولانا عبدالغفار غزنوی کی قیادت میں ایک وفد ۲۶۔ مارچ کو کراچی روانہ کیا گیا۔ اسی طرح سکھر (سندھ) میں احرار کا اجتماع ڈاکٹر محمد عمر کی صدارت میں ہوا اور اسی طرح کی قرارداد منظور ہوئی۔

پریس نوٹ

صدر مرکزیہ مجلس احرار اسلام ہند مولانا حبیب الرحمٰن کے بیان اور مجلس احرار کی تائید میں روزنامہ "انقلاب" لاہور نے ۲۹۔ مارچ کے شمارہ میں حسب ذیل نوٹ شائع کیا۔

"ہزار اختلاف کے باوجود جو ہمیں مجلس احرار سے ہے، ہم اس بات کی حمایت اور تائید کرتے ہیں کہ ۲۹۔ مارچ کو کراچی حادثہ کے خلاف اجتماعی طور پر پورے جذبے کے ساتھ یوم احتجاج منایا جائے۔"

ایک اہم الزام کی تردید

سندھ کے ذمہ دار پولیس حکام نے کراچی میں عوام پر گولی چلانے کے جواز پر اعلان کیا کہ سرکاری حکام نے غازی عبدالقیوم کی لاش دفن کر دی تھی لیکن عوام نے قبر کھود کر غازی مرحوم کی لاش نکال لی۔ اس کا جلوس نکالا جس سے شہر میں فساد کا خطرہ تھا۔

پولیس کا مذکورہ بالا اعلان شریعت کے خلاف تھا کہ غازی مرحوم کی لاش قبر کھود کر نکالی گئی ہے۔ اس پر سندھ کے ذمہ دار افراد نے ۲۷۔ مارچ کو حسب ذیل اعلان شائع کیا۔

"یہاں تک تو درست ہے کہ پولیس نے غازی کی میت کو لحد میں اتار دیا تھا۔
لیکن اس پر نہ تو ہنوز پتھر رکھے گئے تھے اور نہ ہی مٹی ڈالی گئی تھی۔ مسلمانوں کے
اصرار پر ذمہ دار حکام نے شہید کا منہ دیکھنے کی اجازت دے دی اور اس کے لیے
لاش نکال کر باہر رکھ دی تاکہ لوگ شہید کا منہ دیکھ سکیں۔
لہٰذا یہ غلط ہے کہ قبر کھود کر لاش نکالی گئی ہے۔"

جمعیتہ علمائے ہند نے کراچی کے واقعہ پر زبردست احتجاج کیا اور اس ضمن میں صدر جمعیتہ علمائے ہند حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ نے اپنے پریس بیان میں کہا کہ پولیس نے گولی چلا کر نہایت سفاکی کا مظاہرہ کیا ہے۔

روس اور برطانیہ میں اتحاد

ہندوستان بھر کے اخبارات نے ۴۔اپریل کو یہ خبر جلی عنوان سے شائع کی کہ۔

"برطانیہ کے نائب وزیر خارجہ انتھونی ایڈن نے دورۂ ماسکو کے موقعہ پر روس کے ڈکٹیٹر سٹالن سے ملاقات کی کہ آئندہ روس اور برطانیہ بین الاقوامی حالات میں ایک دوسرے کے دوست رہیں گے۔

نوٹ: مندرجہ بالا خبر کو ہٹلر کے ۱۶ مارچ کے اعلان کے پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔ روس اور برطانیہ اتحاد دراصل جرمن اور جاپان کے خلاف ایک تحریک ہے۔

تحقیقات سے انکار

۹۔اپریل کو حکومت بمبئی نے ہوم سیکرٹری کے مشورے پر مجلس احرار کے اس مطالبے کو ٹھکرا دیا کہ کراچی کے واقعہ کی غیر جانبدارانہ تحقیقات کی جائے۔

اس سے انکار کرتے ہوئے گورنر بمبئی اور وائسرائے ہند نے اپنے مشترک فیصلے میں نتھورام کے قتل پر روشنی ڈالتے ہوئے تمام واقعات تفصیل سے بیان کرتے ہوئے کہا، کہ ان حالات کے پیش نظر مزید کسی تحقیقات کی ضرورت نہیں۔

اس سرکاری بیان کے خلاف راجہ غضنفر علی نے سنٹرل اسمبلی میں تحریک پیش کی کہ کراچی سے متعلق از سر نو تحقیقاتی کمیٹی قائم کی جائے۔ نیز مسلم اخبارات نے بھی اس پر زور دیا اور مجلس احرار نے

حکومت کے اس یک طرفہ فیصلے پر سخت احتجاج کیا۔ سنٹرل اسمبلی کے ممبر خالد لطیف گابا نے ۱۱ اپریل کو پریس بیان میں کہا کہ

"حکومت بمبئی کے اعلان کو صرف ایک فریق یا ایک طرفہ بیان کہا جا سکتا ہے۔ کوئی شخص بھی اسے کسی غیر جانبدار ٹریبونل کا فیصلہ قرار نہیں دے سکتا۔ تحقیق سے انکار کا مطلب یہ ہے کہ حکومت کسی غیر جانبدارانہ تحقیقات سے گریز کر رہی ہے اور یہ بیان بھی خود مشکوک اور حکومت کی مذمت کے لیے کافی ہے۔ اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا گیا کہ ہجوم کو میوہ شاہ کے قبرستان میں جمع ہونے سے روکا جا سکتا تھا یا منتشر کیا جا سکتا تھا۔ اور نہ ہی اس بات کا کوئی جواب دیا گیا ہے کہ گولی چلانے سے پہلے کوئی انتباہ ہی کیا گیا ہو۔

اسمبلی میں تحریک التوا پر جن لوگوں نے ووٹ دیے ان میں زیادہ تر ہندو شامل تھے۔ لیکن مسلمانوں نے ان کے خلاف کبھی اس بنا پر اعتراض نہیں کیا کہ ایک صریحی طور پر فرقہ وارانہ مسئلے میں ان کو شامل نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

شیخ عبدالمجید سندھی کا استعفیٰ

مذکورہ بالا تمام کارروائی کا جب حکومت نے کوئی اثر قبول نہ کیا تو ۱۲۔ اپریل ۱۹۳۵ء کو شیخ عبدالمجید سندھی نے بمبئی کونسل کی ممبری سے استعفیٰ دے دیا اور اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ:

"میں نے بحیثیت صدر حادثہ کراچی لیگ۔ وائسرائے ہند کو باہمی گفتگو کے موقعہ پر مطلع کر دیا تھا کہ تحقیقات کے لیے ایک خالص غیر مسلم کمیٹی قائم کی جائے لیکن افسوس ہے کہ میرے اس مطالبے کو ٹھکرا دیا گیا اور نہ ہی سرکاری بیان میں میرے مطالبے کا کوئی ذکر کیا گیا ہے۔ اس حادثہ میں پچاس کے قریب مسلمان شہید ہوئے اور ایک سو پچاس زخمی۔ مگر اس عظیم حادثہ کی غیر جانبدارانہ تحقیقات سے وائسرائے ہند نے صاف انکار کر دیا ہے۔

اندریں حالات تمام مسلمانوں کو حکومت کی اس روش پر نہایت رنج اور غصہ ہے۔ چنانچہ اس کے اظہار کے لیے میرے پاس دوسرا کوئی ذریعہ نہیں کہ میں

بمبئی کونسل کی رکنیت سے مستعفی ہو جائیں۔"

اس روز جمعیۃ علمائے ہند کے صدر اور ناظم اعلیٰ مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید نے حکومت ہند کو انتباہ کیا کہ کراچی کے حادثہ کی اگر غیر جانبدارانہ تحقیقات روک دی گئی تو اس کا نتیجہ حکومت کے حق میں بہتر نہیں ہو گا۔

احرار کے خلاف ملک گیر مہم

جیسے کہ اوپر عرض کر دیا گیا ہے کہ برطانوی ہند کے نزدیک پنجاب ہندوستان کے دیگر صوبوں سے عسکری اعتبار سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ غیر ملکی حکومت کو اپنے اقتدار کی طنابیں سنبھالنے کے لیے جن چوہدروں کی ضرورت تھی۔ پنجاب کے بعض اضلاع کو اس میں اولیت حاصل رہی۔

مجلس احرار آل انڈیا تنظیم ہونے کے باوجود پنجاب پر خاصہ اثر رکھتی تھی۔ آل انڈیا کانگریس کے بعد حکومت مجلس احرار پر خاصی نظر رکھتی تھی۔ اور اس کے خلاف ہر روز نئے حیلے بہانے تراشے جاتے۔

۱۸۔ اپریل ۱۹۳۵ء کے روزنامہ "انقلاب" لاہور کا ایک بیان ملاحظہ ہو۔

"عالمگیر اور عالم سوز جنگ شروع ہونے پر تمام بین الاقوامی خانہ جنگیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ اور ملک کے تمام باشندے بلا اختلاف مذہب و ملت بیرونی طاقتوں کے مقابل تیار ہو جاتے ہیں۔ اس طرح جب کسی گاؤں میں یا قصبہ میں مسلح خونخوار ڈاکو شب تاریک کی پردہ پوشی سے فائدہ اٹھا کر حملہ آور ہوتے ہیں تو وہاں کے تمام لوگ بلا امتیاز مذہب و ملت، دوست دشمن مدافعت کے واسطے تیار ہو جاتے ہیں۔

آج ہندوستان کے مسلمان بھی ایسی محشر خیز مشکلات میں مبتلا ہیں ہندوستان کے طرز حکومت میں جو تبدیلیاں عنقریب رونما ہونے والی ہیں۔ ان میں اگرچہ گورنر اور گورنر جنرل کو غیر محدود اختیار دے دیے گئے ہیں۔ باوجود اس کے اکثریت قوت زور اقتدار سے اقلیت کو کچلنے اور مٹانے کے واسطے اصلاحات جدید کی زیر حمایت کافی ضرب لگا سکتی ہے۔

ایسی حالت میں مسلمانانِ ہند کا یہ فرض ہے کہ اس وقت وہ اپنے اندرونی اختلاف کو بالائے طاق رکھ کر کامل یک جہتی اور اتفاق کے ساتھ ایک متحدہ آواز میں اپنے حقوق کی حفاظت اور اپنی مذہبی آزادی اور روایات کو قائم رکھنے کے واسطے میدانِ عمل میں گامزن ہوں۔ لیکن افسوس ہے کہ اس وقت بھی مسلمان خانہ جنگی میں مبتلا ہیں اور فروعی مسائل میں مذہبی اختلاف کو اور ایک فرقے کو دوسرے فرقے کی تخریب اور سب و شتم میں مبتلا کر رہے ہیں، جس کی وجہ سے ہمارا قومی وقار اور اثر غیر قوموں کی نظر میں روز بروز گرتا جا رہا ہے۔ چنانچہ آج بھی سنی، شیعہ اور وہابی۔ بدعتی کے اختلافات کونسل اور اسمبلی کے انتخاب میں نہایت بدنما صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اور بعض بالخصوص پنجاب کے بعض اضلاع میں عامۃ المسلمین اور فرقہ احمدیہ کے مابین مخالفت نے ایک ایسی خطرناک صورت اختیار کر لی ہے، جس سے آئندہ ناخوشگوار نتائج پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔

ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم مسلمانوں سے پرزور اپیل کرتے ہیں کہ خدارا کم از کم اس وقت کی خانہ جنگی اور اندرونی نزاعات سے قطع نظر کر کے کامل اتحاد اور اتفاق کے ساتھ اصلاحات جدیدہ میں اپنے حقوق کو محفوظ اور مضبوط کرنے کے واسطے ہمہ تن مصروف ہو جائیں۔ اور بلا اختلاف عقائد مسلمانوں میں جو شخص مفید اور کارآمد ثابت ہو اس کی پوری اعانت اور امداد کریں۔"

الداعیان

۱۔ آنریبل نواب بہادر خواجہ حبیب اللہ ممبر کونسل آف سٹیٹ ڈھاکہ۔
۲۔ آنریبل مسٹر محمد سہروردی ممبر کونسل آف سٹیٹ بنگال
۳۔ آنریبل سید محمد پاشا۔ بہادر ممبر کونسل سٹیٹ مدراس۔
۴۔ آنریبل سر محمد یامین خاں۔ سی آئی اے ممبر کونسل آف سٹیٹ یوپی۔
۵۔ آنریبل عبدالحفیظ ممبر کونسل آف سٹیٹ بنگال۔
۶۔ آنریبل خاں بہادر علی بخش محمد حسین سندھ ممبر کونسل آف سٹیٹ۔

۷۔ آنریبل حسن امام۔ بہار اڑیسہ۔ ممبر کونسل آف سٹیٹ۔

۸۔ اے۔ کے۔ فضل حق۔ ممبر اسمبلی بنگال۔

۹۔ خاں صاحب شیخ فضل حق پراچہ۔ ممبر اسمبلی (بھیرہ ضلع سرگودھا)۔

۱۰۔ نبی بخش الٰہی بخش بھٹو۔ ممبر اسمبلی۔

۱۱۔ اے۔ ایچ۔ عبداللہ۔ ممبر پنجاب۔ کونسل۔

۱۲۔ کپتان سردار شیر محمد خاں۔ سی۔ آئی۔ اے۔ ایم۔ بی۔ ای ممبر اسمبلی پنجاب۔

۱۳۔ محمد ابراہیم ہارون۔ ممبر کونسل۔ بمبئی۔

۱۴۔ خاں صاحب صدیق علی خاں ممبر اسمبلی۔ سی۔ پی

۱۵۔ میجر نواب احمد نواز خاں۔ سی۔ آئی۔ ای۔ یو۔ پی۔ ممبر اسمبلی۔

۱۶۔ مولوی سر محمد یعقوب۔ کے۔ ای۔ ممبر اسمبلی۔

۱۷۔ خواجہ حسن نظامی۔

اس بیان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ احرار کے خلاف کن اطوار سے سازش ہو رہی تھی

حمائت اسلام کی قرارداد

۲۰۔ اپریل کو لاہور میں انجمن حمائت اسلام کا پچاسواں سالانہ اجلاس نواب چھتاری کی صدارت میں منعقد ہوا کہ عوام نے انجمن کے نمائندوں سے مطالبہ کیا کہ چونکہ سر ظفر اللہ مسلمانوں کا نمائندہ نہیں، لہٰذا اس اجلاس میں اس کے خلاف قرارداد پیش کی جائے۔ اس پر تمام اجلاس میں ہنگامہ ہو گیا۔ اور صدر سمیت تمام لوگ پنڈال سے اٹھ کر باہر چلے گئے۔ اتنے میں عوام نے سٹیج پر قبضہ کر لیا اور حافظ محمد یعقوب نامی ایک شخص کی صدارت میں انجمن کا منتشر اجلاس دوبارہ شروع ہوا تو سر ظفر اللہ کے خلاف قرارداد پیش ہو کر پاس ہو گئی۔ قرارداد کے الفاظ یہ تھے۔

"چونکہ سر ظفر اللہ قادیانی ہے اور قادیانی مسلمان نہیں اس لحاظ سے ظفر اللہ غیر مسلم ہے لہٰذا اس کو وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل سے فوراً الگ کر دیا جائے۔"

کراچی کے حادثہ پر احتجاج

حادثہ کراچی کی تحقیقات سے حکومت کا انحراف عوام میں اشتعال کا باعث بنتا چلا گیا۔ ۲۱۔ اپریل

کو مرکزی مجلس احرار نے لاہور دہلی دروازہ میں چودھری افضل حق ایم ایل سی کی صدارت میں ایک عوامی اجلاس منعقد کیا، جس میں سنٹرل اسمبلی کے ممبر مسٹر خالد لطیف گابا نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

"میں نے اسمبلی میں کراچی گولی چلانے کے متعلق صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے جو تحریک التوا پیش کی وہ کثرت آرا سے منظور ہو گئی۔ تمام مسلم ارکان اسمبلی اور کانگریسی ارکان نے بھی تحریک کے حق میں ووٹ دیئے۔ حکومت نے اس کے باوجود تحقیقاتی کمیشن مقرر کرنے سے انکار کر دیا۔

میری قرارداد کا منشاء یہ تھا کہ حکومت کی حکمت عملی کی مذمت کی جائے اور حکومت سے مطالبہ کیا جائے کہ کراچی میں نہتے اور پرامن ماتمی جلوس پر فائرنگ کے متعلق تحقیقات کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی جائے۔ گولی چلانے والے افسران کو سزا اور پسماندگان شہدا اور مجروحین کو کافی تاوان دیا جائے۔

تحریک منظور ہو چکی ہے لیکن حکومت اپنے حکام کے مظالم پر پردہ ڈالنے کی غرض سے تحقیقات کرنے سے انکار کر رہی ہے۔ اگر حکومت سچائی پر ہوتی تو تحقیقات سے ہرگز انکار نہ کرتی۔"

اس کے بعد اسمبلی میں مجلس احرار کے دوسرے نمائندے سید محمد احمد کاظمی ایڈووکیٹ الہ آباد ہائیکورٹ نے جلسہ میں، تقریر کے دوران کہا۔

"تحقیق کے گریز سے ثابت ہوتا ہے کہ حکومت حقائق کو چھپانے پر تلی ہوئی ہے۔ میں اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ حکومت کو تحقیقات کرانی پڑے گی اور پبلک کی پرزور آواز کے سامنے جھکنا پڑے گا۔ نیز جو لوگ کراچی کے حادثہ کو فرقہ وارانہ رنگ دے رہے ہیں وہ ملک اور قوم کے دشمن ہیں۔"

اس کے بعد شیخ عبدالمجید سندھی سابق ایم ایل اے نے جو کراچی سے احرار کی ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کی غرض سے لاہور آئے تھے۔ تقریر کے دوران کہا:

"میں مسلمانان سندھ کی طرف سے مسٹر خالد لطیف گابا اور مجلس احرار کا شکریہ

ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مظلوموں کی حمایت میں اسمبلی کے اندر اور سارے ملک میں حصہ لیا۔

حکومت بمبئی نے اعلان شائع کرایا ہے کہ اب تحقیقات کی ضرورت نہیں حالانکہ حکومت کے فرائض میں تھا کہ بے گناہ ہجوم پر گولی چلانے والوں کے خلاف پورا پورا نوٹس لیتی۔ مجروحین اور شہداء کے پسماندگان کو معقول مالی امداد دی جاتی۔ لیکن حکومت نے ایسا نہیں کیا بلکہ حکومت کی طرف سے حکام کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے اور انہیں گولی چلانے میں حق بجانب قرار دیا جا رہا ہے۔

نتھورام کے قتل کو چھ ماہ گزر چکے ہیں۔ لیکن اس عرصہ میں کراچی میں کوئی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا۔ بلکہ کوئی معمولی جھگڑا تک نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ عبدالقیوم شہید کے جنازے کے ساتھ ہندو پھیری والے موجود تھے مسلمانوں نے انہیں ایک لفظ تک نہیں کہا۔ ہندو اخبارات کے نمائندے موجود تھے۔ انہیں بھی کچھ نہیں کہا گیا۔ اس بناء پر حکومت کے بیانات میں شب وروز کا تضاد ہے۔ ہوم ممبر کونسل آف اسٹیٹ کا بیان ہے کہ گولی چلانے والوں کی تعداد پینتیس ۳۵ تھی۔ انڈر سیکرٹری گورنمنٹ آف انڈیا کا بیان ہے کہ گولی چلانے والے پچیس ۲۵ تھے، جنہوں نے راؤنڈ چلائے۔ لیکن حکومت بمبئی کا ہوم سیکرٹری ان کے متعلق بالکل خاموش ہے۔ حکومت کے ان بیانات میں اس قدر فرق موجود ہے کہ جس سے پتہ چلتا ہے کہ حکومت حقائق کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی ہے۔"

آخر میں چودھری افضل حق کی تقریر کے بعد جلسہ ختم ہوا۔

مرکزی احرار ورکنگ کمیٹی کا اجلاس

آل انڈیا مجلس احرار کی جنرل کونسل کا اجلاس ۲۲۔ اپریل کو مولانا حبیب الرحمٰن کی صدارت میں مرکزی دفتر لاہور میں حادثہ کراچی پر غور کرنے کے لیے منعقد ہوا۔ جس میں محمد احمد کاظمی ایم ایل اے، شیخ عبدالمجید سندھی، چودھری افضل حق ایم ایل سی۔ خالد لطیف گابا ایم ایل اے مولانا مظہر علی

اظہر ایم ایل سی - سید عطاء اللہ شاہ بخاری - شیخ حسام الدین، مولانا داؤد غزنوی نے شرکت کی۔

اجلاس میں حادثہ کراچی پر مندرجہ ذیل قرارداد پاس ہوئی۔

"مجلس احرار کا یہ مرکزی اجلاس حادثہ کراچی پر اپنے غم و غصہ کا اظہار کرتا ہے۔ اور اس بات کا یقین رکھتا ہے کہ فرنگی بلا وجہ، بلا ضرورت ظالمانہ رویہ اختیار کیے ہوئے ہے۔ نیز یہ اجلاس اس حقیقت کے اظہار کو نہایت ضروری خیال کرتا ہے کہ حکومت کا واقعہ کراچی کی تحقیقات سے انحراف کرنا دو باتوں کا بیّن ثبوت ہے۔

اول: حکومت کے پاس نہتے ہجوم پر گولی چلانے کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں۔

دوم: حکومت مسلمانوں کو کمزور اور مردہ سمجھتی ہے اور مسلمانوں سے یہ توقع نہیں رکھتی کہ وہ اپنے مطالبات حکومت سے منوانے کے لیے قربانی دے سکتے ہیں۔ اس اجلاس کی رائے ہے کہ فی الفور تمام اسلامی جماعتوں کا نمائندہ اجتماع مسلمانانِ کراچی کے مشورے پر منعقد ہونا چاہیے۔ تاکہ تمام صورتِ حال پر غور کر کے مناسب رویہ اختیار کیا جائے۔"

یہ قرارداد مولانا عبدالغفار غزنوی کی طرف سے پیش ہوئی اور اس کی تائید چودھری افضل حق نے کی۔ یہ قرارداد بلا کسی اختلاف کے منظور ہو گئی۔

اس کے بعد ایک اور قرارداد سید محمد احمد کاظمی نے پیش کی، جس کی تائید میں خالد لطیف گابا نے کہا:

"یہ اجلاس اسمبلی میں واقعۂ کراچی کے التواء کی تجویز کے بارے میں کانگریس پارٹی کے تعاون کو بنظرِ استحسان دیکھتا ہے۔ اور مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی لیڈر آف کانگریس پارٹی اور دیگر مسلم ممبران تائید کنندگان کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہے اور ان سب کی خدمت میں مجلس احرار کی طرف سے مبارک باد پیش کرتا ہے کہ ان کی انصاف پسندی نے ایسے نازک وقت میں ملک کی مکدر فضا کو ایک حد تک سازگار رہنے دیا۔ نیز امید ہے ان کا تدبر معاملات

رجسٹرڈ ایل نمبر

ٹیلیفون نمبر ۲۵۳۳

فضل اللہ المجاہدین علی القاعدین اجراً عظیماً

روزنامہ

احرار

لاہور

قیمت فی پرچہ ایک آنہ ۱/

اشتراک
سالانہ
ششماہی
سہ ماہی
ماہانہ

The Daily AHRAR Lahore.

جلد ۱ | لاہور۔ یوم شنبہ پنجم شعبان المعظم ۱۳۵۰ سنہ ہجری المقدس مطابق ۱۲ دسمبر ۱۹۳۱ سنہ عیسوی | نمبر ۱

احرار

(از حضرت مولانا ظفر علی خان مدظلہ العالی)

پردۂ موت سے نکلیگی حیاتِ جاوید
کہ مسلمان شہادت کے طلبگار ہوئے

جس نے ڈھایا تھا کبھی ظلم کی بنیادوں کو
پھر مسلمان اسی جذبہ سے سرشار ہوئے

ہڈیاں جنکی ہیں چونا تو لہو ہے گارا
قصرِ آزادیٔ کشمیر کے معمار ہوئے

کیوں نہ خوش ہوں آج اس اخبار کے گھر گھر چرچے
جس کے اوراق کی زینت مرے اشعار ہوئے

(۱۰ دسمبر ۱۹۳۱ء)

(ظفر علی خان)

مجلس احرار اسلام کا پہلا روزنامہ

کو اصل روشنی میں پیش کر کے فرقہ وارانہ کشمکش دور کر کے باہمی رواداری کو ترقی دے گا۔"

قادیانیوں کا سالانہ بجٹ

احرار کے خلاف حکومت ہی مصروف کار نہیں تھی۔ رجعت پسند طاقتوں کی رہنمائی میں قادیانی ٹولہ بھی احرار سے اپنا انتقام لینا چاہتا تھا۔ چنانچہ ۲۲۔اپریل ۱۹۳۵ء کو قادیان میں مرزائیوں کا سالانہ اجلاس ہوا۔ تو انہوں نے آئندہ سال کے لیے گیارہ لاکھ روپے کا بجٹ منظور کیا۔ اس میں ستر ہزار روپیہ جماعت مرزائیہ کے پروپیگنڈہ کے لیے اور بیاسی ہزار روپیہ اندرونی نظم و ضبط پر خرچ کرنے کے لیے۔ "روزنامہ انقلاب ۲۴۔اپریل ۱۹۳۵ء"

تحریک مرزائیت سے آج تک قادیانیوں نے اس قدر بھاری بجٹ کبھی پاس نہیں کیا۔ اب دیکھنا ہے کہ یہ روپیہ کہاں اور کس طرح خرچ ہوتا ہے؟

جناح، راجندر فارمولا کی اشاعت

۲۴۔اپریل کے اخبارات میں راجندرا جناح فارمولا کا متن شائع کر دیا۔ جس میں حسب ذیل تجاویز پر بحث ہوتی رہی، جو بنگالی ہندو اور پنجابی مسلمان کی طرف سے پیش کی گئی تھیں۔

۱۔ فرنچائز۔ اس اسلوب پر مرتب کیا جائے کہ صوبہ جات اور مرکزی انتخابی فہرستیں مختلف اقوام کی آبادی کا تناسب قائم رہے۔ اور اس مقصد کے حصول میں اگر ضرورت پڑے تو پھر مستقل فرنچائز کے اصول کو اختیار کر لیا جائے۔

۲۔ حلقہ ہائے انتخاب نیابت کو خلط ملط نہیں کیا جائے گا۔

۳۔ پنجابی سکھوں کو یہ اختیار دیا جائے گا کہ فرقہ وارانہ اعلان میں ان کو جو نشستیں دی گئی ہیں، ان کو مد نظر رکھتے ہوئے وہ اپنی مرضی کے مطابق حلقہ ہائے نیابت منتخب کر لیں۔ اس کے بعد ہندوؤں کو فرقہ وارانہ اعلان کی مقررہ نشستوں کے مطابق حلقہ ہائے نیابت کے انتخاب کا موقعہ دیا جائے گا۔ اور اس کے بعد فرقہ وارانہ اعلان کے مطابق باقی حلقہ ہائے نیابت مسلمانوں کو دیے جائیں گے۔ یورپین ہندوستانی عیسائیوں، اینگلو انڈین اور خاص حلقہ ہائے انتخاب ان میں

شامل نہیں ہیں)۔

۴۔ بنگالی ہندو اور مسلمانوں کے درمیان یہ سمجھوتہ ہونا چاہیے کہ اگر یورپینوں سے انہیں کچھ نشستیں مل گئیں تو ان کو ہندو اور مسلمانوں کے درمیان تقسیم کر دیا جائے گا۔ ان دونوں کو مل کر یورپینوں کو اس بات پر رضامند کرنا چاہیے کہ وہ فرقہ وارانہ اعلان کے ذریعے اپنی مقررہ نشستوں میں سے زیادہ سے زیادہ ان کو دے دیں۔ ان کے تحت فرقہ وارانہ اعلان کے مطابق مسلمانوں کو جو نشستیں حاصل ہیں وہ ان کے لیے محفوظ ہیں۔ اور یورپینوں اور اینگلو انڈینز ہندوستانی عیسائیوں کے علاوہ خاص حلقہ ہائے نیابت بھی ان میں شامل نہیں ہیں۔

۵۔ اور اس کے علاوہ باقی صوبوں میں مسلمانوں کو نشستوں کی وہی تعداد دی جائے جو فرقہ وارانہ اعلان کی وجہ سے انہیں حاصل ہیں۔ خاص حلقہ ہائے انتخاب پر یورپینوں اینگلو انڈینز اور ہندوستانی عیسائیوں کی نشستیں ان میں شامل نہیں۔

۶۔ اعلیٰ مرکزی مجلس وضع آئین میں مسلمانوں کی مقررہ نشستیں محفوظ رہیں۔

۷۔ ان شرائط کی بنا پر سمجھوتہ ہونا چاہیے کہ تمام صوبہ جات اور مرکز میں جداگانہ انتخاب کی بجائے مخلوط انتخاب رائج کیا جائے۔

اس فارمولا کو جب بنگالی ہندوؤں کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور ایسی تجاویز پیش کیں جو اس کے بالکل متضاد تھیں۔ اور اس بات پر رضامند تھے کہ مخلوط انتخاب کی بنیاد پر مسلمانوں کے لیے نشستیں مخصوص کر دی جائیں لیکن وہ پروونشل فرنچائز کے مخالف تھے۔ اور ان کا مطالبہ تھا کہ ان کو بنگال میں پروونشل مرکز میں پانچ نشستیں مسلمانوں کے حصہ سے وضع کر کے دی جائیں۔

سکھوں نے بھی اس فارمولے کی مخالفت کی اور انہوں نے تو مخلوط انتخاب کی بنا پر بھی نشستوں کے تحفظ کو قبول نہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ انتخاب غیر مشروط طور پر مخلوط ہونا چاہیے اس کے علاوہ ان کا مطالبہ تھا کہ مرکز میں انہیں پانچ فیصدی نشستیں مرکزی کابینہ میں ایک وزارت اور پنجاب کی ملازمتوں اور پبلک باڈیز میں بیس فیصد عملہ محفوظ کر دیا جائے ...

نے اس بات پر بھی اعتراض کیا کہ پنجاب کی وزارت میں نصف سے زائد وزراء مسلمان کیوں ہوں؟
اگرچہ بنگالی ہندوؤں کی متضاد تجاویز اور پنجابی سکھوں کے مطالبات ناقابلِ مفاہمت تھے۔
پھر بھی مناسب سمجھا گیا کہ اگر مسلمان اس فارمولے کو تسلیم کر لیں تو ان کو بھی اس پر رضامند ہونے
کے لیے آمادہ کیا جائے گا۔ چنانچہ مسٹر جناح نے یہ مطالبہ پیش کیا، کہ ہندوؤں کی طرف سے
پنڈت مالوی اس سمجھوتے پر دستخط کر دیں۔ کیونکہ ایجی ٹیشن کا خاتمہ صرف ایسی صورت میں ہو سکتا ہے،
لیکن یہ نہ ہو سکا لہٰذا صرف اسی بناء پر گفت و شنید ترک کر دی گئی۔

شاہ جی کو سزا

۲۵۔اپریل ۱۹۳۵ء کو گورداسپور کے مجسٹریٹ مسٹر لکشمی نرائن نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو قادیان کانفرنس منعقدہ ۲۴۔اکتوبر ۱۹۳۴ء کے موقعہ پر صدارتی تقریر کرنے کے جرم میں چھ ماہ قید با مشقت کی سزا کا حکم دیا۔ نیز انہیں اسی وقت ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔

ڈاکٹر اقبال کا استعفٰی

کاغذ کے پھول بظاہر اپنی بہار دکھاتے ہیں اور کبھی کبھار دیکھتی نظریں ان سے فریب بھی کھا جاتی ہیں۔ لیکن جیسے ہی عارضی ملمع اترتا ہے تو افسانہ آپ سے آپ کہہ اٹھتا ہے: "میں حقیقت نہیں ہوں" ورنہ بہار کا نکھار موسم کے جوان ہونے تک حقیقت کے لیے خود ہی فریب بنا رہے۔

مرزائیت نے جھوٹ ہونے پر بھی اپنے کو سچائی کے پردے میں چھپائے رکھا۔ مگر جیسے ہی وقت کے ہاتھوں یہ چادر تار تار ہوئی تو اس سنڈاس کی بو سے دماغ پھٹنے لگا۔

۱۹۳۱ء میں کشمیر کی آزادی کو جو نقصان مرزائیت سے پہنچا اور پھر علامہ اقبال کو جیسے ہی حالات۔ سے آگاہی حاصل ہوئی وہ کشمیر کمیٹی کی صدارت سے فوراً الگ ہو گئے اور یہیں سے انہوں نے مرزائیت کا مطالعہ شروع کیا اور آخر کو بے اختیار کہہ اٹھے۔ ؎

وہ نبوت ہے مسلمان کے لیے برگ حشیش
جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت پیام "ضرب کلیم"

فتنۂ ملت بیضا ہے امامت اس کی
جو مسلمان کو سلاطین کا پرستار کرے۔
"ضرب کلیم"

پنجاب کے اربابِ نبوّت کی شریعت
کہتی ہے کہ یہ مومنِ پارینہ ہے کافر

"ضربِ کلیم"

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق۔

"ضربِ کلیم"

مرزائی مسلمانوں کا لباس اور اسلام کا روپ دھار کر اسلامی اداروں کے ساتھ دیمک کی طرح چمٹے رہے۔ برطانوی سامراج تلے انہیں مسلمانوں کا نمائندہ قرار دے کر اپنے محکموں میں کلیدی اسامیوں پر فائز کیے رکھا۔ لیکن مجلسِ احرار نے فریب خوردہ مسلمانوں پر جب اس کفر کی اصلیت واضح کی تو باطل کو ہر موڑ پر شکست کھانی پڑی۔

لاہور کی انجمن حمایت اسلام اپنی بنیاد سے رجعت پسند مسلمانوں کی مذہبی پناہ گاہ رہی ہے۔ سروں اور خان بہادروں کے اس ادارے سے وابستگی ہر تن آسان آدمی کیلئے باعثِ اطمینان تھی۔ اسلام کی حمایت کا عنوان دے کر اس ادارے نے ہمیشہ ایسی نسل کی آبیاری کی جو غیر ملکی حکمران کی بازوئے شمشیر زن کہلائی (الا ماشاء اللہ)

ڈاکٹر سر محمد اقبال بھی اس گروہ میں اپنے اس اقرار کے ساتھ شامل رہے۔ ؎

اقبال بڑا اُپدیشک ہے من باتوں سے موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا کردار کا غازی بن نہ سکا

(بالِ جبریل)

مرزائی اپنی سیاسی ضرورت کے تحت انجمن حمایت اسلام سے والہانہ چمٹے ہوئے تھے اقبال کو، جو مرزائیت سے آشنا ہو چکے تھے، جب صحن انجمن کو ان کانٹوں سے پاک کرنا چاہا تو انجمن کے ماحول میں اضطراب پھیل گیا۔ اس سال ڈاکٹر اقبال انجمن حمایت اسلام کے مرکزی صدر تھے۔ اس ذمہ داری کے پیش نظر جب انہوں نے مرزائیوں کو انجمن کی رکنیت سے خارج کرنا چاہا تو مرزائی اور مرزائی نواز ان کے مقابل کھڑے ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اقبال اپنے ادارے کے باوجود اپنے کو یکہ و تنہا محسوس کرنے لگے۔ آخر اس صدر نشینی سے ۵ اپریل ۱۹۳۵ء کو

انجمن حمایت اسلام کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔ گو انھوں نے استعفیٰ کی وجہ اپنی بیماری قرار دیا تاہم انجمن حمایت اسلام کا اندرونی ڈھانچہ متزلزل ہو گیا۔ (اس کی تفصیل آئندہ اوراق میں آئے گی۔)

سکھوں میں ہنگامہ آرائی

ایکٹ ۱۹۳۵ء کے رائج ہونے سے پیشتر اقوام ہند کے درمیان اختلاف اپنے عروج پر رہا۔ لیکن سکھ معمولی اقلیت ہونے کے باعث اس اکھاڑے میں نہیں تھے۔ البتہ کبھی کبھار ان کے نام کی صدائے بازگشت ضرور سنائی دیتی۔ ۲۷۔ اپریل کو خصوصاً پنجاب کے اندر جبکہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی سزا یابی کے خلاف ملک گیر احتجاجی اجتماعات ہو رہے تھے۔ سکھ لیڈر بابا کھڑک سنگھ نے نے سنٹرل اکالی دل کے اجتماع میں اعلان کیا کہ وہ آئندہ ماہ سے برطانیہ کے فرقہ وارانہ اعلان کے خلاف مورچہ لگائیں گے۔ اس پر گیانی شیر سنگھ (سکھوں کا نابینا لیڈر) نے ان کی سخت مخالفت کی۔ اس پر سکھوں کے مابین کافی ہنگامہ آرائی ہوئی۔

یکم مئی

اسلام کے معاشی نظام میں انسانوں کے لیے وہ سارا کچھ موجود ہے جو فطرت نے ان کے لیے مناسب سمجھا۔ مخلوق کو مساوی حقوق دینے میں خالق نے اسلام میں زکوٰۃ کے طریق کو اس طرح رائج کیا کہ غریب اور امیر کے درمیان حدِ فاصل ہونے کے باوجود امیر پر قدغن لگا دی کہ جب تک وہ اپنی دولت میں غریب کو حصہ دار نہیں ٹھہراتا اس کی تمام کمائی ناجائز ہے۔ دنیا کا کوئی دستور اس دستورِ شریعت کی برابری میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ مزدور اور سرمایہ دار کے درمیان دنیاوی قانون کو آئے دن کے جھگڑوں کا باعث سمجھنا چاہیے۔ اگر ایسا نہ ہو تو انسانوں کے درمیان کوئی چیز وجہ نزاع نہیں۔

یکم مئی ۱۸۸۶ء کو شکاگو کے مزدوروں نے اپنے ملک کے کارخانہ داروں سے اپنی محنت کے اوقات متعین کرانا چاہے، جس پر طبقاتی جنگ کا آغاز ہوا اور یہ آگ ایسی بھڑکی کہ مزدور اور کارخانہ دار کے درمیان ہمیشہ کے لیے نفرت کی لکیر کھنچ گئی۔

یکم مئی ۱۹۳۵ء کا یہی دن تھا جب ہٹلر نے جرمن کے مزدوروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ:

"اے جرمنی کے لوگو! تمہارے لیے ایک عظیم دور آیا ہے۔ لیکن اس دور کی عظمت اس بات میں مضمر ہے کہ ہمارے سامنے جو کام ہے ہم اس کی کامیابی کے لیے اٹھ کھڑے ہوں"۔

(دیگر اقوام سے جرمنی کے افلاس کا موازنہ کرتے ہوئے ہٹلر نے کہا۔)

"ہمارے پاس نہ تو کوئی نوآبادی ہے، اور نہ خام اجناس ہیں، نہ زرِ مبادلہ ہمارے پاس تو صرف اپنی قوم کے نوجوان ہیں، جس پر ہمیں بھروسہ کرنا ہے۔ ہم جنگ نہیں چاہتے اور نہ ہی کسی قسم کی بے چینی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ہم اپنی قوم کی عزت کی ضرور حفاظت کریں گے تاکہ دنیا جان سکے کہ آج کا جرمن گذرے ہوئے کل کا جرمن نہیں"۔

(ہٹلر نے روس، برطانیہ اور فرانس کے درمیان معاہدات کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔)

"جرمن کے لاکھوں سپاہی فرانس کی اینٹ سے اینٹ بجادیں گے اور یہ روس کو بھی پریشان کر سکتے ہیں۔ اگر آئندہ جنگ میں روس نے جرمنی کے خلاف فرانس کی کوئی مدد کی، تو اس صورت میں جاپان جرمن کی پوری مدد کرے گا۔ جرمن جنگ نہیں چاہتا لیکن اس قسم کے معاہدات ہمیں شبہ میں ڈال رہے ہیں کہ ہم اپنی آبرو کے لیے اپنے کو مستحکم کریں"۔

(اسی اجتماع میں جرمن کے پروپیگنڈہ وزیر جنرل گوئرنگ نے کہا۔)

"دوسری قوموں کے سیاستدان یا مجلسِ اقوام کے بزدل بہادروں سے متاثر ہو کر ہم کبھی اپنے مطالبات سے دست کش نہیں ہوں گے۔ جرمن کی فضائی قوت اب پہلے سے کہیں زیادہ مسلح ہے۔ ہم جرمن کے تحفظ سے کبھی دستبردار نہیں ہوں گے۔

مطالبات کے لیے معاہدات ایک فضول چیز ہے۔ جرمن جو حاصل کرے گا اپنے زورِ بازو سے حاصل کرے گا"۔

گلگت پر برطانیہ کا قبضہ

وہی ہوا جس کا کھٹکا تھا۔
۱۹۳۱ء میں مجلس احرار نے جب محسوس کیا کہ برطانیہ کسی نہ کسی طرح کشمیر میں اپنی سیاسی حیثیت کو مستحکم کرنے کے لیے گلگت پر قبضہ جمانا چاہتا ہے اور اس کے لیے مرزائیوں کو آگے بڑھایا جا رہا ہے۔ ان دنوں ریاست کشمیر کے محکمہ تعلیم میں خواجہ جمال الدین (لاہوری مرزائی) بڑی اہم پوسٹ پر متعین تھا۔ چنانچہ اس کی وساطت سے کشمیر میں سارا کھیل کھیلا گیا۔ (جس کی تفصیل زیر نظر کتاب کی جلد اول میں آ چکی ہے۔)

روس کی دیواریں گلگت سے سانجھی تھیں اور راستے میں پہاڑوں کا طویل سلسلہ حائل تھا۔ لہٰذا فوجی ضرورت کا تقاضہ تھا کہ گلگت برطانیہ کے قبضے میں ہو۔ تاکہ وہاں پر وہ اپنی فوجی چھاؤنی قائم کر سکے۔ یہ جانتے ہوئے کہ انگریز کشمیر کی بہاریں لوٹنا چاہتا ہے۔ مجلس احرار نے مہاراجہ کشمیر کے خلاف کیوں لڑائی چھیڑی؟ یہ ایک سوال ہے جو سیاسی ذہنوں میں گردش کرتا رہے گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کشمیر کمیٹی کی بنیاد سے پیشتر ہی ریاست کے اندرونی حالات میں ایسا زہر گھول دیا گیا تھا کہ جس سے وہاں کے مسلمان کی جان و مال کے ساتھ اس کا ایمان بھی ضائع ہو جانے کا ڈر تھا۔ اب ایک طرف ریاست میں انگریز کی ضرورت کام کر رہی تھی تو دوسری طرف بتیس ۳۲ لاکھ کشمیری مسلمانوں کے ایمان کا سوال تھا۔ مجلس احرار نے مسلمان کے ایمان کو انگریز اور ریاست سے کہیں زیادہ قیمتی خیال کرتے ہوئے ریاست کے معاملات میں مداخلت ضروری سمجھی۔ ان حالات میں جب تحریک اپنے عروج پر پہنچی تو ریاست کے مہاراج سر ہری سنگھ نے احرار سے نجات حاصل کرنے کے لیے انگریز سے گلگت کا سودا چکا لیا۔ آخر چار سال خاموش رہنے کے بعد، ۱۷ مئی کے اخبار "انقلاب" نے یہ خبر کسی اہمیت کے بغیر شائع کی۔

"گلگت برطانیہ کی سپرداری میں دے دیا گیا"

"۱۵ مئی۔ شملہ کی اطلاع کے مطابق حکومت کشمیر عنقریب گلگت کا تمام علاقہ حکومت برطانیہ کے حوالے کر دے گی۔ لیکن اس کارروائی کی کوئی نمائش نہیں ہو گی۔"

دوسری جنگِ عظیم کے آثار

جرمن قوم کے حوصلے اور ہٹلر کے جنگی ارادوں نے اقوامِ یورپ میں تہلکہ مچا دیا۔ برطانوی ایوان، دوسری جنگِ عظیم کے مستقبل پر غور کرنے لگا۔ ۱۷۔ مئی کو برطانوی وزیرِ خارجہ مسٹر ایڈن نے جو گذشتہ کئی دنوں سے زیرِ علاج تھے، اپنی صحت یابی پر ایک تقریر کے دوران کہا،

"میں اس بات کا کئی دفعہ اظہار کر چکا ہوں کہ ہم مجلس اقوام میں جرمن کی واپسی کے منتظر ہیں۔ باقی جہاں تک اسلحہ کا تعلق ہے، جرمن اس بات پر زور دے رہا ہے کہ معاہدہ اسلحہ مرتب کیا جائے۔ لیکن اس معاہدے کی حقیقت اس بات پر ہو کہ وہی اسلحہ ہو جو اقوام کی بنیادی ضرورت ہو۔ کیا جرمن اس پابندی کو برداشت کرنے کو تیار ہے۔؟

تجدید اسلحہ کے متعلق جو بحث اب تک ہوئی ہے، اس میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ فوجی تعداد مقرر کی جائے۔ مثلاً برطانیہ کے مسودہ میں برِاعظم کی تین بڑی سلطنتیں ہیں۔ فرانس، جرمن اور اٹلی کے لیے حسب ذیل تعداد مقرر کی جا چکی ہے۔

فرانس ——— دو لاکھ

جرمن ——— دو لاکھ

اٹلی ——— دو لاکھ اور

روس ——— پانچ لاکھ

جرمن ماضی میں اس معاہدہ کی تائید کرتا آ رہا ہے اور اب اس اصول سے انحراف کو اس نے ناپسند کیا ہے۔ اور اصل واقعہ یہ ہے کہ مجلس تجدید اسلحہ نے اس اصول کو تسلیم کر لیا تھا اور آئندہ معاہدے کا انحصار جرمن کے رویہ کو قرار دیا گیا تھا۔

بہرحال اگر کسی قوم کو اپنی حفاظت کا اندیشہ ہو تو اس کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ مجلسِ اقوام میں شامل ہو کر اجتماعی امن کے لیے کوشش اور گفتگو کرے۔"

خالد لطیف گابا کی لندن روانگی

مجلس احرار کا نمائندہ مسٹر خالد لطیف گابا ممبر اسمبلی امپائر پارلیمنٹری اجلاس میں شرکت کیلئے ۲۰ مئی کو لندن روانہ ہو رہا تھا۔ اس کے اعزاز میں ۱۹ مئی کو مجلس احرار نے عصرانہ دیا۔ جس میں قریباً سبھی سیاسی جماعتوں کے نمائندوں نے شرکت کی۔ اس موقعہ پر خالد لطیف گابا نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ

وہ ہندو پریس نے مجھ پر الزام لگایا ہے کہ میں یورپ میں ہندوؤں کے خلاف کوئی سازش کرنے جا رہا ہوں اور اس سازش میں مسٹر جناح اور سر آغا خاں شامل ہیں۔ میں ہندوؤں کو یقین دلاتا ہوں کہ میں کسی قسم کی کوئی سازش کرنے نہیں جا رہا۔ بلکہ میرا جانا محض امپائر پارلیمنٹری کانفرنس کے سلسلے میں ہے۔ البتہ اگر پنڈت اتوبی نے جیسا کہ اطلاع ہے کہ وہ لندن جا رہے ہیں، انہوں نے مسلمانوں کے خلاف اگر وہاں کوئی فرقہ وارانہ بات کہی تو ممکن ہے اس کا جواب دینا پڑ جائے۔ ہاں حادثہ کراچی کے متعلق حکومت کی پالیسی پر ضرور بحث کروں گا کہ وہ واقعہ کی تحقیقات کرے۔"

کرنل لارنس کا انتقال

۱۹ مئی کے ہندوستانی اخبارات نے یہ خبر شہ سرخیوں سے شائع کی۔

"عرب میں ترکوں اور عربوں کے درمیان تصادم کے بانی کرنل لارنس، جن کا گذشتہ دنوں موٹر سائیکل سے حادثہ ہو گیا تھا، ایک سو بیالیس گھنٹے بیہوش رہنے کے بعد انتقال ہو گیا ہے۔ برطانوی رہنماؤں نے جن میں مسٹر چرچل بھی شامل ہیں کرنل لارنس کی موت پر آنسو بہاتے ہوئے کہا "برطانوی شہنشاہیت کو کرنل لارنس کی موت سے بے پناہ صدمہ پہنچا ہے۔"

اس خبر کا پس منظر بیان کرتے ہوئے بعض اخبارات نے لکھا:

پہلی جنگِ عظیم کے دوران اس شخص (کرنل لارنس) نے اپنی زبان دانی، دلآویز شخصیت اور برطانوی خزانے سے کام لے کر سارے عرب میں ترکوں کے خلاف بغاوت کی آگ بھڑکائی شریف حسین اور ان کے خاندان کو سارے حجاز کی حکومت کا لالچ دے کر خلافتِ عثمانیہ کے

خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے پر آمادہ کیا۔

جب برطانیہ نے کرنل لارنس کے ان وعدوں کو جو شریف حسین سے کیے تھے پورے نہ کیے تو کرنل لارنس مایوس ہو کر گوشہ نشین ہو گیا۔

دفتر احرار پر چراغاں

ایک طرف لندن میں کرنل لارنس کی موت پر ماتم کیا جا رہا تھا تو ہندوستان میں مجلس احرار کے دفاتر چراغوں سے جگمگا رہے تھے

اسی روز مجلس احرار کے مرکزی ناظم اعلیٰ مولانا مظہر علی اظہر نے اس کی وضاحت میں کہا:

"موت سب پر آنی ہے الہٰذا کسی کی موت پر خوش ہونا زیب نہیں دیتا۔

لیکن کرنل لارنس کی موت ایک آدمی کی موت نہیں کہ جس پر مجلس احرار کو افسوس ہو بلکہ یہ برطانوی مشن کی موت ہے، جس کے تحت لاکھوں ترکوں کا عربوں کے ہاتھوں خون بہایا گیا اور حرم کی مقدس سرزمین کو مسلمان کے بے گناہ خون سے آلودہ کیا گیا۔ سینکڑوں عورتوں کی عصمت دری ہوئی، لاکھوں بچے یتیم ہوئے۔

آخر اس مشن کے تحت حجاز کی سرزمین پر برطانوی اقتدار کا پرچم لہرانے لگا۔

اس لیے مجلس احرار کو کرنل لارنس کی موت پر مسرت ہے کہ اس سے برطانیہ کا یہ مشن ایشیا میں پھیلنے سے رک گیا۔"

کرنل لارنس

اسلام اور عیسائیت کے درمیان اختلاف کی دیوار کسی عارضی واقعہ کی محرک نہیں اور نہ ہی دونوں مذاہب کے پرچم کسی ایک فضا میں لہراتے ہیں۔ داعیٔ اسلام کی تشریف آوری سے پیشتر تثلیث کے کونے عقیدۂ توحید کو زخمی کرتے رہے۔ لیکن جیسے ہی اسلام کی صبح طلوع ہوئی۔ عیسائیت کے اندھیرے مزید اجاگر ہو کر سامنے آ گئے۔ پھر صدیاں گذر چکی ہیں کہ یہ متحارب مذاہب آمنے سامنے رہے۔ اس دوران رچرڈ جیسے جرنیل صلاح الدین ایوبی جیسے بہادروں کے مقابل آئے۔ مگر اسلام کا پرچم بہرطور بلند رہا، تاہم عیسائیت کے سینوں کی آگ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف وقت ملنے پر اپنی تپش دکھانے سے باز نہیں رہی۔

عرب، عیسائی مرکز کے پڑوس میں ہوتے ہوئے جغرافیائی حدبندیوں کے باوجود کفر سے

کرنل لارنس انگریزی لباس میں

نبرد آزما ہے۔ اس طرح مذہب کے میدان میں شکست خوردہ عیسائیت نے ہر سیاسی بساط پر
مسلمانوں کو شہ دے کر مات دینے کی تدبیریں سوچیں۔
ترک اور عرب قوم کے درمیان تعلق کی پختہ گرہ کشائی پر عیسائی سلطنتوں کی دیرینہ نظریں
تھیں۔ چنانچہ پہلی جنگ عظیم سے ایک سال پیشتر ۱۹۱۳ء میں عرب کے صحراؤں سے عرب

کرنل لارنس عربی لباس میں

قومیت کی تحریک نے جنم لیا۔ یہ وہ دور ہے جب سارا حجاز خلافتِ عثمانیہ کے زیرِ نگین تھا۔
چونکہ دنیائے مسیحیت پان اسلام ازم (اسلام کی بین الاقوامی دعوت) سے خائف تھی۔ انہیں علم
تھا کہ اگر مختلف النسل کے مسلمان متحد ہو گئے تو سارے یورپ کے لیے ان کا وجود ایک
عظیم خطرہ بن جائے گا۔ چنانچہ عرب ترک اتحاد کو سبوتاژ کرنا عیسائیت کے لیے اہم اور ضروری

مسئلہ بن گیا۔ اس سازش کے تحت ترکوں کو درس دیا گیا کہ عرب اور مصر سے ان کا کوئی نسلی رشتہ نہیں، لہٰذا انہیں وطنیت کو اخوت اسلامی پر مقدم رکھنا چاہیے اور دوسری طرف عربوں سے کہا گیا کہ ترک اسلام چھوڑ چکے ہیں اور انہیں مذہب سے کوئی سروکار نہیں رہا۔ ترک چاہتے ہیں کہ عرب اپنی زبان چھوڑ کر ترکی طرز تکلم اختیار کر لیں۔ نیز ترکوں نے قرآن کریم سے انبیاء کے اسمائے گرامی نکال کر ان کی جگہ تاتاری بادشاہوں کے نام درج کر دیے ہیں۔

اس کام کے لیے ابتداء میں عیسائی پادری عربی لباس پہن کر عربی زبان میں عرب قبائل میں وعظ کرتے رہے۔ ۱۷۶۱ء میں ڈنمارک میں پہلی دفعہ عیسائیوں کا وفد یمن کے علاقے میں بھیجا گیا۔ اس وفد کا لیڈر نیبوہرات نامی ایک عیسائی تھا، جس نے منافرت کی اس تحریک کو ہوا دے کر سارے عرب کی تحریک بنا دی۔ اور یہی تحریک آئندہ چل کر عرب قومیت کی بنیاد کہلائی۔

تاریخ ایک اور شخص حسن بن قلیل کا ذکر بھی کرتی ہے۔ جو امیر فیصل کی فوج میں شامل تھا۔ جس کی عمر کا ایک حصہ عیسائی ممالک میں گزر چکا تھا۔ حقیقت میں یہ مسیحی تھا۔ گو اس نے علانیہ اپنے عقیدے کا کبھی اظہار نہیں کیا لیکن تحریک دعوت عربیہ کی تائید و حمایت اور اپنے سیاسی افکار کی تبلیغ سے اسے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ یہ شخص شام کی فوج کے تمام عرب سپاہیوں کو سلطنت عثمانیہ سے بغاوت پر ابھارتا رہا۔

("بغاوت عرب اور کرنل لارنس" ص ۱۰۔ مصنفہ مولانا چراغ حسن حسرت)

جب تک بادِ سموم کا گزر صحن چمن سے نہ ہو۔ پھول پتیاں بہاروں سے اٹھکیلیاں کرتی رہتی ہیں۔ لالہ و گل کے چہروں کا نکھار دھوپ کی تمازت کو شرمندہ کرتا ہے۔ پیلے پیلے اور اودے اودے پھول نو بیاہتا دلہن کی طرح اپنے سہاگ کے گیت بادِ صبحگاہی سے لے مہا رگاتے ناچتے دکھائی دیتے ہیں۔ شبنم اٹھتے بیٹھتے صحن چمن سے مستیاں کرتی ہے۔ اس کے ناچنے اور تھرکنے کے معصومانہ انداز ساون بھادوں کی برستی گھٹاؤں میں جوبن پر ہوتے ہیں لیکن جونہی صحراؤں کے بگولے تپتی ریت کی جھولیاں بھر کر باغ میں داخل ہوتے ہیں، ہر شاخ پر اداسی چھا جاتی ہے۔ پتے ویران موسم کی طرح منہ لٹکائے پریشان دکھائی دیتے ہیں۔ ہر روش پر خزاں کے آثار ہویدا ہونے لگتے ہیں۔ ہواؤں کے رخ بدلتے ہیں تو سورج مکھی کا رنگ زرد

پڑجاتا ہے۔ سرو وسمن باغ کے آنگن میں کھڑے رہ جاتے ہیں۔

قوموں کے عروج وزوال کی داستان بھی کچھ یوں ہی سی ہے۔ جب ضمیر فروش بر دان چڑھتے ہیں۔ غدار وقت کے سہارے سردار کہلانے لگتے ہیں تو ملت انحطاط کے دور میں داخل ہوتی ہے۔ پھر وہی ہوتا ہے جو گذشتہ پون صدی سے اقوام عرب سے ہو رہا ہے۔

حالانکہ کرنل لارنس خود ایک خط میں جو اس نے ۱۹۲۰ء کو لندن ٹائمز کے نام لکھا۔ اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے کہ "عرب ترکوں کی سلطنت سے خوش تھے" لیکن سیاسی اغراض نے انہی کے ہاتھوں پرائی ضرورت کے پھول اپنے گلے میں ڈال لیے جو بعد میں کانٹے ثابت ہوئے

۱۹۱۳ء میں ترکی حکومت نے عرب رہنماؤں سے بگڑتے ہوئے حالات پر پیرس میں گفتگو کی۔ اور جانبین میں ایک معاہدہ طے پایا۔ جس کی رو سے عرب صوبے سلطنت عثمانیہ میں خود مختار ہوں گے۔ دوسری شرط یہ تھی کہ عربی زبان عام سکولوں میں تعلیمی زبان تسلیم کی جائے۔ نیز پارلیمنٹ میں عربوں کے لیے مناسب تعداد میں نشستیں مخصوص ہونی چاہیں۔

اس معاہدے کی سیاہی خشک نہ ہوئی تھی کہ پہلی عالمگیر جنگ نے سارے یورپ کو پیٹ میں لے لیا۔ ترک، جرمن کے ساتھ ہو کر اتحادی طاقتوں سے ٹکرانے لگے۔ اس طرح ترکوں کا عربوں کے ساتھ معاہدہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ یہی دن تھے کہ کرنل لارنس عرب کی سیاست میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ہی برطانوی نمائندے عرب لیڈروں سے ملنے جا پہنچے کہ

"اگر ترکی اتحادیوں کے خلاف جنگ میں شریک ہوا تو عرب ملکوں کا ردِ عمل کیا ہوگا"۔؟

اس کے فوراً بعد برطانیہ کے وزیر جنگ لارڈ کچنر نے قاہرہ کی برطانوی ایجنسی کو تار کے ذریعے پیغام دیا،

"اگر جنگ میں عرب برطانیہ کا ساتھ دیں تو انگلستان عربوں کی جدوجہد آزادی میں ان کی حمایت کرے گا"

لارڈ کچنر کا یہ پیغام ۳۱۔ اکتوبر ۱۹۱۴ء کو مکہ میں شریف حسین کو ملا۔ اسی طرح کا ایک اور پیغام سوڈان کے انگریز گورنر جنرل کا بھی شریف مکہ کو ملا۔

ان برطانوی پیغامات نے عربوں کو نئی زندگی بخشی۔ کرنل لارنس عرب قبائل میں مختلف لباس، مختلف طرزِ تکلم کے ساتھ اپنا کام کر رہا تھا۔

"عرب عربوں کا، اور ٹرکی ترکوں کا"

عرب شیوخ سے وہ اپنی ملاقات میں اس انداز سے گفتگو کرتا۔ اس دوران شریف حسین کے چاروں بیٹے (عبداللہ۔ فیصل۔ حسن اور زاہد) برطانوی وعدوں پر مطمئن تھے۔

کرنل لارنس کہتا ہے کہ:

"ہم نے بالآخر شاہِ حجاز کو اتحادیوں کا ساتھ دینے پر آمادہ کر لیا"

(ڈیلی ایکسپریس لندن ۲۰-۵-۲۸)

اس خفیہ معاہدے کے باوجود (جو بحرِ قلزم کے ایک غیر آباد ساحل پر شریفِ مکہ اور انگریزوں کے درمیان طے پایا) شریفِ حسین ترکوں کو بظاہر اپنی وفاداری کا یقین دلاتا رہا۔

شریفِ حسین کا مطالبہ

"شمال میں سرسینہ تک، جنوب میں بحرِ ہند تک اور مشرق میں ایرانی سرحد تک میری بادشاہت تسلیم کر لی جائے"

برطانیہ کا جواب

"سرسینہ اسکندریہ اور حمیض وغیرہ عرب میں شامل نہیں لہٰذا ان علاقوں پر شریفِ مکہ کی سیادت تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ البتہ مشرقی اور جنوبی حدود کے متعلق اس کا مطالبہ منظور کیا جاتا ہے"

غرض ان شرائط پر انگریزوں سے شریفِ مکہ کا معاہدہ طے پا گیا اور اس نے ۵۔ جون ۱۹۱۶ء کو ترکوں کے خلاف بغاوت کا اعلان کرتے ہوئے توپ کا پہلا گولا مکہ میں اپنے محل سے چھوڑا دوسری جانب سلطان عبدالحمید نے جہاد کا اعلان کر دیا، جس میں مقدس جنگ کی حیثیت سے حصہ لینا تمام مسلمانوں کا فرض تھا۔ مگر شریفِ مکہ جو پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کہلاتا تھا اور اسلام کے مقدس شہر کا محافظ تھا۔ انگریزوں کے حق میں بغاوت کی رہنمائی کر کے اس جہاد کا زور توڑتا رہا۔ عربوں کی اس بغاوت نے ترکی اور جرمنی کی مشترک مہم کو بیکار کر دیا۔

("تاریخی واقعات" مرتبہ نصیر احمد جامعی ص۱۲۱)

آخر جنگِ عظیم کے خاتمے پر ۱۱۔نومبر ۱۹۱۸ء کو انگریزوں نے جشن فتح منایا۔ اس تقریب میں شریف حسین اور اس کا بڑا لڑکا فیصل کرنل لارنس کی معیت میں لندن پہنچے اور بعد میں یہ لوگ پیرس روانہ ہو گئے کہ صلح کانفرنس میں شامل ہو سکیں۔ یہاں پر لارڈ جارج اور ولسن جیسے برطانوی مدبر اور ان کے سامنے کرنل لارنس کی قیادت میں شریف مکہ اور فیصل بیٹھے۔

اس مجلس میں شریف مکہ نے اپنے مطالبات دہرائے کہ عرب کے تمام علاقے ان کے حوالے کیے جائیں۔ جبکہ ان کے بڑے لڑکے فیصل نے مطالبہ کیا کہ اسے صرف شام کا بادشاہ تسلیم کر لیا جائے لیکن ولسن اس پر راضی نہیں تھا۔

جنگ کے دوران کرنل لارنس شریف مکہ سے سارے حجاز کی بادشاہت کا وعدہ کرتا رہا۔ شامیوں کو یہ فریب دیا جاتا رہا کہ شام تمہارا اور صرف تمہارا ہے اور فیصل کو یقین دلایا گیا تھا کہ شام تمہارے اقتدار میں رہے گا۔ لیکن جنگ کے اختتام پر یہ تمام وعدے پس پشت ڈال دیے گئے۔ نہ شام شامیوں کو ملا اور نہ فیصل کو اور نہ ہی شریف مکہ کی تمناؤں کا چراغ روشن ہوا۔ ؎

تیرے وعدوں پہ جیئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے گر اعتبار ہوتا

الشريف الحسين بن علي

فیصل ۱

ہوا یہ کہ شام پر فرانس کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا۔ عراق پر فیصل کا لیکن انگریز حاکم کے تحت

رہا فلسطین تو اس میں عربوں کی بجائے یہودیوں کا مرکز قائم کر دیا گیا۔ اس طرح باقی حجاز کے ٹکڑے کر دیئے گئے۔ شریف مکہ نے آنکھیں دکھائیں تو اسے مالٹا کے جزیرے میں نظر بند کر دیا

کرنل لارنس اور شریف مکہ کی وساطت سے عرب مسلمانوں کی مرکزیت کو جو نقصان پہنچا اس کی تلافی شاید صدیوں نہ ہو سکے۔ اگر دستِ قضا بڑھ کر لارنس کے ارادوں کو روک نہ لیتا تو ممکن ہے یہ فرنگی غدار ایشیائی ممالک میں (جس میں مسلمانوں کی اکثریت ہے) اسی طرح کا ادھم تماشا بھی کرتا۔

مجلسِ احرار نے اسی خوشی میں اپنے دفاتر پر چراغاں کیے کہ ایک غدار فرنگی کی موت سے کئی مسلمان ممالک محفوظ ہو گئے۔ الحمد للہ۔

لارنس اس کا پورا نام ٹامس ایڈورڈ لارنس تھا۔ اس کی ولادت ۱۸۸۸ء میں بمقام ٹریمیڈوگ میں ہوئی جو شمالی ویلز میں واقع ہے۔ اس کا والد ٹامس لارنس آئرش نسل سے تھا اور ماں دینِ مسیح کی تبلیغ کرتی تھی۔ اس کی تعلیم آکسفورڈ میں مکمل ہوئی۔

لارنس نے جب فوج میں بھرتی ہونے کی خواہش ظاہر کی تو طبی مجلس نے اس کے قد و قامت اور ڈیل ڈول کو دیکھ کر جواب دے دیا۔

لارنس فوج میں بھرتی تو نہ ہو سکا لیکن تھوڑے دنوں ہی میں اسے برطانیہ کے خفیہ محکمہ میں لے لیا گیا۔ صحرائے عرب کے متعلق اس کا علم وسیع تھا۔ عربوں کے رسم و رواج اور فکری رجحان کا مطالعہ کر چکا تھا۔ عربوں کی مہمان نوازی اور ترکوں کی مہمان نوازی کی بدولت اس نے بہت سے رازہائے درونِ پردہ معلوم کر لیے تھے۔ زمانہ جنگ میں جن غدار عربوں نے ترکوں کے خلاف فلسطین، عراق اور شام میں سازشیں کیں۔ ترکی افواج کی نقل و حرکت کی اطلاع انگریزوں اور فرانسیسیوں کو دیتے رہے۔ ان میں بڑے بڑے صاحب جبہ عمامہ و شیوخ شامل تھے۔ ان لوگوں کو لارنس کے توسط سے ہدایات ملتی تھیں۔ اس کی معرفت روپیہ دیا جاتا تھا۔ غرض لارنس اپنی استعداد خاص کی بدولت تھوڑے ہی دنوں میں ان عرب جاسوسوں کا سردار بن گیا جو حجازِ مقدس سے ایشیائے کوچک تک پھیلے ہوئے تھے اور انہی خدمات کے صلے میں لفٹیننٹ سے لفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی دی گئی اور پھر جلد کرنل بنا دیا گیا۔

لارنس اپنی ظاہری شکل و صورت کے اعتبار سے کوئی باوقار شخص نہیں تھا اور یہی وجہ ہے

کہ لوگ اسے دیکھ کر اس کے خصائل اور سیرت کے متعلق کوئی صحیح اندازہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس کا قد پانچ فٹ ساڑھے پانچ انچ تھا۔ اس کے گورے رنگ سے یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ اس نے اپنی عمر کا ایک حصہ عرب جیسے تپتے ملک میں بسر کیا ہے۔ اس کی آنکھیں نیلی تھیں جو پیہم حرکت کرتی رہتی تھیں۔ اس کی ٹانگیں جسم کے بالائی حصے کے مقابل چھوٹی اور حقیر نظر آتیں۔ اس کا سر بہت بڑا تھا۔ عام طور پر اپنا دایاں ہاتھ سینے کے نیچے باندھ کر رکھتا اور سفر میں سر جھکا کر چلتا۔

کرنل لارنس کے مداحوں میں لارڈ جارج، لارڈ کرزن، برنارڈ شا اور ٹامس ہارڈ سے جیسے باشعور برطانوی لوگوں کے نام ملتے ہیں۔

جرمن اور برطانیہ وقت کے طلوع و غروب کے ساتھ سلطنتوں کے ارادے اور مزاج میں تغیر کوئی بڑی بات نہیں۔ خصوصاً بڑی طاقتیں حالات کو ہمیشہ اپنی اغراض کے سانچے میں ڈھالتی ہیں۔ جب ان کے ارادوں کی تکمیل ہو چکتی ہے تو ان سانچوں کو خود بخود توڑ دیتی ہیں۔

برطانیہ بیسویں صدی کی سب سے اہم قوت قرار دی گئی تھی۔ پہلی بڑی لڑائی کے بعد کمزور قوموں کے مقدر اس سلطنت کے قبضۂ اقتدار میں رہے۔ جس طرح چاہا اپنی مرضی اور رضا پر استعمال کیا۔ فاتح کی حیثیت سے مفتوح اقوام کے ساتھ اس نے جن اطوار سے اپنی تاریخ مرتب کی امورخ اس کو حقیقت ماننے سے انکار کرتا ہے۔ کیونکہ اس کی نظر میں یہ اوراق انصاف اور دیانت کے خلاف مرتب کیے گئے ہیں۔ لیکن جیسے ہی مفتوح فاتح پر غالب نظر آیا فاتح نے اپنے مصنوعی سہارے تلاش کرنے شروع کیے۔

۲۲ مئی کو ہٹلر نے سیاسی بساط پر ایک نئی چال چلی۔ یعنی اس نے فرانس اور روس کے درمیان معاہدہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

"اس معاہدہ کے متعلق کوئی ذمہ دار بیان نہیں شائع کیا گیا جس سے اس کے اغراض و مقاصد واضح ہوں۔ کیونکہ جرمن! روس اور فرانس کے فوجی اتحاد کو لیگ آف نیشنز کی سپرٹ کے خلاف سمجھتا ہے۔

جرمن! آسٹریلیا کے اندرونی معاملات میں دخل دینا مناسب نہیں سمجھتا اور نہ

اس کی خواہش ہے کہ آسٹریلیا کا جرمنی کے ساتھ الحاق ہو۔

مجھے افسوس ہے کہ آسٹریلیا کے ساتھ ہمارے تعلقات خراب ہیں ۔ اور اس کشیدگی کا نتیجہ ہے ، کہ اٹلی کے ساتھ بھی ہمارے تعلقات ناخوشگوار ہو گئے ہیں ۔ حالانکہ جرمن اور اٹلی کے مفاد میں کوئی تصادم نہیں"۔

ہٹلر نے جرمن کے بحری بیڑے کے متعلق کہا :

" برطانیہ کے پاس جتنے بڑے وزنی جہاز ہیں ، جرمن کو ان کا پینتیس[35] فیصد رکھنے کی اجازت دی جائے ۔ اگر اس مطالبے کو منظور کر لیا جائے تو جرمن کا بحری بیڑا ، فرانس کے بحری بیڑے کے مقابل میں پندرہ فی صد سے بھی کم وزنی ہو گا"

آگے چل کر ہٹلر نے روس کے سوا باقی تمام ممالک کے ساتھ ہوائی مساوات کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا :

" جرمنی بڑی بڑی توپوں ، ٹینکوں اور آبدوز کشتیوں کا خاتمہ کرنے اور جنگی جہازوں کے وزن کی حد مقرر کرنے نیز اسلحہ پر پابندی منظور کرنے کے لیے تیار ہے"۔

بین الاقوامی حالات پر جرمنی کے رویے کی وضاحت کرتے ہوئے ہٹلر نے کہا :

" ۱۷ اپریل کو جنیوا میں جو مطالبہ کیا گیا تھا ، جرمن گورنمنٹ نے اسے نامنظور کر دیا ۔ صرف جرمنی نے ہی معاہدہ وارسائی کو نہیں توڑا بلکہ ان طاقتوں نے بھی توڑا ہے ، جو اسلحہ کو کم کرنے کے مطالبہ کے متعلق جرمن کی شکایت کرتی ہیں حالانکہ معاہدہ کی رو سے وہ ایسا کرنے کی پابند نہیں ۔

لیگ آف نیشنز نے حال ہی میں جرمنی کے خلاف جو امتیازی فیصلہ دیا ہے ، وہ جرمن کو اس قابل نہیں بناتا کہ وہ لیگ آف نیشنز میں واپس جائے جب تک تمام الجھاؤ میں انصاف اور مساوات پیدا نہ ہو جائے ۔ ازیں حالات جرمن چاہتا ہے کہ معاہدہ ورسیلز پر ، جس میں مفتوح اور فاتح قوم میں امتیاز روا رکھا گیا ہے خطِ تنسیخ کھینچ دی جائے اور لیگ آف نیشنز

کوئی ایسا سمجھوتہ نہ کرائے جس میں اس کے تمام ممبروں کے مساوی درجات کو تسلیم نہ کیا گیا ہو اور بین الاقوامی زندگی میں تمام اقوام کو مساوی حقوق حاصل نہ ہوں۔

حکومت جرمنی کسی ایسے سمجھوتے پر دستخط نہیں کرے گی جس کی شرائط اس کے خیال میں پوری نہ ہو۔ ہاں وہ ان تمام معاہدوں کی، خواہ وہ موجودہ گورنمنٹ سے پہلے ہی کیوں نہ کیے گئے ہوں، پابند رہے گی۔ جن پر اس نے اپنی مرضی سے دستخط کیے ہیں۔ جب تک معاہدہ لوکارنو پر دستخط کرنے والی دیگر طاقتیں اس معاہدے کی پابند رہیں گی جرمن بھی ان معاہدوں پر پیدا شدہ ذمہ داریوں کو قبول کرتا رہے گا۔ چونکہ دوسری طاقتوں نے تخفیف اسلحہ کی ذمہ داریوں کو پورا نہیں کیا اس لیے جرمن نے معاہدہ ورسیلز کے اس آرٹیکل کا پابند رہنے سے انکار کر دیا ہے، جس کی رو سے جرمن کے خلاف امتیازی سلوک روا رکھا جا رہا تھا۔

جرمن غیر مشروط طور پر ان احساسات کا احترام کرے گا جو اقوام کی بین الاقوامی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ جرمن اجتماعی سسٹم میں شامل ہونے اور لوکارنو پیکٹ کے علاوہ ہوائی طاقت کے متعلق معاہدہ کرنے کے لیے بھی تیار ہے اور اس سلسلے میں جو بھی گفتگو ہوگی وہ اس میں شامل ہوگا۔ جرمن گورنمنٹ اپنے ہمسایوں کے ساتھ جارحانہ کارروائی نہ کرنے کے متعلق الگ معاہدہ کرنے کو بھی تیار ہے۔

جرمن گورنمنٹ کسی حالت میں بھی جرمن فوج کی از سر نو تنظیم کے کام کو بند نہیں کرے گی۔

جرمن کے اس کام سے کسی کو کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔ جرمن اپنے اسلحہ جات کو بھی کم کرنے کے لیے تیار ہے۔ بشرطیکہ دوسری طاقتیں بھی ایسا کرنے پر آمادہ ہوں۔ جرمن سمندر میں بھی کسی کا حریف نہیں بننا چاہتا۔ کیونکہ وہ برطانیہ کے اس معاہدے کو تسلیم کرتا ہے کہ برطانوی سلطنت کے استحکام کے لیے اسے زبردست بحری طاقت کی ضرورت ہے۔ لیکن یورپ میں اپنی ہستی کو قائم رکھنے کے لیے وہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہے۔ نیز جرمن اسلحہ پر پابندی عائد کرنے

یا اسے ختم کرنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ ہے۔
جرمن ایسا معاہدہ کرنے پر بھی آمادہ ہے، جس کی رو سے کوئی ملک
دوسرے ملک کے اندرونی معاملات میں دخل نہ دے سکے۔"

ہٹلر کی اس تقریر سے جرمن پریس اور عوام نے یہ تاثر لیا کہ ہٹلر نے برطانیہ کی رائے عامہ کو اپنی حمایت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

ایکٹ ۱۹۳۵ء نے اقوامِ ہند کے مابین جو انتشار ڈال دیا تھا، برطانیہ کی گرتی ہوئی دیوار کو یہ انتشار بھی سنبھالا نہ دے سکا، تاہم برطانوی سیاستدانوں کو جرمن لیڈر کی مندرجہ بالا تقریر میں اپنے لیے قدرِ عافیت نظر آئی اور انھوں نے ہٹلر سے پیچھا چھڑانے کے لیے اس وقت کو غنیمت جانا۔ اور دوسرے روز ۲۳ مئی کو برطانوی وزیرِ خارجہ مسٹر بالڈون (جن کے متعلق ان دنوں یہ افواہ تھی کہ وہ رمزے میکڈانلڈ کے بعد وزیرِ اعظم ہونے والے ہیں) نے دارالعلوم میں اپنی تقریر کے دوران ہٹلر کی گزشتہ روز کی تقریر کے جواب میں کہا:

"ہٹلر کی تقریر میں اُمید کی ایک جھلک ہے۔ ہمیں اس روشنی کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہم ایک بار پھر یہ چاہتے ہیں کہ دیگر ممالک کے دلوں پر جرمن کا جو خوف طاری ہو چکا ہے اسے نکال دیا جائے۔
بین الاقوامی سیاست کے پس پردہ پچھلے دنوں جو کچھ ہوتا رہا ہے اس سے برطانیہ بھی خائف تھا اور اس خوف کی خاص وجہ بین الاقوامی حالات سے لاعلمی تھی۔ اب جرمن نے صحیح صحیح حالات بے نقاب کر دیے ہیں۔ لہٰذا وہ وقت قریب آ رہا ہے جب کہ تمام یورپین ممالک اپنی خواہش صاف صاف بیان کر دیں گے۔
گزشتہ نومبر میں میں نے جو جرمن کے جنگی جہازوں اور ہوائی بیڑے کے متعلق اعداد و شمار پیش کیے تھے وہ مبنی بر انصاف ہیں اور گزشتہ چھ سالوں میں جرمن نے مزید ہوائی جہازوں کی تیاری کے کام میں نمایاں توسیع کر لی ہے۔
دراصل ان امور کے متعلق ہمیں کسی قدر غلط فہمی ہوئی تھی۔ جن دنوں سر جان سائمن نے جرمن میں ہٹلر سے ملاقات کی تھی اور وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ

جرمن کی ہوائی طاقت برطانیہ کے برابر ہو گئی ہے۔ بعد کی تحقیق سے پتہ چلا کہ ساڑھے آٹھ سو جنگی جہاز ہیں جو ہوائی جنگ کی صورت میں نہایت کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔

ہٹلر نے سر جان سائمن سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ جرمن ہوائی طاقت کے لحاظ سے دراصل فرانس کا ہم پلہ ہونا چاہتا ہے۔ گویا ہٹلر فرانس کے بین بین چل کر پندرہ سو جنگی جہاز تیار کرنے کے درپے ہے۔ ان حالات میں برطانیہ کے لیے اس موقعہ کو غنیمت جان کر چاہیے کہ وہ بین الاقوامی امن کے لیے کوشش کرے۔"

کوزے میں زلزلہ

صناع کے نزدیک اس کی ہر تخلیق ایک عظیم شاہکار سمجھی جاتی ہے۔ تخیلات کے ہجوم میں کھو کر جب وہ موئے قلم سے صفحۂ قرطاس پر الٹی سیدھی لکیروں کے ہیولے لکھتا ہے تو اس کی اپنی فطرت کہہ اٹھتی ہے کہ میری کائنات میں میرا جواب نہیں۔ حالانکہ عارضی رنگوں کے امتزاج کی یہ کاغذی عمارت ہوا کے ایک جھونکے سے اپنی تمام رونق ضائع کر بیٹھتی ہے۔ لیکن اس پر بھی گمراہی کا یہ عالم ہے کہ بے اختیار بول اٹھتا ہے۔

تو نے یہ کیا غضب کیا، مجھ کو بھی رسوا کر دیا!
میں ہی تو ایک راز تھا، سینۂ کائنات میں

اگر مصور کاغذ اور مٹی کے کھلونوں پر اس قدر مسرور اور مغرور ہو سکتا ہے تو خالق کائنات کو یہ حق کیوں نہیں کہ وہ ارض و سماوات کا مالک و خالق ہونے [illegible] اپنے تخلیقی شہ پاروں پر اپنے احکام نازل نہ کرے؟ اور انہیں اپنی رضا پر [illegible] کبھی کبھار مٹی کی ان رنگین مورتوں میں ایسا ہیجان اٹھتا ہے کہ ان کے [illegible] بغاوت پر اکساتے ہیں تو یہ آپے سے باہر ہو اٹھتی ہیں۔ [illegible] تتلیاں فساد [illegible] آتی ہیں مگر جیسے ہی تار ٹوٹتی ہے یہ بے حس و حرکت [illegible] لیٹ جاتی ہیں۔ قرآن حکیم نے اسی پر کہا ہے:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ

ترجمہ: پھیل گیا فساد جنگل اور دریا میں لوگوں کی ہاتھ کی کمائی سے تاکہ چکھایا جائے ان کو کچھ مزہ ان کے کام کا کہ شاید واپس آجائیں۔

یہی حوادثِ کائنات ہے جسے مادی دنیا زلزلہ کہتی ہے۔ اس سے فطرت کی مراد انسانوں کو ان کے برے افعال پر عبرت دینا مقصود ہوتا ہے نہ کہ تباہی۔

ہندو تھیالوجی کے نزدیک دھرتی کا تمام بوجھ بیل دیوتا کے سینگ پر ہے اور جب وہ اپنا سینگ تبدیل کرتا ہے تو زمین کانپ اٹھتی ہے۔ اپنے پاپوں (گناہوں) سے دھڑکتے ہوئے دل اسے زلزلہ کہتے ہیں۔ پھر وہ دھن دولت سے اپنے پاپ دھونے کی کوشش میں فقیروں کو خیرات بانٹتے ہیں۔

سائنس دان زلزلے کو زمین کے بخارات سے تعبیر کرتے ہیں ان کی رائے ہے کہ جہاں کہیں بخارات کو نکاس کی راہ نہیں ملتی وہیں زلزلہ آتا ہے۔

انسانوں کا دل بذاتِ خود ایک کائنات ہے اور یہ کائنات اس قدر کمزور ہے کہ اس آبگینے کو نگاہ کی ایک ہلکی سی چوٹ پارہ پارہ کر جاتی ہے۔ شاعر کہتا ہے: ؎

مت کسی کا دل دکھا اور مت کسی کی آہ لے
دل کے دکھ جانے سے ناداں عرش بھی ہل جاتے ہے،

یہ حقیقت ہے کہ جب دل کی دنیا میں زلزلہ آتا ہے تو بحر و بر کانپ اٹھتے ہیں۔

صدیوں پہلے سقراط نے کہا تھا کہ زمین گردش میں ہے اور اسے اس جرم میں زہر پینا پڑا۔ لیکن آج سمندر ہوں کہ پہاڑ، زمین ہو کہ آسمان۔ اس طرح لرزہ براندام ہیں کہ کائنات کا سکون جنس گراں بنتا جا رہا ہے۔ بدیں وجہ قرآن حکیم کا یہ فیصلہ درست ہے ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ

ترجمہ: پھیل گیا فساد جنگل اور دریا میں لوگوں کی ہاتھ کی کمائی سے تاکہ چکھایا جائے ان کو کچھ مزہ ان کے کام کا کہ شاید واپس آجائیں۔

یکم جون کے اخبارات کی پہلی سرخی تھی۔

"۳۱ مئی رات پونے تین بجے کوئٹہ میں شدید زلزلہ آیا، جس میں ہزاروں جانیں تلف ہوگئیں۔ شہر اور دیہاتوں کا نشان تک مٹ گیا۔ کوئٹہ کا بابو محلہ اس سے خاصہ متاثر ہوا۔ چالیس ہزار سے زیادہ اموات ہوئیں۔ سرکاری اطلاع پچاس ہزار کی ہے۔"

پلک جھپکتے ہی عمارتیں کھنڈرات میں تبدیل ہو گئیں

مورخین کی تحقیق ہے کہ کرۂ ارض پر سب سے پہلا زلزلہ "کوریتھ گریس" میں ۸۵۶ء میں آیا تھا اور اس میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد پینتالیس ہزار تھی۔

(یہ ٹائم پیس زلزلہ کے وقت رک گیا تھا اس سے زلزلے کے صحیح وقت کا پتہ چلتا ہے)

ممکن ہے کہ مورخین کی تحقیق صحیح ہو لیکن اگر اسلام کی سطح پر پرکھا جائے کہ زمین انسانی گناہوں سے کانپ اٹھتی ہے تو مورخ کی رائے پر اختلاف لازم آتا ہے۔ کیونکہ انسان اور گناہ کا رشتہ روزِ آفرینش سے قائم ہے۔ آرزوؤں اور تمناؤں کا گہوارہ انسان شاہراہِ زندگی کے ہر موڑ پر فریب کھاتا ہے اور فریب خوردہ انسان اپنے عصیاں پر مطمئن ہوتے کے ساتھ بعض

دفعہ اسے نیکی کا درجہ دینے پر تیار ہو جاتا ہے یہی گمراہی انسان کے گناہوں کی پہلی منزل ہے۔

اگر اس حقیقت کو درست مان لیا جائے تو مؤرخین کی تحقیق غلط ہو جاتی ہے۔ طوفانِ نوح فرعونِ مصر، عاد، ثمود اور آئے دن کوہ آتشیں کے پھٹنے کو کیا سمجھا جائے، جس میں ہزاروں نہیں لاکھوں جانیں تلف ہو چکی ہیں۔ یہ بھونچال نہیں تو اور کیا ہے۔

بہر حال ۳۰ اور ۳۱ مئی ۱۹۳۵ء کی درمیانی شب کوئٹہ کی تباہی کی چشم دید گواہ ہے کہ اس رات کی صبح ہزاروں مرنے والوں کو نصیب نہیں ہوئی۔

لے آب و گیاہ پہاڑوں کے درمیان پینسٹھ ہزار کی یہ آبادی جس میں ہر سال تفریح کے لیے آنے والوں کی تعداد قریباً بیس ہزار کا اضافہ کر دیتی تھی کوئٹہ میں مئی کے دنوں موسم تبدیل ہو جاتا ہے لیکن اس سال موسم گرما اس ماہ بھی سرد رہا۔ اس طرح اس بدنصیب شہر کی آبادی تباہی کے دنوں اسی ہزار کے قریب تھی۔

برطانیہ کے ایک صحافی رابرٹ جیکسن اپنی تصنیف "کوئٹہ کے تیس سیکنڈ" میں اس قیامت صغریٰ کا نقشہ یوں کھینچتا ہے۔

> وہ ہوا میں خنکی تھی۔ چاند ابتدائی دنوں کا تھا۔ بادلوں کے آوارہ سائے ادھر اُدھر بھٹک رہے تھے۔ کچھ بے گھر لوگ فٹ پاتھوں پر سو رہے تھے اور جن کے گھر تھے وہ بند کمروں میں آنے والی تباہی سے بے خبر گہری نیند میں مبتلا تھے۔
>
> اس رات کوئٹہ کے جانور عجیب سی بولیاں بول کر اپنی بے چینی کا اظہار کر رہے تھے۔ گھوڑے، بھینس، بکریاں اپنی اپنی جگہ پر نہایت اضطراری کیفیت میں مبتلا تھے۔ لیکن نہ تو کسی نے ان کی آواز سنی اور نہ توجہ دی۔

○

کوئٹہ بلوچستان کا واحد مقام نہ تھا جہاں تین بجکر تین منٹ پر موت، زندگی پر حاوی ہو گئی تھی۔ زلزلے کا پھیلاؤ ستر میل لمبے اور سولہ میل چوڑے علاقے تک تھا۔ قلات کا معروف قصبہ مستونگ بھی آناً فاناً ہلاکت دنیا ہی کے اندھیرے میں ڈوب گیا تھا۔"

ایک اور واقعہ نگار آفاقی لکھتا ہے۔

۳۱ مئی ۱۹۳۵ء کی صبح ——— آج کی صبح کوئٹہ میں اندھا سورج طلوع ہوا۔ آج کوئی ہنستا مسکراتا بچہ سکول نہ جا سکا۔ آج کوئی خاتون قندھاری بازار خریداری کے لیے نہیں آئی۔ آج کسی بنک کا دروازہ کاروبار کے لیے نہ کھل سکا۔
آج کوئٹہ شہر کے تمام بازار اچانک ماتم کناں نظر آتے ہیں۔
اندھا سورج ہر طرف تاریکی اور بربادی کی کرنیں پھیلا رہا ہے۔"

٥

نصف رات کے قریب گرد و پیش کے ماحول میں کچھ مبہم سا تغیر رونما ہونے لگا۔ گھٹن اور حبس کی سی کیفیت بڑھنے لگی۔ کچھ ہی ثانیہ بعد مغرب کی طرف سے سائیں سائیں کا شور بلند ہونے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس شور نے آندھی کا روپ دھار لیا۔ کوئٹہ شہر شرقاً غرباً اور شمالاً جنوباً خوفناک اور مہیب آندھی کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔
ابھی آندھی کا زور تھمنے نہ پایا تھا کہ مغرب کی طرف سے زیر زمین ایک جھٹکے کی برق رفتار اور جھنجھلا دینے والی لہر آئی اور مشرق کی طرف کوند گئی۔ بمشکل چند ثانیے گذرے ہوں گے کہ مشرق کی طرف سے اسی طرح کی ایک خوفناک زیر زمین لہر آئی۔ معاً یہ خیال گذرا کہ دونوں مخالف لہروں میں ایک زبردست قسم کا ٹکراؤ ہوا ہے۔ بس پھر کیا تھا کوئٹہ شہر ایک لرزہ خیز گڑگڑاہٹ کے سمندر میں ڈوب گیا۔
پینتالیس سیکنڈ تک گڑگڑاہٹ اور زلزلے کے بے رحم جھٹکوں کا سلسلہ جاری رہا اور اس کے ساتھ جھونپڑیوں، مکانوں اور دکانوں کے انہدام کا غیر معمولی شور و غوغا اٹھا کہ الامان! سوئے ہوئے زندہ انسان عمارتوں کی چھتوں تلے آ کر کچلے گئے۔ معصوم بچے اور الہڑ دوشیزائیں، جو خوابوں کے حسین جزیرے میں پہنچے ہوئے تھے، پھر کبھی بھی لوٹ کر اس حقیقی دنیا میں نہیں آ سکے۔ جوان جو سینوں میں عزم و ہمت کے چراغ روشن کیے سو رہے تھے دوبارہ آنکھ نہ کھول سکے۔
ہر طرف کہرام مچ گیا۔ مکان گر رہے تھے۔ زمین پھٹ رہی تھی۔ پہاڑوں سے

توی ہیکل پتھر اور بھاری بھرکم چٹانیں نشیبی آبادیوں کی طرف ڈھلک رہی تھیں اور وہ بدقسمت جو اس قیامت صغریٰ کی زد میں آ رہے تھے اپنی دل دوز چیخ و پکار سے کانوں کے پردے پھاڑ رہے تھے۔ یہ سلسلہ صبح ہونے تک جاری رہا۔ بچے یتیم ہوتے رہے۔ مائیں اپنے لخت ہائے جگر سے محروم ہوتی رہیں۔ بہنوں کے بھائی ہزاروں من مٹی کے بوجھ تلے سسک سسک کر دم توڑتے رہے۔

اسی طرح رات بھر زندگی اور موت، موت اور زندگی کے درمیان تصادم جاری رہا۔

o

میں نے دیکھا کہ انگریزوں نے لاشیں لواحقین کے سپرد نہ کیں، بلکہ بڑے بڑے گڑھے کھودے اور مسلمان، ہندو، سکھ یا عیسائی کا امتیاز کیے بغیر لاشوں سے بھر دیے۔ ایک ایک گڑھے میں سو سو افراد دفن کیے گئے۔

یہ قبرستان کانسی منڈ پر آج بھی موجود ہے۔"

جس کو راکھے سائیاں

عبدالصمد درانی لکھتے ہیں:-

" بابو محلہ میں ایک ڈرائیور رہتا تھا۔ اس کا گھر بھی زلزلہ میں تباہ ہو چکا تھا۔ جب سات دن کے بعد اس کے گھر کی کھدائی کی گئی تو اس کا شیر خوار بچہ زندہ تھا اور انگوٹھا چوس رہا تھا۔

o

۳۰ مئی کی رات کو ہماری مرغی نے انڈوں میں سے تیرہ بچے نکالے۔ ہمیں گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ زندہ بچ رہیں گے۔ قدرت کا کرشمہ دیکھئے تین دن کے بعد جب ملبہ اٹھایا گیا تو مرغی اپنے پروں تلے بچوں کو لیے بیٹھی تھی۔ انہیں باہر نکالا تو سفید بچے ملبے پر قلانچیں لینے لگے

o

ایک خاتون ملبے کے نیچے دب کر ہلاک ہو گئی۔ مگر اس کی ننھی منی سی شیر خوار

بچی زندہ بچ گئی اور اسے خراش تک نہ آئی۔

۵

ایک معجزہ میں نے اپنی نظروں سے دیکھا ہے۔ میرے اور موسیٰ خاں (سابق گورنر مغربی پاکستان) کے استاد سید غلام حسین معمر تھے۔ ان کے اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔ ایک بچی پال رکھی تھی۔ حادثے کی رات سید غلام حسین، ان کی بیوی اور لے پالک بیٹی سب گھر ہی میں تھے۔ حادثے کے دس گھنٹے بعد ان کا پتہ لگانے ان کے گھر پہنچا تو مکان ڈھیر ہو چکا تھا۔ ساتھ والی دو منزلہ عمارت بھی ان کے مکان پر گری تھی۔ ہاتھوں سے ملبہ اٹھانا شروع کیا۔ چند دوست بھی میرے ساتھ تھے۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد ملبے سے آواز سی سنائی دی۔ کان لگایا تو یقین ہو گیا کہ استاد محترم زندہ ہیں۔ کچھ دیر کے بعد آواز صاف سنائی دینے لگی۔ میں نے کہا "ہم پہنچ گئے ہیں تو استاد محترم نے جواب دیا کہ سٹور میں سے کدال اور بیلچہ لے کر ملبے کو ہٹاؤ۔ ہم نے مسلسل جدوجہد کے بعد گھر کے تینوں افراد کو باہر نکالا۔

ان کے بچ رہنے کی وجہ دو شہتیر تھے۔ جو گرتے وقت آپس میں اوپر کی طرف مل کر زمین میں دھنس گئے تھے۔ جو ملبہ پڑتا تھا یہ شہتیر اسے روک لیتے۔ استاد غلام حسین، ان کی بیوی اور لے پالک بیٹی۔ تینوں ان شہتیروں کی اوٹ میں بیٹھے ہوئے تھے۔"

"روزنامہ مشرق۔ سنڈے ایڈیشن۔ کوئٹہ نمبر۔ ۲۸ مئی ۱۹۶۷ء"

احرار کا کوئٹہ ریلیف کیمپ

چاہیے تو یہ تھا کہ اس قیامت صغریٰ میں انسان انسان کے کام آتا۔ کوئٹہ کے مصیبت زدگان کے لیے دنیاوی دھندوں سے چند دنوں کے لیے ہاتھ کھینچ لیا جاتا۔ مگر ملک بھر کی سیاسی جماعتوں نے اپنی دنیاوی ضرورتوں کو ترک نہ کیا۔ وہ آئندہ انتخاب کی تیاریوں میں بدستور مصروف رہیں لیکن احرار رہنماؤں نے شعبہ خدام خلق کے تحت لاہور دہلی دروازہ سے باہر کوئٹہ ریلیف کیمپ قائم کر دیا۔ بارہ ڈاکٹر اور پچاس کمپوڈروں کی ایک جماعت پوری تیاری کے ساتھ کوئٹہ روانہ کر دی گئی۔ اس کے ساتھ ہی

رضا کاروں کی بھرتی کا عام اعلان کر دیا گیا جو کوئٹہ سے آنے والے زخمیوں کی دیکھ بھال میں مجلس احرار کا ہاتھ بٹائیں۔ نیز مصیبت زدگان کی امداد کے لیے ایک ریلیف فنڈ جاری کیا گیا۔

مقامی ریلیف کیمپ کے انچارج ڈاکٹر محمد عبد القوی لقمان ایم۔ بی۔ بی۔ ایس مقرر تھے کیمپ دہلی دروازے سے اکبری دروازے تک پھیلا ہوا تھا۔ سو سے زائد برقی پنکھے اور اسی قدر برقی روشنی کا انتظام تھا۔ مجلس احرار نے کوئٹہ سے لاہور تک تمام اسٹیشنوں پر اپنے رضا کار متعین کر دیے تھے جو زخمیوں کی ہر طرح تیمارداری کرتے۔ امرتسر اور لاہور میں ۲۔ جون تک دو ہزار سے زائد کوئٹہ سے زخمی پہنچ چکے تھے۔ اس ضمن میں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ احرار نے اپنے تمام تبلیغی اور سیاسی پروگرام ملتوی کر دیے اور تمام رہنما لاہور مرکز میں جمع ہو گئے۔

احرار کوئٹہ ریلیف کیمپ کے امدادی کاموں میں مقامی کانگریس، انجمن حمایت اسلام لاہور اور دیگر مسلم جماعتوں نے پورا تعاون کیے رکھا۔ چھ لاریاں روزانہ لاہور ریلوے اسٹیشن سے مجروحین کو کیمپ تک پہنچانے میں دن رات مصروف تھیں۔ کیمپ میں مختلف جگہوں پر لاؤڈ اسپیکر لگا دیے گئے تھے تاکہ تکلیف یا ضرورت کے وقت کسی ڈاکٹر کو بلانے میں دقت نہ ہو۔ میو ہسپتال لاہور کے ڈاکٹر بھی بسا اوقات زخمیوں کو طبی امداد دیتے۔ لاہور کے معزز گھرانوں کی عورتیں زخمی بہنوں کی تیمارداری کرتیں۔

کیمپ کے انچارج چودھری افضل حق تھے۔ جو کوئی لمحہ گذارے بغیر کیمپ کے اردگرد گھومتے پھرتے اور ہر طرح کے کام کی نگرانی کرتے۔ اسی طرح امرتسر ریلیف کیمپ کے انچارج مولانا عبد السلام ہمدانی تھے اور ان کے معاون شیخ صادق حسن رئیس امرتسر، مولانا عبد الکریم مباہلہ خواجہ عبد الرحیم عاجز اور مرزا غلام نبی جانباز تھے۔ پنجاب کے سرکاری حکام نے بھی اس سلسلے میں پوری طرح تعاون کیا۔ وائسرائے ہند لارڈ ولنگڈن اور اس کی بیوی نے احرار ریلیف فنڈ میں پانچ ہزار روپیہ دیا۔ اس وقت کیمپ میں زخمیوں کی تعداد سینکڑوں تھی۔

احرار وفد پر پابندی

یکم جون سے ۵۔ جون تک مجلس احرار کے چار مختلف وفد مصیبت زدگان کی امداد کے لیے کوئٹہ روانہ ہو چکے تھے۔ اور ان کی رپورٹ کے مطابق ہر طرح کی اشیاء کوئٹہ روانہ کی جا رہی تھیں کہ ۵۔ جون کو حکومت بلوچستان نے ڈاکٹر

عبدالقوی نعمان انچارج رلیف کیمپ کو تار کے ذریعہ مطلع کیا۔

"کوئٹہ میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا ہے۔ وہاں ہر طرح کی بیرونی مداخلت ممنوع قرار دے دی گئی ہے۔ لہٰذا ہمیں افسوس ہے کہ ہم آپ کی مزید خدمات سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ برائے نوازش اب آپ کوئٹہ میں اپنی رلیف پارٹیاں نہ بھیجیں۔"

اس کے ساتھ ہی چوتھے احرار وفد کے سیکرٹری مولانا عبدالغفار غزنوی نے جیکب آباد سے چودھری افضل حق کو تار کے ذریعہ مطلع کیا کہ:

"ملٹری آفیسروں نے ہمیں جیکب آباد کے ریلوے اسٹیشن پر روک لیا ہے آپ ڈپٹی کمشنر لاہور کے ذریعہ ان افسران سے کوئٹہ جانے کی اجازت لے کر دیں کیونکہ ابھی کوئٹہ میں امداد کی سخت ضرورت ہے۔ نیز کمبل اور سامان خورد و نوش بھی روانہ کریں۔"

"روزنامہ انقلاب لاہور ۲۔ جون ۱۹۳۵ء"

صدر مرکزیہ کا حکم

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی صدر مرکزیہ مجلس احرار نے ماتحت مجالس کو حکم دیا کہ وہ کوئٹہ مصیبت زدگان کی امداد کے لیے مقامی ڈاکٹروں کو جو بغیر معاوضے کے کام کریں فوراً لاہور روانہ کریں۔

حکومت بلوچستان کے مطابق کوئٹہ میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یورپین مجروحین کے لیے باقاعدہ رلیف کمیٹیاں کوئٹہ پہنچ رہی ہیں۔ خاص طور پر ان کے ذمہ ہے کہ انگریز خاندان کی دیکھ بھال کی جائے۔ انہی دنوں وائسرائے ہند کوئٹہ رلیف فنڈ جاری کیا گیا، جس میں دیکھتے دیکھتے لاکھوں روپے جمع ہو گئے۔ سرکاری اور غیر سرکاری سرمایہ دار وائسرائے کے رلیف فنڈ میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر امداد کرتے حالانکہ سرکاری آفیسر ہر روز احرار رلیف کیمپ دیکھنے آتے لیکن امدادی رقوم وائسرائے فنڈ میں دیتے۔ اس کے مقابل احرار رلیف فنڈ میں بیس ہزار سے زیادہ روپیہ جمع نہیں ہوا۔ جس کی تفصیل ہر روز شام کو شائع ہونے والی بلٹین میں درج کر دی جاتی تھی۔

احرار کیمپ کا معائنہ

لاہور۔ ۶۔ جون۔ آج تیسرے پہر میں نے مجروحین کوئٹہ کے اس کیمپ کا معائنہ کیا جو مجلس احرار نے باغ بیرون دہلی دروازہ میں قائم کر رکھا ہے۔ بحالات موجودہ ایک سو سے زائد بستروں کا انتظام شامیانوں کے نیچے مجروحین کے علاج کا بیک وقت انتظام ہے۔ ایم۔ بی۔ ہائی سکول کی عمارت میں بھی مجروحین ہیں۔ اس کیمپ میں عورتیں اور بچے بھی مجروحین ہیں، جن کی دیکھ بھال کے لیے عورتیں مقرر ہیں۔ پناہ گزینوں کے نام کا رجسٹر موجود ہے۔ بجلی کے پنکھے اور روشنی کا بہترین انتظام ہے۔ مجروحین کی خوراک کا انتظام بھی خوب ہے۔ ڈاکٹر عبدالقوی لقمان، ڈاکٹر عبدالرحیم خاں ایم۔ بی۔ بی۔ ایس سابق سول سرجن اور ان کے ساتھ دوسرے ڈاکٹر ہمہ تن مصروف ہیں۔

بحیثیت مجموعی احرار کیمپ نہایت مفید خدمت انجام دے رہا ہے! ایسے میں مسلمانان لاہور کا فرض ہے کہ وہ مجلس احرار کی دل کھول کر امداد کریں۔ کیونکہ اس وقت صرف یہی ایک کیمپ ہے جو مجلس احرار نے قائم کر رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے۔ آمین"

(عبدالمجید سالک۔ مدیر روزنامہ انقلاب" لاہور۔ ۸۔ جون ۱۹۳۵ء)

بُرائی نیکی سے خائف

نیکی بہرحال نیکی ہے، اسے کرتے رہنا چاہیے۔ برائی نیکی سے خائف رہ کر اسے ڈرانے دھمکانے کے کئی بہانے تلاش کرتی ہے۔ مگر ایک وقت آتا ہے جب انسان کے نامۂ اعمال میں نیکی واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔

۷۔ جون کو روزنامہ" انقلاب" لاہور کے ایڈیٹر عبدالمجید سالک نے احرار ریلیف کیمپ دیکھا۔ اور اس کی روئداد اگلے روز اپنے جریدے میں شائع کی۔ لیکن ۹۔ جون کے شمارے میں اپنے ادارتی نوٹ میں لکھتے ہیں۔

"ان دنوں بعض حضرات حکومت ہند کو مشورہ دے رہے ہیں کہ وہ احرار کو کوئٹہ ریلیف کے سلسلے میں اس قدر آگے جانے کی اجازت نہ دے کیونکہ اندیشہ ہے کہ وہ اس سے کوئی سیاسی فائدہ نہ اٹھائیں۔"

(محترم مدیر" انقلاب اگر ان مشیروں کے نام شائع کر دیتے تو بات صاف ہو جاتی لیکن

اس مبہم سے اداری نوٹ سے کئی شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ احرار کی بڑھتی ہوئی شہرت سے مرزائیوں کو خطرہ ہو۔)

اس کے دوسرے روز حکومت ہند نے اخبارات کے نام ایک پریس نوٹ جاری کیا کہ

"کوئٹہ کے متعلق کوئی خبر یا پریس نوٹ جو شائع ہو، وہ حکومت کی نگرانی میں ہو یا اس پر پابندی سختی سے ہو۔"

لاوارث بچے مصیبت کے دنوں میں بھی کفر اپنی شرارتوں سے باز نہیں رہا۔ چنانچہ کوئٹہ کے زلزلہ میں زندہ بچ رہنے والے یتیم اور لاوارث بچوں کو ہندو اور عیسائی مشنری اپنے جال میں پھانسنے کے لیے کوئٹہ سے لاہور تک تمام ریلوے اسٹیشنوں پر بھرپور حملے کرتے رہے۔ غیر مسلموں کی ان حرکات کے پیش نظر چودھری افضل حق ایم ایل اے نے ۱۲۔ جون کو پریس بیان کے ذریعے ہندو اور مسلمانوں سے اپیل کرتے ہوئے کہا:

"کوئٹہ کے مصیبت زدگان کا کام ابھی پورے طور پر شروع نہیں ہوا لیکن مختلف فرقوں نے یتیم بچوں اور مظلوم عورتوں کے اغوا کا کام شروع کر دیا ہے جس فرقے کے دماغ کے کسی گوشے میں دوسری قوم کے بچوں اور عورتوں کے اغوا کا خیال ہو انہیں خوف خداوندی سے ڈرنا چاہیے۔ بجائے دوسری قوم کے اغوا کا خیال کرنے کے انہیں اپنے ہزاروں بھیک مانگنے والے لوگوں کی حالت سدھارنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہزاروں ہندو مسلمان بچے اور عورتیں بھوک کے دکھ سے ملک میں مارے مارے پھر رہے ہیں ایسے وقت میں محبت اور نیک دل لوگ اپنی قوم اور مذہب کے ان بدنصیبوں کی امداد کیوں نہیں کرتے؟

میں تمام ہندو، مسلمان دوستوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ مصیبت زدگان کی بلاتفریق مذہب امداد کریں۔ فضول افواہوں کی طرف توجہ نہ دیں نیز کوشش کریں کہ ہندو عورتیں اور ہندو بچے ہندوؤں کے سپرد کر دیے جائیں۔ مسلمان عورتوں اور بچوں کو مسلمانوں کے حوالے کیا جائے۔ اس طرح باہمی اتحاد کو بڑھائیں

کسی قوم کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا بدترین اخلاقی گناہ ہے مجھے امید ہے کہ کوئی انصاف پسند ایسا گناہ نہیں کر سکتا۔

مجلس احرار اس وقت صرف اور صرف انسانی ہمدردی کے طور پر کوئٹہ کے مصیبت زدگان کی امداد کر رہی ہے۔ ہمارے کیمپ میں نہ صرف ہندو مسلمان مل کر مصیبت زدگان کی امداد کر رہے ہیں بلکہ سکھ اور عیسائی بھی اس مصیبت میں ہمارے معاون ہیں۔ ہماری یہ منشاء ہے کہ زیادہ سے زیادہ متحد ہو کر کام کیا جائے۔ مجھے امید ہے کہ تمام شہروں میں کام کرنے والی ریلیف پارٹیاں پورے تعاون سے کوئٹہ کے مظلومین کی امداد کریں گی۔ ایسا نہ ہو کہ کوئٹہ کے مصیبت زدگان کی امداد کی بجائے باہمی بداعتمادی سے لڑائی جھگڑا شروع ہو جائے۔ کوئٹہ والوں کی امداد کرتے کرتے کہیں دوسری مصیبت ملک پر نہ آ جائے۔"

کوئٹہ اور مجلس احرار

لاہور ہسپتال کو چھوڑ کر امدادِ مصیبت زدگان کوئٹہ کے دوسرے تمام مراکز میں مجلس احرار کے کیمپوں کو ہر اعتبار سے فوقیت حاصل ہے۔ اس مجلس نے باشندگان لاہور میں زخمیوں اور پناہ گزینوں کی امداد کا بے پناہ جوش پیدا کر دیا ہے، جس کا نتیجہ ہے کہ چارپائیاں البتہ سے اور ہسپتال کے سازوسامان خیمے شامیانے اشیائے خورد و نوش اور پہننے کے کپڑے، غرض ہر چیز بافراط مہیا کی جا رہی ہے اور ہر روز ان کیمپوں میں بے شمار پناہ گزین مطمئن اور زخمی تندرست ہو کر اپنے اپنے گھروں کو جا رہے ہیں۔ اور کارکنان احرار کی مخلصانہ خدمت کا شہر بھر میں چرچا ہو رہا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ مسلمان آئندہ بھی مجلس احرار کی امداد میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں گے۔

اشیائے مذکورہ بالا کے علاوہ نقد روپے کی بھی سخت ضرورت ہے مخیر حضرات اس طرف بھی توجہ فرمائیں۔ بعض اخباروں میں احرار کے کام کی تعریف کے ساتھ ہی ساتھ [illegible] انجمن اسلامیہ اور انجمن اشاعت اسلام پر بیہودہ اور بے [illegible] حملے کیے جا رہے ہیں [illegible] نزدیک یہ حملے محض احمقانہ جذبے کے تحت کیے جا رہے [illegible] ایسے شغل میں مصروف ہونا نہایت افسوسناک ہے [illegible]

مطابق خدمت کی ہے۔ مجلس احرار کے حُسنِ عمل کا اعتراف تمام ملک میں کیا جارہا ہے اور یقین ہے کہ مجلس کے حامی دوسری جماعتوں کو برا بھلا کہے بغیر بھی احرار کی معرفت مصیبت زدگان کی امداد جاری رکھیں گے۔

(روزنامہ "انقلاب" لاہور ۱۴۔جون ۱۹۳۵ء)

میو ہسپتال کا چارج لاہور میو ہسپتال میں کوئٹہ سے آنے والے مجروحین کا چارج بھی احرار کے حوالے کردیا گیا۔ اس ضمن میں چودھری افضل حق ایم۔ایل۔اے روزانہ صبح و شام میو ہسپتال پہنچ کر مجروحین کو دیکھتے ان کی ضرورت کا خیال کرتے۔ زنانہ احرار ریلیف کیمپ کی انچارج رشیدہ لطیف کو میو ہسپتال زنانہ وارڈ سونپ دیا گیا۔

(چوہدری افضل حق)

احرار بلیٹن کوئٹہ ریلیف کیمپ کی طرف سے ہر شام بلیٹن شائع ہوتا تھا اور ساتھ ہی تمام دن کا حساب آمد و خرچ بھی درج ہوتا۔ اس طرح ۲۲۔جون کے بلیٹن میں اعلان کیا گیا کہ

"یکم جون سے ۲۰۔جون تک دو ہزار دو سو پچاسی روپے کی آمد ہوئی۔ اس کے مقابل اسی تاریخ کو وائسرائے ہند کے ریلیف فنڈ میں بائیس لاکھ روپیہ جمع ہوچکا تھا۔"

وائسرائے کا اعتراف قریباً ایک ماہ بعد خدمت خلق کے جذبے سے قائم کردہ کوئٹہ ریلیف کیمپ اٹھا دیا گیا۔ مصیبت زدگان تندرست ہوکر گھروں کو جاچکے تھے، جو رہے انہیں لاہور میو ہسپتال تبدیل کردیا۔ لاوارث بچوں کو پنجاب کے مختلف خیراتی اداروں کے سپرد کردیا گیا۔ بیوہ عورتوں کو کچھ توان کے وارث لے

گئے اور چورہ گئیں انہیں دارالامان بھیج دیا گیا۔ اس طرح مجلس احرار انسانی فرائض سے سرخرو ہوئی۔

"ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد" کے مصداق مجلس احرار کو ہندوستان بھر میں شہرت ملی۔ اپنے اور پرائے اس خلوص کا اعتراف کرنے لگے گھروں سے نکل کر یہ شہرت حکومت کے ایوان تک جا پہنچی۔ وائسرائے ہند لارڈ ولنگڈن نے احرار کی ان خدمات کو سراہتے ہوئے انہیں وائسرائے ہاؤس نیو دہلی بلا بھیجا۔ اس موقعہ پر احرار ورکنگ کمیٹی کی آراء تقسیم ہو گئیں ایک گروہ وائسرائے کے سرٹیفکیٹ کے حق میں تھا اور دوسرا حکومت کی اس داد تحسین کے خلاف موقف دونوں کا درست تھا۔ اوّل الذکر کی رائے تھی۔

"جب ہم نے کسی سیاسی ضرورت یا غرض سے کوئٹہ کے مصیبت زدگان کی امداد نہیں کی تو پھر ہمیں اس مسئلہ میں حکومت کے تعاون کو پسند کرنا چاہیے اور اتنی سی بات پر حکومت کی ناراضگی لینا درست نہیں۔"

دوسرے گروہ (جس میں حضرت امیر شریعت سید عطا اللہ شاہ بخاری شامل تھے) کی رائے تھی

"اگر ہم نے کسی سیاسی ضرورت یا غرض سے یہ کام نہیں کیا تو پھر ہمیں حکومت کی خوشنودی کی بجائے اس کا صلہ اللہ تعالیٰ سے لینا چاہیے۔ (دوسری دلیل تھی)

ملک ہمارا تباہی بھی ہمارے ملک کی ہوئی۔ بھائی بھی ہمارے مرے ہم نے جو کچھ کیا ہے انسانیت کے لیے کیا ہے۔ انگریز سے سرٹیفکیٹ یا انعام کے لیے نہیں۔ لہٰذا ہمیں وائسرائے ہاؤس نہیں جانا چاہیے۔

اس پر کافی دیر بحث رہی۔ آخر اول الذکر گروہ کو شکست ہوئی اور احرار رہنماؤں نے وائسرائے کو ملنے سے انکار کر دیا۔

یوم کراچی جیسے ہی احرار کوئٹہ ریلیف کیمپ سے فارغ ہوئے کراچی کے مسئلے کو پھر اٹھا لیا گیا۔ حکومت ارادتاً اپنے اس ظلم پر پردہ ڈال رہی تھی جس کے باعث سینکڑوں مسلمان شہید اور زخمی ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ ایوان لندن میں بھی اس ظلم کی

صدائے بازگشت سنائی دی، لیکن حکومت کے فیصلے میں کوئی جنبش نہ آئی۔ آخر صدر آل انڈیا مجلس احرار نے ۲۱ جون کو تمام ہندوستان میں یوم کراچی منانے کا پھر سے اعلان کرایا۔ جس کی تائید میں ڈاکٹر سر محمد اقبال، مولانا حسرت موہانی، شیخ عبدالمجید سندھی، مفتی کفایت اللہ صدر جمعیتہ علمائے ہند اور بمبئی خلافت کمیٹی کے رہنماؤں نے پریس بیان دیئے، جس میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا۔ کہ

"کراچی کے واقعہ کی غیر جانبدارانہ تحقیقات کی جائے۔ مگر حکومت نے ایسی ضد پکڑی ہے کہ وہ اس جائز بات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اگر آگے چل کر حالات بگڑ گئے تو اس کی تمام تر ذمہ داری حکومت ہند پر ہوگی۔"

ووٹروں کی فہرست

۲۶ جون کو مجلس احرار کے ناظم مولانا مظہر علی اظہر نے مسلمانان ہند سے اپیل کی کہ

"جدید رائے دہندگان کی فہرست تیار ہو رہی ہے۔ یہ خبر سرکاری طور پر بھی شائع ہو چکی ہے۔ تمام مسلمان بلا سیاسی اختلاف اس موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے نام درج کرائیں۔

اگر کوئی کلرک اس سلسلے میں کسی قسم کا تساہل کرے تو اس کی اطلاع فوراً دفتر احرار کو کریں۔ یہ فہرست پندرہ جولائی تک مکمل ہو جائے گی۔ لہٰذا اس میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کرنی چاہیے۔"

جرمن، برطانوی معاہدہ

دنیا کبھی طاقت کے سامنے سجدہ ریز ہوتی ہے اور کبھی ضرورت کے سامنے جھکتی ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد برطانوی اقتدار کا سورج نئے زاویوں سے ابھرا اور شکست خوردہ طاقتیں فرنگی کے روبرو سپر انداز ہونے پر مجبور ہو گئیں۔ مگر جیسے ہی یہ دوپہر ڈھلی اور شام کے دھندلکے دکھائی دیئے تو آسمان کے ستارے بھی ایوان برطانیہ میں چھید کرنے لگے۔ جرمن کے اکھڑے ہوئے قدموں میں ٹھہراؤ آیا۔ حالات بدلتے دیر نہیں لگتی۔ قوت کا توازن کبھی ایک ہاتھ نہیں رہا۔ میدان جنگ میں ہار جانے والی قومیں جب سنبھالا لیتی ہیں تو بپھرے ہوئے شیر کی طرح اپنے شکار پر جھپٹتی ہیں

جرمن نے ۱۹۱۸ء میں مات کھا کر ورسیلز کے مقام پر اتحادیوں کے ہاتھوں ایک اور شکست کھائی کر جرمن کو ان کے سامنے پارہ پارہ کر کے اتحادیوں نے اپنی جھولی میں ڈال لیا۔ لیکن دلِ لخت لخت کو جوڑنے کے لیے جرمن قوم نئے عزم سے آراستہ ہو کر میدانِ کارزار میں آن پہنچی۔ فرانس اور برطانیہ، روس سمیت ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ ہٹلر نے جرمن چانسلر کی حیثیت میں بکھرے ہوئے دانوں کو پھر ایک تسبیح میں پرو دیا۔ جوان ہمت جرمن حالات اور وقت کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ اگرچہ اتحادیوں کے پسینے چھوٹتے رہے لیکن بہار کو آنا تھا وہ آ کر رہی۔

۱۱۔ جون ۱۹۳۵ء کو رمزے میکڈانلڈ کی جگہ مسٹر بالڈون کو برطانیہ کا وزیراعظم مقرر کر دیا گیا۔ موصوف اس سے پیشتر وزیر خارجہ کی حیثیت سے جرمن سے رابطہ قائم کیے ہوئے تھا اور خاص کر امسال ۲۲ مئی کو اپنی تقریر میں مسٹر بالڈون ، ہٹلر کی امن پسند پالیسی پر پسندیدگی کا اظہار کر چکا تھا۔ چنانچہ نئی ذمہ داریاں سنبھالتے ہی جون کے آخری دنوں انہوں نے ہٹلر سے ایک معاہدہ کر لیا۔ جس کی رو سے

> "جرمن کا یہ حق مان لیا گیا کہ وہ اپنی بحری قوت برطانیہ کے مقابل پینتیس[۳۵] فیصد تک بڑھا سکتا ہے۔ نیز اسے ہمسایہ ممالک کے برابر ہوائی فوج رکھنے کا اختیار بھی مل گیا"

اس طرح سترہ سال کے بعد معاہدہ ورسیلز جس کی وجہ سے جرمن کے دامن پر رسوائی کا داغ لگ چکا تھا، عملی طور پر ختم ہو کے رہ گیا۔ اس معاہدے کو لندن کے اخبارات نے برطانیہ کی سب سے بڑی غلطی قرار دیا اور ہٹلر کی بلند ہمتی پر اسے مبارک باد دی اور کہا کہ برطانیہ کی نرم پالیسی، ہٹلر کے روشن مستقبل کی ضامن بن کر ابھرے گی۔

ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات بھی برطانیہ کے لیے غیر مفید تھے۔ اقوام ہند حکومت کے کسی فیصلے سے مطمئن نہیں تھیں۔ اس موڑ پر حکومت کی یہ بنیادی پالیسی (کہ قوموں کو باہم لڑاؤ اور حکومت کرو) بھی فیل ہو چکی تھی۔ حالانکہ ہندو مسلمان دست و گریبان تھے۔ تاہم انگریز کو ان حالات میں بھی اپنے لیے سکون نہیں تھا۔ اسی صورت میں جلیسے

کیسے بن پڑا اس لیے وقتی طور پر ہٹلر سے معاہدہ کر کے اپنے دامن کا ایک سرا آگ سے بچا لیا۔ اور اپنی دانست میں وہ یورپ کی دوسری بڑی جنگ سے محفوظ ہو گیا۔ ہندوستان پر اس معاہدے کا یہ اثر ہوا کہ حکومت ہند اس بساط پر نئی چالیں چلنے لگی۔

مسجد شہید گنج / تحریک مسجد شہید گنج اور اس کے اسباب

جب قومیں کسی انقلاب کی زد میں آتی ہیں، تو حوادث آپ سے آپ رونما ہوتے۔ خواہش زمانہ اس انقلاب کی راہنمائی کرتی ہے۔ عوام کے ہاتھ اٹھتے ہیں۔ زبان دل سے ہم آہنگ ہو کر ہاتھوں کی معاون ہوتی ہے۔ بس پھر کیا ہوتا ہے، دلوں کی آگ عمارتوں کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے، امن گوشہ عافیت میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔ بغاوت کے انہی شعلوں میں کبھی سلطنتیں تباہ ہو جاتی ہیں اور کبھی قومیں اپنا وقار کھو بیٹھتی ہیں۔

یہی حال سیاسی جماعتوں کا ہے۔ یہ جب عوامی محاسبہ میں آتی ہیں تو اپنے دستور یا منشور کی اوٹ میں بچاؤ کے راستے تلاش کرتی ہیں۔ لیکن عوام کی آنکھوں میں اترا ہوا خون انہیں کہیں امان نہیں لینے دیتا۔ جذبات غلط ہوں یا صحیح، وقت کا اُمڈا ہوا طوفان ساحل مقصد پر پہنچ کر ہی دم لیتا ہے۔ اور جب حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے تو اندھیر گردی اپنا کام کر چکی ہوتی ہے افسانہ حقیقت کو جھٹلا کر اپنے قارئین میں مقبولیت پا چکا ہوتا ہے۔

عزیز مصر کے محل سے شہادت عثمان غنی تک اگر ناکردہ گناہوں کے خون کو جمع کیا جائے تو کئی نہریں بہہ نکلیں اور دجلہ دفرات کو اپنی تنگ دامنی کا گلہ ہو۔

دجلہ دفرات کی موجوں نے واقعات کرب وبلا پر اپنی آنکھیں کیوں بند کر لیں۔ حقیقت جان کر بھی دریاؤں کا پانی حسینؓ کے قدموں تک کیوں نہ آن پہنچا؟۔ اگر ایسا ہو جاتا تو شاید تاریخ کو اپنی رنگینی کے لیے حسینؓ کی بجائے دشمنان حسینؓ کا خون تلاش کرنا پڑتا۔ لیکن عوام کے جذبات سے کھیلنے والے جب اپنے شکار کے لیے نکلتے ہیں تو راستے کی ہر شے کو روندتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے پیش نظر اپنا مفاد ہوتا ہے اور بس جب انسان یہاں پہنچتا ہے تو پھر نہ برائی برائی رہتی ہے۔ نہ نیکی کو امان ملتی ہے۔ انسان کا یہ کردار انسانیت کے چہرے پر ایک بدنما داغ ہے۔

زعمائے احرار شخصی طور پر اس قدر بلند کردار کے وارث رہے کہ حاسد ہزار اچھل کود کے باوجود ان تک نہ پہنچ سکے۔ فطرت نے ہمیشہ انہیں اپنے حصار میں رکھا۔ بادِ سموم کے جھونکے ان کے دامن سے لپٹے کر وہ چل جائے لیکن بہار آنے پر خزاں کو شرمندہ ہونا پڑا۔

تحریک مسجد شہید گنج کے پس منظر میں بھی یہی ارادے کارفرما تھے کہ ان کے خلوص پر چھینٹے اڑائے جائیں۔ لیکن گرد و غبار چھٹنے پر جو سورج طلوع ہوا تو اس کے دامن پر نہ تو کوئی داغ تھا اور نہ آنچل پر کوئی بادل کا ٹکڑا کہ جس سے دھوپ چمکنے سے نکھار نہ آئے۔ مستقبل کا مورخ بچشم دید گواہ بن کر سامنے آیا کہ تاریخ کے ورق غبار آلود نہ ہوں مخالف قوتوں نے احرار رہنماؤں کے سامنے جو کانٹے بکھیرے وہ انہیں خود اپنی پلکوں سے صاف کرنے پڑے۔

(مولانا ظفر علیخاں)

۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۵ء تک کبھی خلافت عثمانیہ کے لیے، کبھی آزادی وطن کے لیے اور کبھی ریاستی عوام کی بہتری کے لیے جو جدوجہد احرار رہنماؤں نے کی اس کے لیے انہیں ہندوستان گر بھر

شہرت حاصل ہوئی اور وہ قافلہ ہائے حریت کے رہنما بن کر ابھرے۔ کانگریس کی سیاسی طاقت اور اجتماعیت سے انگریز خائف تھا۔ لیکن مسلمانوں میں احرار کا بطور سیاسی طاقت کے ابھرنا فرنگی حکمرانوں کو پسند نہیں تھا۔ مسلمانوں میں احرار کی مقبولیت سے کانگریس بھی سوچ میں تھی۔ خصوصاً پنجاب کا ٹوڈی مسلمان دنیاوی اغراض کے صدقے میں غیر ملکی بساط کا کامیاب مہرہ تھا۔ ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت ہونے والے انتخاب میں احرار کی کامیابی مشکوک نہیں تھی لیکن انگریز اس کے لیے تیار نہیں تھا کہ پنجاب، احرار ایسی انتہاپسند تنظیم کے

(میاں سر فضل حسین)

قبضہ میں چلا جائے۔ عسکری اعتبار سے پنجاب برطانیہ کیلئے بازوئے شمشیر زن تھا۔ پھر جبکہ سر فضل حسین خود پنجاب کی وزارت عظمیٰ کا امیدوار تھا اور اس کے لیے پیشتر سے اس نے سر سکندر حیات کو پنجاب کی عملی سیاست سے خارج کر دیا تھا۔ ایسے میں وہ احرار کو اپنے راستے کا سنگِ گراں سمجھ رہا تھا۔ اور اس کوہ ہمالیہ کو گرانا اس کے لیے ازبس ضروری تھا۔ چنانچہ ۱۱۔ جون ۱۹۳۵ء کو شملہ کے احرار رہنما میر احمد حسین[1] کو پولیس کے ایک تھانیدار راجہ صبح صادق

---

[1] میر احمد حسین نیوٹیلی اور شملہ کے بہت بڑے کاروباری لوگوں میں شمار ہوتے۔ چونکہ سیاسی ذہن رکھتے تھے اس لیے احرار رہنما جب کبھی شملہ یا دہلی جاتے انہیں کے ہاں قیام کرتے۔

نے جو ان دنوں شملہ تھانہ میں تعینات تھا ایک اطلاع کے ذریعہ خبردار کیا۔

"میر صاحب! احرار رہنما اکثر آپ کے ہاں قیام کرتے ہیں انہیں مطلع کر دیں کہ ان پر کوئی بڑی آفت آنے والی ہے"

ایک اخباری خبر ۲۰۔جون کے روزنامہ "جے ہند" لاہور نے اپنے ڈلہوزی کے نامہ نگار کے حوالے سے ایک خبر شائع کی۔

"ڈلہوزی کانگریس کے صدر شیخ غلام رسول نے کانگریس کے جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے کہا ہے، گزشتہ دنوں ڈلہوزی میں سر فضل حسین کی کوٹھی بکروٹہ ہاوس میں مولانا ظفر علی خاں مالک روزنامہ زمیندار لاہور اور سر فضل حسین کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا۔ (آگے چل کر شیخ صاحب نے کہا) قادیان کے خلیفہ بشیر الدین محمود بھی ان دنوں ڈلہوزی میں قیام پذیر ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس خفیہ ملاقات اور معاہدہ میں ان کا مشورہ بھی شامل ہو۔ بنابریں مجھے یقین ہے کہ میاں سر فضل حسین، خلیفہ محمود اور مولانا ظفر علیخاں کا بغیر کسی اطلاع اور پروگرام کے یکایک ڈلہوزی آنا کسی سیاسی اغراض سے خالی نہیں سمجھنا چاہیے:

خطرہ ہے کہ آئندہ چل کر ان خفیہ ملاقاتوں کے نتائج کے سلسلہ میں سیاسی اعتبار سے پنجاب میں کوئی نیا طوفان نہ اٹھے"

۱۵۔نومبر ۱۹۳۴ء کے روزنامہ انقلاب، لاہور کا یہ فقرہ تو زیر نظر کتاب کے صفحہ نمبر ۴۷ پر قارئین دیکھ چکے ہیں۔

"احرار کی مخالفت کے لیے کوئی نیا میدان آراستہ کیا جائے۔

مندرجہ بالا مسلسل واقعات کی کڑیاں کہاں ملتی ہیں، ان کے نتائج کیا نکلتے ہیں یہ مستقبل بتائے گا۔

حادثہ مسجد شہید گنج ۲۸ سے ۳۰ جون تک احرار رہنما لائلپور میں پراونشل احرار کانفرس میں مصروف تھے کہ ۲۸ اور ۲۹ جون کی درمیانی رات کو سکھ مزدوروں نے رات کی تاریکی میں مسجد شہید گنج کو گرانا شروع کر دیا۔ اس دوران ایک سکھ مزدور

مسجد کی دیوار سے گر کر ہلاک ہو گیا۔ اس کی اطلاع صبح لاہور کے مسلمانوں کو ہوئی تو انہوں نے ہنگامہ کر دیا۔ یہ خبر جب گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے سکھ لیڈروں کو امرتسر پہنچی تو وہ حیران ہو گئے۔ کیونکہ ان کے کسی پروگرام یا ارادے میں نہیں تھا کہ مسجد گرائی جائے۔

یہ درست ہے کہ مسجد گرانے والے سکھ تھے لیکن وہ صرف مزدور تھے۔ انہیں محض اپنی مزدوری سے غرض تھی۔ وہ سکھ جماعت کے بھیجے ہوئے نہیں تھے۔ سکھ مزدوروں کی اس حرکت سے لاہور کی پرامن فضا اچانک زہر آلود ہو گئی۔ سکھ اور مسلمان آمنے سامنے آن کھڑے ہوئے۔

احرار رہنماؤں کو لائلپور میں مسجد کی شہادت کی اطلاع ملی تو وہ سوچ میں پڑ گئے۔ اگلے دن خواجہ غلام حسین ایڈووکیٹ (جو لائلپور پروونشل احرار کانفرنس کی استقبالیہ کے صدر تھے) کے مکان پر صوبائی رہنماؤں کا اجلاس ہوا۔ یکم جولائی کو مولانا ظفر علی خاں کی دعوت پر میاں عبدالعزیز بیرسٹر کے مکان پر چند رہنما جمع ہوئے۔ جن میں مولانا ظفر علی خاں کے علاوہ ڈاکٹر محمد عالم، چودھری افضل حق، مولانا مظہر علی اظہر، میاں امیرالدین اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو شامل تھے۔ یہاں فیصلہ کیا گیا کہ سکھوں سے گفتگو کے لیے ایک وفد تشکیل دیا جائے۔ ہنوز اس کے لیے کوئی تاریخ مقرر نہیں ہوئی تھی کہ حکومت پنجاب نے لاہور میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی۔

یکم جولائی کو مرزائیوں کے آرگن "الفضل" نے مرزا بشیرالدین محمود کا حسب ذیل پیغام اپنی قوم کے نام نقل کیا۔

"برادران اسلام! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

میں اپنے ایک خطبہ میں اعلان کر چکا ہوں کہ چند اشتہارات موجودہ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے عنقریب شائع کیے جائیں گے۔ احباب کو ان کی طرف خاص توجہ کرنی چاہیے۔ پوسٹر عمدہ جگہوں پر لگائیں جائیں اور چھوٹے اشتہار عقل اور سمجھ کے مطابق تقسیم کرنے چاہیں۔ کیونکہ جلد یہ سلسلہ شروع ہونے والا ہے۔ میں پھر اس اعلان کے ذریعے (مرزائی) جماعتوں کو توجہ دلاتا ہوں کہ وہ فوراً مندرجہ ذیل امور کے متعلق انتظام کریں۔

۱- وہ جلد دفتر تحریکِ جدید میں اطلاع دیں کہ انہیں کس کس قدر پوسٹروں اور اشتہاروں کی ضرورت ہوا کرے گی۔

۲- ان کی جماعت یا اگر فرد ہے تو وہ کس قدر رقم کے اشتہار قیمت پر منگوانا چاہتے ہیں۔ اشتہار صرف لاگت پر ملیں گے۔ کوئی نفع محکمہ ان سے نہیں لے گا ہو سکتا ہے خرید زیادہ ہو اور جماعت پورے خرچ کی متحمل نہ ہو سکے تو کچھ حصہ قیمت پر اور کچھ مفت ارسال کیا جائے۔

۳- بنگال، سندھ اور صوبہ سرحد کی جماعتوں کو چاہیے کہ بنگالی، سندھی اور پشتو میں ان اشتہاروں کے تراجم شائع کرنے کی کوشش کریں۔ اس میں ایک معقول حد تک دفترِ تحریکِ جدید ان کی امداد کرے گی۔ مگر فیصلہ بذریعہ خط و کتابت ہونا چاہیے۔

۴- ہر جماعت یا فرد ان اشتہاروں کے چسپاں کرنے اور تقسیم کرنے کا انتظام فوراً کر چھوڑیں۔

۵- ہر جماعت یا فرد کو اس امر کا انتظام رکھنا چاہیے کہ ہر اشتہار ایسے ہاتھ میں جائے جہاں اس کا فائدہ ہو۔ اور اچھی جگہ پر پوسٹر چسپاں ہوں۔ سارے پوسٹر ایک دن نہ لگائے جائیں کیونکہ بعض شریر دشمن انہیں پھاڑ دیتے ہیں۔ بلکہ دو تین دن میں لگیں تا کہ سب لوگ پڑھ سکیں۔

۶- اشتہاروں کی اشاعت کے بعد جماعت کے افراد ان کے اثرات کا اندازہ لگاتے رہا کریں اور مرکز کو اس کی اطلاع دیتے رہا کریں تا کہ اشتہاروں میں اس تجربے سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔

۷- سب اطلاعات میرے نام یا سیکرٹری دفتر تحریک جدید کے نام ہوں۔

والسلام۔

خاکسار مرزا محمود احمد

خلیفۃ المسیح ثانی احمدیہ امام جماعت

اسی رات بیرون موچی دروازہ مولانا ظفر علی خاں کی صدارت میں جلسہ ہوا جس کے لیے کسی احرار کے لیڈر کو دعوت نہیں دی گئی۔ حالانکہ میاں عبدالعزیز کے مکان پر جو کمیٹی تشکیل دی گئی تھی اس میں چودھری افضل حق اور مولانا مظہر علی اظہر کے نام شامل تھے۔

چاہیے تو یہ تھا کہ اس جلسے میں حکومت سے مطالبہ کیا جاتا کہ مسجد گرانے والے سکھ مزدوروں کے متعلق تحقیق کی جائے کہ انہیں اس کارروائی پر کس نے اکسایا ہے لیکن ہوا یہ کہ تمام مقرروں نے سکھوں کو من حیث القوم للکارا۔ اور انہیں طرح طرح سے دھمکیاں دیں۔

اس جلسہ کی کارروائی جب صبح "زمیندار" میں شائع ہوئی تو مزدوروں کی حرکت کو سکھ قوم کی حرکت قرار دیا گیا۔ آگے چل کر یہی معاملہ سکھ قوم کے لیے چیلنج کی حیثیت اختیار کر گیا۔ چنانچہ ۷۔ اور ۸۔ جولائی کو اس پر غور کرنے کیلئے سکھوں کی نمائندہ جماعت گوردوارہ پربندھک کمیٹی نے اپنا اجلاس بلوایا۔ لیکن اس رات ریلوے کرین کے ذریعے مسجد کے مزید حصے گرا دیے گئے۔

یہ تمام کارروائی اس قدر عاجلانہ طور پر ہوئی کہ کسی کی سمجھ میں نہ آسکا کہ ۲۹۔ جون سے ۸۔ جولائی کے عرصے میں یہ سارا کچھ کیوں اور کس طرح ہوا یا اس سارے کھیل کا اصل محرک کون ہے؟

اس وقت تک جو لوگ تحریک کی رہنمائی کر رہے تھے ان میں مولانا ظفر علی خاں، ملک لال خاں (گوجرانوالہ) اور ڈاکٹر محمد عالم پیش پیش تھے۔ آخر الذکر آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کا ممبر رہ چکا ہے اور ابھی تک اس کا ذہن وہی تھا۔ ملک لال خاں خلافت تحریک کے بعد کبھی سننے میں نہیں آئے۔ رہے مولانا ظفر علی خاں نومبر ۱۹۲۵ء میں مسجد کے گرانے سے زیادہ سکھوں کے حق میں تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب سر فضل حسین نے وزیر تعلیم کی حیثیت سے پہلا گوردوارہ ایکٹ پنجاب کونسل میں پیش کیا تھا۔ یہ ایکٹ حکومت اور مسلمان ممبروں کے تعاون سے منظور ہوا تھا۔ ان دنوں گوردواروں، مندروں اور مساجد کے انچارج سر فضل حسین تھے۔ روزنامہ "سیاست" کے مالک و مدیر سید حبیب نے یہ مؤقف لیا

تھا کہ گوردوارہ ایکٹ کے سلسلہ میں ووٹ دینے سے پہلے مسلمانوں کو سکھوں سے مسجد شہید گنج کی بازیابی کی بات کرنی چاہیے۔ لیکن مولانا ظفر علی خاں نے ۳۰۔ جون ۱۹۲۵ء کے روزنامہ "زمیندار" میں لکھا:

لنڈا بازار کی مسجد: لنڈا بازار لاہور کی وہ مسجد جو شہید گنج کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔ چند روز سے بعض مسلمانوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے اور معاصر "سیاست" میں یہ تحریک جاری کر رکھی ہے کہ گوردوارہ بل منظور ہو جانے سے پیشتر مسلمان اس مسجد کو سکھوں سے حاصل کر لیں۔

ہم کسی گذشتہ اشاعت میں اس مسجد کے متعلق اپنی حکمت عملی کا اعلان کر چکے ہیں اور ہمارا اب بھی یہی خیال ہے کہ سکھوں سے گوردوارہ بل کی حمایت کا معاوضہ وصول کرنا مسلمانوں کی حق پرستی اور ان کے شرف و وقار کے خلاف ہے۔ مسلمان گوردواروں کے معاملے میں سکھوں کی حمایت محض اس لیے کرتے ہیں کہ سکھ اپنے معابد کے آزاد کرانے کی کوشش میں بالکل حق بجانب ہیں۔

لنڈا بازار کی مسجد فوراً مل سکے یا نہ مل سکے، مسلمان حمایت حق سے باز نہیں رہ سکتے۔ اور ہم پنجاب کونسل کے مسلمان اراکین کی خدمت میں نہایت ادب سے گذارش کرتے ہیں کہ بل کے متعلق رائے دیتے وقت صرف اس قانون کی دفعات کو مدنظر رکھیں اور کسی مفروضہ وجہ اختلاف کو حمایت حق کے راستے میں حائل نہ ہونے دیں۔"

اس سے پیشتر ۱۹۲۲ء میں ملک لال خاں اسی مسجد شہید گنج کے متعلق گوردوارہ شرومنی کمیٹی سے ایک سمجھوتہ کر چکے تھے۔ اس کے متعلق مولانا ظفر علیخان اخبار "زمیندار" کی اشاعت یکم جولائی ۱۹۲۲ء میں لکھتے ہیں۔

شرومنی گوردوارہ کمیٹی کا انصاف: شہید گنج لاہور میں زمانہ قدیم کی ایک مسجد واقع ہے جو مدتوں سے سکھ بھائیوں کے قبضہ میں ہے۔ اور اس

مسجد کے نواح میں پنجاب کے آخری مسلمان تاجدار کی قبر بھی ہے۔اس مسجد کو سکھوں کے قبضے سے واپس لینے کے لیے مسلمانان لاہور نے ہر ممکن جد وجہد کی۔کوشش، تبلیغ، روپے پیسے کا خرچ سب کچھ عمل میں آیا۔عدالت کے دروازے کھٹکھٹائے گئے۔حکام اور حکومت کے آستانوں پر نظریں جما کر بیٹھے لیکن اس دور میں جبکہ ہندوستانی بھائی ایک دوسرے کے دشمن اور لہو کے پیاسے رہا کرتے تھے یہ کہاں ممکن تھا مسجد مسلمانوں کے قبضے میں آجاتی۔

آخر اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے وہ دورِ فتن ختم ہوگیا۔محبت اور آشتی اتفاق واتحاد کا دور شروع ہوا۔اس دور کے شروع ہوتے ہی مسجد کا معاملہ دشمنانِ اتحاد کے سامنے مسلمانوں اور سکھوں کو سزا دینے اور ایک دوسرے سے جدا کرنے کا اچھا خاصہ بہانہ بن گیا۔چند شریر النفس ہستیوں نے جن کی آنکھوں میں باہمی اتحاد خار کی طرح کھٹکتا ہے، ساز باز اور باہمی مشوروں سے اشتہارات کے ذریعے سے مسلمانوں کو مشتعل کرنے کی کوشش کی ۔ اور عوام الناس کی بہبودی اور خدمتِ اسلام کے پردے میں پھوٹ ڈالنے کی طرح ڈالنی شروع کی۔لیکن خدا کا شکر ہے کہ ان کے ہتھکنڈے بے کار ثابت ہوئے آخر اتحاد واتفاق کی برکت سے اس پر پیچ مسئلے کا حل نکل آیا۔جناب ملک لال خاں صاحب جو مدتوں سے اس مسجد کو سکھ بھائیوں سے لینے کے لیے شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے معزز ارکان سے گفت وشنید کر رہے تھے اور سکھ بھائیوں پر حکومت کی چشم التفاتِ خصوصی کی وجہ سے اب تک ناکام رہے تھے امرتسر تشریف لے گئے۔شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے متعدد ارکان نے جناب ملک لال خاں کا جس اخلاص اور محبت سے خیر مقدم کیا وہ ان کے دلی جذبات کی آئینہ داری کرتا تھا اور ان کے پوشیدہ خلوص کے احساس کو روشنی میں لاتا تھا۔ہم شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے ارکان کا شکریہ ادا

کرتے ہیں کہ انہوں نے ہمارے واجب الاحترام ملک صاحب کی عزت افزائی

مسجد شہید گنج ۔ غربی جنوبی پہلو

فرما کر ان کی مدتوں کی مساعی جمیلہ پر نظر کرم فرما کر مسلمانوں کو اظہار تشکر کا موقعہ دیا۔

کیا یہ اتفاق و اتحاد کی برکت نہیں کہ وہ مسجد جس کا قبضہ مدّتوں سے باہمی رنجش اور کدورت کا سرچشمہ بنا ہوا تھا اور جس کا ذکر دشمنانِ اتحاد کے لیے
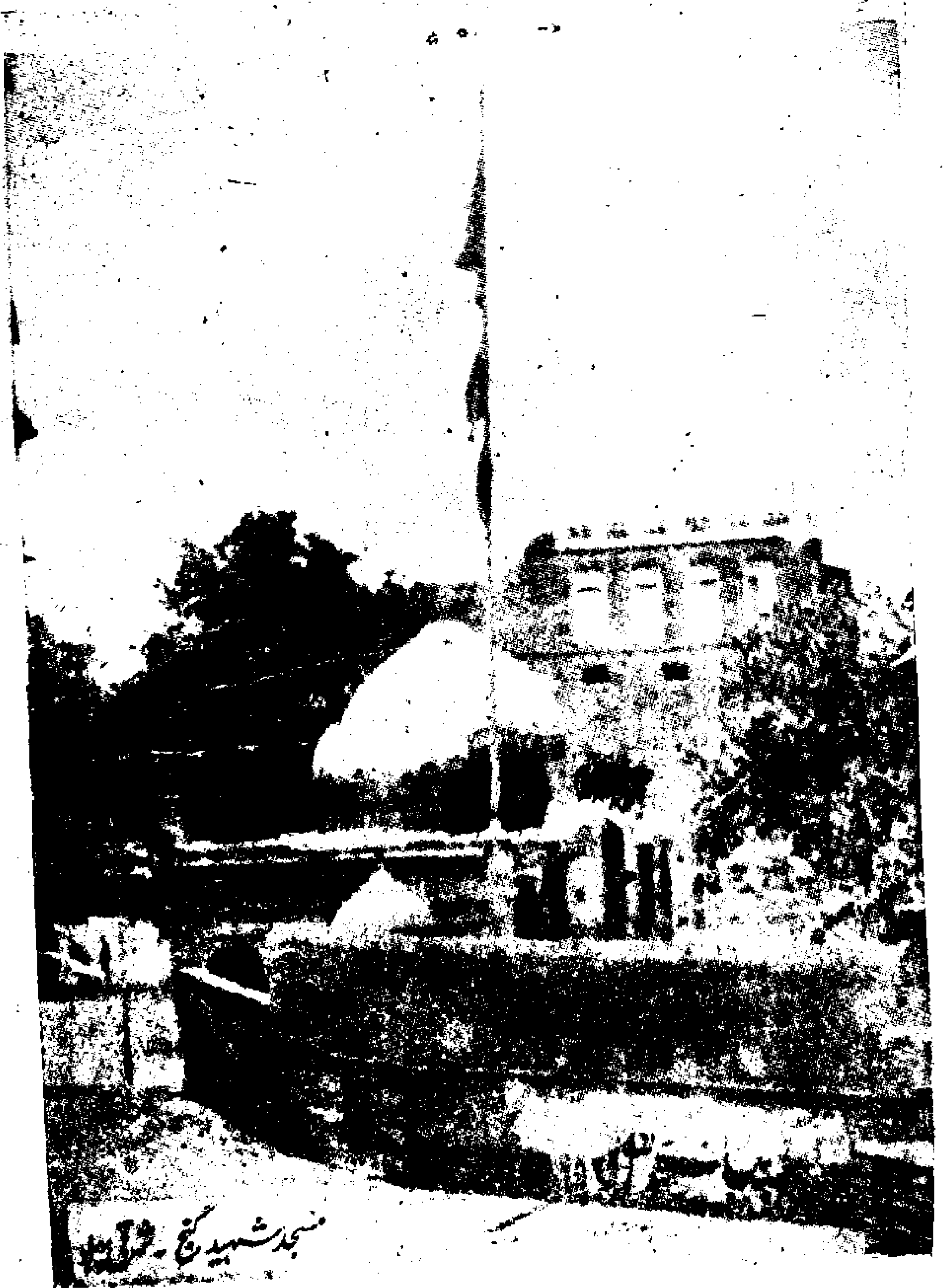
مسجد شہید گنج ۔ لاہور

سود مند ہو سکتا ہے آج باہمی مفاہمت و مصالحت شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی

کے فیصلے کے مطابق مسلمانوں کے قبضے میں آگئی ہے“۔[1]

ان مندرجہ بالا تاریخی اقتباس کے بعد ۱۹۳۵ء میں مولانا ظفر علی خاں کو مسجد شہید گنج کے لیے کیا خیال آیا کہ وہ اس کے حصول میں تڑپنے لگے۔ ملک لال خاں سے بھی یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ

”۱۹۳۳ء میں آپ نے شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی سے جو سمجھوتہ کیا تھا اس کے کاغذات کہاں ہیں“؟

مگر دونوں حضرات سے سوال کرنے کی بجائے ہر جلسے میں احرار سے تقاضہ کیا جاتا رہا کہ مسجد کے لیے آگے بڑھ کر حکومت سے ٹکرائیں اور سول نافرمانی کریں۔ دیکھتے دیکھتے مولانا ظفر علی خاں نے انجمن اتحادِ ملت بنا ڈالی۔ اور احرار سُرخپوش کے مقابل نیلی پوش تحریک کا پرچار ہونے لگا۔ ع

جو لینی ہے تمہیں مسجد تو نیلی پوش ہو جاؤ! (ظفر علیخاں)

کوچہ و بازار میں یہی گیت سنائی دینے لگا۔ جیسے جیسے مسجد کا قضیہ آگے بڑھتا گیا۔ فضا احرار کے خلاف ہوتی چلی گئی۔ اس دوران مرزائیوں کی تحریک جدید کا دفتر قادیاں کی بجائے لاہور دفتر زمیندار کے قریب آگیا اور ان کی طرف سے قدِ آدم پوسٹر احرار کے خلاف شائع ہونے لگے۔

اوباش قسم کے لڑکے ٹولیاں بنا کر دفتر کے سامنے آتے اور زعمائے احرار کے خلاف نعرے لگاتے۔ اب ایک طرف لوگوں کو ابھار کر لنڈا بازار کی مسجد کی طرف بھیجا جا رہا تھا کہ وہ پولیس کی لاٹھیاں اور فوج کی گولیاں کھائیں، تو دوسرا گروہ احرار کے خلاف شہر بھر میں مظاہرہ کر رہا ہوتا کہ احرار والوں سے کہو کہ وہ مسجد کے لیے سول نافرمانی کریں۔

۱۔ روزنامہ انقلاب کا پریس نوٹ۔

۲۔ راجہ صبح صادق کی اطلاع۔

۳۔ مولانا ظفر علی خاں کا خاموشی سے ڈلہوزی پہنچنا۔

۴۔ مرزائی خلیفہ کا بیان۔

ان تمام کڑیوں کے جوڑنے سے ایک ایسی زنجیر بنائی جا سکتی ہے جس میں احرار کو اطرافِ عالم میں جکڑنا صاف اور واضح طور پر سمجھ میں آ رہا تھا۔ یہ سارا ڈرامہ حکومت کی اسٹیج پر ہو رہا تھا اور اس کے ہدایت کار سر فضل حسین تھے۔

احرار کا موقف برطانوی آئین کے مطابق وہ عمارت (خواہ مسجد ہو، مندر ہو، گوردوارہ ہو یا رہائشی مکان یا سادہ پلاٹ) جو بارہ سال سے زائد عرصہ اگر کسی کے مخالفانہ قبضے میں رہے اور اس دوران کوئی کرایہ نامہ، بیعہ نامہ یا رجسٹری نہ ہو اس پر مخالف کا قبضہ بطور مالک سمجھا جاتا تھا۔ اس کے برعکس اسلامی فقہ اس زمین کو بھی مسجد قرار دیتی ہے جس پر ایک دفعہ مسجد تعمیر ہو چکی ہو۔ خواہ یہ مسجد بعد میں کسی حادثے کا شکار ہو جائے۔ مگر غیر شرعی حکومت تو اس ضابطے کی پابند نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ شہید گنج مسجد ہے لیکن اس وقت کے غیر ملکی قانون نے اسے محض ایک عمارت قرار دیا اور بس۔ اس اعتبار سے جب کبھی مسلمانوں نے اس تاریخی مسجد کے حصول کے لیے قانون کو پکارا تو عدالتوں نے اپنا فیصلہ مسلمانوں کے خلاف کیا۔

اس مسجد[1] کا اصل نام عبداللہ خاں کی مسجد تھا۔ اسے ۱۰۶۴ھ میں شاہجہان کے ولیعہد دارا شکوہ کے خانساماں (کھانا بنانے والا نہیں بلکہ سامان کی حفاظت کرنے والا) محمد عبداللہ نے تعمیر کیا تھا۔ مغلیہ دورِ حکومت میں باغی سکھوں کو اس جگہ قتل کیا گیا تھا۔ جب مہاراجہ رنجیت پنجاب پر قابض ہوا تو اس نے سکھوں کی سمادھیاں، جو یہاں قتل ہوئے تھے یہاں بنوا دیں۔ اس طرح سکھوں کی زبان میں یہ گوردوارہ شہید گنج قرار دیا گیا۔

ان تاریخی حقائق کے پیشِ نظر احرار نے کسی غیر قانونی حرکات کو نامناسب سمجھا اور نہ ہی مسلمانوں کو اس کی دعوت دی۔ ان کے نزدیک مسجد کا حصول صرف باہمی افہام و تفہیم سے ہی ممکن ہو سکتا تھا۔ مگر مولانا ظفر علی خاں اور ان کے اخبار زمیندار میں روزانہ ایسا مواد شائع ہوتا جو مسجد کی بازیابی کے لیے کم اور احرار کو سول نافرمانی پر اکسانے کیلئے زیادہ ہوتا تھا۔ جیل خانہ احرار کے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھی اور نہ ہی وہ اس سے خائف تھے۔

---

[1] مصنف کی دوسری کتاب حیات امیر شریعت میں مسجد شہید گنج کی پوری تاریخ شائع ہو چکی ہے۔

سوال اصول کا تھا کہ انگریز اپنے قانون کے مطابق اس مسجد کو مسلمانوں کی سست روی کے باعث غیر مسلموں کی ملکیت قرار دے چکا تھا۔ ایسے میں بات جھگڑے سے طے نہیں ہو سکتی تھی۔ بلکہ دونوں قوموں کے رہنما مل کر ہی اس قضیئے کو چکا سکتے تھے۔
چنانچہ ۴۔جولائی کو گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے نمائندوں سے گفتگو کا دن طے ہوا۔ اس میں مولانا محمد داؤد غزنوی کو احرار کی طرف سے شامل ہونے کی دعوت دی گئی۔ اس سے پیشتر باہم رہنماؤں نے اپنی نجی مجلس میں جو گفتگو کی، مولانا داؤد غزنوی اپنی ڈائری میں اسے نقل کرتے ہیں۔

(مولانا داؤد غزنوی، مولانا ظفر علیخاں سے)

"آپ آئینی طور پر اس مسجد کو حاصل کرنے کی کوشش کریں گے یا اگر ضرورت پڑی تو اس کے لیے سول نافرمانی بھی کریں گے؟"

ظفر علیخاں: "ہم آئینی طور پر اس مسجد کو حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔"

داؤد غزنوی: آپ نے اس مسجد کے تمام قانونی پہلوؤں پر غور کر لیا ہے۔ اس سے پیشتر اس مسجد کے حصول کے لیے مسلمانوں کی طرف سے جس قدر مقدمات دائر کیے گئے ان کے فیصلوں کو دیکھ لیا ہے؟"

ظفر علیخاں: "مجھے کچھ معلوم نہیں۔ لیکن پورے حالات معلوم کرنے کیلئے ایک سب کمیٹی بنا دی گئی ہے جو اس کے متعلق تمام دستاویز اور تاریخی مواد اکٹھا کرے گی۔"

داؤد غزنوی: "جس صورت میں کئی عدالتوں کے فیصلے اس مسجد کے سلسلے میں مسلمانوں کے خلاف ہو چکے ہیں اور پونے دو سو سال سے سکھوں کا اس مسجد پر قبضہ ہے۔ آئینی ایجی ٹیشن سے آپ اس کو کس طرح حاصل کر سکتے ہیں؟"

ظفر علیخاں: اسمبلی پنجاب کونسل کے ذریعے تمام ہندوستان میں جلسوں کے ذریعے ہم گورنمنٹ کو مجبور کریں گے کہ وہ سکھوں [illegible]

مسلمانوں کے حوالے کر دے یا کم از کم آثار قدیمہ کے سپرد کر دے۔"

داؤد غزنوی: اس صورت میں کہ انگریزی عدالتیں کسی فریق کے حق میں فیصلہ دے دیں تو ان عدالتوں کے فیصلوں کا احترام رکھنا گورنمنٹ کا فرض ہو جاتا ہے۔

یہ ناممکن ہے کہ حکومت آپ کے جلسوں سے متاثر ہو کر اپنی تمام عدالتوں کے فیصلوں کو نظر انداز کرتے ہوئے بلکہ ان کے صریح خلاف سکھوں سے متنازعہ فیہ مسجد چھین کر مسلمانوں کے حوالے کر دے۔"

ظفر علیخاں: مجھے ایک بہت بڑے مسلمان افسر نے کہا ہے کہ آپ ایجی ٹیشن جاری رکھیں حکومت یہ مسجد مسلمانوں کے حوالے کر دے گی۔"

داؤد غزنوی: مولانا! میں تو ایک منٹ کے لیے بھی اس مسلمان افسر کی بات پر یقین نہیں کر سکتا کیونکہ یہ قطعاً ناممکن ہے کہ عدالتوں کے فیصلوں کے برخلاف حکومت کوئی اقدام کر سکے اور نہ حکومت یہ جرأت کر سکتی ہے کہ مسلمانوں کو خوش کرنے کے لیے سکھوں سے جنگ خرید ے۔

مجھے تو اس افسر اعلیٰ کی گفتگو آپ سے سن کر یہ شبہ ہوتا ہے کہ حکومت مسلمانوں اور سکھوں کو لڑانا چاہتی ہے۔ بہر طور آپ کو بہت ہی حزم و احتیاط سے کام کرنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ نادانستہ طور پر حکومت کے اس مذموم ارادے کی تکمیل کے لیے آلہ کار بن جائیں۔"

ظفر علیخاں، " میں حالات و قرائن سے یہی اندازہ لگاتا ہوں کہ اگر مسلمانوں نے اس تحریک کو جاری رکھا تو مسجد مسلمانوں کو ضرور مل جائے گی۔"

" ایک خوفناک سازش یعنی تحریک شہید گنج کے مختلف دور ص ۹۶ تا ۹۸"

سکھ لیڈروں سے ملاقات

اس نجی گفتگو کے بعد وفد کے ارکان دو بجے کے قریب مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سمادھی کے متصل گوردوارہ میں سکھ لیڈروں سے ملنے گئے۔ ماسٹر تارا سنگھ سردار منگل سنگھ اور گیانی گورمکھ سنگھ مسافر اسیکرٹری گوردوارہ پربندھک کمیٹی سکھوں کی طرف سے گفتگو کے لیے یہاں موجود تھے۔ مسلم وفد کی قیادت مولانا ظفر علیخاں

کر رہے تھے۔

سکھ صاحبان سے مسجد شہید گنج کی حوالگی کے مطالبے کو ظفر علیخاں نے نہایت مناسب الفاظ میں پیش کیا، جس کے جواب میں تارا سنگھ نے کہا:

"یہ تو ہمیں معلوم نہیں کہ یہ مسجد ہے یا کیا؟ لیکن اس حالت میں جبکہ مسلمانوں کے لٹھ بند جتھے لاہور کے بازاروں میں پھر رہے ہیں اور سکھ قوم کو دھمکیاں دے رہے ہیں۔ مسجد کی حوالگی کے متعلق کوئی گفتگو نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ان حالات میں مسجد کے متعلق کسی قسم کی گفتگو کرنا سکھ قوم کی توہین ہے۔"

ظفر علیخاں: "آپ شائد ہندو اخبارات کے غلط بیانات سے متاثر ہیں۔ مسلمانوں کی طرف سے سکھ قوم کو کوئی دھمکی نہیں دی گئی۔ بلکہ ہم تو برادرانہ طور پر آپ سے درخواست کرنے آئے ہیں۔"

اس کے جواب میں تارا سنگھ نے روزنامہ زمیندار، سیاست اور انقلاب کے فائل پیش کیے۔ ظفر علیخاں نے یہ اخبارات دیکھ کر کہا:

"اگر مسلمان سکھ قوم سے اس کی معافی مانگ لیں اور میں اپنی ٹوپی آپ کے قدموں میں رکھ دوں تو کیا پھر آپ ان تحریروں کو نظر انداز کر کے مسجد مسلمانوں کے حوالے کر دیں گے؟"

تارا سنگھ: "مولانا صاحب! میں آپ کو اس گفتگو میں مخلص نہیں سمجھتا۔ کیونکہ مسلمانوں نے اپنے عہد حکومت میں جن مندروں پر قبضہ کر کے ان پر مساجد تعمیر کر لی ہیں اور مندروں کے نشانات بھی موجود ہیں۔ کیا آپ لوگ وہ مندر ہندوؤں کو واپس کرنے کو تیار ہیں؟"

ظفر علیخاں: اس وقت ہم کسی ہندو مسلم تنازعہ کے لیے نہیں آئے۔ ہم اس وقت سکھ نمائندوں سے بات چیت کر رہے ہیں۔ کیا ہم نے سکھوں کے کسی گوردوارے پر قبضہ کیا ہے؟"

تارا سنگھ: "ہر قوم نے اپنے اپنے عہد حکومت میں اس قسم کی حرکات کی ہیں۔"

رہی بقول آپ کے مسجد شہید گنج کی بات تو ہماری تاریخ شاہد ہے کہ اس جگہ پر سکھ قوم کے بہت سے بہادر شہید کیے گئے تھے۔ اس لیے سکھ قوم کا ایک فرد بھی ایسا نہیں ملے گا جو شہید گنج واپس کرنے کا خیال بھی دل میں لا سکے۔

مصالحت کی تجویز

ماسٹر تارا سنگھ کی گفتگو سے اس مشترک اجلاس میں قدرے تلخی پیدا ہوئی۔ ارکان وفد نے فیصلہ کیا کہ مصالحت کی کوئی راہ نظر نہیں آتی لہٰذا واپس چلنا چاہیے۔ اتنے میں مولانا داؤد غزنوی نے سکھ لیڈروں کے سامنے ایک تجویز پیش کی۔

"اگر آپ انہدام مسجد کے ارادے سے باز آجائیں اور منہدم شدہ حصے کی مرمت کرا دیں اور آئندہ مسجد کی حرمت کے خلاف کوئی اقدام نہ کریں۔ نیز مزار حضرت کاکو شاہ کے لیے پانچ فٹ کا راستہ مسلمانوں کو دے دیں تو زخمی دلوں کو قدرے سکون ہو جائے گا۔"

اس تجویز پر اجلاس میں فریقین کے چہروں سے گذشتہ تلخی ہلکی ہو گئی اور تارا سنگھ نے مسکراتے ہوئے انداز میں سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا:

"ہاں! اس تجویز پر ہم غور کرنے کو تیار ہیں۔ بشرطیکہ اس فیصلے پر اس قضیے کو ختم کر دیا جائے اور آئندہ کوئی سوال اس کے قبضے وغیرہ کا نہ اٹھایا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی دوسری انجمن اٹھ کھڑی ہو اور از سر نو اس قضیے کو شروع کر دے۔"

سید حبیب (روزنامہ 'سیاست' لاہور)

"یہ وفد مسلمانوں کا نمائندہ وفد ہے۔ اگر اس فیصلے کے بعد کسی نے مخالفت کی تو یہ ہماری مخالفت ہو گی۔"

اس کے بعد تارا سنگھ نے مولانا داؤد غزنوی کی تجویز کے متعلق اپنی جماعت کی طرف سے آمادگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

"آپ حضرات کے نزدیک (متنازعہ فیہ مقام) مسجد ہونے کی حیثیت سے متبرک مقام ہے اور ہمارے نزدیک بہ شہید گنج ہونے کے لحاظ سے متبرک

جگہ ہے۔ اس لیے دونوں قوموں کے احساسات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس جگہ کے آداب اور احترام کے خلاف ہم کوئی کام کرنا نہیں چاہتے۔

آپ حضرات کو معلوم ہے کہ جب یہ مسجد مہنتوں کے قبضے میں تھی تو اس کی چھت پر ٹٹی بنی ہوئی تھی لیکن جب سے یہ جگہ گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے قبضہ میں آئی ہے، ہم نے ٹٹی اٹھوا دی۔ صرف اس خیال سے کہ اس سے مسلمانوں کی دل آزاری ہوتی ہے۔

مسجد کے گرانے کا سوال عرصہ سے ہمارے پیشِ نظر تھا، لیکن ہم اس تذبذب میں تھے کہ یہ کام مسلمانوں کی دل آزاری کا باعث تو نہ ہوگا۔ روزنامہ "زمیندار" نے آج سے دس سال پہلے یہ لکھا تھا کہ موجودہ حالت سے بدرجہا یہی بہتر ہے کہ اس مسجد کو گرا دیا جائے تاکہ ہر روز مسلمانوں کے دلوں پر چرکے نہ لگیں۔ اس کے پیشِ نظر بالآخر یہی فیصلہ کیا گیا تھا کہ مسجد گرا دی جاتے ہمیں قطعاً امید نہ تھی کہ ایسی صورتِ حال پیدا ہو جائے گی۔"

("ایک خوفناک سازش" ص ۶۶-۶۷)

بات بنتے بنتے رہ گئی

"جیسے کہ سکھ لیڈر میری تجویز مان رہے تھے اور مسلم وفد کے ارکان میں سے میاں امیرالدین میونسپل کمشنر لاہور میری تائید پر تھے۔ ہو سکتا تھا کہ یہ بات سرے چڑھ جاتی لیکن وہیں بیٹھے بیٹھے ظفر علیخاں اور سید حبیب کے درمیان چپقلش شروع ہو گئی۔ "زمیندار" نے یقیناً ایسا لکھا ہوگا جیسے کہ سکھ کہہ رہے ہیں۔ مگر روزنامہ "سیاست" نے سکھوں کو مسجد گرانے کی کبھی رائے نہیں دی۔ قریب تھا کہ آپس کا یہ جھگڑا طول پکڑتا، مولانا داؤد غزنوی نے درمیان سے بات کاٹتے ہوئے کہا:

"گزشتہ قصوں کو آپ حضرات بھول جائیں اور میں نے جو تجویز مصالحت پیش کی ہے اس پر غور کریں تاکہ ہم کسی نتیجے پر پہنچیں۔"

ابھی یہ بات چل رہی تھی کہ مولانا ظفر علیخاں نے نہایت غیر مآل اندیشانہ طور پر

ماسٹر تارا سنگھ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"اچھا ماسٹر جی! جیسے کہ مولانا داؤد غزنوی کی تجویز ہے، اگر مسجد کا منہدم شدہ حصہ کی آپ مرمت کرا دیں اور مزار کے لیے پانچ فٹ کا راستہ دے دیں۔ مگر باقی امور کے لیے میں اپنا حق محفوظ رکھتا ہوں۔ اس مصالحت کے بعد میں یہ حق عدالت کے ذریعے وصول کروں گا، جس سے مسجد واگذار ہو سکے۔"

تارا سنگھ: "مولانا صاحب! اگر یہ بات ہے تو پھر سارا کچھ آپ عدالت سے حاصل کریں۔"

قریب تھا کہ مسلم ارکان اٹھ کر چلے آتے کہ مولانا ظفر علیخاں سے علیحدگی میں بات کرنے کے لیے سکھ صاحبان سے گذارش کی کہ وہ ہمیں ذرا علیحدگی میں بات کرنے کا موقع دیں۔ چنانچہ وہ سب اٹھ کر گوردوارہ کے اندر چلے گئے تو مسلم ارکان نے مولانا ظفر علیخاں کی خدمت میں گذارش کی:

"خدا کے لیے آپ مولانا داؤد کی تجویز کو مان لیں اور ضد نہ کریں۔ ہم پھر آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ ایجی ٹیشن سے مسجد نہیں ملے گی بلکہ مسلمان من حیث القوم ذلیل ہو جائیں گے۔"

اس موقعہ پر میاں امیرالدین نے پھر میری تجویز کی تائید کی لیکن مولانا ظفر علیخاں نے کہا:

"مسجد کی واگذاری کے بغیر اور کوئی مطالبہ نہیں ہے اور نہ ہم اس کے بغیر کسی دوسری چیز پر مصالحت کر سکتے ہیں۔"

میرے ذہن میں مولانا ظفر علیخاں کی پھر وہی بات آئی کہ "مجھے ایک ذمہ دار افسر نے کہہ دیا ہے کہ آپ ایجی ٹیشن جاری رکھیں مسجد آپ کو مل جائے گی۔" اس موقعہ پر مولانا سید حبیب فوراً بول اٹھے:

"میں نے یہ سنا ہے کہ کسی ذمہ دار شخصیت نے سکھوں سے کہا ہے کہ تم (سکھ) حق بجانب ہو۔ قانون تمہاری حمایت پر ہے اور عدالت کے فیصلے تمہاری پشت پناہی کر رہے ہیں۔ تم اگر مسجد گرانا چاہو تو تم کو حق ہے۔ اور مسلمانوں کی شورش کی وجہ سے اگر سکھ خطرہ محسوس کریں۔ تو بالکل بے فکر رہو

حکومت، پولیس اور فوج کے ذریعے تمہاری حفاظت کرے گی۔"

اس راز کے فاش ہونے پر مولانا ظفر علیخاں سے پھر گذارش کی گئی۔

"اب تو بات آپ سمجھ گئے ہونگے کہ یہ کوئی دشمن ہے جو ایک طرف آپ کو کہہ رہا ہے کہ تم ایجی ٹیشن جاری رکھو مسجد تمہیں مل جائے گی اور دوسری طرف سکھوں کو اکسایا جا رہا ہے کہ عدالت کے فیصلے تمہاری پشت پر ہیں تم مسجد کو گرا سکتے ہو۔"

ظفر علیخاں کے آخری فقروں پر ہم سب مایوس ہوئے اور سکھ صاحبان کو بلا لیا گیا اور ان کے سامنے مسجد کی واپسی کی تجویز کا پھر سے اعادہ کیا گیا۔ اس کے جواب میں سکھ رہنماؤں نے کہا:

"آپ حضرات جو کچھ چاہتے ہیں، لکھ کر گوردوارہ پربندھک کمیٹی کو بھیج دیں۔ ہم اس وقت از خود کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ کمیٹی جو فیصلہ کرے گی آپ کو مطلع کر دیا جائے گا۔"

اس جواب کے بعد مسلم ارکان واپس آ گئے۔

(روزنامہ مجاہد لاہور۔ ۵ جولائی ۱۹۳۵ء)

سکھوں اور مسلمان راہنماؤں کی مندرجہ بالا ناکام گفتگو کے بعد حالات میں مزید سماہمی پیدا ہو گئی۔ مسلمان نوجوان جتھوں کی صورت میں مسجد کی طرف بڑھنے لگے۔ پولیس کی لاٹھیاں اور فوج کی گولیاں ان کا استقبال کرتیں۔ پنجاب کے دیگر اضلاع سے مسلمانوں کے قافلے لاہور پہنچنے لگے اور سکھ جتھوں کی آمد بھی شروع ہو گئی۔ اس سے پنجاب کی فرقہ وارانہ فضا مکدر ہونا شروع ہوئی۔ اس دوران حکومت نے ریلوے کرین کی مدد سے راتوں رات مسجد کا اندرونی حصہ بھی مسمار کر دیا۔ اس پر یہ آگ اور بھڑکی۔ نیز حکومت پنجاب نے ظفر علیخاں، سید حبیب، ملک لال خاں اور اس طرح کے دوسرے لیڈروں کو پنجاب کے مختلف مقام پر نظر بند کر کے ان کے الاؤنس مقرر کر دیے۔

۱۰۔ جولائی کے روزنامہ "انقلاب" میں ایک خبر شائع ہوئی۔

"سرفیروز خاں نون کے مکان پر لاہور کے معزز علمائے کرام اور دوسرے لوگوں کا اجتماع ہوا۔ جس میں علمائے دین نے یہ فتویٰ دیا کہ مسجد کا گرایا جانا ناجائز ہے۔ ہمیں کوشش کر کے اپنے حقوق حاصل کرنے چاہئیں۔ بغیر کسی سے الجھے ہوئے۔"

لیکن اس خبر کے نیچے کسی کا نام درج نہیں تھا۔

اسی طرح ۱۱۔ جولائی کے روزنامہ "انقلاب" میں نامہ نگار کے حوالہ سے ایک خبر شائع ہوئی۔

"قانون کا بہرحال احترام کرتے ہوئے مسجد کے حصول میں مجلس احرار کو اپنی روایتی شان کے مطابق میدانِ عمل میں آجانا چاہیے۔"

اس خبر میں حکومت کو مسجد کے حادثے سے لاتعلق قرار دیا گیا تھا۔

تجویز ہو کہ تحریک، محرک کے ذہن سے نکل کر اگر عوام کی زبان پر آجاتے تو رسوائی کے راستے کھل جاتے ہیں۔ کبھی کبھار کامیابی بھی ہوتی ہے۔ لیکن اس کی عمر دیرپا نہیں ہوتی جماعتوں کے راہنما ہوں کہ جنگ کے نقشے لکیرنے والے جرنیل، کسی کو اپنا ہمراز نہیں بناتے یہاں تک کہ فتح و شکست واضح ہو جائے۔ اس پر بھی یہ راز صرف تاریخ تک رہتا ہے۔

مسجد شہید گنج کی تحریک کو جس ذہن نے جنم دیا اس سے بڑی غلطی یہ ہوئی کہ اس نے ظفر علی خاں ایسے جذباتی اور تلون مزاج آدمی کو اپنے راز میں شامل کر لیا۔ جذباتی دل اور دماغ کا آدمی راز اگلنے میں دیر نہیں کرتا۔

مولانا ظفر علیخاں نے ڈلہوزی سے اترتے ہی اس راز کو "زمیندار" کے صفحات پر اگل دیا، جس کے تعفن سے نہ صرف پنجاب، بلکہ ہر ہندوستانی کا دماغ پھٹنے لگا۔ اب یہ حقیقت واشگاف ہو کر سامنے آگئی کہ ڈلہوزی پلان کے پس منظر میں حصول مسجد سے کہیں زیادہ احرار کی شہرت کو نقصان پہنچا کر آئندہ الیکشن میں یونینسٹ پارٹی کو کامیاب کرانا مقصود تھا۔ اگر حصولِ مسجد میں خلوص کار فرما ہوتا تو یہ مہم باہم مشورہ سے سر ہو سکتی تھی۔ جیسے کہ اکثر موڑ بھی کر بات بن جاتی لیکن تحریک کے رہنماؤں نے حالات کے راستے میں ارادتاً ایسے کانٹے

بکھیرے کہ نہ صرف مجلس احرار ایسی فعال جماعت اس سے متاثر ہوئی بلکہ مسلمان قوم کا وقار بھی مجروح ہوا۔

احرار اپنی دیانت کے آئینے میں تمام کارروائی کرتے رہے لیکن جب انہیں یقین ہوگیا کہ ان کا سیاسی حریف نئے ارادوں سے حملہ آور ہوا ہے تو وہ سچائی اور انصاف کے اصولوں پر اپنا دفاع کرتے رہے۔

جن حالات میں مسجد گرائی گئی، اس کی براہ راست زد حکومت پر بھی پڑتی تھی۔ چنانچہ ۱۰۔ جولائی کو حکومت پنجاب نے حسب ذیل بیان کے ذریعے صورت حال واضح کردی۔

"گذشتہ کئی دنوں سے سکھوں اور مسلمانوں سے حکومت نے بات چیت کی کہ کسی طرح کوئی سمجھوتہ ہو جائے۔

واقعات اس طرح ہیں کہ متذکرہ بالا عمارت تقریباً ایک سو ستر (۱۷۰) سال سے سکھوں کے قبضے میں چلی آرہی ہے اور مقدمہ بازی کے بعد جس کی ابتدا ۱۸۵۳ء میں ہوئی۔ اس مسجد کے متعلق سکھوں کے دیوانی حقوق کی گوردوارہ ٹربیونل نے ۱۹۳۰ء میں آخری تصدیق کردی۔ ٹربیونل کے فیصلے کے خلاف مسلمانوں نے کوئی اپیل دائر نہ کی۔ اس قانونی پہلو کے پیش نظر حکومت کی طرف سے سکھوں سے یہ اقرار لینے کی کوشش کی گئی کہ وہ اپنے حقوق کو ایسے طریق پر استعمال نہ کریں جس سے مسلمانوں کے مذہبی احساسات کو صدمہ پہنچے۔

اس فیصلے کے مختلف امکانی حل طرفین کے ساتھ علیحدہ علیحدہ معرض بحث میں لائے گئے۔ اور سکھ لیڈروں کی طرف سے حکومت کو یہ جتایا گیا کہ انہدام کے حق میں یا خلاف کم از کم اس وقت تک کوئی فیصلہ نہیں کیا جائے گا۔ جب تک شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے اجلاس جو ۸۔ جولائی کو قرار پایا تھا، نہ ہو جائے۔ اگرچہ حکومت کو ان حالات کا علم نہیں جن میں مسجد کے انہدام کا یکایکی فیصلہ کیا گیا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سکھ لیڈروں کا اپنے انتہا پسند پیرؤوں پر قابو نہیں۔ ۷۔ جولائی کی شام کو شاہ عالمی دروازہ

کے قریب ایک سکھ کی لاش پائے جانے کی اطلاع ملی۔ گو تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ یہ موت تشدد سے نہیں ہوئی۔ لیکن سکھوں نے اسے فرقہ وارانہ قتل کی واردات سمجھ لیا اور اس طرح ان میں جوش پیدا ہو گیا۔

ظاہری اسباب خواہ کچھ ہی ہوں لیکن مسجد کا انہدام ۸۔ جولائی صبح شروع ہو گیا۔ حکومت کو افسوس ہے کہ سکھوں نے اچانک کارروائی کرنا مناسب سمجھا جس سے تصفیہ کے تمام مواقع جاتے رہے۔ اس طرح سے صورتحال نہایت نازک ہو گئی اور فرقہ وارانہ منافرت کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ ایسے میں حکومت عوام سے اپیل کرتی ہے کہ وہ فضا میں سکون قائم رکھیں اور امن قائم رکھنے میں مدد دیں۔"

حکومت پنجاب نے اس بیان میں اپنی پاک دامنی کا روائتی مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی بلا دوسروں کے گلے ڈال دی۔ حالانکہ تمام پتلیوں کی ڈور اسی کے ہاتھ میں تھی۔ حکومت کے بیان کے بعد مجلس احرار نے صورتحال واضح کرتے ہوئے اپنی پالیسی کی وضاحت کی۔

مندرجہ ذیل بیان مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے ۱۳۔ جولائی ۱۹۳۵ء کو شاہی مسجد لاہور میں زیر صدارت صاحبزادہ سید فیض الحسن سجادہ نشین آلو مہار شریف مجلس احرار اسلام ہند کی طرف سے پڑھ کر سنایا۔ اس اجلاس میں حاضرین کی تعداد پچاس ہزار کے قریب تھی۔

"مسجد شہید گنج کے متعلق اور ہماری جماعت کی پوزیشن کے متعلق چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک محتاط بیان پبلک کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ اگر کبھی اس کی تفصیل بیان کرنے کا موقعہ ملا تو مفصل بیان دیا جائے گا۔

ابھی ہم تبلیغ کانفرنس کے سلسلے میں لائلپور میں تھے کہ بذریعہ ٹیلیفون ہمیں لاہور سے صورت حال کے متعلق اطلاع دی گئی۔ فوراً خواجہ غلام حسین ایڈووکیٹ نائب صدر مجلس استقبالیہ تبلیغ کانفرنس لائلپور کے مکان پر جمع ہو کر مجلس احرار اسلام کے کارکنوں نے مشورہ کیا۔ رانا فیروزالدین ایڈووکیٹ

لائلپور نے جو مولانا ظفر علیخاں کے قریبی عزیز اور مجلس احرار کے معزز رکن ہیں مسجد شہید گنج اور حالات پر روشنی ڈال کر حزم و احتیاط کا مشورہ دیا اور ایک پالیسی تجویز کر لی گئی - جب ہمارے کارکن لاہور پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ مسجد شہید گنج کے تحفظ کے لیے ایک مقتدر جماعت بنالی گئی ہے - جس میں مولانا ظفر علیخاں، ان کے بیٹے اختر علیخاں، سید حبیب، ڈاکٹر محمد عالم، ملک لال خاں (گوجرانوالہ) شریک ہیں اور مسجد کے لیے ایجی ٹیشن کرنے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔

جب ایک مقتدر جماعت نے ہماری لائلپور سے واپسی سے پہلے کام سنبھالنے کا فیصلہ کر لیا ہو تو مجلس احرار کا من حیث الجماعت دخل دینا مسلمانوں میں کشمکش کا باعث ہو جانا لازمی تھا۔ اور جائز طور سے اس اعتراض کا موقع مہیا ہوتا کہ احرار ہر ایجی ٹیشن میں ٹانگ اڑا دیتے ہیں۔ اور کسی دوسری جماعت کو خواہ وہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو اکام کرنے کا موقع نہیں دیتے۔

بنابریں خاموشی کو بہتر سمجھا گیا لیکن ہم اس امر کا اعلان کرتے ہیں کہ خاموشی کے معنی مخالفت کے نہ تھے۔ بلکہ مولانا سید محمد داؤد غزنوی جنرل سیکرٹری مجلس احرار اسلام ہند کا تمام مشوروں میں برابر شامل رہنے کا فیصلہ کیا گیا اور انہوں نے ابتدا سے انجمن تحفظ مسجد شہید گنج میں نہایت محنت سے خدمت کو انجام دیا۔ لیکن نواب صاحب آف ممدوٹ کی کوٹھی پر ایک میٹنگ میں ایک عذر کی بنا پر شامل نہ ہونے کے لیے مولانا محمد داؤد کے خلاف غلط پروپیگنڈا بعض حلقوں سے شروع ہو گیا، جس کا تمام افسوس دفتر "زمیندار" کو ہونا چاہیے۔

پوزیشن کی وضاحت: اب مسجد گرا دی گئی تو بعض عاقبت نااندیش طبقوں کی طرف سے مجلس کی دانشمندانہ خاموشی کو مجرمانہ خاموشی بیان کیا گیا اور ملک میں ناکردہ گناہوں کے خلاف انتہائی طور پر پروپیگنڈہ شروع کر دیا - ہم نے اپنی پوزیشن واضح کرنے کے لیے یہ جلسہ ضروری سمجھا - یہ واضح رہے کہ جس دن سے مسجد شہید ہوئی ہے، ہم باخبر آدمیوں سے برابر مشورہ کرتے رہے۔

کل میاں عبدالعزیز بیرسٹر نے ٹیلیفون کیا کہ مجلسِ احرار اب کیا کرنا چاہتی ہے اور میں اس سلسلے میں جماعت کے ذمہ دار ارکان سے بات چیت کرنا چاہتا ہوں۔

غور و فکر کی مہلت: چنانچہ میاں صاحب کو مجلسِ احرار کی ورکنگ کمیٹی میں شمولیت کی دعوت دی گئی اور انہوں نے اس ایجی ٹیشن کی تمام تاریخ دہرا کر احرار کارکنوں کو کہا کہ آپ کو اس مسئلے میں رہنمائی کرنی چاہیے۔

ہم نے کہا کہ آپ تجویز کریں کہ کام کس طرح ہو؟۔ انہوں نے کہا اس وقت اجلاس برخاست کر دیا جائے اور میں چار بجے شام پھر آؤں گا۔ اور احباب کے مشورہ کے بعد دوبارہ گفتگو کروں گا۔

چار بجے ان کا فون آیا کہ وہ احباب سے مشورہ کر رہے ہیں۔ پھر آج صبح ان کا ایک آدمی پیغام لے کر آیا کہ میری استدعا ہے کہ آج کے جلسے میں کوئی اختلافی بات نہ کی جائے اور نہ ہی کوئی رائے اور پروگرام دیا جائے، جس پر تمام مسلمان پہلے سے متفق نہ ہو جائیں۔ میرے دوست مجلسِ احرار سے آج شام ضروری گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ میری احرار کارکنوں سے درخواست ہے کہ وہ اس نازک موقع پر اتحاد بین المسلمین کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

مجلسِ احرار نے اپنے کسی قول و فعل سے مسلمانوں کے مقاصدِ عالیہ کو نہ پہلے کبھی نقصان پہنچایا ہے اور نہ کبھی آئندہ پہنچانے کو تیار ہیں۔ آج یہ تحریر اس لیے مناسب سمجھی گئی کہ مبادا کسی لفظ سے کوئی غلط فہمی نہ پیدا ہو۔ اس بنا پر ہم حاضرین سے معذرت خواہ ہیں اور آج اس تحریر کے بعد کوئی تقریر نہیں کر سکے۔ امید ہے کہ آپ بھی ضبط و تحمل سے کام لیں گے۔ آپ مجھے تقریر کرنے سے معذور سمجھیں گے تاکہ مجلسِ احرار پر کوئی الزام نہ آئے۔

مسجد شاہ چراغ شاہ صاحب نے اپنی مندرجہ بالا تحریر کے خاتمے پر کہا:
"مسجد شہید گنج کے علاوہ ایک اور مسجد بھی ہے جس پر حکومت پنجاب کا قبضہ ہے، جسے ہم عنقریب حکومت سے آزاد کرائیں گے۔"

مسجد شاہ چراغ کے متعلق اشارہ کرتے ہوئے شاہ جی نے جس ارادے کا اظہار کیا تھا۔ حکومت پنجاب نے اس کے جواب میں ۱۶۔جولائی کے اخبارات میں اعلان کیا:

"مسلمانوں کی طرف سے مسجد شاہ چراغ کی واپسی کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ یہ مسجد ۱۸۶۰ء میں ایک ایسے آدمی سے خریدی گئی تھی جو اسے ذاتی سکونت کے لیے استعمال کرتا تھا۔ مگر اب اس جگہ کو حکومت خالی کر دے گی۔ لیکن جیسے ہی سیشن عدالتوں کے کمرے جو زیر تعمیر ہیں، مکمل ہوئے مسجد شاہ چراغ کو مسلمانوں کے حوالے کر دیں گے۔"

مسجد شاہ چراغ

یہ مسجد ایک درویش شاہ چراغ کے نام سے منسوب ہے، جو شاہجہان کے عہد میں گذرے ہیں۔ شاہ چراغ اوچ شریف (بہاولپور) کے باشندے تھے اور حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ کی اولاد میں سے تھے۔ جن کا ۱۶۵۷ء میں انتقال ہوا۔ ان کا مزار شہنشاہ اورنگ زیب نے تعمیر کرایا تھا۔ اس مزار کے قریب ہی یہ مسجد نواب خان بہادر خان گورنر لاہور نے محمد شاہ کے عہد میں بنوائی تھی۔ جب زمام اقتدار سکھوں کے ہاتھ آئی تو اس مسجد پر سکھوں نے حملہ کر دیا اور بعد میں اسے

ایک مسلمان کے ہاتھ فروخت کر دیا جو اسے بطور مکان کے استعمال کرتا رہا۔ یہ مسجد ۱۹۰۰ء میں حکومت پنجاب نے خرید کی اور اس میں اکاؤنٹنٹ کا دفتر قائم کیا گیا۔

مرزائی اور تحریکِ شہید گنج

قوتِ باطلہ روزِ آفرینش سے اس تاک میں رہی کہ حق کے راستے روک کر اس پر گامزن افراد کو گمراہ کیا جائے۔ لیکن اسلام کا پرتو جنہیں اندھیروں سے اجالوں میں لایا تھا وہ راستے کی روک ٹوک کے بغیر صراطِ مستقیم پر رواں دواں رہے۔ تاہم کئی موڑ آئے کہ جادۂ حق کے مسافروں کو کفر کی آگ سے اپنا دامن سمیٹنا پڑا۔

تحریکِ مسجد شہید گنج ایک ایسی سرخ اور بھیانک آندھی تھی کہ سچائی کو منہ چھپانے کیلئے اماں ڈھونڈنی پڑی۔ ہم رنگ زمین دام اس عنوان اور فریب سے بچھائے گئے کہ ہر قدم الجھتا چلا گیا۔ بگڑے ہوئے عوام کی زبان اور ہاتھ بغیر کسی سوچ اور فکر کے اپنا کام کرتے رہے۔ ایسے میں احرار رہنماؤں کا خلوص سر پیٹ کر رہ گیا۔ اور دل و جان کا نذرانہ لے کر اس راہ پر آ کھڑے ہوتے جو اصول کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس تحریک میں من حیث القوم مسلمان کو سیاسی اور مذہبی کس قدر ندامت اٹھانا پڑی اس کا جواب آئندہ تاریخ دے گی۔

مسجد شہید گنج ۸۔ جولائی کو گرائی گئی۔ لیکن قادیانی لیڈر بشیر الدین محمود نے یکم جولائی کو ہی اپنے مریدوں کو اطلاع کر دی کہ عنقریب عمدہ قسم کے اشتہار شائع کیے جائیں گے انہیں عمدہ جگہ پر لگائیں اور سمجھدار لوگوں میں تقسیم کریں۔ نیز ان پوسٹروں سے متعلق عوام کے تاثرات بھی معلوم کریں۔ چنانچہ جیسے ہی انہدامِ مسجد کا واقعہ پیش آیا۔ مرزائی تنظیم (تحریک جدید) کے بارہ سو کارکن لاہور پہنچ گئے اور انہوں نے "زمیندار" کے برابر حجازی بلڈنگ میں اپنا دفتر قائم کر لیا اور یہیں سے ۳۰×۲۰ سائز کے پوسٹر شائع ہونا شروع ہوئے۔ لاہور سے بمبئی پھر شمال مغربی صوبہ سرحد تک یہ پوسٹر شہروں کے علاوہ دیہاتوں، بستیوں اور گاؤں گاؤں تقسیم کیے گئے۔ ہر روز مختلف اقسام کے پوسٹر دیکھنے میں آتے۔ جن میں حصولِ مسجد کی بجائے احرار رہنماؤں کو گالیاں اور الزامات درج ہوتے۔ ان اشتہاروں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

جعلی خطوط انہی دنوں احرار رہنماؤں کے خلاف دو جعلی خط بھی شائع ہوئے۔ یہ خط پہلے روزنامہ زمیندار میں اور بعد میں اشتہاروں کی شکل میں لاکھوں کی تعداد میں عوام تک پہنچائے گئے۔

خط ۱ — دو گورداسپور۔ ۲۴۔ جولائی ۱۹۳۵ء

برادرم مکرم چودھری (افضل حق) صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

میں دورے سے واپسی پر دفتر پہنچا لیکن آپ موجود نہ تھے۔ زبانی طور پر تمام واقعات مولوی محمد شفیع صاحب سے کہہ آیا تھا۔ غالباً انہوں نے تمام نشیب و فراز بیان کر دیے ہوں گے۔ احتیاطاً دوبارہ عرض کرتا ہوں:

۱۲۔ جولائی کا شاہی مسجد کا اعلان بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ پبلک کا رجحان ہماری طرف پلٹ چکا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ دو سرے تیسرے دن کے بعد ایسا ہی ہنگامہ خیز بیان شائع کر دیا جایا کرے تاکہ مولوی ظفر علیخاں یا اس کی پارٹی سے عامۃ المسلمین کٹ جائیں۔ مکمل فیصلہ و اقتدار ہونے کے بعد ایجی ٹیشن فوراً ختم کی جا سکتی ہے۔

مانا کہ مسجد کا معاملہ نہایت اہم ہے۔ مگر اس میں حصہ لینے سے اگر کامیابی ہو بھی گئی تو نام ظفر علیخاں کا ہو گا۔ کیونکہ اس تحریک کا قائد وہی تسلیم کیا جا چکا ہے اور ہمارا اور مجلس احرار کا وقار سخت خطرے میں پڑ جائے گا۔ اور اکیلے ظفر علیخاں کی کامیابی ہمارے لیے بہت مشکل ہے۔

شاہ صاحب کو ہر ممکن طریق سے یقین دلائیں کہ ایجی ٹیشن میں شامل ہونے سے جماعت فنا ہو جائے گی۔ انہیں مذہبی رنگ میں ہی قائل کیا جا سکتا ہے۔ مولوی حبیب الرحمٰن سے معلوم ہوا ہے کہ اعلان پڑھنے کے بعد وہ کچھ نرم ہو رہے ہیں اور انفرادی طور پر ایجی ٹیشن میں شامل ہونے کا وعدہ بھی کر چکے ہیں۔ خدا کے لیے انہیں سمجھا دیجئے ان کی شمولیت سے [illegible]

فیل ہو جائے گی۔ میں مشاورت کے اجلاس میں شریک نہیں ہو سکا امید ہے آپ نے حسب منشا کارروائی کرالی ہو گی۔"

احقر۔ منظہر علی اظہر

دوسرا خط۔

گورداسپور۔ ۱۲ ستمبر ۱۹۳۵ء

برادر مکرم چودھری صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں آپ کے اس خط سے حرف بحرف متفق ہوں کہ پیر صاحب (حضرت پیر جماعت علی شاہ صاحب علی پور) امیر ملت ہند و صدر مجلس اتحاد ملت ہند کی مخالفت نہ کی جائے۔ کیونکہ اس وقت قوم ان کے ساتھ ہے۔ نیز یہ مسلمہ بات ہے کہ وہ سول نافرمانی نہیں کریں گے۔ اس لیے ان کی حمایت کرنے میں ہی ہماری بہتری ہے۔ ۱۵ ستمبر کو پیر صاحب لاہور آ رہے ہیں۔ اپنے ورکرز کو ہدایت کر دیں کہ یہ جلسہ کامیابی سے ہونے دیں۔ نیز روزنامہ مجاہد میں نہایت تدبر کے ساتھ مخالفت بھی جاری رکھی جائے اور اس جماعت میں اپنے آدمی بھی شامل کر دیے جائیں تا کہ ان کی سرگرمی سے اطلاع بھی ہوتی رہے اور وقت آنے پر یہ حمارت فوراً گرائی جا سکے۔ مگر کوئی کچا آدمی ان کے نزدیک تک بھی نہ جانے دیا جائے۔ شاہ صاحب سے کہہ دیں کہ اپنی توجہات خاکساریت کی طرف زیادہ منعطف کریں۔ اس دشمن کا سدِ باب نہایت ضروری ہے۔

مسئلہ حجاز کے متعلق میرا مشورہ صرف اتنا ہے کہ سلطان کی براہ راست ہرگز مخالفت نہ کی جائے۔ کیونکہ اس طرح یہ تحریک ہمارے لیے نقصان دہ ثابت ہو گی۔ یہ مانا کہ اس کی انگیخت میں اس کا بھی کوئی خاص فائدہ ہو گا۔ مگر ہمیں اس سے کیا؟ مگر ہمارا مطلب پورا پورا حل ہو جائے گا۔

پبلک کی توجہ شہید گنج ایجی ٹیشن سے ہٹانے[1] کا اس سے بہتر اور کوئی حربہ

---

[1] چودھری صاحب کے اس خط کا کہیں ذکر نہیں کہ نہ خط کیا تھا۔

نہیں ہو سکتا۔ پھر اگر سلطان حجاز پر کما حقہ، اثر ہو گیا تو مالی مشکلات بھی حل ہو جائیں گی اور چندے کی مصیبت سے کچھ عرصہ کے لیے نجات حاصل ہو جائے گی۔ ہاں! یاد آیا کہ ۲۰ ستمبر کا جلسہ اگر لاہور میں ہوتا تو بہتر تھا۔ اگر لاہور کے حالات موافق نہ ہوں تو اچھرہ ہی میں سہی۔ یہ جلسہ بہت مفید رہے گا۔ کیونکہ تمام نمائندگان کی موجودگی میں ہو گا۔ اور کمزور طبیعتیں بھی مضبوط ہو جائیں گیں۔ ۲۰ ستمبر کے اجلاس میں شمولیت کی کوشش کروں گا۔ والسلام"

احقر مظہر علی اظہر

جعلی خطوط کا محرک

ان خطوط کا شائع ہونا تھا کہ بدگمانیوں نے عوام میں نیا جنم لیا۔ افسانہ حقیقت کا پیرہن اوڑھے بزم آرائیوں میں مصروف ہو گیا۔ رہے سہے دوست و احباب دشمنوں کی صف میں چلے گئے۔ یہ جادو اس قدر سر چڑھ کر بولا کہ سچائی کی قوت گویائی سلب ہو کے رہ گئی۔ احرار کے راستے میں مشکلات کے نئے پہاڑ ابھرے خزاں نے بہار کے راستے روک لیے۔ گمراہی مرض کی طرح پھیلتی چلی گئی۔ سیاہ رات کے سائے آگے بڑھ کر جھوٹ کے نئے چراغ روشن کرنے لگے۔ جس سے حقیقت کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس سارے ڈرامے کا ایک ایک کردار اپنی برہنگی پر شرمندہ ہونے لگا۔

شیخ محمد شریف شوق[1] جو ان دنوں مرکزی مجلس احرار کا آفس سیکرٹری تھا۔ دیگر باتوں کے علاوہ اسے جعلی دستخط بنانے کا بھی ملکہ حاصل تھا۔ بحیثیت مرکزی احرار آفس کے انچارج کے تمام احرار رہنماؤں کے کاغذات اس کے قبضے میں تھے۔ چنانچہ اس کی خدمات جعلی خطوط بنانے کے ضمن میں حاصل کی گئیں اور اسے امرتسر اسماعیل غزنوی کے مکان پر لے جایا گیا۔ اور یہی جگہ جعلی خطوط مرتب کیے گئے۔ اور محمد شریف شوق سے مولانا مظہر علی اظہر کے جعلی دستخط کرائے گئے۔ یہاں سے یہ خطوط روزنامہ زمیندار کے دفتر پہنچے اور چھپ کر شائع ہوئے۔ انہیں انتہائی کی

---

[1] یہ شخص ان دنوں گوجرانوالہ کچہری احاطہ میں عرضی نویس تھا۔ [illegible] حکیم نورالدین کا حقیقی نواسہ ہے۔

شکل میں شائع کیا اس کا اعتراف مرزا محمود ان الفاظ میں کرتا ہے۔

"ہمیں ان (احرار) پر غصہ ہے۔ پس اگر کوئی شخص احرار کے خلاف لٹریچر شائع کرتا ہے اور ہم اس کی اشاعت میں مدد دیتے ہیں یا خریدتے ہیں تو اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا۔ ہمارے بعض آدمیوں نے ایسا لٹریچر خرید کر شائع کیا ہے یا اس کے شائع ہونے میں مدد دی ہے تو میں اسے برا نہیں سمجھتا۔ بلکہ اسے ایک قومی خدمت سمجھتا ہوں"

(خطبہ مرزا محمود "الفضل" ۱۹۔ ستمبر ۱۹۳۵ء)

اس طرح شیخ محمد شریف شوق کو مولانا مظہر علی اظہر نے اپنی الیکشن پٹیشن میں بطور گواہ پیش کیا تو اس نے عدالت کے روبرو اعتراف کیا کہ اس سے یہ خط مولوی اسماعیل غزنوی کے مکان میں لکھوائے گئے تھے۔ اس طرح محمد شریف شوق اپنے جھوٹ کا ایک اور جگہ اعتراف کرتا ہے:

"میں ایک الیکشن پٹیشن کے سلسلے میں لاہور کی ایک عدالت میں یہ بیان دے چکا ہوں کہ چٹھیاں مولانا مظہر علی اظہر کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی نہیں ہیں بلکہ یہ میرے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ میں عدالت موصوف میں یہ بیان بھی دے چکا ہوں کہ مولوی محمد اسماعیل صاحب کے دولت کدہ امرتسر میں ایک طے شدہ پروگرام کے تحت مجھے لے جایا گیا۔ کہ تمہارا خط اچھا ہے یہ دو چٹھیاں لکھ دو۔ چنانچہ مولوی محمد اسماعیل صاحب غزنوی الفاظ بولتے گئے اور میں لکھتا گیا۔ مولانا مظہر علی اظہر کے جعلی دستخط بھی میں نے خود کیے۔

میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ ان چٹھیوں سے مجلس احرار کو قتل کرایا جائے گا۔ اور مسجد شہید گنج کا ملبہ مجلس احرار ایسی فعال جماعت پر گرا دیا جائے گا۔ چنانچہ یہ لوگ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ میرا یہ گناہ معاف کر دے"

محمد شریف شوق۔ (ماہنامہ تبصرہ۔ شمارہ اگست ۱۹۶۹ء)

احرار کا دوسرا جھٹکا

اس وقت تک یہ بات کھل کر سامنے آچکی تھی کہ اندھیرے کے بادل چھٹ رہے ہیں اور حقیقت بلیوں اچھل رہی تھی کہ باطل کا کھیل تماشہ حصولِ مسجد کے لیے نہیں، محض مسلمانوں میں انگریزی سامراج کے خلاف منظم اور فعال جماعت کو نقصان پہنچانا اور آئندہ الیکشن میں یونینسٹ پارٹی کو کامیاب کرانے کا ایک حربہ تھا

۱۔ ایک ہی سرکاری آفیسر مولانا ظفر علیخاں کو یقین دلاتا ہے۔

"تم ایجی ٹیشن جاری رکھو، مسجد تمہیں مل جائے گی"

۲۔ وہی سرکاری آفیسر (بقول سید حبیب) سکھوں سے کہتا ہے:

"تم مسجد گرا سکتے ہو۔ کیونکہ یہ تمہارا حق ہے۔ اگر مسلمان اس کے راستے میں آئیں تو حکومت اپنی فوج اور پولیس سے تمہاری پشت پناہی کرے گی"

۳۔ یہی سرکاری آفیسر جس کے متعلق مرزائی لیڈر نے خود اعتراف کیا کہ:

"ایک ذمہ دار آفیسر نے جن کا میں نام نہیں لیتا، ایک معزز احمدی سے کہا ہے کہ اگر تم لوگ شہید گنج کے سلسلے میں دلچسپی رکھتے ہو تو میں ایسے آدمی بتا سکتا ہوں جو تمہارے حسبِ منشا کام کر سکتے ہیں"

ہفت روزہ "الفضل" (مرزائی آرگن)

خطبہ مرزا محمود۔ ۱۹۔ ستمبر ۱۹۳۵ء

آخر میں مولانا مظہر علی اظہر کی طرف منسوب جعلی چٹھیاں اور دیگر تمام واقعات نے جو جون کے آخری دنوں سے شروع ہو کر جولائی کے اختتام تک ہوتے چلے آئے تھے احرار کے لیے تمام راستے صاف کر دیے اور وہ چراغ گل ہو گئے جو کبھی بادِ سموم نے جلائے تھے۔ ابلیس کے اڑائے ہوئے چھینٹے حق کے دامن کو داغدار نہ کر سکے۔ وقت گواہی دینے کو آن پہنچا کہ باطل کی تمام کارروائی شرارت پر تھی۔ اس پر بھی بتوں کا دعویٰ خدائی شرمندہ نہ ہوا اور وہ بدستور جھوٹ کی پتنگ کو ڈور ہلاتے رہے۔

احرار ایک متعینہ منزل کے مسافر تھے۔ راستے کا کوئی پتھر ان کے قدم نہ روک سکا۔

وہ چلتے گئے اور چلتے ہی رہے۔ اس دوران اگر کوئی دیوار آئی تو ان کے آہنی ارادوں کے سامنے ٹھہر نہ سکی۔ بلا شبہ تحریک مسجد شہید گنج احرار کے راستے کا مشکل ترین موڑ تھا کہ تمام قوم سنگ اٹھائے ان کے سروں پر آگئی۔ گریبان چاک کر دیے۔ تہمام طرازی اور بدکلامی سے اخلاق کی حدیں بری طرح زخمی ہوئیں۔ لیکن وفا شعار اور ایثار پیشہ احرار ملت اسلامیہ کی خفگی کو خندہ پیشانی سے سنتے اور برداشت کرتے رہے مگر تا کجے؟۔

آخر ان آنکھوں کے ڈورے سرخ ہونے لگے، جن میں کل تک اپنی بے گناہی کے آنسو تیر رہے تھے۔ ان زبانوں میں گویائی کی قوت لوٹ آئی جو اپنی وفا اور شرافت سنبھالے ہوئے تھیں۔ وہ ہاتھ آوارہ عناصر پر ابھرنے لگے جو اپنے اکابر کی اطاعت میں بندھے ہوئے تھے۔ پھر ان قوتوں کی گوشمالی کے لیے احرار نے عسکری قوت ترتیب دی۔ ان فرائض کی انجام دہی کے لیے ایک سو نوجوان منظم اور مسلح کیے گئے۔ ان کی تربیت کی ذمہ داری لاہور کے مہر علم الدین اور سالار معراج دین کے سپرد تھی۔ چند دنوں کی یمین و لیسار کے بعد احرار کا یہ دُرلی جتھہ (گوریلے) چاق و چوبند ہو کر اپنا کام سرانجام دینے لگا۔ اس گروہ کی ڈیوٹی تھی کہ وہ احرار کے اجلاس میں اگر کہیں گڑبڑ پائیں تو مشکوک لوگوں کے گرد بیٹھ جائیں۔ اگر وہ خاموشی سے جلسے کی کارروائی سنیں تو بہتر، ورنہ جلسے میں گڑبڑ کرنے کی کوشش کرنے والوں کو نہایت امن سے اٹھا کر باہر لے جائیں اور خوب پٹائی کریں۔ یہاں تک کہ وہ آئندہ احرار کے اجتماعات میں مخالفت کرنے سے توبہ نہ کرلیں۔ البتہ گوریلوں کو تاکید تھی کہ مخالفین کو نہ تو جان سے مارا جائے اور نہ مہلک ضربات پہنچائیں۔

اس انتظام کے بعد ۱۶ ستمبر کو احرار نے اپنا پہلا جلسہ لاہور شہر کی بجائے اچھرہ میں رکھا۔ مخالفین احرار کی اس سکیم سے بے خبر تھے۔ چنانچہ راقم کی نظم کے بعد حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ تقریر کے لیے کھڑے ہوئے تو مخالفین نے حسب عادت ہنگامہ کرنا چاہا۔ چند منٹ انہیں سمجھایا گیا۔ لیکن جب پانی سر سے گزر گیا تو پھر احرار گوریلوں کو حکم دیا گیا کہ وہ جلسے کے انتظام کو سنبھالیں۔ بس پھر کیا تھا۔ کارروائی شروع ہو گئی۔ جلسے کا نظام بیس منٹ کیلئے معطل رہا۔ پھر جو امن ہوا تو شاہ جی نے رات کے دو بجے تک نہایت سکون سے

تقریر کی۔ دوسرا جلسہ لاہور باغبانپورہ میں رکھا گیا۔ اس میں راقم کے علاوہ خطیب پاکستان قاضی احسان احمد شجاع آبادی کو خطاب کرنا تھا۔ اس میں گڑبڑ کرنے کے لیے لاہور میکلیگن کالج کے طالب علم بڑی تعداد میں جمع تھے۔ ابھی قرآن حکیم کی تلاوت شروع تھی کہ نادانوں نے دانائی سے عاری ہو کر احرار رہنماؤں پر کیچڑ اچھالنا شروع کر دیا۔ احرار فورس پہلے سے تیار تھی۔ آج یہ ہاکیوں سے مسلح تھے۔ انہوں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ بھاگتے ہوئے طلباء میں چند ایک بھاری بھرکم طلباء سڑک پر گر پڑے۔ بھاگنے والے تو بھاگ گئے۔ جو رہے انہیں سٹریچروں میں لے جایا گیا۔

ایک ہفتہ بعد احرار لاہور شہر میں داخل ہوئے۔ یہ جلسہ دہلی دروازہ کے باغ میں رکھا گیا۔ اس کے لیے انتظامات کہیں وافر کرنے پڑے۔ اس وقت تک احرار کا یہ وردی جتھہ مزید طاقت پکڑ چکا تھا۔ نوجوان بڑی تعداد میں شامل ہو چکے تھے۔ آج مخالفین بھی بڑی طاقت میں لیس ہو کر آئے تھے۔ احرار گوریلے اس سے بے خبر نہیں تھے۔ اسٹیج سیکرٹری نے جیسے ہی اعلان کیا "حضرات اب جلسے کی کارروائی شروع ہو رہی ہے" ایک دم سے ہجوم کا ایک ریلا اسٹیج کی جانب بڑھا۔ قریب تھا کہ وہ اسٹیج پر قابض ہو جاتا کہ احرار رضاکار ہاکیوں اور لاٹھیوں سے مسلح ان کے سامنے آکھڑے ہوئے۔ کرائے کے آدمی مخلص رضاکاروں کے سامنے کہاں ٹھہر سکتے تھے۔ آمنے سامنے کی مڈھ بھیڑ میں فریقین زخمی ہوئے۔ اور آخر میدان احرار کے ہاتھ رہا۔ اور جلسہ رات بارہ بجے تک بغیر کسی مداخلت کے ہوتا رہا۔

لاہور کے بعد باقی پنجاب میں بھی یہی طریق اختیار کیا گیا تو پھر کہیں جا کر سکون ہوا۔ اسی پھینٹی پروگرام کو احراری حربہ بھی کہا گیا اور یہ لفظ اب تک رائج ہے۔

مولانا ظفر علیخان کے یہ تین شعر اسی دور کی یادگار ہیں۔ ؎

سر بازار اچھلتی ہم نے دیکھیں پگڑیاں اپنی
پڑا ہے جب سے پالا فتنۂ احرار سے ہم کو

بڑھایا آشتی کا ہاتھ جب ان کی طرف ہم نے
جواب اس کا ملا تلوار کی جھنکار سے ہم کو

اگر ڈر ہے تو ہے احرار کی مُسلم نمائی کا
کوئی طاقت ڈرا سکتی نہیں کفار سے ہم کو

("نگارستان" - مجموعہ کلام مولانا ظفر علیخاں ص۱۶۴، ۱۶۵)

نوٹ: تحریک مسجد شہید گنج ۱۹۳۷ء کے جنرل انتخاب تک جاری رہی - اس کا انجام کیا ہوا - ؟ اس کی تفصیل آئندہ اوراق میں آئے گی - (مصنف)

مسجد شہید گنج کے واقعات کو تاریخ کے دامن میں گرہ دینا رواں دواں تاریخ کا راستہ روکنا ہے - البتہ ایک موڑ کہیے جس پر مؤرخ کو چند لمحات کے لیے سستانا پڑا - اس سے بہتر کوئی دوسرا عنوان قائم کرنا درست نہیں - ہاں اس سارے ہنگامے کو سیاسی سازش بھی قرار دیا جا سکتا ہے، جو محض مجلس احرار کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے کی گئی تھی - جیسے کہ اس تحریک کے محرک مولانا ظفر علیخاں خود اقرار کرتے ہیں - سے

ہماری جیت میں ہے رازان کی موت کا پنہاں
پیام زندگی پہنچا ہے ان کی ہار سے ہم کو

("نگارستان" - مجموعہ کلام مولانا ظفر علیخاں ص۱۶۴)

اس تحریک میں کرانے کے چند نوجوان بھی ملوث تھے، جن میں عبدالکریم شورش اس طائفہ کا لیڈر تھا - لیکن جیسے ہی اس نے اس سازش کے اندرون جھانک کر دیکھا تو اس کا دل کیا ہی دے اٹھا کر حصول مسجد کی تحریک کوئی تحریک نہیں بلکہ یہ ڈرامہ صرف یونینسٹ پارٹی نے انتخاب جیتنے کے لیے رچایا ہے اور بس! ___ وہ فوراً مجلس احرار میں آشامل ہوا - اور پھر یہی شخص آئندہ چل کر آل انڈیا مجلس احرار کا جنرل سیکرٹری بھی بنایا گیا -

انگریز اپنے اقتدار کے ڈوبتے سورج کو زندگی دینے کے لیے در پردہ جن حرکات کا مرتکب ہو رہا تھا - تحریک مسجد شہید گنج بھی اس کے کام کی تحریک نکلی - چنانچہ یہ وقتی تحریک پنجاب سے ہٹ کر ہندوستان کی ہمہ گیر سیاست پر اثر انداز ہوئی - اس کی طفیل اقوام ہند متحد ہوتے ہوئے اس موڑ پر پھر ایک ٹھوکر کھا گئیں - بعض ہندو لیڈر بھی سکھوں کی ہاں میں ہاں ملانے لگے - اس ہم آہنگی نے مسلمان کو مزید مشتعل کر دیا -

بارش کے تھمتے ہی آسمان پر قوس و قزح کی لہریں دیکھ کر قیاس ہونے لگتا ہے کہ اب بارش نہیں ہو گی۔ لیکن کبھی کبھار بادِ سموم رنگوں کے اس امتزاج کو اپنی لپیٹ میں لے کر قیاس آرائیاں ختم کر دیتی ہے۔ اسی طرح ۱۹۳۵ء کے سنبھلتے ہوئے حالات میں تحریک شہید گنج نے ایک نیا زہر گھولا کہ ۲۔ جولائی کو حکومت ہند نے اعلان کیا کہ:

"حال ہی میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ دفعہ ۳۰۴ کے متعلق یہ گمان پیدا ہو گیا ہے کہ اس دفعہ کی رو سے ملک معظم کی حکومت کو یہ حق حاصل ہو گیا ہے کہ وہ حسب منشا فرقہ وارانہ اعلان میں تغیر پیدا کرے گی۔

کیمونگ میں اس خیال کی تردید کر دی گئی ہے۔ کیمونک مندرجہ ذیل الفاظ پر ختم ہوتا ہے۔

فرقہ وارانہ اطلاق کی حدود اور شرائط کے اندر رہتے ہوئے ملک معظم کی حکومت کا ہرگز ارادہ نہیں کہ وہ اس دفعہ کی رو سے حاصل شدہ اختیارات کے تحت پارلیمنٹ کے پاس کسی قسم کی تبدیلی کی سفارش کرے۔ تا وقتیکہ اقوام ہند کی طرف سے کوئی متفقہ لائحہ عمل پیش نہ کیا جائے۔"

(روزنامہ "انقلاب"۔ لاہور۔ ۴۔ جولائی ۱۹۳۵ء)

جیسے ہی احرار کی عسکری قوت نے حالات کو درست راستے پر گامزن کیا اور فضا نے کروٹ لی، واقعات نئے رخ پر آنے لگے۔ تو ۷۔ جولائی کو احرار نے لاہور شاہی مسجد میں عام جلسے کا اعلان کیا۔ مذکورہ تاریخ سے چل کر یہ پہلا موقعہ تھا کہ احرار کا اجتماع پرامن ماحول میں اختتام کو پہنچا۔ مگر جلسے سے واپسی پر مسجد وزیر خاں کے چوک میں بلا کسی اشتعال کے پولیس نے ہجوم پر لاٹھی چارج کر دیا۔ اس موقعہ پر چاہیے تو یہ تھا کہ پولیس کے متشددانہ رویہ کے خلاف احتجاج کیا جاتا۔ لیکن اس موقعہ پر مسجد وزیر خاں سے کرائے کے نوجوانوں نے احرار مردہ باد اور راہنمایان احرار مردہ باد کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ حالانکہ احرار بے قصور تھے۔ مگر جب حالات کو بگاڑنا مقصود ہو تو اچھے برے کا امتیاز کون کرتا ہے۔

حالات کو مزید سدھارنے کے لیے ۱۹۔ جولائی کو حسب ذیل مشترک دعوت نامے پنجاب

کے مختلف اہل الرائے حضرات کو روانہ کیے گئے۔

"مکرمی و محترمی! السلام علیکم

ارکان مجلس تحفظ مسجد شہید گنج اور مجلس احرار کے متحدہ اعلان کے مطابق آپ کو دعوت دی جاتی ہے کہ آپ مسلمانان پنجاب کی مجلس مشاورت میں شریک ہوں، مسجد شہید گنج کے انہدام سے پنجاب کے مسلمانوں میں جو جوش پیدا ہو چکا ہے۔ اس کو صحیح راہ پر ڈالنے اور اس کے مفید نتائج پیدا کرنے کے لیے آپ کے مشوروں کی اشد ضرورت ہے۔ اور دیگر اکابر قوم کو بھی دعوت دی جاتی ہے۔

لہٰذا آپ مہربانی فرما کر ۲۷۔ جولائی کو لاہور پہنچ جائیں۔ اجلاس دو روز رہے گا۔ پہلا اجلاس ۲۷۔ جولائی ۳۔ بجے شام اور دوسرا ۲۸۔ جولائی ۸ بجے صبح شروع ہوگا۔

الداعی: (مولانا) سید عطاء اللہ شاہ بخاری

(مولانا) حبیب الرحمٰن۔ چودھری افضل حق

(مولانا) محمد داؤد غزنوی۔ (مولانا) مظہر علی اظہر

عبداللہ قصوری۔ اختر علیخاں۔ لال دین قیصر

محمد یوسف حسن۔ ایڈیٹر نیرنگ خیال۔ لاہور

نوٹ: مجلس احرار نے اپنا مرکزی اجلاس بھی اسی روز طلب کر لیا۔ تاکہ جو فیصلہ ہو اس پر فوری عمل کیا جا سکے۔

ممکن تھا مذکورہ اجلاس کے بعد پنجاب کے حالات میں قدرے سکون ہو جاتا۔ لیکن ۲۱ اور ۲۲۔ جولائی کو پولیس نے مسجد کی جانب بڑھتے ہوئے ہجوم پر لنڈا بازار میں گولی چلا دی۔ جس کے نتیجے میں سرکاری رپورٹ کے مطابق کئی مسلمان شہید اور اسی کے قریب زخمی ہوئے۔

فتویٰ

گولی چلنے اور مسلمانوں کی شہادت کے بعد جذبات میں نئے سرے سے ہیجان پھیل گیا۔ نیز خطرہ بڑھ گیا کہ پنجاب کے دوسرے اضلاع سے مسلمانوں کے قافلے لاہور پہنچنا شروع ہو جائیں گے۔ اسی صورت میں مسجد وزیر خاں کے خطیب مولانا دیدار علی نے ۲۴ جولائی کو حسب ذیل فتویٰ ایک عام اجتماع میں پڑھ کر سنایا جو مسجد میں منعقد ہوا تھا۔

"مولانا نے (کتاب) شامی کا حوالہ پیش کرتے ہوئے فتوی دیا۔ جب مسجد شہید ہو رہی ہو تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ مسجد کی حفاظت کریں اور اس حفاظت کے ساتھ ساتھ اپنے خون کی بھی حفاظت کریں اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالیں۔"

روزنامہ "انقلاب" ۲۶- جولائی ۱۹۳۵ء

اس فتوی کا پڑھنا تھا کہ جلسہ میں شریک لوگوں نے شور مچا دیا کہ اگر یہی بات تھی تو علماء پہلے کیوں خاموش رہے۔ کیوں نہ مجمع کو آگاہ کیا؟ مرنے والوں کی جانیں کیوں خطرے میں ڈالی گئیں اور اکثر لوگوں نے بے سمجھی میں احرار رہنماؤں سے گستاخی بھی کی۔ مسجد کے اندر سینکڑوں لوگ علماء کی اس خاموشی پر زار و قطار رونے لگ پڑے اور فتوی دینے والوں پر آوازے کسے گئے۔

اس کے ایک ہفتہ بعد جمعیۃ علمائے ہند کے امیر مفتی کفایت اللہ اور ناظم اعلی مولانا احمد سعید کا حسب ذیل بیان اخبارات میں شائع ہوا۔

"مسجد شہید گنج کے انہدام پر جس قدر افسوس کا اظہار کیا جائے کم ہے اسی قدر مسلمانوں پر لاٹھی چارج اور آتش باری کے نتائج الم انگیز ہیں۔ اور روح فرسا بھی۔ اس ضمن میں ہم جماعتی حیثیت میں تشویش کا اظہار حسب ذیل اعلان سے کرتے ہیں۔

۱۔ باوجودیکہ عدالتی فیصلے سکھوں کے حق میں تھے اور بدیں وجہ سکھ مسجد پر قابض تھے۔ سکھوں کے لیے مسجد کا گرا دینا، مسلمانانِ ہند کی انتہائی دل آزاری کرتا ہے۔ نیز اخلاقی اور وطنی حیثیت سے جائز نہیں تھا۔

۲۔ مذکورہ بالا دونوں باتوں کے باوجود حکومت قیام امن کی خاطر مسجد کے انہدام کو روک سکتی تھی۔

۳۔ جن مسلمانوں نے مسجد کے انہدام کے خلاف اظہارِ رنج و غم کیا اور اس کے لیے پُرامن مظاہرے کیے حق بجانب تھے۔

۴۔ مسلمانوں نے باوجود انتہائی اشتعال انگیزی کے جو امن پسندی کا ثبوت دیا

وہ اپنی نظیر آپ ہے۔

۵۔ مسلمانوں نے لاٹھی چارج اور آتش باری کے خلوص رہا موافق پر جس ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا وہ بے نظیر ہے اس پر وہ تمام مسلمان مبارک باد کے مستحق ہیں۔

۶۔ جو مسلمان ان پرامن مظاہروں کے درمیان متعلقہ حکام کی ناعاقبت اندیشانہ آتش باری سے شہید ہوئے وہ ہرگز اس تشدد کے مستحق نہ تھے۔ اور جو اس بناء پر شہید ہوئے یا مجروح ہوئے ہیں وہ ثواب کے مستحق ہیں۔

۷۔ مسجد جب ایک مرتبہ مسجد بن جائے تو قیامت تک مسجد ہی رہتی ہے کوئی جابرانہ دستور یا مخالفانہ قبضہ اس کو مسجد ہونے سے خارج نہیں کر سکتا۔

۸۔ اگر کوئی غیر منظم ایجی ٹیشن با اعتبار نتائج کے معنوی طور پر مفید نہ ہو تو اس ایجی ٹیشن کو ترک کر کے حصولِ مسجد کے لیے دوسرے ذرائع مثلاً باہمی مفاہمت پر غور کرنا چاہیے اور کوئی ایسا اقدام کرنا چاہیے جو فرزندانِ توحید کیلئے مفید ثابت ہو

۹۔ جو طریقہ بھی اختیار کیا جائے وہ تمام مسلمان زعما کے باہم مشورہ اور اتحادِ عمل سے ہو تاکہ اس کا نتیجہ بہتر اور باعزت صورت میں نکل سکے۔

صدرِ بلدیہ لاہور کا بیان

۲۶۔ جولائی کے مسلم اخبارات میں صدرِ بلدیہ لاہور ملک محمد دین کا ایک بیان شائع ہوا۔

"اگر بعض بیان اور علماء کا فتویٰ جو اس وقت شائع کیا گیا ہے۔ اگر ہمارے یہی علماء (مولانا دیدار علی) اس وقت جرأت سے کام لے کر یہی اعلان پہلے کرتے تو بے گناہ مسلمانوں کا خون ضائع نہ ہوتا اور نہ ہی بے گناہ معصوم جانیں ضائع ہوتیں۔

افسوس کہ تحریک کے دنوں مذہبی رہنماؤں کی حیثیت سے انہوں نے نہ اپنی ذمہ داری نبھائی اور نہ ہی وکلاء نے مسلمانوں کو مسجد کی قانونی حیثیت سمجھائی کہ اس کا نتیجہ بہتر ہوتا۔"

(روزنامہ "انقلاب" لاہور۔ ۲۷۔ جولائی ۱۹۳۵ء)

اس سے ایک ہفتہ پیشتر روزنامہ "انقلاب" لاہور نے مسلم لیگ کے سیکرٹری کا بیان شائع کیا۔

"دہلی - ۲۵ - جولائی - خان بہادر حافظ ہدایت حسین ایم - ایل - سی (یو پی) نے لاہور کی صورتِ حال پر مسلمانوں کے نام ایک پیغام میں کہا، کہ وہ ایسے اقدام سے باز رہیں جس سے خرابی ہو اور امن کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو۔ ساتھ ہی آپ نے سکھوں کے انہدامِ مسجد کی مذمت کی۔ نیز آپ نے کہا کہ یہ واقعہ نئے دستورِ اساسی کی کامیابی کو خطرے میں ڈال رہا ہے۔ آخر میں آپ نے کہا کہ میں حکومت سے استدعا کروں گا کہ وہ جلد کوئی اقدام کرے جس سے مسلمانوں کی تسلی ہو۔"

مشترک اجلاس دعوت نامے کی بنیاد پر جو ۱۹ - جولائی کو جاری کیے گئے تھے۔ ۲۰ جلائی کو پنجاب اور سرحد کے مختلف الخیال مسلم رہنماؤں کا ایک مشترک اجلاس لاہور میں ہوا۔

اس مشترک اجلاس کی تجویز پر مجلسِ احرار کے نمائندوں نے اپنی پوزیشن واضح کی کہ مسجد کو حاصل کرنے کی ہم نے کبھی مخالفت نہیں کی۔ لیکن سول نافرمانی یا تشدّد کے ذریعے مسجد کے حصول کو ناممکن ضرور سمجھا اور دو ہی راستے مسجد کے حصول کے متعلق ہمارے ذہن میں ہیں۔ اوّل یہ کہ عدالت کے ذریعے۔ دوسرا سکھوں سے باہمی افہام و تفہیم سے یا کسی باعزت سمجھوتے کے ذریعہ۔ بحیثیت مسلمان کے مسجد کے تحفّظ کا سوال ہمارے پیشِ نظر تھا۔ اور ہمارے خیال میں ہر فرقے کے مسلمان ہمارے اس خیال سے متفق تھے۔ ہمارے سامنے شروع سے سوال تھا کہ اس مقصد کو کس طرح حاصل کیا جائے۔ الحمدللہ کہ مجلس مشاورت نے سکھوں سے افہام و تفہیم کے لیے ایک کمیٹی بنا دی۔ جو مسجد شہید گنج کے متعلق سکھوں سے کوئی باعزت مفاہمت کرنے کی کوشش کرے گی۔

باقی چار شقوں کے متعلق ہمیں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ شق اوّل کے متعلق پنجاب کونسل میں احرار نمائندوں نے بہت بڑی حد تک کامیابی حاصل کی کہ سوائے پانچ اضلاع باقی تمام اضلاع میں تلوار پر سے پابندی اٹھ گئی ہے۔ باقی تین چیزوں کے حصول کیلئے ہر جائز تدبیر اختیار کرنے میں کوتاہی نہیں کریں گے۔

کانفرنس کی مشترک قرارداد

مجلس احرار کے اس واضح بیان کے بعد مشترک کمیٹی نے حسب ذیل قرارداد پاس کی۔

۱۔ پنجاب اور صوبہ سرحد کے مسلم مندوبین کا یہ اجلاس مسجد شہید گنج لاہور کے انہدام پر اپنے دلی رنج وغم کا اظہار کرتا ہے۔ اور سکھوں کے اس غیر تہذیبی اور غیر روادارانہ فعل کی پرزور مذمت کرتا ہے۔

۲۔ نیز مسلم شہداء کے لیے جو تحفظ مسجد شہید گنج کے سلسلے میں شہید ہوئے ہیں دعائے مغفرت کرتے ہوئے زخمیوں، قید شدہ اور زیر حراست کو مبارکباد پیش کرتا ہے اور ان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔

۳۔ نیز مسلم مندوبین کا یہ اجلاس اپنے اس عزم کے اعلان کے بعد کہ مسلمان کسی حالت میں تحفظ مسجد شہید گنج کے بغیر مطمئن نہیں ہو سکتے۔ ذیل کے اراکین پر مشتمل ایک سب کمیٹی بدیں غرض مقرر کرتا ہے کہ وہ اس سلسلے میں تمام پنجاب اور سرحد کے چیدہ چیدہ افراد کے پورے طبع شدہ مشورہ کے بعد کوئی پروگرام بنائیں جس میں ذیل کے امور کا خاص خیال رکھا جائے۔

و۔ مسلمانوں کو غیر مشروط طور پر تلوار رکھنے کی اجازت۔

ب۔ مساجد اوقاف کے تحفظ کے لیے ایکٹ کا نفاذ۔

ج۔ مسجد شہید گنج کے سلسلہ میں گرفتار شدگان کی رہائی اور شہداء کے خون کا معاوضہ دلایا جائے۔

د۔ نیز یہی سب کمیٹی جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اور جس کی تفصیل ذیل میں درج ہے کہ سکھوں سے مسجد کے متعلق گفتگو کر کے باعزت مفاہمت کرنے کی کوشش کرے۔

اراکین کمیٹی مولانا محمد داؤد غزنوی۔ خواجہ عبدالرحمٰن غازی۔ چودھری افضل حق۔ مولانا مظہر علی اظہر ملک لال دین قیصر۔ مولانا اختر علیخاں۔ مولانا عبدالقادر قصوری۔ سید عنایت شاہ خواجہ محمد حسین امرتسری۔ مولانا شیر نواب قصوری۔ پروفیسر ملک عنایت اللہ۔ ملک محمد دین صدر۔

بلدیہ لاہور۔ میاں عبدالعزیز ایڈووکیٹ۔ شیخ محمد صادق امرتسری۔ میر مقبول محمود امرتسر۔ میاں محمد شریف پراچہ لاہور۔ بعد میں مولانا عبدالمجید سالک اور مصطفٰے شاہ گیلانی کو بھی اس کمیٹی میں شامل کر لیا گیا۔

نام میں تبدیلی

۳۰۔ جولائی کو اس جماعت کا نام مجلسِ اتحادِ ملی قرار پایا۔ اس کے صدر ملک محمد دین (صدر بلدیہ لاہور) نائب صدر ملک لال دین قیصر۔ جنرل سیکرٹری مولانا محمد داؤد غزنوی خزانچی مسلم بنک کو قرار دیا گیا۔

سکھوں سے گفتگو کے لیے جو سب کمیٹی مقرر ہوئی۔ ان میں چودھری افضل حق ایم ایل سی مولانا مظہر علی اظہر ایم ایل سی۔ میاں عبدالعزیز بیرسٹر۔ میر مقبول محمود۔ شیخ محمد صادق۔ مولوی شیر نواب قصوری۔

اس مشترک اور واضح بیان کے بعد احرار نے تحریک شہید گنج کو ثانوی حیثیت قرار دے کر اپنے رکے ہوئے کاروان کو منزل کی جانب روانگی کا حکم دیا۔ البتہ مذکورہ کارروائی پر نظر رکھی۔

کون کیا تھا

میدانِ جنگ ہو کہ اندرونِ خانہ سازش، دونوں کی منزل میں بعد نہیں ہوتا۔ فریق زندہ رہے کہ مرے پس منظر میں کام کرنے والے ہاتھ نتائج سے ماوراء رہ کر نقشے لکیرتے رہتے ہیں کبھی کبھار دل و دماغ متصادم بھی ہوتے ہیں۔ لیکن نیتوں کا فتور بدستور کارفرما رہتا ہے۔ آخر وقت آتا ہے کبھی ملک تباہ ہو جاتے ہیں اور کبھی افراد یا پارٹیوں کا وجود نہیں رہتا۔

شہید گنج تحریک تین مختلف ذہنوں کی پیداوار تھی۔ ہر سہ ذہن اپنی اپنی سوچ میں منفرد تھا۔ لیکن ہدف ایک اور وہ مجلسِ احرار تھی۔

۱۔ گذشتہ سال خالد لطیف گابا کے الیکشن کے دنوں احرار رہنما شیخ حسام الدین نے عوام میں تقریر کرتے ہوئے ایک موقعہ پر کہا:

"یہ انتخاب ہمارا امتحان ہے۔ اگر ہم اس میں کامیاب ہو گئے تو مجلسِ احرار آئندہ کے لیے انتخاب میں بھرپور حصہ لے گی"

سر فضل حسین انہی دنوں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل سے فارغ ہو کر لاہور آئے تھے۔

وہ ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت ہونے والے الیکشن میں کامیاب ہو کر پنجاب کی وزارت عظمیٰ کے متمنی تھے۔ اس غرض سے انہوں نے پہلے تو سر سکندر حیات لوہاؤں کا ڈپٹی گورنر بنوا کر بمبئی بھجوایا۔ اب ان کے راستے کی سب سے بڑی دیوار مجلس احرار تھی شیخ حسام الدین کے اشارے سے (مجلس احرار آئندہ الیکشن میں بھرپور حصہ لے گی) وہ سنبھلے۔ آدمی ذہین اور ڈپلومیٹک قسم کے تھے۔ گورنر پنجاب مسٹر ایمرسن سے مل کر مسجد شہید گنج کی دیوار کا ملبہ احرار پر گرادیا ——— ایک ذہن یہ تھا ———

مولانا ظفر علیخاں کا اس ذہن میں شریک دوسرا ذہن تھا ——— ۱۹۲۴ء میں جب قادیان احرار کانفرنس کی صدارت کا سوال سامنے آیا تو ظفر علیخاں بھی اس کرسی کے امیدوار تھے۔ مگر جماعتی ضابطہ اس کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ کیونکہ وہ احرار کے ابتدائی رکن بھی نہیں تھے۔ لہٰذا یہ قرعہ نام سید عطاء اللہ شاہ بخاری نکلا ——— وہ دن جانے اور یہ آئے کہ مولانا ظفر علیخاں احرار کے خلاف صف آراء ہو گئے۔

مرزا بشیر الدین محمود اس سازش کا تیسرا ذہن تھا۔ اس کی احرار سے کیا دشمنی تھی؟ یہ تعارف کی محتاج نہیں۔

متضاد عناصر کے اس اتحاد نے ہندوستان کی ایک فعال مسلم سیاسی جماعت کو کس قدر نقصان پہنچایا۔ اس کا جواب تاریخ دے گی۔

حکومت سعودیہ کا برطانوی کمپنی سے معاہدہ

انگریز بساط سیاست کا منجھا ہوا کھلاڑی اور اپنے مہرے پھیلانے میں استاد مانا گیا ہے۔ اپنے حریف کو مات دینے میں اس کی سوچ اس کے قدموں سے میلوں آگے ہے۔ یہ زمین کا سودا چکانے سے پیشتر ضمیر کا سودا کرتا ہے۔ اس خرید سے فارغ ہو کر آباد بستیوں کو ویران کرنے کے ارادے باندھتا ہے۔ پھر آزاد؛ غلام ہو کر اپنی زنجیروں کو آپ گرہ دیتے ہیں۔ اور اس پر سے صدیاں گذر جاتی ہیں۔ تا آنکہ محکوم اپنے لہو کی آگ سے اس گرہ کو کھولتے ہیں۔

پرانی تہذیب جب نئے سانچوں میں ڈھلتی ہے تو قوموں کا حقیقی تمدن انہیں نفرت

سے دیکھتا ہے۔ لباس کی کتر بیونت، طرزِ تکلم، غلام قوموں کے اخلاق میں کئی تغیر پیدا کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ تدبیر اور شمشیر بیکار ہو کر رہ جاتی ہیں۔

پہلی جنگ عظیم کے آغاز میں ترکی کے زیر نگین عربوں نے جو کردار ادا کیا انگریز اس سے غافل نہیں تھا۔ گو شریف مکہ کی غداری سے انگریزوں کا قرض اتر چکا تھا۔ تاہم فرنگی وسط ایشیا کی پھانس ہمیشہ کے لیے اپنے حلق سے نکال دینا چاہتا تھا۔ ویسے بھی عرب کے ریگزاروں میں پہاڑوں کے سینکڑوں خزانے پوشیدہ تھے، جنہیں نگاہِ افرنگ نے دور سے تاڑ لیا تھا۔ سونے کے ذخائر، تیل کے چشمے اقوامِ یورپ کے اندھیروں میں اجالا کرنے کے لیے ضروری اور اہم تھے۔ چنانچہ معاشی اور سیاسی ضرورت کے لیے اقوامِ عرب کا ذہنی استحصال فرنگی دانشوروں کے نزدیک ضروری سمجھا گیا۔

یکم اگست ۱۹۳۵ء کے ہندوستانی اخبارات اور روزنامہ "انقلاب" لاہور میں خصوصیت سے شاہ ابن سعود فرمانروائے حجاز کا فرمان اور معاہدے کا متن اس کی منظوری سے شائع کر دیا گیا جو درج ذیل ہے۔

"ہمیں اس معاہدے کی اطلاع ملی جو جدّہ میں ۱۷۔ رمضان المبارک ۱۳۵۲ھ مطابق ۲۳۔ دسمبر ۱۹۳۴ء کو ہمارے وزیر مال اور مسٹر کے۔ سی۔ ٹوشل نمائندہ کمپنی تعدین عربیہ سعودیہ متعینہ لندن میں ہوا۔ لہٰذا ہم مجلس وزراء کی تائید کرتے ہوئے حکم دیتے ہیں کہ

۱۔ کمپنی ہٰذا کو اس زمین سے جس کی حدود اس معاہدہ میں متعین ہے تمام معدنیات نکالنے کی اجازت ہے۔ یہ زمین ہماری مملکت عربیہ سعودیہ کی ہے جس کی حدود اس معاہدہ میں مذکور ہیں۔ جس پر ہمارے وزیر مال اور نمائندہ کمپنی مذکور سے ۱۷۔ رمضان المبارک ۱۳۵۲ھ مطابق ۲۳۔ دسمبر ۱۹۳۴ء کو جدہ میں معاہدہ ہوا اور تصدیق ثبت کر دی گئی۔

۲۔ ہم اس معاہدہ کی تصدیق کرتے ہیں اور تاریخ اشاعت سے قابل نفاذ سمجھتے ہیں۔

۳۔ ہمارے وزیر مال پر اس کا نفاذ کرنا لازم ہے۔ اور یہ معاہدہ قصر ریاض میں

۸۔ ذیقعدہ ۱۳۵۳ھ مطابق ۱۴۔ فروری ۱۹۳۵ء کو پیش ہوا۔ اور ہم نے اس کی تصدیق کی۔"

"دستخط عبدالعزیز ملک حجاز"

معاہدہ یہ معاہدہ ۱۷۔ رمضان المبارک ۱۳۵۳ھ مطابق ۲۳۔ دسمبر ۱۹۳۴ء کو شیخ عبداللہ سلمان احمد نائب حکومت عربیہ سعودیہ فریق اول اور فریق ثانی مسٹر کارل رسائین توشل کے مابین ہوا۔ جو نائب ہیں کمپنی این۔ این عربیہ سعودیہ کے۔ جو رجسٹرڈ ہے۔ اور اس کا ہیڈ کوارٹر ۱/۶/۵۵ مارکیٹ شہر لندن (انگلستان) میں ہے۔ یہ معاہدہ حکومت اور کمپنی کے مابین مندرجہ ذیل شکل میں طے پایا۔

دفعہ اول۔ حکومت اس معاہدے کی رُو سے ان شرائط پر جو بیان کی گئی ہیں۔ اس کا حق صرف اسی کمپنی کو دیتی ہے کہ اندرونی داخلی ہر قسم کی معدنیات کو تلاش کرے۔ ان کو کھود سے یا کھدائی کر کے نکال لے۔ وہ سطح زمین پر ہوں یا اس کے اندر۔ ان حدود کے مطابق جن کی تصریح دفعہ دوم میں کر دی گئی ہے اور اس غرض کے لیے کمپنی کو یہ حق دیا جاتا ہے کہ وہ چھوٹے بڑے گڑھے نیچی اور اونچی جگہ اور پہاڑوں وغیرہ کو بھی کھود سکتی ہے اور وہ سوراخ وغیرہ بھی کر سکتی ہے حکومت اس بارے میں تمام ممکن وضروری آسامیاں کمپنی کے لیے اغراض ہذا کی خاطر بہم پہنچائے گی، جن کی تصریح اس معاہدہ میں کر دی گئی ہے اور کام شروع ہونے سے دو سال تک یہ تمام آسانیاں بہم پہنچانے کی ذمہ داری ہوگی۔

دفعہ دوم: یہ حق تفتیش کان کنی جس کا تذکرہ دفعہ اول میں ہے اس تمام خطۂ ارض میں دیا جاتا ہے جو سپیر خریطہ میں بیان کر دیا گیا ہے۔ اور جس پر نمبر ا کا نشان ہے۔ اس کی حدود شمال مشرق میں طولاً درجہ ۳۸ سے شروع ہوتے ہیں اور عرضاً ۲۹ درجہ اور ۳۵ درجہ متعینہ ہے اور یہاں سے غرباً یہ خط خود مختار ہوتا ہے اور اس بلاد کے نشان تک جو اس وقت حکومت عربیہ سعودیہ کے قبضہ میں ہیں۔ شمالاً جہت شرق اردن ہے۔ جہت غرباً خلیج عقبہ اور بحیرۂ احمر تک اور یہاں

سے جنوباً نور البرکت تک وخطہ عرض وقائق تک۔

اس کے بعد یہ مختلف معدنیات کی تصریح ہے جو نقشہ حجاز سے متعلق ہے۔

اور جس کا معاہدہ ہے کہ معاہدہ میں حسب ذیل دو مقامات مستثنیٰ کیے گئے ہیں مدینہ منورہ ہر چہار جانب شہر پناہ ۔تیس کلو میٹر تک ۔ مکہ مکرمہ کی وہ حدود جو شرعی طور پر حرم میں داخل ہے۔

دفعہ سوم :(ا) اس معاہدے کی تاریخ نفاد سے تین ماہ کے اندر اندر اس تمام رقبہ میں کان کنی اور تفتیش کا کام شروع ہو جائے گا۔ اور اس وقت تک یہ کمپنی کام جاری رکھے گی۔ جب تک کہ قوی موانع پیش نہ آئیں۔ آلات کان کنی وغیرہ کمپنی تیس دن کے اندر اندر تاریخ نفاد سے منگا سکتی ہے۔

(ب) ۔اس معاہدے کے ہونے سے ایک سال کے ختم ہونے تک یا اس سے پہلے کمپنی اس زمین وخطے کو منتخب کرے گی ۔جہاں تک معدنیات کے نکلنے کا اغلب امکان ہو۔ نیز کمپنی کو چاہیے کہ معاہدے کے ایک سال گذرنے کے بعد جدہ میں اپنی اقامت گاہ متعین کرلے ۔

(ت) معاہدہ کے دو سال ختم ہونے تک یا اس سے پہلے کمپنی کو چاہیے کہ وہ ان مقامات اور زمینوں کو پسند کرے جنہیں وہ کان کنی کے لیے اٹھاون برس کے لیے ٹھیکہ پر لے رہی ہے تاکہ وہ خود کان کنی کرے یا اس غرض کے لیے کوئی اور کمپنی یا چند کمپنیاں بنائے۔

دفعہ چہارم :(ا) پہلے سال کے دوران کمپنی حکومت کو زر مصارفہ نہ دے گی اور اس کے لیے جس کا دفعہ سوم میں فقرہ و میں تذکرہ ہے۔

(ب) دوسرے سال کمپنی پر فدان (ایک فدان ،۴۰۴۴ مربع میٹر کا ہوتا ہے اور ایک میٹر قریباً ایک گز دو انچ کا ہوتا ہے) کا معاوضہ ۴ شلنگ اسٹرلنگ کے حساب سے سالانہ حکومت کو دے گی ۔ اگر وہ کان کنی میں دفعہ سوم کے فقرہ ب سے زیادہ کام کرے گی۔

(ت) کمپنی حکومت کو ہر فدان کے عوض میں اس زمین کے لیے جس پر وہ دفعہ سوم کے فقرہ ت کے مطابق منتخب کرے ایک گنی سالانہ دیا کرے گی۔

(ث) کمپنی حکومت کو کان کنی میں ان معادن کے قیمت کا جو برآمد ہوں پانچ فیصد ادا کرے گی۔ بشرطیکہ اس کا اوسط ہر فدان کے عوض میں ۴ شلنگ سے زیادہ ہوتا ہو۔ یعنی آخر الذکر کے حساب سے لینے میں حکومت کا فائدہ پانچ فیصدی میں ہے تو لیا جائے گا۔ ورنہ ۴ شلنگ فی فدان کے اعتبار سے لیا جائے گا۔

(ج) یہ تمام رقوم اس بنک اور اسی عملہ کی معرفت ادا کی جائیں۔ جس کو حکومت پسند کرے گی۔

(ح) قبل اس کے کہ کمپنی کسی اور کمپنی کو اپنے حقوق و منافع کسی خطۂ زمین کے متعلق عطا کرے یہ ضروری ہے کہ وہ حکومت سے استصواب کرکے اس کی منظوری حاصل کرے۔ حکومت کے لیے ضروری ہوگا کہ جب تک کافی اسباب کی بنا پر صریح نقصان اس میں نہ دیکھے تو اس کی اجازت دے دے۔

(روزنامہ "انقلاب" لاہور۔ یکم اگست ۱۹۳۵ء)

انڈیا بل کی منظوری کئی ماہ کی مسلسل بحث اور باہم گفتگو کے بعد ۲۔ اگست ۱۹۳۵ء کو گیارہ بجکر چالیس منٹ پر ملک معظم نے انڈیا بل پر مہر تصدیق ثبت کر دی

اس طرح برطانوی شہنشاہ نے اپنے نزدیک ہندوستان کو آزادی دے دی اور ایکٹ ۱۹۳۵ء کو آخری شکل میں منظور کر لیا۔

اس ایکٹ پر ۱۹۲۸ء سے برطانوی دستوری کمیشن نے اپنا کام شروع کیا تھا۔ روزنامہ "ٹیلیگراف" لندن نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ

"آج حکومت انگلستان نے موجودہ پارلیمنٹ کا سب سے اہم کام ختم کر دیا ہے۔"

ہندوستان کا نیا وائسرائے ۶۔ اگست کو سرکاری اعلان کے مطابق لارڈ ولنگڈن کی جگہ لارڈ لنلیتھگو نے وائسرائے ہند کا عہدہ سنبھال لیا۔

تحریک کا نیا موڑ

۹۔ اگست کو حکومتِ پنجاب نے اخبارات پر سے سنسر کی تمام پابندیاں ختم کر دیں اور شہید گنج تحریک کے نظر بندوں کے ذاتی الاؤنس میں اضافہ کر دیا۔ نیز ۱۳۔ اگست کو لاہور شہر میں متعین گورا فوج واپس بلالی گئی۔ اس کے ساتھ ہی گورنر پنجاب مسٹر ایمرسن اور ان کا عملہ شملہ روانہ ہو گیا۔ جبکہ پنجاب کے ریونیو ممبر خان بہادر ظفر خاں اور وزیر تعلیم ملک فیروز خاں نون دو روز پیشتر ہی شملہ جا چکے تھے۔

اس سے چار روز پیشتر ۹۔ اگست کے روزنامہ "انقلاب" میں حسب ذیل خبر شائع ہو چکی تھی:

"جنرل سیکرٹری مجلس مرکزیہ تحفظ مساجد اوقاف لاہور کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ شہدائے مسجد شہید گنج کی شاندار یادگار[1] قائم کی جائے گی اور مجروحین کی امداد کے لیے ایک متحدہ اسلامی فنڈ کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔ اس سارے پروگرام کی تفصیل کا اعلان ایک دو روز میں کر دیا جائے گا۔

ایک اور خبر: بلدیہ لاہور سے سکھوں نے درخواست کی کہ انہیں مسجد کی جگہ گوردوارہ تعمیر کرنے کی اجازت دی جائے۔"

اس پر مرکزی مجلس تحفظ مساجد نے مطالبہ کیا کہ مسلمانوں کو مزار حضرت پیر کا کو شاہ پر قبضہ کرنے کی اجازت دی جائے۔"

(روزنامہ "انقلاب" لاہور۔ ۱۴۔ اگست ۱۹۳۵ء)

مسلمانوں نے سکھوں کو مسجد پر گوردوارہ تعمیر کرنے سے روکنے کے لیے دیوانی عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا۔

تحریک مسجد شہید گنج کو بغیر کسی نتیجے کے چھوڑ کر مولانا ظفر علی خاں کے ہمراہیوں نے نیلی پوش تحریک کو پنجاب میں جنم دیا اور انتخاب کی مہم شروع کر دی۔ اس پر بھی احرار کے خلاف پروپیگنڈہ ہوتا رہا۔

روزنامہ "مجاہد" کا اجراء

روزنامہ "زمیندار" کے آئے دن کے غلط طرزِ عمل اور جھوٹی سچی خبروں نے عوام اور احرار کے مابین ایسی دراڑ پیدا کر دی تھی کہ

---

[1] ۱۹۷۰ء گزر رہا ہے۔ مگر یہ یادگار ابھی تک قائم نہ ہو سکی اور نہ ہی مجروحین کے لیے کسی اسلامی فنڈ کا قیام عمل میں آیا۔

احرار اپنا اخبار نہ ہونے کے باعث اس کا جواب نہ دے سکتے تھے۔ اس طرح ہر روز نیا سکینڈل تیار کیا جاتا۔ آخر ۹۔ اگست ۱۹۳۵ء کو مجلس احرار نے روزنامہ "مجاہد" کا اجراء کیا۔ یہ اخبار ابتداء میں ۴ صفحات پر مشتمل شائع ہونا شروع ہوا۔ ماسٹر تاج الدین انصاری اس کے چیف ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اور جواب آں غزل کے طور پر روزنامہ "زمیندار" کا جواب الجواب شروع ہوا۔ اگر "زمیندار" ایک جھوٹ شائع کرتا تو "مجاہد" چار جھوٹ بنا کر شائع کرتا۔ عوام ہر صبح اس کے منتظر رہتے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مجاہد کی اشاعت دس ہزار کے قریب پہنچ گئی۔

"مجاہد" کے اجراء کو ہنوز ایک ہفتہ بھی نہیں گذرا تھا کہ مالکانِ "زمیندار" نے مجاہد کے سامنے سپر ڈال دی۔ اور ۱۵۔ اگست کو روزنامہ "زمیندار" اور "مجاہد" کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا۔

"آئندہ دونوں اخبار ایک دوسرے کے خلاف کوئی مضمون یا ذاتی حملہ نہیں کریں گے۔"

اس معاہدے کے نیچے ماسٹر تاج الدین اور اختر علیخاں نے دستخط کیے۔

تحریکِ التواء سیاسی ضرورت کے تحت مسجد کا انہدام حکومت پنجاب اور ٹوڈی مسلمانوں کی آشاؤں کو پورا نہ کر سکا۔ کیونکہ انتخاب میں ابھی ڈیڑھ دو سال کا عرصہ باقی تھا۔ ادھر احرار رہنماؤں نے اپنی فراست سے اس سازش کو بے نقاب کر دیا۔ رہی سہی کسر ۲۸۔ جولائی کے مشترک اجلاس کی قرارداد ۳ نے پوری کر دی۔ دوسری طرف مجلس احرار کے رہنما مسٹر خالد لطیف گابا نے (۲۰۔ اگست) کو مسجد کے متعلق سنٹرل اسمبلی میں اس تحریک پر بحث کا نوٹس دے دیا کہ حکومت جواب دے۔

ا۔ "آیا شہید گنج" کے تنازعہ کے سلسلے میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لاہور نے ۲۔ جولائی کو مندرجہ ذیل اعلان اخبارات میں درج کرایا تھا۔ جو ۳۔ جولائی کے مقامی اخبارات میں شائع ہوا تھا۔

تمام ذی عقل انسانوں کو معلوم ہے کہ اگر ایسی صورتِ حال کا سدِّ باب نہ کیا جائے تو اس صورت میں فرقہ وارانہ تعلقات خراب ہو جائیں گے اور شہر میں

نقصِ امن کا شدید خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ میں اپیل کرتا ہوں کہ افواہوں کی تکذیب کے بارے میں اپنی تمام تر قوت کو صرف کریں اور فرقہ وارانہ تعلقات کو کشیدہ ہونے سے بچائیں۔ مسجد اور گوردوارہ بالکل محفوظ ہیں اور اربابِ حل وعقد اس اقدام میں مصروف ہیں کہ ایک فیصلہ ہونے تک ان کی حفاظت کی جائے۔

(ب) مسجد اور گوردوارہ کی حفاظت کے بارے میں مندرجہ بالا اقدام سے کیا چیز مراد ہے؟ جس کی حفاظت کی جائے۔

(ج) اس کا کیا مطلب ہے؟ کہ مسجد کے بارے میں ہر ممکن اقدام کے بعد ایسے حالات میں کہ حکومت اور لیڈروں کے درمیان گفت وشنید جاری تھی۔

سکھوں کی بڑی تعداد نے مسجد کو گرا دیا — آیا مقامی اربابِ حل وعقد کے حفاظتی اقدامات ناکافی تھے۔ یا انہوں نے اس بارے میں بالکل انکساری سے کام لیا ہے؟

(ح) آیا حکومت ہند مطمئن ہے کہ مقامی حکومت کے وسائل مسجد کے انہدام کے بعد اس باب میں ناکافی تھے؟

(س) آیا حکومت کی اب یہ منشا ہے کہ ہر فرقہ یا مذہب کو اختیار دے دیا جائے کہ اپنے قانونی حقوق کی آپ حفاظت کرے۔

۲۔ آیا حکومت مندرجہ ذیل سوالات کا جواب دے گی۔

حکومت ان افراد یا افسران کے نام ظاہر کرے گی؟ جنہوں نے مسجد کو حفاظتی انتظامات کے بعد (جیسا کہ ڈپٹی کمشنر لاہور کے اعلان سے واضح ہے) سکھوں کے حوالے کر دیا۔ تاکہ وہ اسے مسمار کر دیں۔

۳۔ آیا حکومت جواب دے گی؛ کہ

(ا) آیا سکھ جتھے جو لاہور میں شورش کے دوران شہر میں داخل ہوئے اور تلواروں سے مسلح تھے؟۔ آیا قانونِ اسلحہ کے تحت سکھوں کو اجازت ہے کہ وہ ایسا کریں۔؟

(ب) ۔ آیا حکومت اس امر سے آگاہ ہے کہ یہ امر مسلمانوں کے مذہبی حقوق میں شامل ہے کہ وہ اپنی حفاظت کے لیے تلوار رکھ سکیں ؟ ۔ آیا حکومت آمادہ ہے کہ مسلمانوں کو بھی ایسی سہولتیں دے ؟

ایک اور مسجد کا انہدام

وبا پھیلتی ہے تو ہوا کی طرح پھیلتی ہے ۔ سارا علاقہ اس کی لپیٹ میں ہوتا ہے ۔ اگر ماہر امراض ہمت اور تدبر سے اسے نہ روک لیں تو متعدی مرض کی طرح اس کا پھیلاؤ روکنا ناممکن ہو جاتا ہے ۔

سکھ اگر باشعور قوم ہوتی تو غیر ملکی سامراج کے ایجنٹوں کی اس سازش کی تکمیل کی بجائے مسلمانوں کا دل رکھنے کے لیے مسجد کو اسی حالت میں رہنے دیتی مگر غلاموں کا شعور اقتدار کے ہاں رہن ہوتا ہے ۔

مسجد شہید گنج کے انہدام کی صدائے بازگشت صوبہ مدراس کے ایک قصبہ دیپائے (ضلع گنٹور) میں بھی سنائی گئی ۔ جبکہ ۲۱ ۔ اگست کو علاقہ کے ہندوؤں نے اپنے کلکٹر سے شکایت کی کہ مسجد ہماری آبادی کے قریب ہے ۔ لہٰذا اسے گرا دیا جائے ۔ اس پر حکومت مدراس نے ضلعی مجسٹریٹ کو واقعہ کے متعلق رپورٹ کرنے کو کہا ۔ آخر حکومت مدراس نے مسجد کو گرانے کا حکم دیا ۔ لیکن گاؤں کے مسلمانوں نے جلدی سے ایک اجتماع میں صدائے احتجاج بلند کرنے کے ساتھ ساتھ آل انڈیا مجلس احرار اور دہلی میں جمعیۃ علمائے ہند کو برقی پیغام کے ذریعے اس حادثے کی اطلاع کر دی ۔ اس پر ۲۲ ۔ اگست کو مولانا حبیب الرحمان صدر مرکزیہ مجلس احرار اور مفتی کفایت اللہ صدر جمعیۃ علمائے ہند نے حکومت مدراس کو مشترک برقی پیغام کے ذریعے مطلع کیا ۔

"قصبہ دیپائے کی مسجد کو گرانے کا حکم فوراً واپس لے لیا جائے ۔ شکریہ"

۲۲ ۔ اگست کو گورنر مدراس نے دونوں رہنماؤں کو حسب ذیل جواب دیا ۔

"بعض غلط اطلاعات کی بنا پر علاقہ کے مسلمانوں میں اضطراب پھیل گیا تھا ۔ مسجد کا انہدام روک دیا گیا ہے ۔ یاد آوری کا شکریہ"

(روزنامہ "مجاہد" ۔ ۲۵ ۔ اگست ۱۹۳۵ء)

ڈاکٹر محمد عالم اور مسجد کی تحریک

موسم برشگال ہو تو کوڑے کرکٹ کے ڈھیر سے بھی پھول اگتے ہیں۔ دیکھتی نظروں کو یہ پھول بھلے دکھائی دیتے ہیں لیکن ان میں حقیقت نہیں ہوتی۔ ان میں نہ خوشبو ہوتی ہے نہ ان کی عمر کو دوام حاصل ہوتا ہے عوام میں مسجد کی تحریک کے برگ و بار پھیلنے لگے تو گورکن قسم کے لوگ بھی جنازے کو کندھا دینے آموجود ہوئے۔ آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر ڈاکٹر محمد عالم ایڈووکیٹ زمانہ ساز آدمی تھے۔ چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی۔ کے مطابق کانگریس سے چھلانگ لگا کر جھٹ سے مسجد شہید گنج کی تحریک میں قانون دان کی حیثیت سے شامل ہو گئے۔ یہ اگست کے آخری دنوں کی بات ہے۔ حالانکہ اس سے پیشتر ۲۹۔ جون کو کانگریس کے منتخب صدر بابو راجندر پرشاد لاہور آئے تو انہوں نے اس تحریک کو فرقہ وارانہ سمجھ کر اس میں مداخلت سے اجتناب کیا۔ جسے خود کانگریس کے کارکنوں نے بھی محسوس کیا۔ مگر جھوٹی شہرت کے خواہش مند اصول اور ضابطے کی تمام طنابیں توڑ کر اس راہ پر چل نکلے جو بالآخر ان کی سیاسی موت پر جا کر ختم ہوئی۔

سکھوں کی انوکھی تحریک

مجلس احرار کی مساعی پر پنجاب کے پانچ اضلاع کے علاوہ باقی ضلعوں میں بھی مسلمانوں کو تلوار رکھنے اور عام لے کر چلنے کی اجازت تھی۔ اس پر سکھوں کا مذہبی طبقہ اس قدر برہم ہوا کہ ۲۰۔ اگست کو اکالی دل نے سکھوں کو حکم دیا کہ وہ آئندہ سے اپنے پاس دو کرپانیں رکھیں۔ اگر اس پر گرفتار ہو جائیں تو پھر اس پر سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی جائے۔ چنانچہ گرفتاریاں شروع ہو گئیں لیکن ایک ماہ کے بعد سکھوں نے یہ تحریک واپس لے لی۔

حکومتِ ہند کا اعلان

اقوام ہند کی حالت یہ تھی کا جب حکومت یہ تماشہ دیکھ چکی۔ تو ۳۰۔ اگست کے اخبارات کے ذریعہ دفعہ ۲۹۵ کے تحت اعلان کیا کہ:

"جو شخص کسی کی عبادت گاہ یا ایسی چیز کو جو کسی فرقے کے نزدیک متبرک سمجھی جاتی ہو، اس نیت سے نقصان پہنچائے یا اس کی بے حرمتی کرے کہ جس سے کسی فرقے کی مذہبی توہین ہو۔ یا سے علم ہو کہ اس کے انہدام سے

کسی فرقے کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچے گی۔ اُسے دو برس قید کی سزا دی جائے گی یا جرمانہ یا دونوں سزائیں دی جاسکتی ہیں۔

بساطِ شہید گنج پر نیا مُہرہ پنجاب میں انگریزی عملداری کے بعد دو طبقوں کا یہاں کے عوام پر زیادہ اثر رہا۔ سیاسی طور پر اُمراء، اور مذہب کے نام پر پیرانِ عظام اپنا لوہا منواتے رہے۔

پہلی جنگِ عظیم میں آخرالذکر گروہ نے اپنے پیروؤں کے علاوہ تعویذ گنڈوں سے بھی انگریز کو اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ آج بھی پنجاب کے جذبات پر یہی لوگ قابض ہیں۔ باشعور لوگوں نے کبھی ان کے چنگل سے رہائی چاہی تو انہیں انگریز کا باغی یا وہابی کہہ کر قابلِ تعزیر قرار دے دیا گیا۔

شہید گنج تحریک کے سفلی جذبات اُت پڑنے لگے، تو پرانے شکاری نئے جال لے کر آن دھمکے۔ یعنی یکم ستمبر کو راولپنڈی میں پیر جماعت علی شاہ علی پوری کی صدارت میں حصولِ مسجد کے لیے نیا پروگرام وضع کیا گیا اور انہیں امیرِ ملت کا خطاب دیا گیا اس اجتماع میں سول نافرمانی کی تجویز پاس کی گئی۔ رضاکاروں کی بھرتی اور فراہمی فنڈ کا بھی اعلان کیا گیا۔ لیکن احرار کو اس اجلاس میں شرکت کی دعوت نہیں دی گئی۔ اس پر ۱۵ ستمبر کے روزنامہ "انقلاب" لاہور نے حسبِ ذیل ادارتی نوٹ لکھا:

"یہ معلوم کر کے ہمیں بہت رنج ہوا کہ راولپنڈی کانفرنس کے کارکنوں نے احرارِ اسلام کو اپنے مشوروں میں شرکت کی دعوت نہیں دی تھی۔ ہمارے نزدیک یہ ایک بہت بڑی فروگزاشت ہے۔

مجلسِ اتحادِ ملت کے کارکن تو کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے شروع مجلس کے وقت بھی بزرگانِ احرار کا تعاون طلب کیا اور اس کے بعد اپنے اجلاسوں اور اعلانوں کے وقت انہیں اطلاع دیتے رہے۔ شریک ہونا نہ ہونا ان کا اپنا فعل ہے۔ لیکن راولپنڈی کانفرنس کے کارکنوں کی یہ غفلت درحقیقت قابلِ ملامت اور چودھری افضل حق کا یہ قول صحیح ہے کہ مجلس احرار اخلاقی طور پر راولپنڈی

کانفرنس کی قرارداد کی پابند نہیں۔

کمزور عقیدے کا مسلمان سیاسی شعور سے ہمیشہ بیگانہ رہا۔ رؤساکی اخلاقی کمزوریوں سے واقفیت کے باوجود غربت اور سیاسی دباؤ نے اسے چپ رہنے پر مجبور کیے رکھا۔ اس پر غیر ملکی غلامی کے بوجھ نے اس کے دماغی کل پرزے بیکار کر دیے۔ اس تہری غلامی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر شعبدہ باز نے انہیں اپنی ضرورت کے سانچے میں ڈھال لیا۔ سید جماعت علی شاہ صوفی منش آدمی تھے اور اپنے حلقہ اثر میں محترم بھی۔ لیکن انہیں سیاسیات کی خارزار وادی میں گھسیٹ لانا ان پر ظلم کرنا تھا۔ مگر سیاسی طالع آزماؤں کے قربان جائیے کہ ایک درویش کو قمار بازوں میں لا بٹھایا۔

راولپنڈی کے اجتماع میں دو روز تک یہ بحث رہی کہ حصولِ مسجد کے لیے سول نافرمانی فوراً کی جائے یا بدیر۔ آخر ہاؤس نے یہ اختیار پیر جماعت علی شاہ کو دے دیا کہ وہ جب مناسب سمجھیں۔ اس پر پیر صاحب نے بات ۲۰ ستمبر پر ٹال دی۔

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے روزنامہ "انقلاب" نے ۷ ستمبر کی اشاعت میں ان رہنماؤں سے گذارش کی کہ وہ سول نافرمانی کی بجائے باہم اتحاد کی کوشش کریں۔ کیونکہ قومیں جنگ سے کم اور اتحاد سے زیادہ مضبوط ہوتی ہیں۔

یہ مفادِ عامہ کے خلاف ہے

مسٹر خالد لطیف گابا نے ۲۰ اگست کو اسمبلی میں جس تحریکِ التوا کا نوٹس دیا تھا۔ ۴ ستمبر کو اس پر بحث کی اجازت دے دی گئی۔ لیکن اس کے جواب میں وائسرائے ہند نے کہا:

"اس پر بحث مفادِ عامہ کے خلاف ہے"۔

پنجاب میں مسلمانوں کو تلوار رکھنے کی مکمل اجازت ملنی چاہیے

۷ ستمبر کو مولانا مظہر علی اظہر سیکرٹری آل انڈیا مجلسِ احرار اور خواجہ محمد یوسف ایم اے ایل سی (لدھیانہ) نے پنجاب کونسل کے آئندہ اجلاس کے لیے حسبِ ذیل قرارداد کا نوٹس دیا۔

"یہ کونسل حکومت سے سفارش کرتی ہے کہ پنجاب کے باقی اضلاع میں جہاں

مسلمانوں کو تلوار رکھنے کی تاحال اجازت نہیں دی گئی۔ تلوار کو قانونِ اسلحہ کے عمل سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔"

یوم شہید گنج

ملک لال دین قیصر سیکرٹری تحفظِ مساجد نے اعلان کیا کہ ۲۰۔ ستمبر کو یوم شہید گنج منایا جائے۔ لیکن اس پروگرام میں سول نافرمانی کی تحریک شامل نہیں اس روز کے اخبار انقلاب لاہور (۱۱۔ ستمبر ۱۹۳۵ء) میں پندرہ وُکلاء کی طرف سے اعلان شائع ہوا: کہ

"عنقریب مسجد شہید گنج سے متعلق قانونی کارروائی شروع کر دی جائے گی۔"

تلوار رکھنے کی اجازت

شملہ۔ ۱۱۔ ستمبر پنجاب حکومت کی طرف سے مندرجہ ذیل کمیونک شائع ہوا۔

"۱۹۳۲ء میں حکومتِ پنجاب نے یہ پالیسی اختیار کی تھی کہ قانونِ اسلحہ ہند کے تحت تلوار پر جو پابندیاں عائد ہیں ان کو رفتہ رفتہ کم کر دیا جائے۔ مثلاً بعض جاگیرداروں، پچاس روپیہ یا پچاس روپے سے زائد لگان ادا کرنے والوں، انکم ٹیکس افسروں کو تلوار رکھنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ اس سال جولائی کے مہینے میں پنجاب کے نو اضلاع میں قانونِ اسلحہ کی دفعہ ۱۳ اور ۱۵ کے تحت تلوار کو مستثنیٰ قرار دے دیا تھا۔ نومبر ۱۹۲۸ء میں پانچ اضلاع۔ مئی ۱۹۳۰ء میں پانچ اور اضلاع کو اس فہرست میں شامل کر دیا گیا اور اب صورتِ حال یہ ہے کہ پنجاب کے ۲۹ اضلاع میں سے ۲۲۔ اضلاع ایسے ہیں جہاں تلوار کو قانونِ اسلحہ سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ضلع فیروزپور، لاہور، امرتسر، گوڑگاؤں، راولپنڈی میں ان خاص اضلاع کو مستثنیٰ قرار دے دیا گیا ہے۔

قانونِ اسلحہ کے تحت سکھوں کو کرپان رکھنے کی اجازت ہے۔ چند سال ہوئے ہائیکورٹ پنجاب نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ جس وقت تلوار کسی سکھ کے پاس ہو گی تو اسے کرپان ہی کہا جائے گا۔ چنانچہ متعدد چھ اضلاع میں بھی سکھوں کو وہ امتیاز حاصل رہا جس سے باقی قومیں محروم تھیں۔ یا جس طرح سکھ تلوار

رکھتے تھے۔

حکومت پنجاب نے حکومت ہند سے یہ درخواست کی تھی کہ اس امتیاز کو ہٹا دیا جائے۔ چنانچہ ان چھ اضلاع میں تلوار کو قانون اسلحہ کی دفعات سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔

مولانا احمد علی لاہوری کا بیان

پنجاب میں جیسے ہی حکومت نے اسلحہ (تلوار) سے پابندی اٹھائی۔ غیر مسلموں کی طرف سے اچھی خاصی ہنگامہ آرائی ہوئی۔ چنانچہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ" [1] نے لکھا کہ اسلام نے مسلمانوں کو تلوار لے کر چلنے کی کہیں اجازت نہیں دی اور نہ ہی اس قسم کا کوئی دوسرا حکم دیا ہے۔

اس پر ۳ ستمبر ۱۹۲۵ء کے روزنامہ "انقلاب" نے اپنے اداراتی نوٹ میں لکھا:

"سول اینڈ ملٹری گزٹ نے تلوار رکھنے کے ضمن میں عالم دین بننے کی کوشش کی ہے اور کہا ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کو تلوار باندھنے کا حکم نہیں دیا ہے۔ ہمارے خیال میں "سول اینڈ ملٹری گزٹ" اور دوسرے غیر مسلم اخباروں کا شریعتِ اسلامی کے متعلق اس قسم کی غلط بیانی کرنا صریحی خلاف ورزی اور مداخلت فی الدین ہے۔ علمائے اسلام کو چاہیے کہ تلوار کے متعلق تمام دینی احکام مسلمانوں، غیر مسلموں اور حکومت کے خداوندوں کی اطلاع کے لیے شائع کریں۔"

روزنامہ "انقلاب" کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے۔ حضرت مولانا احمد علی لاہوری نے ۱۰ ستمبر ۱۹۲۵ء کو حسب ذیل بیان دیا۔

"ہمیں روزنامہ "انقلاب" کی رائے سے پورا اتفاق ہے کہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ" کا یہ کہنا کہ اسلام میں مسلمانوں کو تلوار رکھنے کا کہیں حکم نہیں، اسلام کے متعلق افتراء ہے۔ اور "سول اینڈ ملٹری گزٹ" کا تعلیم اسلام سے ناواقف ہونے کا بیّن ثبوت ہے۔ فقط تلوار نہیں بلکہ مسلمانوں پر فرض ہے کہ اپنے وقت

---

[1] "سول اینڈ ملٹری گزٹ" لاہور کا انگریزی روزنامہ تھا جسے لندن کی ایک لمیٹڈ فرم چلا رہی تھی البتہ اس میں کچھ ہندوستانی حصہ دار بھی تھے جن میں سردار بلدیو سنگھ جو بعد میں یونینسٹ گورنمنٹ میں سکھوں کے نمائندے ہو کر وزیر بنے دوسرے دہلی کے ڈالمیا تھے۔

کے تمام ہتھیاروں سے مسلح رہیں۔

جیسے کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝ (قرآن مجید سورۃ الانفال رکوع ۸)

ترجمہ: دشمنوں (کے شر سے محفوظ رہنے) کے لیے جتنی قوت (یعنی ہتھیار) ممکن ہو سکے اور پلے ہوئے گھوڑے تیار رکھو کہ اس سے اللہ کے دشمنوں اور تمہارے دشمنوں پر دھاک پڑے اور ان کے سوا دوسروں پر جنہیں تم نہیں جانتے اللہ انہیں جانتا ہے۔ اور اللہ کی راہ میں (یعنی فراہمی سامان و اسلحہ) جو کچھ تم خرچ کرو گے وہ تمہیں پورا ملے گا۔ اور تمہارا حق رہ نہیں جائے گا۔ انتہی۔

اس کی تائید مفتی کفایت اللہ صدر جمعیۃ علمائے ہند دہلی۔ مولانا احمد سعید ناظم جمعیۃ علمائے ہند دہلی، مولانا حسین احمد مدنی صدر مدرس دارالعلوم دیوبند، قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند، مولانا عزیز الدین خطیب شاہی مسجد لاہور، مولانا عبدالعزیز خطیب جامع مسجد گوجرانوالہ، مولانا محمد چراغ مدرسہ انوار العلوم گوجرانوالہ، مولانا محمد شریف مدرس مسجد فتح پوری دہلی۔ مولانا عبدالحنان اور دوسرے علمائے حق نے کی۔

احرار کو دعوتِ مباہلہ

احرار کو مخالفین کے نرغے میں دیکھ کر مرزا بشیر الدین محمود کو گمان ہوا کہ زخمی شیر پر اگر مزید حملہ کر دیا جائے تو ہمارا راستہ صاف ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ۳ ستمبر ۱۹۳۵ء کے اخبار "الفضل" میں مجلسِ احرار کو قادیان میں مباہلہ کی دعوت دے دی گئی۔ جسے احرار نے فوراً قبول کر لیا۔ اور ۱۳ ستمبر کو قادیان پہنچنے کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کا شائع ہونا تھا کہ قادیانیوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ اور لگے اپنے آباؤ اجداد کو پکارنے کہ دیکھو جی! احرار والے پھر قادیان میں فساد کرنے آ رہے ہیں۔ حالانکہ خود ہی آنے کی دعوت

دی اور خود ہی واویلا کرنے لگے۔ اب انہیں یقین ہوگیا کہ وہ جس شیر کو مردہ یا گھائل سمجھ رہے تھے، وہ ان کے لیے زندہ ہے۔

مجلس احرار نے مولانا مظہر علی اظہر کو قادیان پہنچ کر بشیر الدین محمود سے مباہلہ کے لیے نامزد کیا اور روزنامہ مجاہد کی ہر اشاعت میں اس تاریخ کو قادیان جانے کا اعلان ہونے لگا۔ پنجاب کے دیگر شہروں سے احرار رضاکار قادیان جانے کی تیاری کرنے لگے۔ ۱۹۳۴ء کی طرح حکومت تماشائی بن کر خاموش رہی۔ کیونکہ اب تو مرزائی لیڈر نے خود ہی احرار کو قادیان آنے کی دعوت دی تھی۔

تاریخ مقررہ پر مولانا مظہر علی اظہر بمعہ اپنے رفقاء جن میں صاحبزادہ فیض الحسن سجادہ نشین آلو مہار، مولانا محمد حیات، حاجی عبدالرحمٰن میونسپل کمشنر بٹالہ، ماسٹر تاج الدین انصاری، خواجہ عبدالرحیم عاجز اور راقم شامل تھے۔ قادیان پہنچے۔ ریلوے اسٹیشن پر مولانا عنایت اللہؒ نے سینکڑوں مسلمانوں کے ساتھ مہمانوں کو خوش آمدید کہا۔ نماز جمعہ صاحبزادہ صاحب نے پڑھائی۔ اس سے پیشتر محترم عاجز صاحب اور راقم کے کفر شکن کلام نے قصر قادیان میں دراڑ ڈال دی۔ دوسرا اجلاس نماز عصر کے بعد ہوا۔ جس میں مولانا مظہر علی اظہر نے حسب ذیل تقریر کی:

> "حضرات! آج میں آپ کے سامنے اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ قادیان کی سرزمین میں جہاں مرزا محمود کے ابا نے نبوت کا دعویٰ کیا اور جس جگہ قرآن مجید کے مقابلہ میں بقول مرزا محمود نیا قرآن نازل ہوا اس کے ابا پر۔ وہ پرانا ہو چکا ہے، جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا۔ وہی قرآن قادیان میں دوبارہ نازل ہوا۔ میں مرزا محمود کے اس چیلنج کا جواب دوں، جو اس نے اپنے ابا کی نبوۃ کو سچا ثابت کرنے کے لیے مجلس احرار کو کیا ہے۔
>
> میرے ہاتھ میں اس وقت ۳۔ ستمبر ۱۹۳۵ء کا "الفضل" موجود ہے جس میں مرزا محمود کا چیلنج مباہلہ شائع ہوا ہے۔ اسے شروع سے آخر تک پڑھ جائیے۔ اس میں کہیں بھی مرزا محمود نے یہ نہیں کہا کہ میں خود مباہلہ میں نکلوں

گا۔ بلکہ کہا ہے کہ ہم میں سے پانچ سو یا ہزار مقابلے کے لیے آئیں گے۔ حالانکہ قرآن مجید میں کسی جگہ نہیں آیا کہ مباہلہ کے لیے پانچ سو یا ہزاروں کی تعداد ہونا ضروری ہے۔ اگر مرزا محمود کو احکام قرآنی کے منشاء سے آگاہی ہوتی تو یہ ہرگز نہ کہتا کہ پانچ سو یا ہزار مباہلہ کے لیے نکلیں گے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب نجران کے عیسائی وفد کو مباہلہ کے لیے بلایا تھا۔ اس وقت کسی مقررہ بڑی تعداد کی شرط نہیں لگائی تھی۔

یہ بات احرار کے حصے میں آئی ہے کہ جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پرانے عیسائیوں کو آیۂ مباہلہ کے ذریعے مباہلہ کا چیلنج دیا تھا اسی طرح ہم بھی آج ان نئے مسیحوں یعنی قادیانیوں کو یاد دلاتے ہیں کہ مباہلہ کے بارے میں حکم قرآنی یہ ہے کہ آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلاتے ہیں، تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ ہم اپنی عورتوں کو بلاتے ہیں، تم اپنی عورتوں کو بلاؤ۔ ہم اپنے نفسوں کو بلاتے ہیں، تم اپنے نفسوں کو بلاؤ۔ پھر ہم مباہلہ کریں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت بھیجیں۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ ہم میں سے جس کو زیادہ سے زیادہ بدعقیدہ یا بدعمل خائن یا غدار سمجھے اس کو مباہلہ کے لیے بلا لے۔ وہ شیعہ ہو یا سنی۔ بریلوی ہو یا دیوبندی، حنفی ہو یا اہلحدیث وہ اسی طرح اپنے خاندان کو میدان مباہلہ میں لے کر نکلے گا۔ جس طرح حضرت نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) حضرت امام حسینؓ کو گود میں لیے ہوئے اور حضرت حسنؓ کو انگلی سے لگائے ہوئے اور جناب فاطمۃ الزہراؓ، اور حضرت علیؓ شیر خدا کو پیچھے پیچھے ہمراہ لیے ہوئے وفد بنو نجار کے مقابلے میں مباہلہ کے لیے نکلے۔

ہم یہ جانتے ہیں اور ہم کو معلوم ہے کہ عام قادیانی تمہارے فریب میں آئے ہوئے ہیں۔ لیکن اگر دانستہ جھوٹے دعوے کرنے کا الزام ہے تو تمہارے ابا مرزا غلام احمد پر ہے۔ جس نے اللہ اور اس کے رسولؐ پر افترا کیا۔ یا تم پر ہے جو الہام و وحی کو پیش گوئیوں کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کرتے ہو۔ اس

۔ لیے اگر تم میں حوصلہ ہے کہ میدان مباہلہ میں اپنے اور اپنے آبا کے دعووں کی تائید کر سکو تو خود میدانِ مباہلہ میں آؤ اور اپنے خاندان کو ساتھ لاؤ۔ یہ مناسب نہیں کہ اپنے فریب خوردہ پیروؤں کے کندھے پر رکھ کر بندوق چلاؤ اور خود گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر دوسروں کا تماشہ دیکھو۔ ہم میں سے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو، مولانا سید داؤد غزنوی کو، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کو، مجھ کو یا چودھری افضل حق، جس کسی کو تم چاہو۔ انشاء اللہ تعالیٰ ہم میں سے ہر ایک بلا تامّل آیاتِ قرآنی کی تعمیل کرتا ہوا، تمہارے مقابلہ میں میدانِ مباہلہ میں نکل آئے گا۔

لیکن اس امر کو واضح کرنے کے لیے ہم کسی صورت میں بھی مباہلہ سے گریز نہیں چاہتے۔ اور مرزا محمود کو ہی گریز کا موقعہ دینے کے لیے تیار ہیں۔ میں صاف اور صریح، غیر مبہم الفاظ میں کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اگر مرزا محمود پانچ سو اور ہزار تو کیا اگر وہ پانچ ہزار یا دس ہزار آدمیوں کو لانے کی شرط پر بھی احرار کو مجبور کرے تو ہم اس تعداد کو بھی پورا کرنے کی ذمہ داری لیتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ آدمی میدانِ مباہلہ میں پیش کر دیں گے۔ ہم مرزا محمود احمد کو کوئی موقعہ دینا نہیں چاہتے کہ وہ مباہلہ سے پہلوتہی کر سکے۔

مرزا محمود نے اپنی تقریر میں بہت سی باتیں کہی ہیں۔ لیکن میں فقط اس مضمون کے متعلق اظہارِ خیال کروں گا، جو مباہلہ کے متعلق ہیں یا جس کا تعلق مجلس احرار سے ہے۔ دوسرے امور کے متعلق میرے پاس نہ فرصت ہے نہ میں تبصرہ کروں گا۔ مگر یہ نہ سمجھا جائے کہ میں باقی تمام خیالات میں مرزا محمود کا ہم خیال ہوں"۔

(روزنامہ "مجاہد" لاہور۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۳۵ء)

احرار کی اس جرأت پر مرزائی پریشان ہوئے۔ انہیں یقین تھا کہ احرار تحریک شہید گنج میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ وہ ہمارے چیلنج کو قبول نہیں کریں گے۔ لیکن احرار نے بھی بڑے کو اس کے گھر تک پہنچا کے چھوڑا۔

امیرِ ملّت کا خطاب

تحریک شہید گنج کے امیر منتخب ہونے کے بعد پیر جماعت علی شاہ صاحب نے ۱۵۔ ستمبر کو پہلی مرتبہ لاہور میں ہزارہا عوام سے خطاب کرتے ہوئے کہا :۔

" انگریز کو ہمارے ملک میں آئے ہوئے چھیاسی سال کا عرصہ ہو چکا ہے۔ اس عرصے میں مسلمانوں کی ایک درخواست بھی منظور نہیں کی گئی۔ ہم نے حکومت سے ہمیشہ وفاداری کی اور کسی قسم کی بغاوت نہیں کی اور نہ ہم ایسا کرنا چاہتے ہیں۔ ہم نے حکومت کی خاطر اپنے ترک بھائیوں پر گولیاں چلائیں اور انگریزوں کو فتح دلائی، جس کا بدلہ ہمیں اس صورت میں دیا جا رہا ہے کہ ہماری مسجدوں کو گرایا جاتا ہے۔

بادشاہ والد کی جگہ اور رعیت بجائے اولاد ہوتی ہے۔ آج تک کسی باپ نے بیٹے کا گلہ نہیں کاٹا۔ جو باپ ہو کر بیٹے کا گلہ کاٹے وہ بادشاہ نہیں ہوتا۔"

(روزنامہ "انقلاب" لاہور ۱۷ ستمبر ۱۹۳۵ء)

امیرِ شریعت اور امیرِ ملّت

تن آسان قومیں ہمت اور ایمان کے ساتھ حافظہ بھی کھو بیٹھتی ہیں۔ آباؤ اجداد کی حقیقت ان کے لیے داستانِ پارینہ بن کے رہ جاتی ہے۔ یہیں سے قوموں کے زوال کی ابتدا ہوتی ہے۔ جنگجو قومیں مرغ اور بٹیروں کی پالیا سجھانے لگتی ہیں اور پھر ———— پھر غرقِ مے ناب آخر۔ ؎

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر
(اقبال)

تختِ طاؤس کے وارث جب محفلِ ناؤ نوش سجا بیٹھے تو ہزاروں میل سے چل کر آنے والی فرنگی قوم نے انہیں اپنے حصار میں لے لیا۔ پھر انہیں یاد نہ رہا کہ ہم کون تھے؟ صدیوں کی حقیقت افسانوں کے تول تلنے لگی۔ اور یہی لوگ خواب میں بڑبڑانے لگے۔ ؎

یہ سنے اُونچے اُونچے جو کوٹ تھے وہ ہیں اب زمیں سے ملے ہوئے
وہاں اُلّو آ کے ہیں بولتے، جہاں باز پَر نہ ہلا سکے

۱۹۳۰ء انگریزی سامراج کے خلاف جہاد کا بھرپور سال تھا۔ غلامی سے نجات کے لیے جذبات کی بھٹیاں آگ اگل رہی تھیں۔ متحدہ ہندوستان کی سرزمین غیر ملکی قدم اکھاڑنے میں فولاد کا دل لیے بیٹھی تھی۔ اہل ایمان کے دل فرنگی ظلم و جور کے سامنے سینہ سپر تھے۔ جہاد کی اس صف میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری بھی تھے کہ انہیں لاہور میں جمع پانچ صد علمائے حق نے، جن میں حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیریؒ، حضرت لاہوریؒ اور مولانا ظفر علی خاں شریک تھے امیر شریعت کا اعزاز بخشا۔ ظفر علیخاں نے اسی خوشی میں کہا۔ ؎

کانوں میں گونجتے ہیں بخاری کے زمزمے
بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسولؐ میں

پانچ برس بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ اپنے مندرجہ بالا فیصلے کے خلاف بغاوت کردی اور امیر شریعتؒ (جنہوں نے ہمیشہ انگریز سے جہاد کیا) کا دامن چھوڑ کر پیر جماعت علی شاہ کو امیر ملت منتخب کر لیا، جنہوں نے انگریزوں کی وفاداری کا یوں اظہار کیا:

"ہم نے اپنے ترک بھائیوں پر وقت کی حکومت کی خاطر گولیاں چلائیں اور انگریزوں کو فتح دلائی۔"

پھر مولانا ظفر علیخاں کے حافظے کی موت کہیے یا تلوّن کی انتہا کہ اتنا بھی یاد نہ رہا کہ وہ امیر شریعت کے متعلق کہہ چکے ہیں۔ ؎

کانوں میں گونجتے ہیں بخاری کے زمزمے
بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسولؐ میں

امیر ملت کا دامن تھامتے ہی کہنا شروع کر دیا۔ ؎

پانچ ٹکوں کا ہے پابند شریعت کا امیر
اس میں طاقت ہے تو کرپان کی جھنکار سے ہے

("نگارستان" ص۱۶۷ مجموعہ کلام مولانا ظفر علیخاں)

ایسے تلوّن مزاج لوگوں کے لیے غالب مرحوم نے کہا ہے۔ ؎

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ — پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

مرکزی مجلس احرار کی عاملہ کا اجلاس

۱۶ ستمبر کو لاہور میں مرکزی مجلس احرار کی مجلس عاملہ کی مشاورت کا اجلاس ہوا، جس میں مسجد شہید گنج کے انہدام پر سکھوں کی مذمت کی گئی اور حکومت کی متشددانہ پالیسی کی بھی مذمت کی گئی۔ اور اس امر پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا کہ تمام مسلم جماعتوں نے سول نافرمانی کا فیصلہ نہیں کیا۔

حکومت کو مشورہ دیا گیا کہ وہ تمام نظربندوں اور قیدیوں کو فوراً رہا کر دے اور شہداء کے پس ماندگان کو معقول معاوضہ دے۔ نیز مجلس عاملہ احرار کو ہدایت کی گئی کہ وہ مسجد شہید گنج کے متعلق سکھوں سے کسی باعزت سمجھوتے کے لیے گفت و شنید جلد سے جلد شروع کرے اور اس کے نتیجے سے مسلمانوں کو آگاہ کرے۔ نیز ماتحت مجالس کو ۲۰ ستمبر کے یوم شہید گنج کے اجتماع میں پرامن شرکت کی اجازت دی گئی۔ اس کے ساتھ ہی مجلس مشاورت نے مسلمانوں کو خبردار کیا کہ وہ مسجد شہید گنج کے سلسلے میں مرزائیوں کا کسی قسم کا تعاون قبول نہ کریں کیونکہ یہ مسلمانوں کا آپس کا معاملہ ہے۔ غیر مسلموں کو اس میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔

سکھوں کے خلاف دعویٰ

۱۸ ستمبر کو لاہور میں مسجد شہید کرنے کے سلسلے میں دفعہ ۲۹۵ کے تحت سکھوں پر ڈاکٹر محمد عالم ایڈووکیٹ اور لدھیانہ کے وکیل میاں عبدالحئی کی طرف سے عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا گیا۔

یوم شہید گنج

۲۰ ستمبر کو لاہور شاہی مسجد میں پیر جماعت علی شاہ کی صدارت میں یوم شہید گنج پر سب سے بڑا اجتماع ہوا جس میں دو لاکھ کے قریب مسلمان یکجا ہوئے۔ اس میں تمام سیاسی جماعتوں نے شرکت کی۔ احرار رہنما، وکلاء اور صحافی بھی شریک ہوئے۔ مسلمانوں نے بازوؤں پر سیاہ پٹیاں باندھ رکھی تھیں۔ عوام کا تاثر تھا کہ اس جلسے میں حصول مسجد کے لیے کوئی بڑا فیصلہ کیا جائے گا لیکن چار گھنٹے کے اجلاس میں کسی ایک مقرر نے اس خیال کی تائید نہیں کی۔ جس نے کہا یہی کہا کہ مسجد مفاہمت سے یا قانونی چارہ جوئی سے مل سکتی ہے۔

حبشہ کی جنگ

ان دنوں اٹلی اور ابی سینیا کے درمیان جنگ کے امکان ہر روز بڑھتے جا رہے تھے۔ اٹلی کے ڈکٹیٹر موسولینی نے تجاویز کو ٹھکرا دیا تھا اور اقوام متحدہ کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔

اس وقت یورپ نازک ترین دور سے گذر رہا تھا۔ اور خطرہ تھا کہ دوسری جنگ عظیم کے حالات پیدا نہ ہوجائیں۔ اطالوی کابینہ نے بھی تمام تجاویز کو ناقابل قبول قرار دیا۔

اس طرح برلن کے سرکاری حلقے اطالیہ کے فیصلے پر سخت متعجب ہو رہے تھے۔ ۲۱۔ ستمبر کو ہٹلر نے اعلان کیا کہ میرے وزراء اس بات پر غور کریں گے کہ فرانس کا وزیراعظم موسیو دال کب تک برطانیہ کی پشت پناہی کرتا رہے گا۔ تاہم اس بات کا آخری فیصلہ موسولینی کے جواب پر منحصر ہے۔

لیگ آف نیشنز کی تجاویز کو ابی سینیا نے منظور کر لیا تھا۔ لیکن اطالیہ نے اسے قبول نہ کیا۔ اطالیہ کے چار مطالبات تھے۔

۱۔ حبشہ کو غیر مسلح کر دیا جائے۔ ۲۔ اور سمندر تک پہنچنے نہ دیا جائے۔

۳۔ ابی سینیا کی افواج کو غیر مسلح کر دیا جائے۔

۴۔ اطالیہ کو ابی سینیا کے علاقے کی ایک پٹی دے دی جائے۔

یہ ۲۶۔ ستمبر کے اخبارات کی خبر تھی۔

احرار کی تاریخ کا مختصر اجتماع

امیر ملت نے بحیثیت پنجاب کے ایک مقتدر پیر کے برطانوی حکومت کو اپنی دیرینہ خدمات کا واسطہ دے کر منوانا چاہا۔ راولپنڈی کے اجلاس میں کوئی لائحہ عمل سامنے نہ آیا، تب حالات واضح ہو کر سامنے آ گئے۔ گمراہی کے تمام بادل چھٹ گئے۔ حقیقت کا سورج دھوپ دینے لگا۔ اپنے اور پرائے یہ بات جان گئے کہ مسجد کا کوئی قضیہ نہیں، صرف احرار کی بڑھتی ہوئی طاقت کو کمزور کرنا مقصود ہے تو احرار اپنی عسکری قوت سمیت سامنے آ گئے۔

۲۴ ستمبر رات نو بجے دہلی دروازہ کے باغ میں اپنا جلسہ کر کے صاف بات کہہ دینے کا فیصلہ کیا۔ اس جلسہ میں عوام کی تعداد پچاس ہزار کے قریب تھی۔ احرار کے لٹھ بند رضاکار جلسہ کے اردگرد موجود تھے۔ مسلح پولیس بھی کافی تعداد میں تھی۔ مخالفین بھی پوری طاقت سے موجود تھے۔ اسٹیج پر مولانا داؤد غزنوی، مولانا مظہر علی اظہر، چودھری افضل حق اور دیگر مقامی احرار رہنما موجود تھے۔ لیکن اس جلسے میں صرف صدر مرکزیہ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے

اپنی زندگی اور احرار کی تاریخ کی مختصر تقریر میں کہا:

"میں مسجد شہید گنج گرانے کی تمام تر ذمہ داری حکومت پر ڈالتا ہوں۔ اگر حکومت چاہے تو مسجد صبح نمودار ہونے سے پہلے مل سکتی ہے۔ اگر حکومت مجھے گرفتار کرلے تو میں قید ہونے کو تیار ہوں تاکہ بات صاف ہو جائے۔ مسجد کا ملنا نہ ملنا حکومت کی مرضی پر منحصر ہے۔

باقی بات میں عدالت میں کروں گا اور ثابت کروں گا کہ مسجد کے گرانے میں حکومت کا کیونکر ہاتھ ہے۔ حکومت اگر مجھے گرفتار کرنا چاہے تو میں اپنے دفتر میں اس کا انتظار کروں گا۔"

یہ آخری فقرہ کہہ کر جلسہ برخاست کر دیا۔ مخالفین منہ تکتے رہ گئے، جو جلسے کو خراب کرنے کا منصوبہ لے کر آئے تھے۔

مولانا حبیب الرحمٰن رات دو بجے تک پولیس کا انتظار کرتے رہے۔ لیکن کوئی نہ آیا۔

تلوار کے متعلق حکومت پنجاب کا اعلان

شملہ ۲۸ ستمبر سرکاری اعلان مظہر ہے کہ:

"حکومت پنجاب کی سفارش پر حکومت ہند نے حال ہی میں ایک اعلان کیا تھا کہ حدود پنجاب میں تلواریں قانون اسلحہ کی دفعات ۱۳ اور ۱۵ سے مستثنیٰ ہوں گی۔ معلوم ہوتا ہے کہ بعض حلقوں میں تلواریں بنانے اور فروخت کرنے کے متعلق کچھ غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے۔

قانون اسلحہ کی دفعات ۱۳ اور ۱۵ جن کا ذکر حکومت کے سابق اعلان میں تھا۔ سامان حرب کو قبضہ میں رکھنے اور لے جانے کے متعلق ہیں۔ پنجاب کے طول و عرض میں تلواریں اجازت نامہ حاصل کیے بغیر بھی لے جائی جا سکتی ہیں تلواریں بنانے اور بیچنے کے متعلق جو قواعد ہیں، جدید اعلان سے ان پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ جو قانون اسلحہ ۱۹۲۴ء کے قاعدہ ۲۸ اور دفعہ ۵ کے ماتحت ہیں۔ تلواریں بنانے اور بیچنے کے لیے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے اجازت حاصل...

ضروری ہے۔

حکومت کے اعلان کی توضیح: سول اینڈ ملٹری گزٹ کے نمائندے نے ان شکوک وشبہات کے ارتفاع کے لیے جو تلواروں کے متعلق حکومت کے اعلان کے بعد عوام میں پیدا ہو سکتے ہیں تحقیق کی۔ اس کے نتیجہ میں ایک ماہر قانون نے حسب ذیل رائے ظاہر کی۔

حدودِ پنجاب کے اندر تلواروں کو قبضہ میں رکھنا اور ان کو استعمال کے لیے لے جانا قانونِ اسلحہ سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ لیکن شمشیر سازی اور شمشیر فروشی کو مستثنیٰ نہیں کیا گیا ہے۔

اعلان میں تھا کہ قانون اسلحہ کے ماتحت قواعد کے شیڈول میں بعض الفاظ کی جگہ دوسرے الفاظ درج کر دیے گئے ہیں۔ اس کا یہ منشا سمجھا جاتا ہے کہ تلواروں کو قانونِ اسلحہ کی بعض دفعات سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔

پنجاب کے تمام اضلاع میں تلواریں اور ان کے علاوہ گپتیاں ..... قانون اسلحہ کی دفعات ۱۳ اور ۱۵ سے مستثنیٰ ہوں گی۔

دفعہ ۵: سرکاری اعلان سے قانون اسلحہ کی دفعہ نمبر ۵ پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ اس دفعہ کا منشاء یہ ہے۔ کہ کوئی شخص اجازت نامہ کے بغیر اور طریقہ اور حد کے باہر جو مقرر کر دی گئی ہو۔ سامانِ حرب نہ بنائے نہ فروخت کرنے کے لیے رکھے نہ فروخت کرنے کے لیے پیش کرے۔ اس میں کوئی ایسی تصریح نہیں ہے۔ جس سے ایسے سامانِ حرب کی فروخت ناجائز ٹھہرے جو ذاتی استعمال کے لیے جائز طور پر کسی کے قبضہ میں ہو۔ بشرطیکہ فروخت اس شخص کے ہاتھ کیا جائے جس کے لیے سامانِ حرب کو قبضہ میں رکھنا کسی قانون کی رو سے ممنوع قرار نہ دے دیا گیا ہو۔ لیکن فروخت کرنے والے کا فرض ہوگا کہ بلا تاخیر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ یا قریبی تھانہ کے افسر انچارج کو فروخت کی اطلاع دے اور خریدار کے نام ونشان سے آگاہ کرے۔

سرکاری اعلان کی رو سے ایک شخص ذاتی استعمال کے لیے تلوار قبضہ میں

رکھ سکتا ہے۔ اور لے جا سکتا ہے۔ لیکن قانون اسلحہ کی دفعہ نمبر ۵ کی پابندی کیے بغیر تلوار بنا اور بیچ نہیں سکتا۔

امیرِ ملّت کا منصب پنجاب میں روحانیت کے مدعی اگر اپنے منصب پر فائز رہتے، تو بھٹکی ہوئی انسانیت صراطِ مستقیم پر آ جاتی۔ لیکن بجائے عاقبت کے انہوں نے دنیا کو اپنے لیے پسند کیا۔ وہ بھی ——— غیر ملکی اقتدار کے سہارے گو ایسے لوگوں کے گھر بجلی کے چراغوں سے روشن رہے۔ مگر جن ستاروں کی لَو کاشانۂ پیر کو رونق بخشتی رہی وہ خود زندگی بھر اندھیرے میں رہے۔ اس پر اقبال چیخ اٹھا۔ ؎

مجھ کو تو میسّر نہیں مٹی کا دیا بھی
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن

پیر جماعت علی شاہ کو مسلمانوں نے حصولِ مسجد کے لیے امیرِ ملّت منتخب کیا تھا۔ یہ درست ہے کہ اس منصب پر یہ آپ نہیں لائے گئے تھے۔ کیونکہ یہ سکیم ہنوز ادھوری تھی اور پسِ پردہ چلانے والا ہاتھ پہچانا گیا تھا۔ لہٰذا پیر صاحب کو اس رخ پر موڑ دیا گیا انہوں نے ۲۔ اکتوبر کو حصولِ مسجد کے لیے دس لاکھ رضاکاروں کی بھرتی کا اعلان کیا۔ اب نو من تیل ہوگا تو رادھا ناچے گی۔

لاہور میں اچانک ہندوؤں سے کاروباری بائیکاٹ کی تحریک چل نکلی۔ اس وقت تک تمام منڈیوں پر غیر مسلم قابض تھے۔ انہوں نے جواب میں مسلمان کے ہاتھ سودا سلف بیچنے سے انکار کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خوانچہ فروش سے درمیانے درجے کا کاروباری مسلمان ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ گیا۔ اس تحریک کا محرک کون تھا؟ اس کی ذمہ داری کسی نے قبول نہیں کی۔ یہاں تک کہ ۱۷۔ اکتوبر کو امیرِ ملّت نے بھی کہہ دیا کہ :

"میں نے بائیکاٹ کے متعلق کوئی حکم نہیں دیا۔ البتہ مسلمانوں کو اپنی طاقت بڑھانے کا مشورہ دیا ہے۔"

اس سے پیشتر ۱۲۔ اکتوبر کو مسلم اخبارات نے ہندوؤں سے دردمندانہ گذارش کے عنوان سے اداراتی نوٹ لکھے، کہ وہ مسلمانوں سے کاروباری بائیکاٹ ختم کر دیں۔ نیز مسلمانوں

کو بھی مشورہ دیا کہ وہ بھی اس قسم کے ارادوں سے باز رہیں۔
اس کاروباری لڑائی میں مسلمان مسجد سے ہٹ کر معاشی مشکلات میں الجھ گیا سو دوسری طرف امیر ملت نے مسلمانوں کو تلوار رکھنے پر زور دیا۔ لہٰذا وہ تلوار کی خرید و فروخت میں لگ گئے۔ اس طرح مسجد کی تحریک کمزور پڑ گئی اور امیر ملت ہندوستان کے دورے پر روانہ ہو گئے۔
اس دوران احمد آباد پہنچ کر انہوں نے اپنی تقریر میں کہا:

"حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو بشر کہنے والے کافر ہیں وہ حرامزادے ہیں جو کسی پیر کے نام کی چیز کو حرام قرار دیتے ہیں۔"

(روزنامہ الجمعیۃ دہلی - ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۲ء)

اس پر روزنامہ "انقلاب" لاہور نے ۲۲-اکتوبر کے پرچے میں احتجاجی نوٹ لکھا۔

"ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ رپورٹ کس حد تک درست ہے۔ لیکن "الجمعیۃ" دہلی بہر حال ایک ذمہ دار اخبار ہے مسجد شہید گنج کے معاملے میں مسلمانوں کے مطالبے کا نہایت سرگرم حامی ہے۔ اس سے یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ اس نے اپنے صفحات پر کسی غیر ذمہ دارانہ تحریر کو شائع کرنا گوارہ کیا ہو۔ اس طرح اجمیر کی ایک اطلاع ہے کہ وہاں حضرت امیر ملت نے سلطان ابن سعود کے معاہدہ پر شدید نکتہ چینی کی ہے۔ ہماری رائے ہے کہ پیر صاحب نے یہ غیر متعلقہ اور نامناسب طرز گفتگو اختیار کیا ہے۔"

روزنامہ "انقلاب" اور مرزائی

مسجد کی تحریک میں مرزائی بدستور اپنے عقائد باطلہ اور ملت اسلامیہ میں تخریب کا باعث بنتے رہے۔ وہ شکل و صورت اور لباس سے مسلمان دکھائی دیتے لیکن اپنی حرکات سے مسلمانوں کے درمیان تخریب کی تخم ریزی کرنے میں کوئی لمحہ ضائع نہیں کرتے تھے۔ خصوصاً احرار کے خلاف پروپیگنڈا کرنے میں ہمہ تن مصروف تھے۔ جہاں چار مسلمان دیکھتے ان میں شامل ہو کر احرار کو گالیاں دینے لگتے۔ تاہم احرار بھی اس سے غافل نہیں تھے۔
روزنامہ "انقلاب" لاہور کے مدیر مولانا غلام رسول مہر ان دنوں آشوب چشم کے مرض

میں مبتلا تھے۔ لہٰذا اخبار مذکور کی ذمہ داری عبدالمجید سالک پر تھی۔ انہوں نے موقعہ کو غنیمت جان کر یکے بعد دیگرے تین اڈیٹوریل احرار کے خلاف اور مرزائیوں کے حق میں لکھ مارے۔ ۲، اور ۴۔ اکتوبر کے اڈیٹوریل خاص کر مرزائیوں کی حمایت میں تھے۔ اس کے جواب میں روزنامہ "مجاہد" نے بھی اڈیٹوریل لکھے۔ اس قلمی چپقلش کے باعث مدیرانِ "انقلاب" کی عوامی حیثیت مشکوک ہو گئی۔

ڈاکٹر امبیتکر کا بیان بمبئی کے ضلع ناسک میں اچھوتوں کی ایک کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے ۱۵۔ اکتوبر کو ڈاکٹر امبیتکر نے کہا:

"اچھوتوں کو چاہیے کہ وہ ہندوؤں سے علیحدہ ہو جائیں اور کوئی دوسرا مذہب اختیار کر لیں، جو ان سے پوری طرح تعاون کرے اور ان کے ساتھ ملنے اٹھنے بیٹھنے میں کوئی امتیاز نہ برتے۔ میں اپنے اچھوت بھائیوں کو مشورہ دوں گا کہ وہ اپنے لیے کوئی دوسرا مذہب اختیار کریں اور ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی پہلی غلطی کی تلافی کریں۔"

گاندھی جی نے ڈاکٹر امبیتکر کے مندرجہ بالا بیان پر سخت پریشانی کا اظہار کیا۔ اور واردھا سے گاندھی جی نے کہا کہ اگر واقعی ڈاکٹر امبیتکر کا یہی خیال ہے تب مجھے اس کا بہت افسوس ہوا ہے۔ لیکن مذہب کسی مکان یا لباس کی طرح نہیں جو اپنی مرضی کے مطابق فوراً تبدیل کر لیا جائے۔ یہ معاملہ جسم کا نہیں روح کا ہے۔ مذہب ایک ایسا رشتہ ہے۔ جو انسان کو خالق سے ملاتا ہے۔ مذہب انسان کی موت کے بعد بھی برقرار رہتا ہے۔ اگر ڈاکٹر امبیتکر کو خدا پر بھروسہ ہے تو میں انہیں مشورہ دوں گا کہ وہ غصے کو تھوک دیں اور اپنے فیصلے پر از سر نو غور کریں۔

مجلس احرار اور اچھوت ڈاکٹر امبیتکر کے بیان کے بعد مجلس احرار نے ۲۰ اکتوبر کو مجلس مشاورت کا ایک عام اجلاس منعقد کیا۔ جس کی صدارت چودھری افضل حق نے کی۔ اس میٹنگ کے ایجنڈے میں ڈاکٹر کے اس بیان کے متعلق، جس میں اس نے اچھوت قوم کو تبدیلی مذہب کا مشورہ دیا ہے غور و خوض

کرنا ہے۔

صبح آٹھ بجے سے گیارہ بجے تک اس پر بحث رہی۔ آخر مجلس نے حسب ذیل فیصلہ کیا۔

۱۔ مجلس مشاورت کا یہ اجلاس ڈاکٹر امبیڈکر کے اس اعلان کے سلسلے میں مجلس احرار نے جو کام اس وقت تک کیا ہے اسے بنظر استحسان دیکھتا ہے اور دفتر کی اس تجویز کی تائید کرتا ہے کہ ڈاکٹر امبیڈکر کے پاس مجلس احرار کی طرف سے ایک مختصر وفد بھیجا جائے۔

۲۔ مجلس مشاورت کا یہ اجلاس تجویز کرتا ہے کہ شعبۂ تبلیغ مجلس احرار اچھوتوں کو ہندوستان میں دوسرے ہندوستانیوں کے برابر درجہ دلانے کی سعی کرے نیز اس سلسلے میں دنیا پر واضح کر دے کہ صرف اسلام ہی ہر قسم کے امتیازات مٹانے والا مذہب ہے۔"

مجلس مشاورت کے فیصلے کے فوراً بعد مجلس احرار نے ڈاکٹر امبیڈکر سے خط و کتابت شروع کر دی اور مجلس احرار بمبئی کے کارکنوں کو ہدایت کی کہ وہ دفتر کو تمام حالات سے مطلع کریں کہ بمبئی میں اس کام کو کس طرح سرانجام دیا جا سکتا ہے۔ یا بمبئی مجلس احرار خود اس معاملے میں مرکز کی کیا امداد کر سکتی ہے۔

۲۱۔ اکتوبر کو مولانا مظہر علی اظہر کی طرف سے ایک خط ڈاکٹر امبیڈکر کے نام لکھا گیا اور ملاقات کے لیے وقت مانگا گیا۔

اس دوران مجلس احرار نے، پنجاب کے متعلق جو معلومات حاصل کیں وہ حسب ذیل ہیں۔

چودہ پندرہ لاکھ کے قریب اچھوت پنجاب بھر میں موجود ہیں۔ اور ان کا بیشتر حصہ مسلمانوں کے گاؤں میں آباد ہے، وہ بہت ہی آسانی سے مسلمان ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہاں کے زمیندار اپنی زبان سے ان کو مسلمان ہونے کے لیے کہیں۔

امید ہے کہ مجلس احرار کا شعبہ تبلیغ پنجاب میں اس ضمن میں بہترین خدمت انجام دے سکے گا۔

دفترِ مجلسِ احرار مرکزیہ کا خیال تھا کہ ہم اچھوتوں میں کام کرتے رہیں اور اخبارات میں اس کا ذکر نہ آئے تاہم مجلسِ مشاورت نے ہدایت کی ہے کہ اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ کارروائی اخبارات میں آنی چاہیے۔ خصوصاً پنجاب کے کام کے متعلق جہاں جنوبی ہند سے زیادہ کامیابی کی امید ہے۔

مولانا داؤد غزنوی کا استعفیٰ ۲۸۔ اکتوبر کو مجلسِ احرار کے ناظمِ اعلیٰ مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے اپنے خانگی حالات کے پیشِ نظر جماعتی ذمہ داریوں سے علیحدگی اختیار کر لی اور ان کی جگہ مولانا مظہر علی اظہر نے سنبھال لی۔

امریکن اور انگریز کمپنیوں کو ٹھیکہ دیا گیا دسمبر ۱۹۳۴ء کے بعد حکومتِ سعودیہ کے وزیرِ مالیات شیخ عبداللہ سلیمان احمد نے جو ان دنوں دمشق کے سرکاری دورے پر تھے۔ ۳۱۔ اکتوبر کو ایک بیان میں کہا:

"ہم نے ایک امریکن کمپنی کو پٹرول نکالنے کا ٹھیکہ دیا ہے۔ اس کمپنی نے اپنا کام شروع کیا تو اس کے دوران معلوم ہوا کہ تیل کے چشمے کافی ہیں۔ ایک اور امریکن کمپنی کو ٹھیکہ دیا گیا ہے کہ وہ حرمین شریف کی حد چھوڑ کر حجاز کے دیگر مقامات میں معدنیات کی تلاش کرے۔ اور اس دوران معلوم ہوا کہ سونے کی بڑی مقدار ہماری مملکت میں ہے اور یہاں سے سونا نکالنا آسان ہے۔

(بیان کے آخری حصے میں وزیرِ مالیات نے کہا)

کچھ عرصہ پیشتر ہماری حکومت کی مالی حالت بہتر نہ تھی۔ مگر اب حالات پر قابو پا لیا گیا ہے۔ گذشتہ جنگ کے باعث ہمارے مالیات پر بوجھ پڑ گیا تھا۔ لیکن اب حالات بہتر ہیں۔"

مطلق العنان حکمران جب بزعمِ خویش اولی الامر بن جاتے تو وہ خاندانی وقار کو ملکی مفاد پر ترجیح دیتا ہے۔ اسلام نے اس طرزِ سلطنت کی نفی کر کے خلافت کے طریق نظام کو انسانوں کے لیے پسند کیا، اس لیے کہ قومی اور نسلی منافرت یہیں سے جنم لیتی ہے۔ طلوعِ اسلام سے پیشتر عرب میں قبائلی جنگیں اسی بنا پر رہیں تا آنکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی ضابطۂ حیات،

کے نفاذ سے اس فتنے کی ہمیشہ کے لیے جڑ کاٹ دی۔

آج بھی راعی اور رعایا کے مابین کہیں فساد ہے تو اس کی بنیادیں بھی شخصی آئین کارفرما ہے۔ یورپ کی پہلی بڑی لڑائی کے دوران جب خلافتِ عثمانیہ کو شریف مکہ ایسے غداروں کی وساطت سے شکست ہو چکی تو ستمبر ۱۹۲۴ء میں آلِ سعود نے حجاز کی عنانِ اقتدار سنبھالی۔ اور امیر عبدالعزیز بن سعود اس کے پہلے فرمانروا ٹھہرے۔

بے آب و گیاہ سرزمین ہونے کے ساتھ اقوامِ عرب کی باہم سر پھٹول نے بھی اس خطہ کو معاشی پریشانیوں میں سمیٹ لیا۔ جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے کہ برطانوی اقتدار کے استحکام کو اقوامِ عرب کی ابتری مفید تھی اور وہ اس سنگلاخ وادی کی ایک ایک پگڈنڈی پر یونین جیک دیکھنا چاہتی تھی۔ لہٰذا پہلی جنگِ عظیم سے فراغت کے بعد یورپین سیاست نے اس طرف کا رخ کیا اور یہاں کی حکمران جماعت سے کاروباری عنوان سے تعلقات استوار کرنا شروع کیے۔ بقول حکومت سعودیہ کے وزیر مال کے کہ "کچھ عرصہ پیشتر ہماری حکومت کی مالی حالت بہتر نہ تھی"۔ یہ درست ہے لیکن برطانیہ اور امریکن کو حجاز میں قدم رکھنے کی اجازت دینے سے پیشتر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی سمجھ لیا ہوتا۔

اَخْرِجُوا الْیَھُوْدَ وَالنَّصَارٰی مِنْ جَزِیْرَۃِ الْعَرَبِ ط۔ ترجمہ: یہود و نصاریٰ کو جزیرہ عرب سے نکال دو۔ (حدیثِ نبوی)

اس حدیث سے یہ کہیں ثابت نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف مکہ اور مدینہ میں یہودیوں اور نصرانیوں کو داخل ہونے سے منع فرمایا ہو۔ بلکہ فرمایا۔ جزیرۃ العرب سے ان کو نکال باہر کرو۔ مگر آلِ سعود نے برطانیہ اور امریکہ کو حجاز سے معدنیات نکالنے کی اجازت دے کر سارے عرب کے تمدن پر یورپین تہذیب کی مہر لگا دی۔

مجلسِ احرار نے حکومت سعودیہ کے اس فعل کو اسلام اور اقوامِ عرب کے لیے غیر مفید سمجھ کر اس پر سخت احتجاج کیا۔

آل انڈیا پولیٹیکل احرار کانفرنس سیالکوٹ

سال رواں اگر ہندوستان میں اقوامِ ہند کے لیے جدوجہد کا آخری سال تھا تو مجلسِ احرار کو بھی

اسی سال اپنے عوام کی غلط راستے سے ٹکرانا پڑ رہا تھا۔ دشمن سے لڑائی اس قدر دشوار نہیں جس قدر اپنی قوم سے برسر پیکار ہونا مشکل ہے۔ بگڑا ہوا ہجوم اور اکھڑے ہوئے قدم مشکل سے جمتے ہیں۔ احرار رہنما سالِ رواں کے وسط تک مسلم عوام کے ہر دل عزیز رہنما تھے۔ لیکن اغراض کے بندوں نے بہتے پانی میں ایسا زہر گھولا کہ ہر قطرہ زہر ہلاہل بن کر حلق میں اترنے لگا۔ مگر پیکرِ ایثار و خلوص دلجمعی سے اپنی قوم کے پرکے برداشت کرتے رہے۔ جو تیر بھی کمان سے نکلا اسے مسکراہٹ سے سینے پر قبول کیا۔ کیا مجال کہ پیشانی شکن آلود ہوئی ہو یا دل پر کوئی میل آیا ہو۔ ؎

تم ہم کو مٹا کر روتے ہو ہم تم پر مٹ کر ہنستے ہیں۔
اس دور میں بھی جانباز تھے ہم اس دور میں بھی جانباز ہیں ہم

(جانباز مرزا)

گھپ اندھیرے کے اس دور میں جب حق و باطل کے مابین امتیاز کی دیوار گر چکی تھی گرم ہواؤں نے پھول پتیاں جلا کر خزاں کا دامن راکھ سے بھر دیا تھا۔ احرار رہنما سیالکوٹ پہنچے۔ یہاں آل انڈیا پولٹیکل احرار کانفرنس منعقد ہونے والی تھی۔ ریلوے اسٹیشن پر ہزاروں سرخ پوش مسلح احرار رضاکاروں نے رہنماؤں کا خیر مقدم کیا۔ شہری عوام نے مکانوں کی چھتوں اور دکانوں کے تھڑوں پر سے ان پر پھولوں کی بارش کی۔ ۱۰۔ نومبر ۱۹۲۵ء کو کانفرنس کے منتخب صدر مولانا غلام غوث ہزاروی کا جلوس جب سیالکوٹ کے بازاروں سے گذر رہا تھا تو یوں لگتا کہ جیسے آج یوم سعید ہے کہ ہر شہری لباس میں اُجلا اور دل سے مسرت کا پیکر دکھائی دیتا ہے۔

احرار کے سرخ پرچم کوچہ و بازار میں لہرا رہے تھے۔ ان کی اڑانیں اپنے حریفوں پر خندہ زن تھیں۔

رات نمازِ عشا کے بعد کانفرنس کا پہلا اجلاس تالاب شیخ مولا بخش میں صدر کانفرنس کی صدارت میں کلام پاک سے شروع ہوا۔ ابتدا میں مولانا مظہر علی اظہر نے خطبہ استقبالیہ پڑھا۔ جس کے چند اقتباس حسبِ ذیل ہیں۔

اسی وقت ہندوستان کے باشندوں کی نگاہیں نئے آئینِ حکومت کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ جب تک ہم اپنی مصیبتوں کے علاج کا صحیح جائزہ نہ لیں اس وقت تک آئین کی تبدیلی فائدہ بخش نہیں ہو سکتی۔ نئے آئین میں صوبجاتی حکومتوں کا نظام بڑی حد تک منتخب شدہ ممبروں کے ہاتھ میں ہوگا جس سے وزراء چنے جائیں گے جو کاروبار حکومت کو چلائیں گے لیکن حقوق کا مل جانا کچھ فائدہ مند نہیں اگر ہم اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہ کریں۔ اگر ووٹ دیتے وقت ایسے نمائندے منتخب نہ کیے جائیں جو آزاد خیال اور قابلِ اعتماد ہوں یہ لوگ ایک طرف گورنر سے خائف نہ ہوں اور اس کی تجاویز کے مقابلے میں ملک کی بہتری کے لیے تجاویز پیش کرنے کی قابلیت کے ساتھ جرأت بھی رکھتے ہوں۔ اور کوئی لالچ یا خوف ان کے عزم و ارادہ کو شکست نہ دے سکتا ہو۔ اور دوسری طرف اپنے ماتحت ملازمین حکومت سے جن میں مقتدر انگریز اور ہندوستانی افسر شامل ہیں، کام لینے کی اہلیت اور جرأت رکھتے ہوں۔ اس وقت تک ذرا برابر بہتری کی امید رکھنا بھی ایک خیالِ خام ہے۔ نمائندوں سے یہ توقع بھی ہونی چاہیے کہ وہ ذاتی اور یگانہ پروری کا خیال نہ رکھیں گے، اور بے لاگ ملک کی خدمت کا عزم صمیم رکھتے ہوئے اپنی تمام کوششوں کو وقف کر دیں گے۔ نیا آئینِ حکومت اخراجات کے لحاظ سے مہنگا پڑے گا۔ اگر اس کے مقابلہ میں اس سے زیادہ فائدہ نہ ہوا تو ملک کی مصیبتیں اور بھی بڑھ جائیں گی۔ اس لیے رائے دینے والوں کو اپنے فرائض کا احساس اور بھی ضروری ہے۔

ملک میں آزاد خیال جماعتوں کا ایک فریق نئے آئین کو ٹھکرانا چاہتا ہے۔ لیکن اسے سوچنا چاہیے کہ جب حکومت صوبجاتی نظام کی باگ ڈور بظاہر ہندوستانیوں کے ہاتھ میں دے رہی ہو اور کوئی آزاد خیال جماعت اپنی اکثریت کونسل میں لا سکتی ہو اور نہ لائے اور ملکی مجالس آئین ساز کی رائے کو دانستہ اپنے

خلاف کرتی ہوئی، میدان رجعت پسند اور خوشامد پسند دشمنانِ وطن کے ہاتھ میں دے دے، تو اس سے برطانوی اقتدار کو دھکا نہ لگے گا، بلکہ ہندوستانی، ہندوستانیوں کے ہاتھوں ہی نالاں ہوں گے اور آزاد خیال اکثریت غلامی پسند اقلیت کو خود اپنے لیے وجۂ مصیبت بنائے گی۔

اگر کونسل میں منتخب ہو کر اور اکثریت حاصل کر کے وزارت مرتب کرنے سے انکار کر دیا جائے تو بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکل سکتا، جو ملک کو آزادی کی منزل کی طرف لے جا سکے۔

گورنر کارِ حمایت خود سنبھال لیں گے۔ اور ان کی تمام کوتاہیوں کی ذمہ داری اس اکثریت پر ہوگی جو دانستہ کاروبارِ سلطنت کو سنبھالنے سے انکار کرے۔ گورنر اور گورنروں کے ہمنوا ہندوستانی ترکِ موالات کرنے والی اکثریت کے خلاف کامیاب پروپگنڈا کر سکیں گے۔ جس کا مؤثر جواب اکثریت کی طرف سے بن نہیں سکے گا۔

بدیں حالات اس امر کے متقاضی ہیں کہ آزاد خیال جماعتیں اپنے آنے والے مؤقف سے فائدہ اٹھا کر ملک میں آزاد خیالی کی رو کو زیادہ وسیع اور پرزور بنا دیں اور ان جھگڑوں کو چکانے کی کوشش کریں، جو آئے دن ملک کے خرمنِ امن کو آگ لگاتے رہتے ہیں۔ اگر گورنروں کو خود پسندی اور ملک دشمنی آزاد خیال وزراء کو خدمتِ وطن کرنے سے روکے اور ان وزراء کو کام نہ کرنے دیا جائے تو گورنر اور ان کے ہمنوا حکامِ بالا جو شملہ اور لندن کے مفاد کی خاطر ہندوستانی مفاد کو کچلنا چاہیں خود اس بات کے ذمہ دار ہوں گے کہ ہندوستانی اکثریت کی آواز دبا دیں۔ بلکہ اس کا گلا گھونٹ دیں۔ اس صورت میں ملک کی آواز انگلستان کے وسیع اقتدار کے خلاف بلند ہوگی ... آزادیٔ ملک کی جدوجہد زیادہ قوت اختیار کرے گی۔

ایک دلیل یہ بھی پیش کی جاتی ہے کہ وزارت کی خواہش آزاد خیال طبقہ

کو متفرق کر دے گی۔ کیونکہ جاہ پسند لوگ آگے آئیں گے۔ اگر آزاد خیال جماعتیں اس قدر تنظیم پیدا نہیں کر سکتیں کہ قابل اور ایثار پسند لوگوں کو پیش کر سکیں تو آزادی کی جنگ میں خود غرض لوگوں کا پیش پیش ہونا کسی حالت میں بھی کامیابی کی منزل تک نہیں پہنچ سکے گا۔"

۲۔ ریاستیں ۔ جو مسائل اقتصادی وسیاسی برطانوی ہند کو پریشان کر رہے ہیں۔ وہ ہندوستانی ریاستوں کے باشندوں کے لیے سوہانِ روح ہیں۔ لیکن ریاستوں کے باشندوں کا بہت بڑا مطالبہ یہ ہے کہ ہمیں ویسی حکومت دی جائے جیسی برطانوی ہند میں ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ریاستوں کے باشندے کس افلاس، غربت اور ہلاکت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اگر برطانوی ہند میں نمائندہ حکومت کے بغیر گذارہ چلنا مشکل ہے تو ریاستوں میں مطلق العنانی کا دور دورہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ ریاستی باشندوں سے ہمیں پوری پوری ہمدردی ہے اور ان کے مصائب کے بوجھ کو کم کرنے کے لیے جہاں تک ہو سکے۔ ہمیں تیار رہنا چاہیے۔ جب تک ریاستوں کے باشندے اور برطانوی ہند کے لوگ آزادانہ فارغ البالی میں زندگی بسر نہ کرنے لگ جائیں اس وقت تک ملکی جد وجہد اختتام کو نہیں پہنچ سکتی۔

۳۔ مسئلہ حجاز: ہندوستانی سیاسیات کے علاوہ آجکل مسئلہ تحفظ حجاز وحرمین شریفین ایک نئی صورت اختیار کر رہا ہے۔ حال ہی میں سلطان ابن سعود والئی حجاز نے ایک انگریز کمپنی کے ساتھ ملک حجاز میں کان کنی کے لیے ایک معاہدہ کیا ہے جس سے مقدس ارضِ حجاز میں انگریزی اثر ورسوخ اور اقتدار کا بڑھ جانا لازمی ہے۔ تاریخ آج سے پہلے ہندوستانیوں کے سامنے یہ حقیقت پیش کر رہی ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے تجارت کے بہانے ہندوستان کی سیاست پر قبضہ کیا اور ایک عرصہ تک خود ہندوستان پر حکومت کی۔ آج شہنشاہ جارج پنجم کی حکومت ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی

وارث اور قائم مقام ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو دلائل سے یہ سمجھانے کی کوشش کرنا کہ نئے معاہدہ میں خطرات نہیں، سعی لاحاصل ہے۔ اس لیے ہمیں ایک طرف تو سلطان ابن سعود کو یقین دلانا ہے کہ ہم اس کے بدخواہ نہیں۔ لیکن مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم اس رجحان سیاسیات و اقتصادیات کو برداشت نہیں کر سکتے، جس سے ایک دن ارض حجاز کامل طور پر غیر مسلم اقتدار کا شکار ہو جائے۔ اور اگر رہ جائے تو محض اس حیثیت میں جس حیثیت میں قومی اور اسلامی جھنڈے ہندوستان میں لہرائے جاتے ہیں۔ دوسری طرف ہم نے حکومت برطانیہ کو بھی بتانا ہے کہ اسے خواہ مخواہ مسلمانوں میں بداعتمادی پیدا نہیں کرنی چاہیے۔ اگر حقیقتاً انگریزی سیاست کی نگاہیں ارض حجاز پر نہیں تو برطانوی کمپنی یا قوم کو معاہدہ حجاز سے ایسے منافع نہیں ہوں گے۔ جن کا نعم البدل دنیا کے کسی اور حصے میں نہ مل سکے۔ جس کے بغیر برطانوی قوم غربت و افلاس کی نذر ہو جاتے۔ اس لیے سلطنت برطانیہ کے مفاد کے پیش نظر حکومت برطانیہ کو پوری کوشش کرنی چاہیے کہ سلطنت حجاز اور برطانوی کمپنی کے درمیان جو معاہدہ ہوا ہے وہ کالعدم قرار دے دیا جائے۔ تاکہ مسلمانوں کے دل برطانیہ کی طرف سے مسئلہ حجاز کے سلسلہ میں مطمئن ہو سکیں۔"

(۱۔ خطبات احرار جلد اول صفحہ ۱۴۲ تا صفحہ ۱۴۴)

خطبہ استقبالیہ کے بعد مولانا مظہر علی اظہر نے احرار پولیٹیکل کانفرنس کے منتخب صدر مولانا غلام غوث ہزاروی کا تعارف کراتے ہوئے کہا:

"احرار کا یہ وصف رہا ہے کہ اس نے ہر مخلص اور محنتی کارکنوں کو اپنے نزدیک لا کر اسے اونچے سے اونچا مقام عطا کیا۔ مولانا غلام غوث اپنے علاقہ (ہری پور ہزارہ) اور صوبہ سرحد میں اپنی قربانیوں اور گوناگوں مشکلات کے باعث مشہور ہیں۔ انہوں نے قید و بند کی مصیبتیں برداشت کیں۔ لیکن اس پر بھی وہ گمنام رہے اور وہ شہرت حاصل نہ کر سکے، جس کے وہ مستحق تھے۔

مجلس احرار نے اپنی روایات کے مطابق ان کی قدر کی اور انہیں آل انڈیا احرار پولٹیکل کانفرنس کی صدارت کا اعزاز بخشا۔ مولانا موصوف مذہبی طور پر دیو بند سے فارغ ہیں اور سیاسی طور شمالی صوبہ سرحد میں سرخپوش تحریک کے قائدرہ چکے ہیں۔"

مولانا مظہر علی اظہر کی تائید میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے ایک مختصر تقریر کی اور بعد میں مولانا غلام غوث نے کرسئ صدارت سنبھالی۔ اپنے خطبۂ صدارت کے بعد کانفرنس کی کارروائی شروع کی۔

۱۱۔ اکتوبر کو پنڈال میں پرچم احرار لہرانے کی رسم ادا کی گئی۔ یہ نظارہ دیدنی تھا۔ پنڈال کے چاروں طرف سرخ باوردی اور مسلح رضا کاروں کے چاق و چوبند دستے فوجی طریقہ پر قطار اندر قطار کھڑے تھے۔ احرار بینڈ قومی دھنیں بجا رہا تھا۔ مولانا غلام غوث نے پرچم کشائی کے بعد کہا:

"یہ جھنڈا آزادئ ہند اور خدا کے نام کو بلند کرنے کا جھنڈا ہے۔ اس کو بلند کرنے سے ہم پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اس کی بلندی کو قائم رکھنے کے لیے ہمیں کن قربانیوں کی ضرورت پیش آئے گی۔ اس کا احساس کریں اور اس سرخ پرچم کے سائے میں آج وعدہ کریں کہ اگر کبھی اس کی سرخی کو قائم رکھنے کے لیے خون کا آخری قطرہ بھی دینا پڑا تو اس سے دریغ نہیں کریں گے۔"

رسم پرچم کشائی کے موقعہ پر ہندوستان بھر کے علماء اور سیاسی شخصیتوں نے حصہ لیا۔ اس موقعہ پر ان تمام حضرات نے دلی کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے وعدہ کیا کہ آزادئ وطن اور ہندوستان میں اسلام کی سربلندی کے لیے اگر کبھی ضرورت پیش آئی تو وہ کسی قربانی سے دریغ نہ کریں گے۔ اس کے بعد احرار رضا کاروں نے جھنڈے کو سلامی دی، اور منتشر ہو گئے۔

جیشِ احرار کا اجلاس اس اجلاس کی صدارت سید محمد احمد کاظمی ایڈووکیٹ الہ آباد نے کی۔ اجلاس میں دس ہزار سے زائد باوردی احرار رضا کار شریک تھے۔

۱۲۔ نومبر کو احرار پولٹیکل کانفرنس کا آخری اجلاس ہوا۔ جس میں دیگر کارروائی کے حسب ذیل قراردادیں منظور کی گئیں۔

۱- "آل انڈیا احرار پولٹیکل کانفرنس سیالکوٹ کا یہ اجلاس مجلس احرار کے نصب العین
یعنی ملکی آزادی کو اہل وطن کے دکھوں کا واحد حل سمجھتا ہے۔ اور ہندوستان کی
آزادی ہی میں تمام دنیا کی آزادی کا راز مضمر دیکھتا ہے۔ لہٰذا ہندوستان کے مسلمانوں
سے اپیل کرتا ہے کہ وہ مجلس احرار کے ساتھ پورا پورا تعاون کر کے ہندوستان کو
آزاد کرانے میں مدد دیں۔"

(قرارداد کے محرک مولانا محمد اسماعیل مرادآبادی اور تائید مولانا حبیب الرحمٰن نے کی۔)

۲- "آل انڈیا مجلس احرار کا یہ اجلاس حکومت ہند سے مطالبہ کرتا ہے کہ زمینداروں
کی مالی بدحالی کے پیش نظر مالیے میں کم از کم پچاس فیصد تخفیف کر دی جائے
جس سے زمینداروں کی مالی مشکلات کا حل ہو سکے۔"

(قرارداد کے محرک صاحبزادہ فیض الحسن اور تائید چودھری عبدالعزیز بیگووالیہ نے کی)

۳- "آل انڈیا احرار کانفرنس کا یہ اجلاس آئین نو کے پیش نظر رجعت پسندوں
کی سرگرمیوں کو تشویش کی نظروں سے دیکھتا ہے۔ نیز مسلمانوں کی تمام آزادی
پسند جماعتوں اور افراد سے اپیل کرتا ہے کہ کسی مناسب مقام پر جمع ہو کر ان
رجعت پسند عناصر کی سرگرمیوں کا مداوا سوچیں۔ ورنہ یہ لوگ اپنی ریشہ دوانیوں
میں کامیاب ہو کر ملک کو بیش از بیش غلامی میں مبتلا کرنے کا باعث ہوں گے۔"

(قرارداد کے محرک سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور تائید مولانا اسمٰعیل ذبیح کانپوری مدیر قومی دلیر کانپور نے کی)

۴- "آل انڈیا احرار پولٹیکل کانفرنس کا یہ اجلاس حکومت سعودیہ کا غیر ملکی کمپنیوں سے
معاہدہ سرزمین حجاز میں غیر ملکی حکومت کی مکمل سیاسی مداخلت اور اثر و رسوخ کے مترادف
سمجھتا ہے۔ ازبس کوئی مسلمان از روئے شریعت اسلامی برداشت نہیں کر سکتا۔
لہٰذا یہ کانفرنس سلطان ابن سعود کو یقین دلاتی ہے کہ دنیا کے ہر فرقے اور عقیدے
کا مسلمان حجاز کی آزادی اور تحفظ کے لیے ہر قسم کی قربانی اور حکومت حجاز کے ساتھ
تعاون کے لیے تیار ہے۔"

اس قرارداد کی دوسری شق میں ایک وفد سلطان ابن سعود کی خدمت میں بھیجنے کا فیصلہ

کیا گیا۔

(قرارداد کے محرک مولانا مظہر علی اظہر اور تائید مولانا عبدالقیوم پوپلزئی (پشاور) نے کی)

مدعیٔ نبوۃ کو سزا جرمن کی اس خبر کو پیرس کے ایک اخبار نے جو کہ روسی زبان میں شائع ہوتا ہے، نمایاں طور پر شائع کیا۔

"برلن میں ایک شخص نے نبی ہونے کا دعویٰ کیا۔ اور اس کے پاس ہزاروں افراد آنے لگے۔ جھوٹی نبوۃ کا دعویدار مریضوں کو دوا دیتا جس کے باعث ان میں سے اکثر صحت یاب ہو جاتے تھے۔ لیکن حکومت جرمنی نے اس شخص کو گرفتار کر لیا۔ حکومت کا موقف یہ ہے کہ یہ شخص دعویٰ نبوۃ کر کے اخلاقی اور مجلسی جرم کا مرتکب ہوا ہے۔"

اس کا مقدمہ بند کرے میں ہوا۔ سینتیس[۳۷] گواہانِ استغاثہ کے بیان ہوئے۔ آخر میں جھوٹے نبی کا بیان ہوا۔ جس میں اس نے کہا کہ اس نے مریض ہی صحت یاب نہیں کیے بلکہ اکثر مردے بھی زندہ کیے ہیں۔ آخر میں عدالت نے مجرم کو ایک سال قید با مشقت کی سزا دی۔

(روزنامہ "انقلاب" لاہور ۱۴۔ نومبر ۱۹۳۵ء)

"یورپ" جنگ کا اکھاڑہ طاقت در ہاتھ ہمیشہ کمزور پر اٹھتا ہے۔ اور جب اسے مغلوب کر لیتا ہے تو فتح کا علم اٹھائے مفتوح پر اپنی مسکراہٹیں بکھیرتا ہے۔ جس میں ہزاروں طنز کے تیر و نشتر ہوتے ہیں۔ کمزور کے وسائل بھی کمزور ہوتے ہیں اور فاتح اسی دراڑ سے داخل ہوتا ہے۔

یورپ کی مہذب قوموں نے اس سال اپنی تہذیب کے دامن میں جس بری طرح چھید کیا۔ مؤرخ اس سانحہ کو سیاہ حاشیہ میں تحریر کرے گا۔ حبشہ اور اٹلی کی جنگ شیر اور بکری کی لڑائی تھی۔ لیکن برطانیہ اور فرانس نے ذاتی اغراض کے تحت اٹلی کو ڈھیل دی کہ وہ مظلوم حبشہ کو اپنی فتح کا نشان بنائے۔

۲۶۔ ستمبر کو جب فریقین میں بات طے نہ پا سکی تو ۳۔ اکتوبر (۱۹۳۵ء) کو اٹلی حبشہ پر چڑھ دوڑا۔ یورپ کی سیاست ان دنوں عجیب مراحل سے گذر رہی تھی۔ برطانیہ، روس اور جرمن کے

اتحاد کو تشویش کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ دوسری طرف فرانس اور سوویٹ روس کے تعلقات کو اس لیے بھی پسند کرتا تھا کہ شاید وہ برلن اور ماسکو کے درمیان کسی کشیدگی کا محرک ثابت ہوں۔ تاہم برطانیہ روس کی انقلابی تحریک سے بھی خائف تھا۔ اس اعتبار سے فرانس کی دوستی بھی اسے گوارہ نہیں تھی۔ اس طرح انگلستان کے سیاستدان روس، فرانس اور جرمن کے اس تماشے کو خوف اور دلچسپی کے ملے جلے جذبات سے دیکھ رہے تھے۔

حبشہ کی ساڑھے چار لاکھ کی مظلوم آبادی پر اٹلی کے بمبار طیارے آگ برسا رہے تھے۔ شہنشاہ حبشہ نے یورپ کے مہذب لوگوں کو پکارا لیکن نقار خانے میں طوطی کی صدا کب سنائی دیتی ہے۔ ایک ہفتہ بعد جمعیتہ اقوام نے جنیوا میں اپنا اجلاس بلایا کہ مسولینی نے حبشہ پر حملہ کر کے میثاق کی دفعہ ۱۶ کی خلاف ورزی کی ہے۔ لہٰذا جمعیتہ اقوام نے اپنے ارکان کو ہدایت کر دی کہ وہ اٹلی کے ہاتھ آئندہ کوئی سامان فروخت نہ کریں۔ نیز اپنے اپنے علاقوں سے اسے قرضوں کا انتظام بھی نہ ہونے دیں۔ اور اٹلی سے کوئی سامان بھی خرید نہ کریں۔

بظاہر یہ حبشہ کا اقتصادی تحفظ تھا۔ لیکن ضروری اور اہم چیز جس سے اٹلی مات کھا سکتا تھا اور بہت جلد گھٹنے ٹیک دیتا وہ تیل کا معاملہ تھا۔ جسے مقاطع میں شامل نہیں کیا گیا۔ کیونکہ اس سے فرانس اور برطانیہ کو نقصان پہنچتا تھا۔ امریکی صدر مسٹر روزویلیٹ نے غیر جانبداری کا جو قانون بیشتر سے منظور کرا لیا تھا۔ اس میں تیل، ٹیکنکل لوہا اور فولاد ایسی اہم جنگی چیزیں شامل تھیں۔

ان حالات میں اٹلی کے ڈکٹیٹر مسولینی کو تیل بھی ملتا رہا اور جنگ کا دوسرا سامان بھی اس وقت تک جنگ میں اٹلی کے دس ڈویژن (اڑھائی لاکھ) اور ڈیڑھ لاکھ افریقی فوج الگ تھی۔ جو جدید سامانِ جنگ سے لیس تھی جبکہ اس کے مقابل حبشہ کی غیر تربیت یافتہ صرف پینتیس ہزار فوج تھی، جس کے پاس سامانِ جنگ بہت کم اور معمولی تھا۔

برطانیہ بڑی طاقت ہونے کے باعث حبشہ کے نتائج سے غافل نہیں تھا تاہم وہ اس کے لیے کسی بڑی جنگ کو دعوت یا اس کے امکان پیدا کرنے کو بھی تیار نہیں تھا۔ فرانس کا وزیر اعظم مسٹر لاوال، موسولینی کی پیش قدمی کا اس وقت تک حامی تھا جب تک فرانس کا مفاد

تھا۔ بالآخر برطانیہ کے وزیر خارجہ مسٹر سر سموئیل ہور اور فرانس کے مسٹر لاوال نے ایک مشترک اور خفیہ منصوبہ ترتیب دیا، جس کے تحت فیصلہ کیا گیا۔

"صومالیہ اور ایریٹیریا کی سرحدوں کے ساتھ ساتھ ساٹھ ہزار مربع میل کا علاقہ اٹلی کے حوالے کر دیا جائے۔ اس کے معاوضے میں تین ہزار مربع میل کی ایک گذرگاہ حبشہ کو دے دی جائے۔ تاکہ وہ اس سے اپنی اقتصادی توسیع اور آبادکاری کا حلقہ بنا سکے۔

اس خفیہ معاہدے پر مسٹر لاوال اور مسٹر ہور نے حلف لیا کہ وہ اس معاہدہ کو صیغہ راز میں رکھیں گے، مگر ہنوز اس کی سیاہی خشک نہ ہونے پائی تھی کہ فرانس نے یہ معاہدہ شائع کر دیا۔ اس کے نتیجے میں سارا انگلستان ناراض ہو گیا کہ چاندی کی طشتری میں رکھ کر فتح کا تحفہ موسولینی کے حوالے کر دیا جائے حالانکہ جنگ ابھی جاری تھی۔ برطانوی اخبارات، برطانوی پارلیمنٹ اور عوام اس قدر سیخ پا ہوئے کہ مسٹر سر سموئیل ہور کو اپنے عہدے سے مستعفی ہونا پڑا اور اس کی جگہ انتھنی ایڈن برطانیہ کے وزیر خارجہ نامزد کیے گئے۔

{ "دنیا کی بساطِ سیاست" مصنفہ مولانا مظہر علی اظہر ص۱۵۸
"دوسری جنگ عظیم" ۔ مصنفہ لوئیس ایل سنائیڈر ص۲۰ تا ص۲۹ }

موسولینی ۱۸۸۳ء میں رمگانا کے پہاڑی علاقہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں لوہار کے ہاں پیدا ہوا۔ اس نے ابتدائی تعلیم اپنی والدہ سے حاصل کی اور فراغت کے بعد تھوڑی مدت کے لیے معلمی کا پیشہ اختیار کیا۔ ایک سال بعد اس پیشے کو چھوڑ گیا۔ اس دوران وہ سوشلزم سے متاثر ہو چکا تھا اور اس نے اٹلی کو خیرباد کہہ کر سوئٹزرلینڈ میں مزدوروں کی ایک انجمن بنائی۔ مقامی حکومت نے ان سرگرمیوں کی بدولت اسے ملک سے نکال دیا۔ وہ پھر اٹلی آ پہنچا۔ انقلاب پسند تحریک یہاں بھی جاری رکھی اور یہاں وہ ایک کمیونسٹ اخبار کا ایڈیٹر بن گیا۔

۱۹۱۵ء میں برطانیہ اور اٹلی کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ ہوا جس کی موسولینی نے حمایت کی۔ اٹلی کی کمیونسٹ پارٹی اس معاہدے کے خلاف تھی۔ لہٰذا اسے جماعت سے

خارج کر دیا گیا۔ حکومت بھی سوشلسٹوں کے خلاف تھی لہٰذا موسولینی کو اس کے نظریات کی بنا پر قید میں ڈال دیا گیا۔ رہائی کے بعد موسولینی آسٹریا آ گیا۔ یہاں اس نے ایک اخبار نکالا جس میں انقلابی سوشلسٹوں کے نام پیغام موجود تھا۔ آسٹروی حکومت کو اس کی یہ سرگرمیاں پسند نہ آئیں اور اسے ملک سے باہر نکال دیا یہ پھر اٹلی واپس آ گیا۔

اٹلی نے جب ٹریپولی کے بارے میں جنگ چھیڑی تو موسولینی نے اس کی زبردست مخالفت کی، جس کی بنا پر حکومت نے اسے پانچ ماہ کے لیے قید کر دیا۔ رہائی کے بعد اسے سوشلسٹ اخبار "اونتی" کا ایڈیٹر بنا دیا گیا۔

پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو موسولینی حب الوطنی کی بنا پر فوج میں بھرتی ہو گیا اور میدان جنگ میں بری طرح زخمی ہوا۔ اسی بنا پر اسے فوج سے الگ کر دیا گیا۔ صحت یاب ہونے پر اس نے ایک اور اخبار نکالا اور اٹلی کی سیاسی اور اقتصادی زندگی کو ازسر نو جاندار بنانے پر زور دیا۔ ازاں بعد وہ قومی مفاد کی خاطر جدوجہد کرنے لگا۔ اس نے روسی کمیونزم کی سخت مخالفت کی۔ لہٰذا اب یہ سوشلسٹ نہیں تھا بلکہ سنڈیکلزم کا حامی بن گیا۔

نومبر ۱۹۱۹ء میں اٹلی کے عام انتخاب ہوئے۔ اٹلی پارلیمنٹ کی کل ۵۰۴ نشستوں میں سے ایک سو چھپن اسٹیٹ سوشلسٹوں کے ہاتھ آئیں۔ تو انہوں نے رضاکار تنظیم قائم کر کے ملک میں چاروں طرف انتشار اور بدامنی پیدا کر دی۔ فسطائیوں نے ان کا مقابلہ کر کے ان کی تمام سرگرمیوں کا خاتمہ کر دیا۔ ملک میں موسولینی کی فسطائی جماعت کا زور تھا۔ موسولینی کی جماعت نے سیاہ قمیص کو اپنی وردی قرار دیا۔ چنانچہ ۱۹۲۲ء میں انہوں نے روم پر پیش قدمی کر کے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ اس یلغار کو سیاہ قمیص والوں کی یلغار کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ شاہ اٹلی وکٹر عمانوئیل سوم نے ملک کو تباہ کن جنگوں سے محفوظ رکھنے کے لیے فسطائیوں کے سربراہ بنیٹو موسولینی کو وزیر اعظم مقرر کر دیا۔ اس نے فوری طور پر کابینہ تشکیل کی۔ فسطائیت نے حکومت پر فتح حاصل کر لی اور بادشاہ محض کٹھ پتلی بن گیا۔ اس طرح موسولینی کو اٹلی میں اقتدار حاصل ہوا۔

شہنشاہ ہیل سلاسی ۱۷۔ جولائی ۱۸۹۱ء کو پیدا ہوا۔ اچھی تعلیم پائی۔ خاصا عقلمند اور باوقار آدمی تھا۔ ۱۹۱۶ء سے نائب سلطنت رہا۔ ۱۹۲۸ء میں بادشاہ بنا۔

ملکہ زادیتو کی وفات کے بعد ۱۹۳۰ء پر شہنشاہ بن گیا۔ اس کے سامنے پروگرام تھا۔ اول ملک کو متحد رکھنا۔ پھر حد درجہ پسماندہ ملک کو عہدِ حاضرہ کے درجے پر لانا۔ نسلی اور مذہبی اختلاف بہت زیادہ تھے۔ نظامی رئیسوں کی روایات یہ تھی کہ الگ تھلگ رہیں۔ غلامی کے ساتھ ساتھ جہالت اور اوہام کا دور دورہ تھا۔ ۱۹۳۲ء میں ہیل سلاسی نے ارادہ کر لیا کہ وہ اپنی مملکت میں بردہ فروشی روک دے گا اور غلامی ختم کر دے گا۔ اس کے بعد اسے جمعیتہ اقوام کا رکن بنالیا گیا۔

ہندوستان کی سیاسی اور اقتصادی صورتِ حال پیشتر سے ابتر تھی۔ لیکن حبشہ اور اطالیہ کی جنگ نے اسے مزید متاثر کیا۔ مغربی ممالک سے مال کی درآمد قطعی محدود ہو گئی۔ جس سے اندرونِ ملک کی ہر شئے گرانی کا شکار ہو گئی۔ ہندوستان کی منڈیاں اور عوام اس کے متحمل نہیں تھے۔ سیاسی رہنما اور جماعتیں انتخاب میں مصروف تھیں۔ جس کے نتیجے میں یورپ کے دلالوں نے کافی فائدہ اٹھایا۔

پنجاب کونسل میں شہید گنج پر بحث

۱۱۔ نومبر کو پنجاب کونسل میں چودھری افضل حق نے اپنی تقریر کا آغاز کرتے ہوئے کہا (بجٹ پولیس کے اخراجات کے متعلق تھی) پولیس کے اخراجات منظور کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کیونکہ اس سے صوبے کو بالکل فائدہ نہیں ہے۔ ابھی شہید گنج کا واقعہ پیش آیا۔ پولیس موجود تھی۔ اس کا سارا ساز و سامان موجود تھا۔ لیکن حالات نے اس پر بھی نازک صورت اختیار کر لی۔ ان واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ نہ پولیس کی ضرورت ہے اور نہ ہی اس کے لیے بجٹ منظور کرنے کی۔ مسجد شہید گنج کے متعلق کافی عرصہ سے بے چینی پائی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں کافی وفود نے گورنمنٹ سے ملاقات کی۔ اور گورنمنٹ نے بھی اس امر کا یقین دلایا کہ مسجد نہیں گرائی جائے گی۔

مسٹر بائیڈ: "یہ غلط ہے۔ حکومت نے کب اور کن الفاظ میں وعدہ کیا تھا"؟

چودھری افضل حق: حکومت نے ان الفاظ میں تو وعدہ نہیں کیا تھا کہ مسجد نہیں گرائی جائے گی۔ لیکن یہ ضرور کہا ہے کہ سکھوں کے ایک وفد نے گورنر پنجاب کے ساتھ ملاقات کی اور یقین دلایا کہ مسجد مسمار نہیں کی جائے گی۔ لیکن اس کے باوجود ۸۔ جولائی کو جب مسلمانوں کی نمائندہ انجمن صورتِ حال پر غور کر رہی تھی کہ انہیں اطلاع ملی کہ مسجد مسمار کی جا رہی ہے۔ کیا

مسٹر بائیڈ: کیا آنریبل ممبر کو یہ معلوم ہے کہ وہ کن شرائط کے تحت وعدہ کیا گیا تھا"۔؟
چودھری افضل حق: "مجھے اس سے سروکار نہیں میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حکومت نے اس معاملے میں مداخلت نہیں کی۔ اگرچہ میرے پاس اس بات کا ثبوت نہیں۔ لیکن میرے مخبر نے مجھے بتایا تھا کہ رات دس بجے فوجی افسروں کو اس بات کا علم تھا کہ مسجد مسمار کی جانے والی ہے
مسٹر بائیڈ: "یہ سفید جھوٹ ہے۔" (اس لفظ کے خلاف ہاؤس میں احتجاج کیا گیا اور اس پر صدر کونسل کے کہنے پر آنریبل ممبر نے الفاظ واپس لے لیے۔)
چودھری افضل حق نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا:
"حکومت اس حیثیت میں اپنی پوزیشن واضح کرے کہ ریلوے کے اور از مسجد گرائے جانے سے پیشتر آئے یا بعد میں۔ لیکن مسجد گرانے میں سہولت بہم پہنچائی۔ اور حکومت نے اس کی امداد کی۔ کیونکہ اس موقعہ پر وہاں پولیس موجود تھی۔ لیکن اس کے باوجود اسے بروقت علم نہ ہو سکا۔ یہ واقعات ثابت کرتے ہیں کہ پولیس نے اس وقت کوئی کام نہیں کیا۔"
چودھری صاحب کی اس تقریر کے جواب میں چیف سیکرٹری حکومت پنجاب نے حکومت کی پوزیشن واضح کی کہ "یہ الزام غلط ہے۔ یہ درست ہے کہ سکھوں کے ایک وفد نے ڈپٹی کمشنر سے ملاقات کے دوران کہا تھا کہ مسجد نہیں گرائی جائے گی۔ اس بنیاد پر ڈپٹی کمشنر نے مسلمانوں کو یقین دلایا تھا کہ مسجد نہیں گرائی جائے گی۔ اس کے باوجود سکھوں نے مسجد کو گرانا شروع کر دیا۔ جس پر حکومت نے فساد کے پیش نظر پولیس اور فوج کو وہاں متعین کر دیا تھا۔ باقی رہا سکھوں کے بیانات تو حکومت اس کی ذمہ دار نہیں۔

مرزائیوں کی درخواست گذشتہ سال ۲۲۔ اکتوبر کو قادیاں احرار کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے جو تقریر کی۔ اس پر مقدمہ چلا اور انہیں چھ ماہ قید کی سزا ہوئی تھی۔ اس کے خلاف سیشن جج جی۔ ڈی کھوسلہ نے ۵۔ جون ۱۹۳۵ء کو اپنا تاریخی فیصلہ دیا تھا۔ مرزائیوں نے اس کے خلاف لاہور ہائیکورٹ میں اپیل دائر کی۔ ۱۱۔ نومبر ۱۹۳۵ء کو لاہور ہائیکورٹ کے جسٹس کولڈسٹریم نے مرزائیوں کی درخواست نگرانی کا فیصلہ سناتے ہوئے لکھا۔

"سیشن جج گورداسپور نے اپنے فیصلے میں گورنمنٹ (برطانیہ) اور مرزا قادیاں کے متعلق کچھ ریمارکس پاس کیے۔ جس پر گورنمنٹ اور خلیفہ صاحب دونوں نے اعتراض کیا۔ ہائی کورٹ میں دونوں نے درخواستیں دیں کہ ان ریمارکس کو فیصلہ سے حذف کر دیا جائے۔"

جسٹس کولڈسٹریم نے اس فیصلے میں سے گورنمنٹ کے خلاف ریمارکس نکالنے کی ضرورت نہ سمجھی لیکن اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے فیصلہ میں لکھا:

"سیشن جج کے روبرو جو شہادت ریکارڈ پر موجود تھی اس کی بنا پر جج حق بجانب نہ تھا کہ وہ ریمارکس پاس کرتا جس میں مندرجہ ذیل الفاظ شامل تھے۔

قادیانیوں کے افعال کے خلاف پولیس کو اطلاع دی گئی لیکن پولیس نے کوئی کارروائی نہ کی۔ وغیرہ، وغیرہ۔

قادیانیوں کے خلاف تین فقرے نکال دیے گئے۔ فاضل جج نے ان چودہ فقروں میں سے جس کے خلاف مرزا قادیان اور اس کے فرقے نے اعتراض کیا تھا۔ تین فقرے نکال دینے کا حکم دیا۔

۱۔ فاضل جج نے قادیانی مذہب نیوفینگلڈ (NEW FANGLED) نکال دیا۔ دوسرا فقرہ یہ تھا۔ مرزا نے عبدالکریم کی موت کی پیش گوئی کی۔ اس میں سے پیش گوئی کا لفظ نکال دیا گیا۔ تیسرا فقرہ مرزا نے کثیر مسلمانوں کو گالیاں نکالیں۔ اس فقرے کو اس لیے نکال دیا گیا کہ اس ریمارکس کے متعلق شہادت موجود نہیں ہے۔ یہ فقرہ بھی کہ مرزا صاحب پلومر کی ٹانک وائن استعمال کرتے تھے۔ اس فقرے کا مقدمے سے کوئی تعلق نہیں مرزائیوں کے اس مقدمہ کی پیروی سر تیج بہادر نے کی۔

پنجاب کونسل میں بحث کا دوسرا روز

۱۴۔ نومبر۔ پنجاب کونسل میں مسجد شہید گنج پر چودھری افضل حق کے بعد مولانا مظہر علی اظہر نے اپنی تقریر کے دوران کہا

"مسجد کے انہدام کی تمام تر ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے۔ اگر

حکومت چاہتی تو مسجد کو بچا سکتی تھی۔ لیکن حکومت کے ایک محکمہ (ریلوے) نے مسجد کی مسماری کے لیے کرین دیا۔ ایک طرف سکھوں کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ مسجد کو گرا دیں۔ دوسری طرف مسلمانوں کو کہا کہ وہ اس کے خلاف احتجاج کریں۔ اس طرح دونوں قوموں کو لڑا دیا۔

مولانا مظہر علی اظہر کے بعد پیر اکبر علی نے حکومت کے مطالبے کی مخالفت کرتے ہوئے کہا:

"شہید گنج کے واقعہ کے دوران پولیس بیکار اور نا اہل ثابت ہوئی ہے وہ اس روپے کی مستحق نہیں، جس میں بجٹ کا ذکر کیا گیا ہے۔"

صوبہ سرحد میں تلوار کی اجازت

پنجاب میں تلوار پر سے پابندی ختم ہونے کے بعد شمالی صوبہ سرحد کے عوام نے بھی یہ مطالبہ کیا کہ انہیں بھی سرِ عام تلوار لے کر چلنے کی اجازت ہونی چاہیے۔

۴۔ نومبر کو سرحد کونسل کا اجلاس شروع ہوا، تو آنریبل سر کنگھم ہوم ممبر نے خان بہادر غلام حیدر خاں کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ حکومت سرحد کے پاس اس مفہوم کی درخواستیں پہنچی ہیں کہ تلوار کو قانون اسلحہ سے مستثنیٰ کر کے اس کے رکھنے اور لے کر پھرنے کی عام اجازت دی جائے۔ لیکن حکومت نے ابھی تک اس سوال پر غور نہیں کیا۔

(اخبار) ترجمان سرحد پشاور، ۷۔ نومبر ۱۹۳۵ء

اس سے پیشتر ۲۴۔ اکتوبر کو احرار کانفرنس بام خیل (سرحد) میں منعقد ہوئی جس کی صدارت حضرت عبدالوارث پادشاہ نے کی، جس میں پشاور کے چیدہ چیدہ علماء نے شرکت کی اس کانفرنس کے آخری اجلاس میں حکومت سرحد سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ پنجاب کی طرح سرحد سے بھی قانونِ اسلحہ پر سے پابندی ختم کر دے۔

آخر ۱۱۔ نومبر کو صوبہ سرحد کی کونسل میں ملک خدا بخش کی قرارداد منظور ہو گئی۔ جس میں حکومت سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ تلوار کو اسلحہ ایکٹ سے مستثنیٰ قرار دے دے۔ اس قرارداد کے حق میں تمام مسلم ارکان نے ووٹ دیا۔ جبکہ غیر مسلم ممبران نے اس قرارداد

کی مخالفت کی۔

پھر مباہلہ کا چیلنج وسط ستمبر کی بات ہے کہ مرزائی مذہب کے لیڈر نے احرار کو مباہلہ کا چیلنج دیا تھا۔ اور جب احرار قادیاں پہنچے تو واویلا شروع کر دیا۔ مگر احرار رہناؤں کو پہنچنا تھا، وہ جا پہنچے۔ حکومت بھی خاموش رہی۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ لیکن نومبر کے وسط میں پھر بات چھیڑ دی اور پہلی خفت کو مٹانے کے لیے مرزائیوں نے ایک دوسرا چیلنج دے دیا۔ اور ساتھ ہی انکار بھی کر دیا۔ مگر احرار اسے منظور کر چکے تھے اور ۱۸۔ نومبر کی تاریخ بھی مقرر کر دی کہ حکومت درمیان میں آن کھڑی ہوئی۔ اور اس نے قادیاں اور اس کے اردگرد نو میل تک دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی۔ اس ضمن میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا حکم حسب ذیل ہے۔

"۱۸۔ نومبر۔ حکومت پنجاب کی ہدایت پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ گورداسپور نے زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطۂ فوجداری کے تحت حکم امتناعی جاری کیا کہ احرار کے ارکان ۱۸۔ نومبر ۱۹۳۵ء سے ۲۴۔ نومبر تک قادیاں سے نو میل کے فاصلے تک کسی مقام پر جمع نہ ہوں۔"

(ایسوسی ایٹڈ پریس)

آل انڈیا احرار کانفرنس کی صدائے بازگشت ۱۸۔ نومبر کو چودھری اسد اللہ خاں ایم ایل سی (برادر چودھری ظفر اللہ مرزائی) نے پنجاب کونسل میں سوال اٹھایا کہ تالاب چودھری مولا بخش کو احرار پولٹیکل کانفرنس کے لیے سیالکوٹ میونسپل کمیٹی نے کیوں صاف کیا اور اس پر روپیہ کس نظریے سے خرچ کیا۔ اگر کیا تو کیوں؟ اس سوال کے جواب میں ڈاکٹر گوکل چند نارنگ وزیر بلدیات نے کہا:

"میونسپل کمیٹی نے حفظان صحت کے طور پر یہ اقدام کیا ہے۔ جو ضروری اور اہم تھا۔ یہ جگہ بے مقصد اور بے کار تھی۔ جس کی صفائی نہ ہونے کے باعث علاقہ کے عوام کی صحت پر اثر پڑ رہا تھا۔"

تمغۂ خدمت ۱۹-نومبر کو حکومتِ ہند نے کوئٹہ کے مصیبت زدگان کے امدادی کاموں کے سلسلہ میں خطابات اور سندیں دینے کا اعلان کیا۔ اس سلسلے میں مجلس احرار کو بھی دعوت دی گئی۔ وائسرائے کے اس بلاوے پر غور کرنے کے لیے امرتسر میں مجلسِ احرار کا فوری اجلاس طلب کیا گیا۔ اس پر احرار رہنماؤں کا مؤقف

اجلاس کے دوسرے روز ۲۱-نومبر کو احرار ورکنگ کمیٹی نے قادیان اور اس کے اردگرد دفعہ ۱۴۴ پر غور کیا۔

چونکہ احرار ۱۸-نومبر کی تاریخ مقرر کر چکے تھے اور اس کی اطلاع ماتحت مجالس کو دی جا چکی تھی جس پر مختلف اضلاع سے احرار رضا کار دفتر مرکزیہ میں پہنچ رہے تھے۔ لیکن مرکز نے انہیں تاحکم ثانی قادیاں جانے سے منع کر دیا۔ اجلاس کی کارروائی شروع تھی کہ پولیس کی بھاری جمعیت نے تمام ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کو گھیرے میں لے لیا۔ جن میں سے حسب ذیل رہنماؤں اور کارکنوں سے نوٹس کی تعمیل کرائی گئی۔

شیخ حسام الدین، مولانا حبیب الرحمٰن، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا مظہر علی اظہر اور غلام نبی جانباز ——— نوٹس کی عبارت حسب ذیل تھی۔

"کریمنل لا امنڈمنٹ ایکٹ کے تحت ان حضرات کو نوٹس دیا جاتا ہے کہ وہ قادیاں میں نومیل کے اندر اندر داخل نہ ہوں" اور

دوسرا نوٹس تھا کہ:

"دفعہ ۱۴۴ کے مطابق حکم دیا جاتا ہے کہ ضلع گورداسپور میں ۲۴-نومبر یا اس کے کسی قریبی دن میں قادیان اور تحصیل بٹالہ و مضافات میں مباحثہ یا مناظرہ کے لیے کسی قسم کی کوئی مجلس منعقد نہ کریں"

ان نوٹسوں کی تعمیل کے بعد احرار ورکنگ کمیٹی نے کیا فیصلہ کیا۔ یہ بات پریس کو بتانا مناسب نہ سمجھی گئی۔ تاہم حکومت کو احرار کی اس خاموشی پہ شبہ گذرا کہ مستقبل قریب میں کوئی نئی آفت آنے والی ہے۔

ملک میں نئی اصلاحات کے پیشِ نظر حکومت اس وقت کسی نئی سیاسی تحریک کو مناسب نہیں سمجھتی تھی۔ چنانچہ آنے والے کسی طوفان کے خوف سے اس نے تحریک شہید گنج کو سمیٹنا شروع کیا۔ اگرچہ حکومت اپنی دانست میں اپنا کام ختم کر چکی تھی۔ جو اس نے اس تحریک سے لینا تھا۔ مگر اب یہ آگ بجھائے بجھتی دکھائی نہ دیتی تھی۔

نظر بندوں کی رہائی

۲۲۔ نومبر کے اخبارات میں سرکاری حوالے سے اطلاع شائع ہوئی کہ تحریک مسجد شہید گنج کے چار اسیر لیڈروں کو رہا کر دیا گیا۔ ان میں روزنامہ "سیاست" کے مدیر سید حبیب، میاں فیروز الدین احمد، ملک لال خاں، مولانا محمد شاہ شامل ہیں۔

ان حضرات کی رہائی پر (بقول روزنامہ انقلاب یکم دسمبر ۱۹۳۵ء) جو جلسہ ہوا۔ اس میں پانچ ہزار افراد جمع ہو سکے اور جب یہ رہنما گرفتار ہوئے تھے، تو ان کے احتجاجی جلسہ میں پچاس ہزار عوام شریک تھے۔

رہا شدگان نے اس جلسہ میں پھر اعلان کیا کہ حصولِ مسجد کے لیے دس لاکھ رضا کاروں کی ضرورت ہے۔

جیسے ہی حکومت کی منشا میں انقلاب آیا، اخبارات کی رائے بھی بدل گئی۔ تحریک مسجد شہید گنج کے دوران روزنامہ "انقلاب" غیر مسلموں کے خلاف جس تیزی سے آگے بڑھا سرکاری پالیسی کیا تبدیل ہوئی کہ اخبار مذکور کا مزاج بھی بدل گیا۔ ۳۔ دسمبر کے شمارے میں مدیرانِ انقلاب نے پنجاب کے ہندو، مسلمان اور سکھ عوام سے اپیل شائع کی کہ وہ پنجاب کی فضا کو مکدر نہ کریں۔ اور پیار و محبت سے رہنے کی اپیل کی۔

یہ اپیل اخبار مذکور میں ایک چوکھٹے کی شکل میں کئی روز شائع ہوتی رہی۔

۶۔ دسمبر کو یومِ شہید گنج منایا جانا تھا۔ مگر ۴۔ دسمبر کو امیر ملت کا اعلان آ گیا کہ یہ دن نہ منایا جائے۔

ایک اور نوٹس

۵۔ دسمبر کو امرتسر کے احرار کارکنوں اور رہنماؤں کو حکومت پنجاب کا ایک نوٹس موصول ہوا کہ:

"حسب ذیل حضرات ۱۴۴ کے تحت غیر معینہ مدت کے لیے قادیاں سے چار چار میل تک کسی اجتماع میں شریک نہ ہوں اور نہ ہی کوئی اجلاس منعقد کریں۔

مولانا عبدالغفار غزنوی۔ شیخ عبدالغفار اثر۔ کیپٹن محمد امیر خاں۔ غلام نبی جانباز۔ مولانا بہاء الحق قاسمی، مولانا عبدالکریم مباہلہ والے اور مولانا محمد سلیمان فاروقی۔

اس نوٹس کی نقول شہر کے تمام احرار دفاتر میں تقسیم کر دی گئیں۔

دفعہ ۱۸۸ اور ۱۴۴

لاہور ۱۳۔ دسمبر ایک غیر معمولی سرکاری اعلان مظہر ہے کہ ضلع گورداسپور میں دفعہ ۱۸۸ تعزیرات ہند کے تمام جرائم پولیس کے قابل دست اندازی ہوں گے۔ دفعہ ۱۸۸ تعزیرات ہند ایسے احکام کی خلاف ورزی کے متعلق ہیں جسے حکام مجاز نے باقاعدہ طور پر نافذ کیا ہو۔

مدیر سیاست کی معذرت

۱۳۔ دسمبر کو مولانا سید حبیب مدیر روزنامہ "سیاست" جو گذشتہ دنوں تحریک مسجد شہید گنج کے سلسلہ میں نظر بندی کے بعد رہا ہو کر آئے تھے ڈپٹی کمشنر اور انسپکٹر جنرل پولیس لاہور نے انہیں انتباہ کیا۔ اس کے جواب میں مدیر "سیاست" نے کہا:

"آج صبح آپ نے مجھے انتباہ کی تھی۔ ذیل کی چند سطریں جواب میں عرض کر رہا ہوں۔

۱۔ میں آپ کو اور آپ کے ذریعے حکومت کو یقین دلاتا ہوں کہ اخبار سیاست کا دفتر یا اس کے دفتر کا عملہ شہید گنج تحریک کے نام میں استعمال نہیں کیا جائے گا۔

۲۔ اگر اخبار سیاست جاری ہو گیا یا دوسرے الفاظ میں جب بھی جاری ہوا وہ بھی دوسرے اخباروں کی طرح معتدل انداز یا رویہ اختیار کرے گا

(روزنامہ "انقلاب" ۱۵۔ دسمبر ۱۹۳۵ء)

شہنشاہ حبشہ نے مصالحتی فارمولا مسترد کر دیا

۱۲۔ دسمبر حبشہ اور اٹلی کے درمیان جنگ میں بڑی طاقتوں سے

مداخلت کی اپیل کی گئی تھی۔ جس پر برطانیہ اور فرانس نے آگے بڑھ کر مصالحت کی جن تجاویز کو مناسب سمجھا تھا شہنشاہ حبشہ نے اس فارمولے کو مسترد کر دیا۔

احرار کی قادیان میں سول نافرمانی

حکومت کے اس فیصلے پر کہ احرار قادیان میں داخل نہ ہوں، احرار رہنماؤں نے اس حکم کو توڑنے کا فیصلہ کیا کہ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری ۲۔ دسمبر کو قادیان میں نمازِ جمعہ پڑھائیں گے اور واپس آجائیں گے۔ اگر حکومت نے مداخلت کی تو نمازِ جمعہ پر پابندی سمجھی جائے گی لہٰذا احرار اس حکم کو مداخلت فی الدین سمجھتے ہوئے اس کے خلاف تحریک چلائیں گے۔ نتیجہ خدا کے سپرد۔ اس فیصلے کے تحت حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری ۲۔ دسمبر صبح کو امرتسر سے روانہ ہو کر جب بٹالہ اسٹیشن پر پہنچے تو حکومت نے انہیں ایک نوٹس کے ذریعے قادیان میں داخل ہونے سے روکنا چاہا۔ لیکن وہ حسب الحکم جماعت، قادیان کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس وقت بٹالہ اسٹیشن پر ہزاروں مسلمانوں کا ہجوم تھا۔ جس نے حضرت شاہ صاحب کو محبت اور عقیدت کے پرجوش نعروں کے ساتھ قادیان روانہ کیا۔ پولیس بھی ریل کے اسی ڈبہ میں شاہ جی کے ساتھ آ بیٹھی۔ جیسے ہی گاڑی جینتی پور ریلوے اسٹیشن پر پہنچی۔ پولیس انسپکٹر نے آگے بڑھ کر شاہ جی سے استدعا کی کہ اس سے آگے دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی ہو گی۔ لہٰذا آپ یہیں اتر جائیں، لیکن شاہ جی نے پولیس کے اس حکم کو ماننے سے انکار کر دیا اور سفر جاری رکھا۔ آخر پولیس نے انہیں گرفتار کر لیا۔

یومِ حجاز

۱۲۔ دسمبر کو ہندوستان بھر میں مجلس احرار کے صدر مولانا حبیب الرحمٰن نے احرار کارکنوں اور دیگر مسلمانوں کو حکم دیا کہ ۲۰۔ دسمبر کو یومِ حجاز منائیں اور ان ٹھیکوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں جو حکومت سعودیہ نے غیر ملکی کمپنیوں کو حجاز میں کان کنی کے لیے دیئے ہیں۔

کرفیو اٹھا لیا گیا

۱۸۔ دسمبر کے اخبارات میں اعلان کر دیا گیا کہ اب لاہور کی فضا درست ہے۔ لہٰذا آج رات بارہ بجے کے بعد کرفیو ختم سمجھا جائے۔

خاکسار لیڈر کا اعلان

۱۴۔دسمبر ۱۹۳۵ء کو تحریک شہید گنج کے سلسلے میں گورنر پنجاب نے ایسی تمام جماعتوں کو انتباہ کیا جو فوجی قسم کی وردی یا پریڈ وغیرہ کرتی تھیں۔اس پر خاکسار تحریک کے لیڈر علامہ عنایت اللہ المشرقی نے گورنر پنجاب کو حسب ذیل مراسلہ تحریر کیا۔

"۱۱۔دسمبر کو لاہور پہنچ کر میں نے ہز ایکسی لنسی کے اس اعلان کو بغور پڑھا ہے جو آپ نے لاہور کی فرقہ وارانہ کشیدگی کے متعلق ۱۰۔دسمبر کو کیا۔اور جس میں ان انجمنوں کی طرف بھی اشارہ تھا، جو سیاسیانہ طور پر متحرک ہیں۔میں امید کرتا ہوں کہ آپ کا انتباہ خاکسار جماعت کے متعلق نہیں، جس کا روز اول سے مقصد وحید حکومت سے الجھاؤ نہیں اور جس کے پیش نظر ہندوستان کی تمام قوموں میں اتحاد اور اتفاق پیدا کرنا ہے۔

خاکسار تحریک امن اور احترام قانون قائم رکھنے کے لیے حکومت کو ہر حیثیت میں امداد دینے کو تیار ہے۔جیسے کہ کئی بار اعلان کیا جا چکا ہے۔

اس وقت لاہور کے افسوسناک حالات کو پیش نظر رکھ کر میں نے خاکساروں کو ایسی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے منع کر دیا ہے، جس کا غلط مفہوم لیا جا سکتا ہو۔میں امید کرتا ہوں کہ میرے ان احکام کے بعد ہز ایکسی لنسی کو خاکسار تحریک کے متعلق کامل اطمینان ہو جائے گا۔

(روزنامہ "انقلاب"۔۲۱۔دسمبر ۱۹۳۵ء)

احرار، کانگریس کی گولڈن جوبلی میں شامل نہ ہوں

۲۲۔دسمبر۔مولانا حبیب الرحمٰن صدر مجلس احرار ہند نے تمام احرار کارکنوں کو ہدایت کی کہ وہ کانگریس کی گولڈن جوبلی میں شریک نہ ہوں۔

صدر مرکزیہ کے علاوہ اس اپیل پر ان رہنماؤں کے بھی دستخط تھے۔

مولانا مظہر علی اظہر۔چودھری افضل حق، سید محمد داؤد غزنوی، شیخ حسام الدین، ماسٹر تاج الدین انصاری اور صاحبزادہ فیض الحسن۔

باوجودیکہ تحریک مسجد شہید گنج میں احرار کی مخالفت انتہا کو پہنچ چکی تھی، تاہم رجعت پسند گروہ کو احرار سے ابھی خطرہ تھا کہ یہ لوگ آئندہ انتخاب میں جس انداز سے سامنے آتے ہیں اور پنجاب میں جس جماعت سے ان کا ٹکراؤ ہوگا، وہ صرف مجلس احرار ہے۔ چنانچہ ان دنوں مخالفین احرار آل انڈیا احرار پولٹیکل کانفرنس کی اس قرارداد کو اچھال رہے تھے، جس میں کہا گیا تھا کہ رجعت پسندوں کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ نیز حجاز کی قرارداد پر بھی بحث جاری تھی۔ انہی دنوں لاہور کے انگریزی روزنامہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ" نے مجلس احرار کی سیاست پر ایک اداریہ لکھا جسے ۲۷۔ دسمبر کے روزنامہ "انقلاب" نے نقل کیا۔

اقبال کا استعفیٰ!

کفر پر سے جونہی ملمع کی چادر اتری حقیقت واضح ہوگئی کہ اسلام کے روپ میں قادیانی طبقہ اسلام نہیں بلکہ ایک باطل گروہ ہے۔ اس مارِ آستین کو کچلنے کے لیے جو ہاتھ اٹھا اور جو قدم آگے بڑھے وارثانِ باطل نے وہ ہاتھ اور قدم نہ صرف روک دیے بلکہ انہیں طوق سلاسل میں جکڑ دیا۔ بالآخر وہ وقت آن پہنچا کہ سنڈاس کو عریاں کر دیا گیا۔ اور اس پر بکھری ہوئی کاغذی پھول پتیاں بیکار کر دی گئیں۔ جونہی یہ تعفن پھیلا۔ سعید روحوں کے دم گھٹنے لگے۔

مرزائیوں کے اخبار "الفضل" نے اپنی ۱۱۔ جولائی ۱۹۲۵ء کی اشاعت میں جب اس حقیقت کا اعلان کیا:

"یہ قادیان بستی ہے اُبنی کی بستی، یہ تختِ گاہِ رسولِ حق ہے۔ خدائے قادر کا یہ وعدہ ہے۔ یہ بلا دارالامان رہے گا۔ ہزاروں عذاب آئیں دنیا میں۔ لاکھ شہر برباد ہوں مگر یہ شہر احمد نبی یقیناً بحفظِ دارالامان رہے گا۔

قادیاں مکہ ہے۔ فرق اس کی اینٹوں میں ہے!"

کفر کے اس واضح چیلنج پر دانشور عقل و خرد کے ناخن لے کر سوچنے لگ پڑے کہ پیتل سونا کیسے ہوسکتا ہے۔ مسکر، زرگر کیسے بن بیٹھا۔ گندگی کا پھول چنبیلی اور گلاب کی ہمسری کیوں کرنے لگا۔ اس سوچ میں ڈاکٹر اقبال نے کہا ؎

پنجاب کے اربابِ نبوۃ کی شریعت ۔ کہتی ہے یہ مومن پارینہ ہے کافر

(ضربِ کلیم مصنفہ ڈاکٹر اقبال)

ضربِ کلیم سے نکل کر اقبال جب پیغمبرِ اسلام کے ارشاد پر پہنچے
"انا خاتم الانبیین، لانبی بعدی"
تو بے اختیار کہہ اٹھے:

"میری رائے میں قادیانیوں کے سامنے صرف دو راہیں ہیں یا وہ "بہائیوں" کی تقلید کریں یا پھر وہ ختم نبوۃ کی تاویلوں کو چھوڑ کر اس اصول کو اس کے پورے مفہوم کے ساتھ قبول کریں۔ ان کی جدید تاویلیں محض اس غرض سے ہیں کہ ان کا شمار حلقۂ اسلام میں ہو۔ تاکہ انہیں سیاسی فوائد پہنچ سکیں۔"

("اقبال اور سیاست ملی" مصنفہ رئیس الاجعفری ص۲۲۲)

علامہ اقبال مرحوم نے مرزائیت کو سمجھنے میں گو بڑی دیر کی۔ تاہم دیر آید درست آید وہ ۱۹۳۵ء میں اس راہ پر آ نکلے کہ مرزائیت ایک خوفناک اژدہا ہے جو اسلام کی گل پوش وادیوں میں زہر پھیلا رہا ہے۔ اس زہر کا تریاق اسی میں ہے کہ اس گروہ کو مسلمانوں سے الگ کر دیا جائے تاکہ کفر کے فریب میں گنجائش نہ رہے۔ چنانچہ معروف انگریزی اخبار "اسٹیٹس مین" کے ۱۰ رجون ۱۹۳۵ء کے ایک مضمون کے جواب میں اقبال نے ایک طویل مضمون لکھا، جس میں پنڈت جواہر لال نہرو سے اقبال کی قلمی لڑائی دیر تک جاری رہی۔

۲۲ نومبر ۱۹۳۵ء کو ڈاکٹر سر محمد اقبال انجمن حمایت اسلام (لاہور) کی صدارت سے بھی مستعفی ہو گئے۔ کیونکہ اس ادارہ میں مرزائیوں کو بحیثیت مسلمان بلند مقام حاصل تھا۔ جو اقبال کی نظر میں مسلمان نہیں تھے۔ لیکن انجمن نے انہیں پناہ دے رکھی تھی۔

استعفیٰ کے الفاظ حسبِ ذیل ہیں۔

"ڈیر شیخ عظیم اللہ!

السلام علیکم۔ میں نے آپ سے اور شیخ گلاب دین سے زبانی گفتگو میں عرض کیا تھا کہ جو تحریر انجمن کی طرف سے میرے استعفیٰ کے متعلق اخباروں میں شائع ہوئی ہے اس کا شائع ہونا ٹھیک نہ تھا۔ اگر میں اس کی تردید کرتا تو شاید اس کے نتائج انجمن کے حق میں اچھے نہ ہوتے اس لیے میں خاموش ہی رہا۔

آپ نے میری رائے سے اتفاق کیا تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں نے علالت کی بنا پر استعفیٰ دیا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اور بھی وجوہات تھے جن کو میں نے محض اس وجہ سے نظر انداز کر دیا تھا کہ ان کی اشاعت سے انجمن کو نقصان پہنچنے کا احتمال تھا۔ اس واسطے اس خط میں بھی ان کو بیان کرنے سے احتراز کرتا ہوں۔ اور میں صرف اسی پر اکتفا کرتا ہوں کہ انجمن کے موجودہ حالات میں میں صدارت کا بارِ گراں نہیں اٹھا سکتا۔ آپ مہربانی کر کے جنرل کونسل سے میری طرف سے استدعا کریں کہ میرا استعفیٰ قبول کر کے مجھے ممنون فرما دیں۔

میں نہیں چاہتا کہ میری صدارت میں انجمن عام مسلمانوں میں اپنا وقار کھو دے اور میں اس بے اعتمادی کا کوئی علاج نہ کر سکوں۔ والسلام

(دستخط) محمد اقبال ۲۲/۱۱/۳۵"

علامہ اقبال کے اس خط اور استعفیٰ پر انجمن ہذا میں کافی دیر بحث رہی۔ بالآخر ۱۵ دسمبر ۱۹۳۵ء کو علامہ اقبال کا استعفیٰ منظور کر لیا گیا۔

دوسری اور تیسری گرفتاری

۶۔ دسمبر کو مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی گرفتاری کے بعد مجلس احرار نے تحریک سول نافرمانی کا آغاز کر دیا لیکن اسے صرف جمعہ کی نماز تک محدود رکھا۔ چونکہ قادیان میں نمازِ جمعہ پر پابندی تھی۔ لہٰذا احرار کے نزدیک یہ مداخلت فی الدین تھی۔ لہٰذا اس پابندی کو ختم کرنا احرار کے مذہبی مقاصد میں تھا۔ دوسرے جمعہ یعنی ۱۳۔ دسمبر کو قادیان میں نماز جمعہ کے لیے مولانا ابوالوفا شاہجہان پوری کو منتخب کیا گیا۔ چنانچہ حسب فیصلہ مولانا ابوالوفا شاہجہانپوری امرتسر سے قادیان جانے کے لیے بذریعہ ریل روانہ ہوئے۔ مقامی جماعت نے راقم کو مولانا کے ساتھ بٹالہ تک بھیجا۔

گذشتہ جمعہ شاہ جی کی گرفتاری کے بعد عدالت نے انہیں تین ماہ قید سخت اور پچاس روپے جرمانہ کی سزا دی تھی۔ راقم اس وقت بھی شاہ جی کے ساتھ تھا اور پولیس کی آنکھ بچا کر قادیان پہنچ کر نمازِ جمعہ پڑھا دی۔ پولیس کو اس بات کا بڑا غصہ تھا۔ چنانچہ جیسے راقم مولانا ابوالوفا شاہجہانپوری کے ساتھ بٹالہ اسٹیشن پر پہنچا۔ مولانا کے ساتھ دوسرا نوٹس راقم کو بھی دے دیا

گیا کہ جانباز قادیان نہیں جا سکتے۔ لیکن راقم نے اس حکم کو غیر شرعی سمجھ کر جماعتی فیصلے کے مطابق ماننے سے انکار کر دیا اور نوٹس کو پولیس کے روبرو پھاڑ دیا۔ اس پر مولانا ابوالوفا شاہجہانپوری اور مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ ساتھ ہی عدالت کے سامنے پیش کر دیا، جس نے تین ماہ قید اور پچاس روپے جرمانہ۔ عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں ایک ایک ماہ مزید قید کا حکم سنایا۔ ساتھ ہی راقم کو بی کلاس میں رکھنے کا حکم دیا گیا۔ سزا کے بعد ہمیں گورداسپور ڈسٹرکٹ جیل بھیج دیا گیا۔ وہاں شاہ جی کے ساتھ ملاقات ہو گئی۔

نمازِ جمعہ پر پابندی کے سلسلہ میں یہ تیسری گرفتاری تھی۔

صاحبزادہ فیض الحسن کا تقرر برائے سالارِ پنجاب

مجلس احرار ان دنوں دو طرفہ لڑائی لڑ رہی تھی۔ ایک طرف تحریک شہید گنج میں پنجاب کے رجعت پسندوں سے اور دوسری طرف قادیانیوں سے مڈبھیڑ ہو چکی تھی۔ اگرچہ اس لڑائی میں حکومت پنجاب براہ راست دخیل تھی۔ تاہم لڑائی کا رخ مرزائیوں کی طرف تھا۔ ایسے میں مجلس احرار نے اپنی عسکری تنظیم کو نئے انداز سے ترتیب دینا شروع کیا اور اس کے لیے خانقاہ آلومہار (ضلع سیالکوٹ) کے سجادہ نشین سید فیض الحسن شاہ صاحب کو سالارِ پنجاب منتخب کیا۔ جبکہ مرکز کے سالار شیخ حسام الدین تھے۔
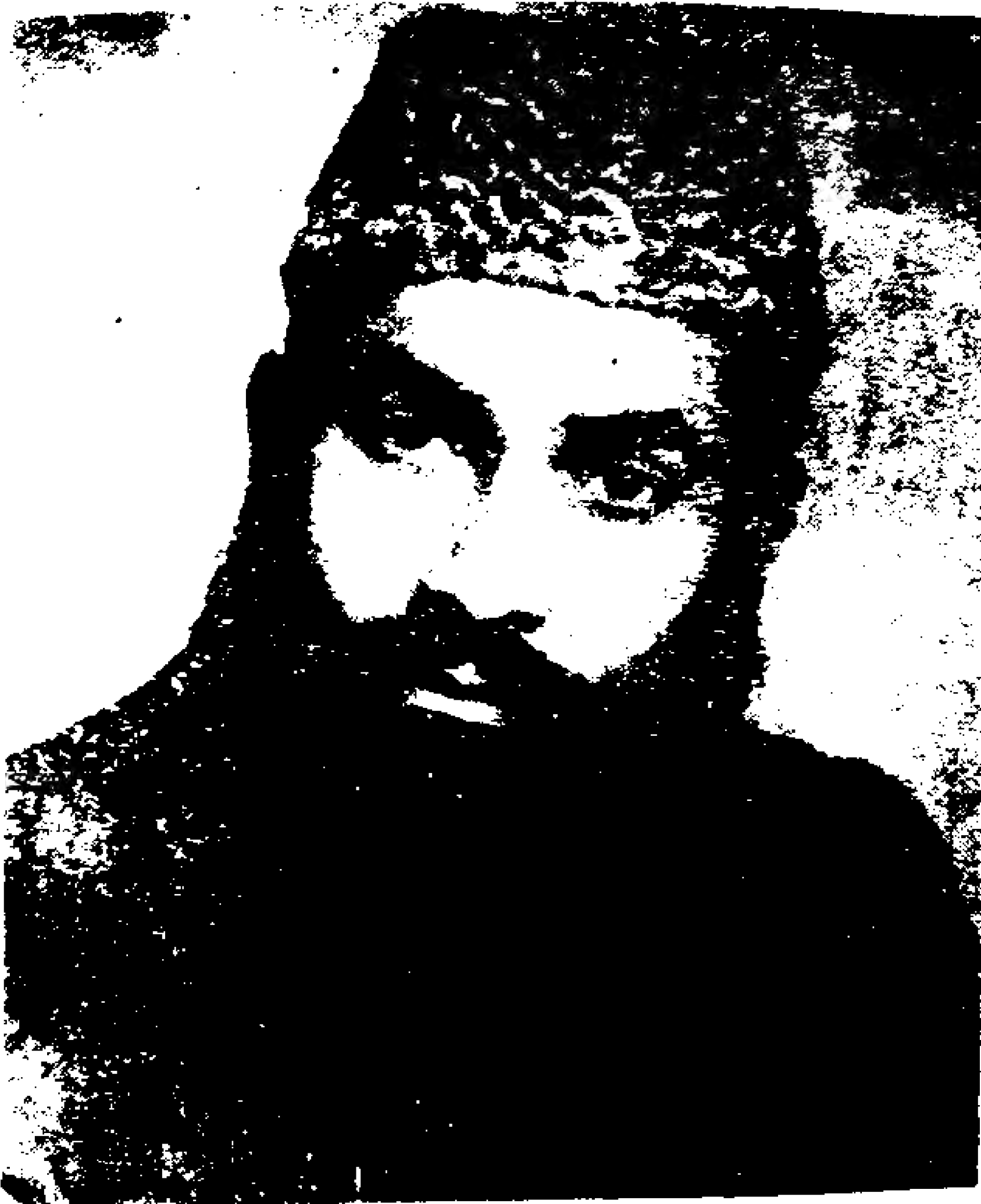
صاحبزادہ فیض الحسن ۱۹۳۲ء میں مجلس احرار میں داخل ہوئے تھے۔ ان

صاحبزادہ سید فیض الحسن شاہ

کی قابلیت، سوچ اور فکر کے مطابق انہیں احرار ورکنگ کمیٹی میں لے لیا گیا تھا۔ اور ان کے مفید مشورے سے جماعت کے لیے معاون ثابت ہوئے۔

صاحبزادہ فیض الحسن ۱ مارچ ۱۹۱۱ء میں سید غلام حسین شاہ صاحب سجادہ نشین آلو مہار کے ہاں پیدا ہوئے بی اے تک تعلیم سیالکوٹ مرے کالج میں حاصل کی۔ ۱۹۳۳ء میں فارغ ہوئے تعلیم کے دوران تحریک کشمیر زوروں پر تھی اور اس کا مرکز سیالکوٹ تھا۔ صاحبزادہ فیض الحسن ان دنوں اکثر احرار رہنماؤں سے ملتے رہے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد انہوں نے باقاعدہ احرار میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔

صاحبزادہ صاحب کردار اور گفتار کے غازی تھے۔ وہ جب تک احرار سے وابستہ رہے برطانوی سامراج ان کے خلاف کئی بہانے تلاش کرتا رہا۔ لیکن ان کی جرأت ایمانی نے دشمن کو ہر موڑ پر شکست دی۔ اس دوران ان کی منزل کے راستے میں علاوہ دیگر مصائب کے جیل خانہ بھی آیا۔ لیکن قفس کی تیلیاں منزل کو اوجھل نہ کر سکیں۔

پنجاب کے روائتی پیروں سے الگ تھلگ انہوں نے اپنے لیے انفرادی مقام حاصل کیا۔ حالانکہ مشاطۂ فطرت نے ان کے بناؤ سنگھار میں کہیں بخیلی سے کام نہیں لیا۔ مضبوط جسم، سرو قد، کھلے گندمی رنگ کے چہرے پر چشم آہو نے ایسی بہار یا اندھیر رکھی تھی کہ الامان الحفیظ۔ سہ

اکھاں یار دیاں توبہ معاذ اللہ
جنویں بھریاں پھرن دیوانیاں نی

اس پر کردار کا یہ عالم کہ جس راہ سے گذر جاتے آہٹ تک نہ ہوتی تھی انہی اوصاف کی بنا پر جماعت نے انہیں عسکری ذمہ داریاں سونپ دیں۔ جسے انہوں نے خوب نبھایا۔ مگر یہ ان دنوں کی بات ہے جب آتش جوان تھا۔ گو آج بھی کھنڈر بتا رہے ہیں کہ عمارت عظیم تھی۔ بہر طور جب تک مجلس احرار میں رہے انوب رہے۔

چوتھی گرفتاری

مجلسِ احرار کی یہ انفرادی اور محدود سول نافرمانی کی تحریک اجتماعی یا ہنگامی تحریک نہیں تھی۔ اس کی نوعیت انگریز کے اس قانون کی خلاف ورزی تھی، جو شرعی فرائض کے راستے میں دیوار بن گیا تھا۔ ورنہ قادیانی گروہ کی کیا حیثیت تھی

جیسے جیسے جمعہ کا دن قریب آتا لوگ اپنی جگہ تیار ہو کر امرتسر ریلوے اسٹیشن اور بٹالہ ریلوے اسٹیشن پر ہجوم در ہجوم جمع ہو جاتے۔ اس طرح تحریک آہستہ آہستہ آگے بڑھتی رہی ۲۰۔ دسمبر کو لاہور کے ایک کارکن محمد حسین سیلفی کا نام سامنے آیا کہ وہ لاہور سے امرتسر پھر پروگرام کے تحت قادیان پہنچ کر نماز جمعہ پڑھائیں۔ لیکن انہیں بٹالہ سے آگے جینتی پور ریلوے اسٹیشن پر گرفتار کر لیا گیا

تحریک ہذا کے قیدی، گورداسپور ڈسٹرکٹ جیل میں رکھے جاتے۔ لیکن حضرت امیر شریعت کو یہاں سے تبدیل کر کے لاہور سنٹرل جیل پہنچا دیا گیا۔

احرار کی انوکھی جسارت

حریف کو مات دینے کے لیے سیاسیات کی سوچ میں بعض ایسی راہیں آتی ہیں۔ جس سے دشمن تو بہرحال سٹپٹاتا ہے لیکن ضمیر غیر مطمئن رہتا ہے۔ ویسے بھی عشق اور جنگ کے میدان میں تخریب کی ہر تدبیر کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ حریف اور رقیب کو جن اطوار سے بھی شکست دی جائے بر انہیں پھر قادیان تو ایسی بستی تھی جہاں کے جھوٹے وقار نے وہاں کی مظلوم آبادی کو ہراساں کیے ہوا تھا۔ مذہب اور سیاست ان کی جیبی گھڑی تھی۔ برسر اقتدار مرزا کی خاندان کا کوئی فرد اگر بازار سے گزرتا تو اس کی پذیرائی میں سارا بازار سر و قامت کھڑا ہو جاتا۔ مرزا غلام احمد کا خاندان نہیں بلکہ جارج پنجم کی اولاد ہے۔ جس کی سواری قادیان کے کوچہ و بازار سے گذرے تو آبادی کے ہر فرد پر لازم تھا کہ اس کے احترام میں اپنی جگہ کھڑا ہو جائے۔ خواہ وہ غیر قادیانی ہی کیوں نہ ہو۔ اس ڈرامے کے ایکٹروں کا یہ مصنوعی لباس اتار کر انہیں سرعام ننگا کرنا بھی احرار کے نزدیک اسلام اور انسانیت کی بڑی خدمت تھی۔

ان دنوں ماسٹر تاج الدین انصاری قادیان میں دفتر احرار کے انچارج تھے۔ ملمع سازی کی اس دوکان کو اجاڑنے اور پیتل کو سونے کے بھاؤ بیچنے والے ان سلی بازوں کو بے نقاب کرنے کے لیے ماسٹر جی نے ایک منصوبہ بنایا۔ جس کے تحت قادیان کے ایک نوجوان محمد حنیف کو جو جیک سنگوں کا لڑکا تھا، تیار کیا۔ اس کے ذمہ یہ لگایا کہ وہ مرزا بشیر الدین محمود خلیفہ قادیان کے بھائی شریف احمد کو جب وہ بازار میں نکلے تو سرعام پیٹ ڈالے۔ اور

موقعہ واردات سے فرار ہو جاتے۔ باقی دیکھا جائے گا۔ چنانچہ اس سکیم پر عمل پیرا ہوتے ہوئے محمد حنیف نے وقت کا جائزہ لیا کہ مذکورہ آدمی کب بازار میں نکلتا ہے۔ جب اسے گرد و پیش کا اندازہ ہو گیا تو ایک دن حنیف ہاکی سے مسلح مرزائیوں کی مسجد اقصیٰ کے قریب کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں شریف احمد سیاہ اچکن پہنے سنہری کلاہ پر سفید پگڑی باندھے اسفید شلوار، پٹینٹ کی سیاہ گرگابی اور ہاتھ میں چھڑی لے کر قادیاں کے مین بازار میں تفریح کے لیے نکلا۔ ابھی وہ اپنی شاہی رفتار سنبھال ہی رہا تھا کہ ڈیوٹی پر کھڑے محمد حنیف نے ہاکی شریف احمد کی دونوں ٹانگوں کے درمیان اڑا کر اسے ایسی ٹھنی دی کر وہ منہ کے بل گرا۔ اور پھر اوپر سے تین چار ہاکیاں اس کے چوتڑوں پر رسید کر دیں اور بھاگ نکلا۔

یہ سارا کچھ اس قدر عاجلانہ طور پر ہوا کہ بازار کے لوگ اس انہونی کارروائی پر ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ گئے۔ آن کی آن میں یہ خبر قصر خلافت سے ہو کر قادیان میں پھیل گئی کہ احرار والوں نے شعائر اللہ کی توہین کر دی۔ گویا شریف احمد کے چوتڑ شعائر اللہ تھے۔ (اللہ کی نشانی) نعوذ باللہ — سارے شہر میں کہرام مچ گیا۔ مرزائیوں کے گھر میں صف ماتم بچھ گئی۔ قریباً ایک صدی کا دام فریب جس کی طنابیں ابلیس نے تھام رکھی تھیں۔ تار تار ہو کر بکھر گیا۔ عزت و احترام کا کاغذی پھول پاؤں تلے مسل دیا گیا۔ جھوٹی نبوت کے قصر خلافت کو ایک فقیر نے ایسا پتھر مارا کہ لات و ہبل کی بنیادیں ہل گئیں۔

اب ملزم کی تلاش شروع ہوئی۔ پولیس نے دفتر احرار کو اپنی تفتیش کا مرکز بنا کر ماسٹر تاج الدین کی نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر ملزم کو ڈھونڈنا چاہا۔ مگر یہ تو بحر قلزم تھا۔ یہاں ان چھوٹی موٹی چیزوں کا اتہ پتہ کہاں مل سکتا تھا۔ قادیاں سے باہر جانے والے تمام راستے مسدود کر دیے گئے لیکن ہوائیں بھی ملزم کی بو سونگھنے میں ناکام رہیں۔ مرزائیوں کی اپنی سی آئی ڈی اور ضلعی انتظامیہ مسلسل تلاش کے بعد جب مایوس ہو چکیں تو رات کے پچھلے پہر محمد حنیف کو قادیان سے نکال کر صبح ہونے تک پٹھانکوٹ پہنچا دیا گیا اور عدالت سے اس کی ضمانت کرا لی گئی۔

اب محمد حنیف قانون کے حصار میں تھا۔ مرزائی اسے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے۔ مگر دل ہی دل میں زہر کے گھونٹ پی رہے تھے۔ قادیاں پہنچ کر حنیف کو کچھ رقم دے دی گئی جس سے وہ منڈی سے آموں کا ٹوکرا خرید لاتا اور مرزائی محلوں میں فروخت کرتا۔ مرزائی عورتیں آم

خریدنے کے بہانے حنیف کو دیکھتیں، اور اس طرح آدھ گھنٹے کے اندر وہ آموں کا ٹوکرا فروخت کر کے دوسرا لے آتا تمام دن یہی شغل رہتا۔ حنیف دن بھر بھیک مانگ کر مشکل سے پیٹ پالتا تھا۔ مگر اب وہ اچھا خاصا خوانچہ فروش بن گیا اور مزے سے روزی کمانے لگا۔ کچھ دنوں تو یہ سلسلہ رہا۔ آخر جمعہ کے روز بشیر الدین محمود نے اپنی تقریر میں کہا:

"(مرزائیو) تمہیں شرم نہیں آتی کہ تم لوگ اس آدمی سے سودا خریدتے ہو۔
جس نے کل سرِ عام شعائر اللہ کی توہین کی تھی"۔

اس پر مرزائی عورتیں حنیف سے آم تو نہ خریدتیں مگر چپکے سے دروازے کی دراڑوں سے حنیف کو دیکھ ضرور لیتیں۔ آخر دو ماہ مقدمہ چلنے کے بعد محمد حنیف کو چھ ماہ قید کی سزا ہو گئی۔ اس دوران مقامی جماعت اس کے اہلِ خانہ کی مالی امداد کرتی رہی۔

تحریک جمعہ کے دوران راقم جب ۱۴۴ کی خلاف ورزی کے جرم میں سزا پاکر گورداسپور جیل پہنچا تو یہاں محمد حنیف سے ملاقات ہو گئی۔ تب اس سے دریافت کیا کہ تم شریف احمد پر حملہ کرنے کے بعد کہاں جا چھپے تھے۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا "قادیانیوں کی مسجد اقصیٰ کے برابر والے مکان میں تھا۔ یہ ایک معروف مرزائی کا مکان تھا۔ دو دن اور تین راتیں اسی جگہ رہا۔ ان دنوں مجھے کھانا بھی اچھا ملا، اور آرام بھی۔ پولیس اور خود مرزائیوں کو اس پر شبہ تک نہ ہو سکا۔ تیسری رات کے آخری حصے میں مولوی رحمت اللہ (مہاجر) اور ان کا ایک ہمراہی مجھے قادیان سے پیدل بٹالہ لے کر پہنچے۔ یہاں ہم حاجی عبدالرحمٰن رئیس بٹالہ کے گھر رہے۔ شام ہونے سے ذرا پہلے یہاں سے چار نوجوان مجھے لاری کے ذریعے پٹھانکوٹ لے گئے اور ایک وکیل نے میری ضمانت کرا دی۔

دوسری جسارت

دامِ تلبیس میں آنے سے پیشتر مرزا غلام احمد اور اس کا دستِ راست حکیم نورالدین بھیروی عقیدتاً غیر مقلد تھے۔ اسلام سے ہٹ کر اپنے باطل مذہب (مرزائیت) کی بنیاد اٹھانے کے بعد تک موصوف اسی عقیدے پر ڈٹے رہے۔ یہی وجہ تھی کہ قادیان میں کوئی تہوار، یہاں تک کہ عید میلاد النبی بھی منانا جرم تھا۔ اثنا عشری

ﻟﮧ۔ تاریخ میں اس کا کافی ثبوت ہے لیکن میں اسے غیر متعلقہ سمجھ کر نظرانداز کر رہا ہوں۔ مصنف

فرقہ کے لوگ سال ہا سال کی جدوجہد کے باوجود یہاں تعزیہ نکالنے میں ناکام رہے۔
گو مجلس احرار میں انگریز اور مرزائی دشمنی کے باعث ہر عقائد لوگ جمع تھے۔ مگر اکثریت اہل سنت کی رہی، جن کے نزدیک عزہ داری جائز نہیں۔ لیکن عشاق جب صحرانوردی کے لیے نکلتے ہیں تو انہیں پھول اور کانٹوں دونوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ جگر مراد آبادی نے اسے یوں کہا ہے۔ ؎

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کیے جا رہا ہوں میں

پنجاب کے معروف صوفی شاعر سید بلھے شاہؒ نے اسی مفہوم کو اپنے انداز میں کہا ہے۔ ؏

سانوں نچ نچ یار نوں مناؤ نا پے گیا

بہر طور عشق اور محبت میں کا ہے ایسی راہیں آتی ہیں کہ قدم اٹھتے نہیں اٹھائے جاتے ہیں۔ جیسے کہ غالب کہتے ہیں۔ ؎

اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل
ہم کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گئے

عقیدۂ ختم نبوۃ کی حفاظت میں قادیانی حصار کو توڑنا اسلام کا بنیادی حصہ تھا۔ کفر کا یہ قلعہ برطانوی پناہ میں تھا۔ اس میں دراڑ ڈالنا، جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ احرار نے ہر رخ سے اس پر یلغار اور حملہ مناسب سمجھا، تاکہ یہ بت ٹوٹ جائے اور اس کی پرستش سے لوگوں کے ایمانوں کی حفاظت ہو سکے۔

سال رواں کے دم توڑتے دنوں کی بات ہے کہ ماسٹر تاج الدین انصاری کی تجویز پر دینا نگر، (ضلع گورداسپور) سے شیعہ رہنما مظفر علی شمسی کو قادیان بلوایا گیا تاکہ محرم کے دنوں قادیان میں گھوڑا نکالنے کا اہتمام کیا جا سکے۔ چنانچہ اندر خانہ اس کی تیاریاں شروع کر دی گئیں۔ اس کے لیے آسمان کے کون کون سے تارے توڑنے پڑے۔ سمندر کی کن گہرائیوں سے موتی نکالنے پڑے اور پہاڑوں کا سینہ چیر کر کیونکر راستہ ہموار کیا گیا۔ یہ راز سربستہ ہے لیکن دسویں محرم کو قادیان کی تاریخ میں پہلا دن تھا، جب اس کے بازاروں

سے گھوڑے کا جلوس گذر رہا تھا۔ اس کی رہنمائی مظفر علی شمسی کر رہے تھے۔

ماتم گساروں کے گرد پولیس کے ہمراہ احرار سرخپوش بھی جلوس کے ساتھ تھے۔ شہر کے ہندوؤں اور سکھوں نے اپنے محلوں میں پانی کی سبیلیں لگائیں۔ قادیاں کے مسلمانوں نے اہل جلوس کی تواضع مٹھائی اور ٹھنڈے پانی سے کی۔ دن بھر شہر میں گھوم پھر کر گھوڑے کا جلوس نماز مغرب کے قریب نہایت امن اور سکون سے ختم ہوا۔

قصر خلافت کے کنگرے اور قادیانیوں کے دل اس واقعہ کو کس طرح برداشت کر سکے یہ بحث کا دوسرا رخ ہے۔ لیکن شریف احمد پر حملہ اور قادیاں میں گھوڑے کے جلوس نے نبوۃ باطلہ کے تمام وقار کو مٹی میں ملا دیا۔ اور قادیاں کی رہی سہی ساکھ تحریک جمعہ پر پابندی نے اڑا دی۔

پانچویں گرفتاری

حسب دستور نماز جمعہ پر پابندی کے سلسلے میں ۲۰۔ دسمبر کو نو مسلم مولوی بشیر احمد (یہ مرزائیت سے تائب ہو کر مشرف باسلام ہوا تھا اور ضلع مظفر گڑھ کا باشندہ تھا) نے بٹالہ سے قادیان جا کر نماز جمعہ پڑھانے کے لیے روانہ ہونا تھا۔ مگر اسے بٹالہ اسٹیشن پر ہی گرفتار کر لیا گیا اور تین ماہ قید سخت بمعہ جرمانہ کی سزا سنائی گئی۔

کفر اور اسلام کے مابین یہ ہاتھا پائی جاری تھی کہ ۱۹۳۵ء کا سال اپنی پیشانی پر نشیب و فراز کے سینکڑوں بل لیے ہوا بحر الکاہل میں ڈوب گیا۔

* * * * * * * * *

سنہ ۱۹۳۶ء

جنوب مشرقی ایشیا سے اُبھرنے والا سال نو کا آفتاب لہو میں نہایا ہوا ہے۔ آسمان دور تک سر جھکائے خونِ آدمیت میں ماتم کناں ہے۔ خون آلود فضاؤں میں ریت کا ہر بگولا سُرخ آندھی اڑائے چلا آ رہا ہے۔ تہذیبِ کُہنہ سے گھبرایا ہوا انسان اپنے حقوق کے حصول میں راستے کی ہر دیوار توڑتا، پہاڑوں سے لڑتا، سمندروں کو چیرتا اور آسمانوں میں شگاف ڈالتا ہوا اپنی آزادی کی طرف دوڑتا چلا جا رہا ہے۔

چین دیوتاؤں کی سرزمین، توہمات کے گرد و غبار میں لپٹے انسانوں کا ہجوم، حقیقت سے دور افسانوں کی بھول بھلیوں میں اُلجھے ہوئے لوگ اپنے آپ سے ناآشنا، وقت اور زمانے کی ضرورت سے کوسوں دور، انسانیت کی منزل سے بیگانہ۔ جب ذرا بیدار ہوئے تو غلامی کی زنجیریں ان پر مسکرا رہی تھیں۔

بدھ مت کے پجاریوں نے اپنے عقیدے میں ایسی افیون گھول کر ہر چینی اپنے حکمران ٹولے کی خرمستیوں سے غافل اپنی ترنگ میں ایسا مست ہوا کہ غلامی کی زنجیروں نے ان کا مذاق ہی نہیں اُڑایا، بلکہ یورپ اور ایشیا بھی ان پر ہنسنے لگے۔ وہ کائنات کے لیے ایک کھلونا بن گئے تھے کہ ۱۹۱۱ء میں ہمالہ کی چوٹیوں نے انہیں جھنجھوڑا۔ تبت کی ترائیوں سے انقلاب کی آگ سلگنے لگی۔ ؎

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ کے چشمے اُبلنے لگے
(اقبال)

چودھری افضل حق کی معروف کتاب "آزادیٔ ہند" اسی موضوع پر انہی دنوں کی تصنیف ہے۔ جس کا پس منظر چین کی موجودہ بیداری سے ہے۔

لیکن یہ انقلاب چینی عوام کو راس نہ آیا۔ کہ ڈاکٹر سن یات سین چینی عوام کو یورپین سیاستدانوں کے دامن سے وابستہ کر دینا چاہتا تھا۔ ان کی موت کے بعد اُن کا ہم زلف چینکائی شیک چینیوں کی قسمت کا مالک بنا، تو روس کے دانشور آگے بڑھے۔ انہوں نے اس خام مال کو اپنی جھولی میں ڈال لینا چاہا۔

قومیں جب بیدار ہوتی ہیں، پھر نہ انہیں حکمران کی ساحری نیند کے جھولے میں سلا سکتی ہے نہ ظلم و جور انہیں اپنے ارادوں سے باز رکھ سکتا ہے۔ صدیوں کا سویا ہوا چین اپنے محکوم تعلق کو بیدار دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی حقیقت معلوم ہو چکی تھی۔ وہ اپنی آزادی کے لیے اب وقت کا محتاج نہیں تھا۔ اس کے قدم منزل کی جانب رواں دواں تھے۔

طوفان آتا ہے تو ساحل بھی موجوں سے کھیلنا چھوڑ دیتا ہے۔ منجدھار میں الجھی ہوئی کشتی کے پتوار ٹوٹ جاتے ہیں۔ ایسے میں ملاح کے حواس اگر درست رہیں، تو کنارے پر پہنچ جانا دشوار نہیں ہوتا۔

۱۸ اکتوبر ۱۹۳۴ء کا دن چینی عوام کی تاریخ میں ہمیشہ سنگ میل رہے گا، جب ایک غریب کسان کے بیٹے نے ہل اور پنجالی چھوڑ کر اپنی دھرتی کی کوکھ سے ان جیالے نوجوانوں کو جنم دیا، جنہوں نے مشرقی ایشیا کی تاریخ کو اپنے خون سے لکھا۔ ۱۹۳۶ء کا سورج ابھرا تو کامریڈ ماؤزے تنگ اپنے لانگ مارچ میں فرسودہ چین کی تمام شاہراہوں پر نیا چین تعمیر کر رہا تھا۔

روس میں کمیونسٹ انقلاب کے بعد جنوب مشرقی ایشیا سے سرخ آندھی کے بادل سرزمین یورپ کے لیے سازگار نہیں تھے۔ حبشہ اور اٹلی کی لڑائی برطانوی سیاستدانوں کے لیے سوہان روح تھی۔ ہندوستان کے حالات بھی انگریزوں کے حق میں نہیں تھے۔ ایکٹ ۱۹۳۵ء کا نفاذ جسے برطانیہ نے اپنی بقا کا ذریعہ سمجھا تھا، اس کی موت کا باعث بن رہا تھا۔ ایسے میں جنوب مشرقی ایشیا سے نئی ابھرتی ہوئی تحریک یورپین سامراج کے لیے ایک نیا الجھاؤ پیدا کر رہی تھی۔ بہرحال ۱۹۳۶ء کے چہرے پر سکون کے آثار نہیں تھے۔

نئے چین کا خالق کامریڈ ماؤزے تنگ (چینی زبان کے تلفظ میں اسے ماؤزے دونگ کہا جاتا ہے) ۲۶۔ دسمبر ۱۸۹۳ء کو چین کے صوبہ ہونان کے ایک گاؤں شاؤشان میں ایک غریب

کسان کے ہاں پیدا ہوا۔ چین میں ان دنوں علم برائے حساب و کتاب تک محدود تھا۔ اپنے گاؤں کے پرائمری سکول سے فارغ ہو کر ماؤ گھریلو زندگی کی کفالت کے ذرائع تلاش کرنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ بغیر اطلاع دیئے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ دوسرے گاؤں کے سکول میں تعلیم مکمل کرنے لگا۔ جہاں اسے حالات کی خبر ہوئی اور اس نے سیاسیات کا مطالعہ شروع کیا۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۱ء کو چین کے حکمران مانچو خاندان کے خلاف بغاوت ہو گئی۔ یہ آگ دیکھتے دیکھتے سارے چین میں پھیل گئی۔ ماؤزے تنگ ان دنوں انقلابی فوج میں بھرتی ہوا۔ ۱۹۱۲ء میں چین کے نظام کہنہ میں بنیادی تبدیلی آئی۔ اس انقلاب کے لیڈر ڈاکٹر سن یات سین تھے۔ اس کی نظریں دیوار چین سے پرے یورپ کی طرف دیکھنے لگیں، جسے ماؤزے تنگ نے پسند نہ کیا اور وہ ملازمت سے الگ ہو کر وقت گذارتا رہا۔ اس دوران سکول میں داخلہ بھی لیا۔ صابن سازی کا کام بھی کیا۔ اس نے طلباء کی تنظیم بھی کی۔ ۱۹۲۱ء میں چینی کمیونسٹ پارٹی وجود میں آئی۔ لیکن ہنوز یہ تحریک خفیہ تقریروں تک محدود تھی۔ ۱۹۲۵ء میں ڈاکٹر سن یات سین کا انتقال ہوا۔ ان کی جگہ چنکیائی شیک نے لی۔ مگر اس کا ذہن لینن ازم کی طرف تھا، جسے ماؤ نے قبول نہ کیا اور یہیں سے ماؤ نے اپنی انفرادی سرگرمیاں شروع کیں۔ جسے چنکیائی شیک نے چین میں نئی بغاوت کا پیش خیمہ قرار دے کر ماؤزے تنگ کا گھیراؤ شروع کیا۔ لیکن ماؤ بچتا بچاتا اپنی مختصر طاقت سمیٹ کر پہاڑوں میں جا چھپا۔ جہاں بیٹھ کر اس نے اپنی انقلابی تحریک کو منظم کیا۔ آخر ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۴ء کا دن آیا کہ ماؤزے تنگ پہاڑوں کے دامن سے مختصر ساتھی لے کر لانگ مارچ (لمبا سفر) کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ وہ جس گاؤں پہنچا لوگ اس کے لیے فرش راہ ہوئے۔ وہ جس شہر گیا اپنا مقام پیدا کرتا چلا گیا۔ لوگ اس کی پذیرائی کے لیے گھروں سے نکل آئے۔ ماؤ نئے نظام کی بنیاد ڈالتا آگے بڑھتا گیا۔

ماؤزے تنگ ابھی پہاڑوں کا سینہ چیر کر دریاؤں کے پانی روندہ کر چنکیائی شیک کی فوج سے نبرد آزمائی سے تھک ہار کر ذرا سی دیر کے لیے سستایا ہی تھا کہ شمال مغربی چین سے ۱۹۳۶ء کا سورج ابھرا۔

حکومت کی شکست قادیان میں نماز جمعہ پر پابندی کے سلسلہ میں ۳۔ جنوری (۱۹۳۶ء) کو قاضی احسان احمد شجاع آبادی قادیان جا رہے تھے کہ بٹالہ ریلوے

اسٹیشن پر انہیں ایک نوٹس کے ذریعے مطلع کیا گیا کہ قادیان میں آپ کے داخلے پر قدغن ہے۔ قاضی صاحب نے یہ پابندی قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ جیسے ہی وہ متعینہ حدود سے آگے بڑھے پولیس نے انہیں گرفتار کر لیا۔ اسی وقت ڈیوٹی مجسٹریٹ نے انہیں چھ ماہ قید اور ایک ہزار روپیہ جرمانہ کی سزا دی۔

قاضی صاحب کی گرفتاری اس تحریک کی آخری گرفتاری ثابت ہوئی۔ ۵۔ جنوری کو حکومت پنجاب نے قادیان میں نماز جمعہ پر سے پابندی اٹھالی۔

۵۔ دسمبر ۱۹۳۵ء کو حکومت پنجاب نے قادیان میں نماز جمعہ پر پابندی عائد کر دی تھی جسے مجلس احرار نے مداخلت فی الدین سمجھ کر قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ۶۔ دسمبر کو اس کی خلاف ورزی کا فیصلہ کیا اور سب سے پہلے قانون شکنی کے لیے امیر شریعت قادیان گئے۔ یہ سلسلہ تحریک کی صورت میں شروع رہا۔ آخر حکومت کو سپر انداز ہونا پڑا۔

ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نفاذ سے پیشتر حکومت ہند پنجاب کو ہر طرح کی سیاسی آلائشوں سے پاک وصاف دیکھنا چاہتی تھی تاکہ برطانیہ کا یہ بازوئے شمشیر زن رجعت پسندوں سے نکل کر آزادی پسند گروہ کے اقتدار میں نہ آجائے۔

یکم جنوری کو حکومت پنجاب نے اعلان کیا کہ لاہور میں تاحکم ثانی دفعہ ۱۴۴ کے تحت کوئی شخص کرپان (تلوار) کو بطور ہتھیار استعمال نہیں کر سکے گا۔ اور یہ حکم ۳۱۔ جنوری تک نافذ رہے گا۔ اس پر گوردوارہ پربندھک کمیٹی نے اعلان کیا کہ سکھ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے اس حکم کی خلاف ورزی کریں گے۔ چنانچہ ۲۔ جنوری کو سردار بوٹا سنگھ ڈپٹی پریذیڈنٹ پنجاب کونسل کی رہنمائی میں پانچ سکھوں کا ایک جتھہ گوردوارہ باولی صاحب (لاہور) سے ننگی کرپانیں لے کر نکلا جسے پولیس نے گرفتار کر لیا۔

اسی روز راولپنڈی میں سکھ اور مسلمانوں کے درمیان ہنگامہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔

۷۔ جنوری کو حکومت ہند نے اعلان کیا۔

"حالات کے پیش نظر کرپان پر پابندی میں ۳۱۔ جنوری کے بعد توسیع نہیں کی جائے گی۔ تاہم اس دوران قانون شکنی کرنے والوں کو سزا اسی طریق ...

گی، جیسے کر دی جا رہی ہے۔

گو حکومتِ ہند کا براہِ راست اس سے کوئی تعلق نہیں لیکن اس دوران عمل کی وہی شکل ہو گی جو حکومتِ پنجاب پسند کرے گی"۔

۹۔ جنوری کو لاہور میں شہید گنج کانفرنس ہونے والی تھی۔ حکومت نے ایک نوٹس کے ذریعے اس کانفرنس کو روک دیا۔

ان حالات میں حکومتِ پنجاب نے احرار سے گلو خلاصی کے لیے قادیاں سے ۱۴۴ واپس لے لی۔ لیکن اس تحریک کے قیدیوں کو رہا نہیں کیا گیا۔ بلکہ وہ اپنی میعادِ اسیری گذار کر رہا ہوئے۔ حکومت کے ۹۔ جنوری کے اعلان کے باوجود ۱۰۔ جنوری کو لاہور کی دیواروں پر تذکرہ کانفرنس کے اشتہار چسپاں پائے گئے۔ کہ آل انڈیا اتحادِ ملت شہید گنج کانفرنس مقررہ تاریخوں پر (۱۰۔۱۱۔۱۲ جنوری) ہو گی۔ اس پر میاں فیروز الدین احمد اور مولانا سید حبیب نے مندرجہ ذیل بیان دیا۔

"حضرت امیر ملت نے گذشتہ دنوں اعلان کیا تھا کہ تحریک مسجد شہید گنج کانفرنس کو علماء اپنے دل سے نکال دیں۔ لیکن اس کے باوجود پھر کسی غیر ذمہ دار شخص نے اس کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کر دیا۔ لہٰذا ہم پھر اعلان کرتے ہیں کہ ایسی کوئی کانفرنس منعقد نہیں ہو رہی اور نہ ہو گی۔ کیونکہ ہمارا خیال ہے، اس تحریک کے سلسلے میں ابھی خاموشی اختیار کی جائے۔ نیز اس سلسلے میں کسی کو کوئی چندہ وغیرہ بھی نہ دیا جائے۔ ۱۱۔ جنوری۔ ہفت روزہ "الجمعیۃ" دہلی)

اس اعلان کے باوجود ۱۰۔ جنوری کو شاہی مسجد لاہور میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ پہنچ گئے۔ جب کانفرنس شروع ہونے لگی تو دوسرے گروہ نے اس کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ

"ہمیں محض مسلمانوں کو سول نافرمانی کی دعوت دے کر ہلاکت میں نہیں ڈالنا چاہیے۔ اس سے پہلے کافی نقصان ہو چکا ہے"۔

سر آغا خاں کا بیان

۱۰۔ جنوری کو لندن سے بمبئی پہنچنے پر سر آغا خاں نے ایسوسی ایٹڈ پریس کو اپنے ایک بیان میں کہا:

"ہندو مسلم اتحاد ہندوستان کے لیے اہم اور ضروری ہے۔ دوسری گول میز

کانفرنس میں اپنی اس مساعی جمیلہ کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا، میں نے اتحاد کرانے کی کانفرنسوں میں حصہ لیا ہے اور لیتا رہوں گا۔ میرا ایمان ہے کہ دونوں قوموں کے لیڈر آپس میں بیٹھ کر تمام تنازعات طے کر سکتے ہیں۔

میں عنقریب دہلی جاؤں گا تو اپنے دوستوں سے گفت و شنید کروں گا۔ میں مہاتما گاندھی کی صحت کے لیے بھی دعا کرتا ہوں کہ وہ جلد صحت یاب ہوں۔ وہ میرے دوست ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ہم مصالحت کرانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

نئے آئین کے متعلق سر آغا خاں نے کہا،

ہمیں اس آئین کو قبول کر لینا چاہیے۔ کیونکہ اب یہ ملک کا قانون بن چکا ہے۔"

(ہفت روزہ "الجمعیۃ" دہلی ۱۶۔ جنوری ۱۹۳۶ء)

قادیان میں نمازِ جمعہ

مرزائیوں کی مسلسل اشتعال انگیزی اور حکومت کی جانبداری کے باعث گذشتہ سال دسمبر کے شروع میں قادیان کے گرد و نواح میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی گئی تھی۔ جس پر مجلسِ احرار نے انفرادی سول نافرمانی کی تحریک چلائی۔ ایک ماہ کے بعد حکومت کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے یہ پابندی اٹھالی تو مجلسِ احرار نے مولانا لال حسین اختر کو قادیان جا کر نمازِ جمعہ پڑھانے کی ہدایت کی۔

مولانا لال حسین اختر ۱۹۳۲ء میں مرزائیت سے تائب ہوئے، تو انہیں قادیان چھوڑنا پڑا۔ امسال جنوری ۱۹۳۶ء میں جب وہ قادیان میں داخل ہوئے تو باطل اپنے ارادوں میں شکست کھا چکا تھا۔ امرتسر، بٹالہ اور ضلع گورداسپور کے ہزاروں مسلمان نمازِ جمعہ کے لیے قادیان پہنچے۔ نماز سے پہلے مولانا لال حسین اختر نے اپنے حالات و واقعات کی تمام کڑیاں اس انداز سے ملائیں کہ تاریخ ماضی اپنے اوراق پلٹنے لگی۔ باطل مذہب کے چھوڑنے کی کہانی سناتے ہوئے مولانا نے کہا:

"میں ۱۵۔ اکتوبر ۱۸۹۸ء کو اپنے والدِ محترم شیخ حسین بخش کے ہاں دھرم کوٹ ضلع گورداسپور میں پیدا ہوا۔ والد صاحب حضرت پیر امام علی شاہ مکان شریف

تحصیل بٹالہ کے خلیفہ مجاز تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر میں اور نویں جماعت تک مانسہرہ ضلع ہزارہ میں پڑھنے کے بعد میں نے لاہور اورنٹیل کالج میں داخلہ لیا اور یہاں منشی فاضل تک پڑھا۔ یہ ۱۹۲۱ء کا زمانہ ہے۔ خلافت تحریک زوروں پر تھی۔ میں مولانا مظہر علی اظہر کے ساتھ ضلع گورداسپور کی خلافت کمیٹی میں کام کرنے لگا۔ اور انہی کے ساتھ گرفتار ہو کر جیل چلا گیا۔ ۱۹۲۳ء میں رہا ہوا تو آریہ سماج نے شدھی کی تحریک شروع کر رکھی تھی۔ ان سے مڈھ بھیڑ ہوئی، مناظرے ہوتے رہے۔ ان ہنگامی دنوں میں میری ملاقات مرزائی مبلّغین سے ہوئی۔ چونکہ میری مذہبی تعلیم ادھوری تھی، لہٰذا میں مرزائیت کا فریب کھا گیا۔ مرزائیوں نے میری تعلیم پر قریباً پچاس ہزار روپیہ صرف کیا تھا۔

پھر میں نے اسلام کے خلاف علماء سے مناظرے کیے اور خوب کیے اخبار "پیغام صلح" کا ایڈیٹر بھی رہا اور احمدیہ ایسوسی ایشن کا جنرل سیکرٹری بھی۔ مرزائیت کو قریب سے دیکھنے، اس تحریک کو سمجھنے کے بعد جب مجھ پر یہ راز کھلا کہ یہ کوئی مذہب نہیں، بلکہ سلّی بازوں کا ایک ٹولہ ہے تو میں نے اس پر سوچنا شروع کیا۔ اسی دوران ایک رات میں نے خواب میں مرزا غلام احمد کو آگ میں جلتے دیکھا۔ ان حالات میں جنوری ۱۹۳۲ء کو میں نے مرزائیت سے توبہ کر لی اور مسلمان ہو گیا۔ علماء کے ساتھ مل کر تردید مرزائیت میں جو مجھ سے ہو سکا کر رہا ہوں۔ مجلس احرار نے شعبہ تبلیغ میرے ذمہ لگا رکھا ہے اور میں یہ ذمہ داری نبھا رہا ہوں۔ آپ میرے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے استقامت عطا فرمائیں آمین۔ ثم آمین۔"

نماز جمعہ آپ نے پڑھائی۔ اس وقت مسلمانوں میں مرزائیت کے خلاف خاصا جوش تھا۔ ماسٹر تاج الدین انصاری، حاجی عبدالرحمٰن رئیس بٹالہ نے بھی تقریریں کیں اور آخر میں حسب ذیل قرارداد منظور ہوئی۔

"مسلمانانِ قادیان کا یہ عام جلسہ حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ امیر شریعت

حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور ان کے ساتھیوں کو جنہیں نماز جمعہ کے لیے قادیان آتے ہوئے گرفتار کر کے جیل بھیج دیا ہے، غیر مشروط طور پر رہا کر کے مسلمانان ہند کی بڑھتی ہوئی بدظنی کو دور کر دے تاکہ عوام یہ سمجھ سکیں کہ حکومت مرزائیت کی امداد کرتے ہوئے مسلمانوں کے مذہب میں مداخلت بے جا نہیں کرتی۔ نیز یہ جلسہ حکومت سے پرزور مطالبہ کرتا ہے کہ قادیان میں احرار تبلیغ کانفرنس پر عائد کردہ پابندیاں دور کر کے انصاف پسندی کا ثبوت دے۔"

(روزنامہ "مجاہد" لاہور۔ ۱۸۔ جنوری ۱۹۳۶ء)

کشمیری بھائیوں کے نام

انہی دنوں روزنامہ "احسان" لاہور میں کشمیر کے چند مسلمانوں کا ایک پیغام شائع ہوا، جس میں شیخ عبداللہ پر عجیب و غریب الزام تھے۔ اور مجلس احرار کو اپنی مظلومیت کی طرف متوجہ کیا گیا تھا۔ اس لیے جواب میں چودھری افضل حق نائب صدر مجلس احرار اسلام ہند نے "کشمیری مسلمانوں" کے عنوان سے روزنامہ "احسان" میں ایک خط شائع کیا جو حسب ذیل ہے۔

"چند دنوں سے مرزائیوں کی کشمیر میں فتنہ انگیزیوں کی خبریں زیادہ گرم ہو رہی ہیں۔ دفتر مجلس احرار اسلام ہند میں متعدد تاریں اور خطوط اس مہینے میں آئے ہیں۔ بعض دوست کشمیر میں بیٹھے ہم پر الزام لگاتے ہیں کہ مجلس احرار نے اتنی کثیر اور بے نظیر قربانیاں کر کے اپنے کشمیری بھائیوں کو بھلا دیا ہے۔ انہیں یقین کرنا چاہیے کہ مجلس احرار کشمیر کی حالت سے کبھی بھی بے خبر نہیں ہوئی۔ لیکن وہ بھی انسانوں کی جماعت ہے۔ اپنے مخالفین کی رخنہ اندازی سے جو کام کرنا ضروری ہوتا ہے، وہ بھی ملتوی کر دینا پڑتا ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ اگر آج سے چار برس پہلے ان تدابیر پر عمل کیا جاتا اور ان خطرات سے پوری طرح آگاہی حاصل کر لی جاتی جو مجلس احرار اسلام کشمیری زعماء کے سامنے پیش کرتی رہی۔ تو آج نہ کشمیر میں اصلاحات کے ناکافی ہونے کا شکوہ ہوتا اور نہ مرزائیوں کے فریب کا جال بچھ سکتا۔ لیکن

اللہ کو یہی منظور تھا جو ہوا۔ اور یہ فائدہ بخش بھی ہے۔ کیونکہ اب تمام جماعتوں نے جو کشمیر کی حقیقی بھلائی کے لیے کام کرنا چاہتی ہیں۔ محسوس کر لیا ہے کہ مرزا بشیرالدین محمود نے اہل کشمیر کو مزید مشکلات میں مبتلا کر دیا ہے اور اس کا مقصد کشمیر کمیٹی میں شمولیت سے اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ وہ مرزائیت کی تبلیغ کے لیے راہیں کھولے۔ انشاءاللہ وہ اس کام میں بھی ناکام رہے گا۔ کیونکہ سوائے عقل کے اندھوں کے کسی کو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ قرآن حکیم نے جو آخری شریعت دی ہے اس کے لانے والا آخری نبی کے سوا اور کون ہو سکتا ہے اور اگر مرزائیوں کے عقیدہ کے مطابق نبی آتے رہے تو مسلمان گروہوں میں تقسیم ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔

مجلس احرار کو یہ دیکھ کر بے حد اطمینان ہوتا ہے کہ کشمیر میں اب خود ایسے صاحب عزم نوجوان پیدا ہو گئے ہیں جنہوں نے اپنا سیاسی نصب العین وہی بنا لیا ہے جو مجلس احرار اسلام ہند کشمیر کے لیے پیش کرتی تھی۔ یہ لوگ خدا کے فضل سے اتنے ایثار پیشہ ہیں کہ ان پر آئندہ کام کا بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ باقی رہا قادیانی فتنے کا سد باب تو اس کے متعلق بھی دیکھتا ہوں کہ کشمیری بھائیوں میں بے حد بیداری پیدا ہو رہی ہے۔ یہ بیداری اس امر کی ضامن ہے کہ یہ فتنہ کشمیر میں اب سر نہیں اٹھا سکتا۔

یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ مجلس احرار کشمیر کے کاموں میں دلچسپی نہیں لے گی۔ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ بلکہ ہم اپنی سرگرمیوں کو نیز اپنے برادرانہ تعلقات کو زیادہ استوار کریں گے۔ ہماری ابتدائی مشکلات ختم ہو گئی ہیں اور کشمیری بھائی خود بخود ہماری ناچیز خدمات کو عزت کی نظر سے دیکھنے لگے ہیں۔ تمام غلط فہمیاں پورے طور پر دور ہو چکی ہیں۔ اب کشمیر میں اطمینان سے کام کرنے کے مواقع پیدا ہو گئے ہیں ہم صرف اس وقت کے منتظر ہیں، جب کشمیر کے وہ بہادر جو ابھی تک جیل میں بند ہیں، رہا ہو جائیں، تو ان کے مشورے سے کسی حقیقی سیاسی و تبلیغی کام کو

جاری کریں اس دوران بہتر یہ ہے کہ کشمیر کے جو بھائی پرامن اور بہتر طریقہ سے مسلمانوں کی حقیقی فلاح کا کام کرنا چاہتے ہوں، وہ مجلس احرار کے ساتھ اپنا رابطہ بڑھاتے رہیں اور خصوصیت سے شعبہ تبلیغ احرار کو کشمیر میں بھی قائم کریں تاکہ اللہ کے دین کی پوری پوری نشر و اشاعت کر سکیں۔ دشمنی کے طور سے مرزائیت کا قلع قمع بھی ہوتا چلا جائے گا اور مرزائیت کے حامی حکام کو بھی پتہ چل جائے گا کہ مرزائیوں کی حمایت سے وہ مسلمانوں کے قیمتی تعاون سے بالکل محروم ہو جائیں گے۔ کیونکہ مذہبی امور میں جانبداری سلطنتوں کو تباہ کر دیتی ہے۔ جب تک مسلمان سوتے رہے، مرزائیوں کا کام بنتا گیا۔ اب مسلمان بھی مرزائیت کے سدِباب کے لیے ہوشیار ہیں۔ کوئی حکومت مرزائیوں کی ناواجب امداد کی غلطی نہیں کرے گی۔

کشمیر کے مسلمان بھائیوں سے میری درخواست ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر اپنے معاملات کو اپنی ہمتوں سے درست کریں۔ نہ صرف مرزائیت کا سدِباب منظور ہے بلکہ ہمارے سامنے تو تمام دنیا کو مسلمان کرنے کا نصب العین ہونا چاہیے۔ اگر اسلام سچا مذہب ہے تو یہ تحفہ ہر ایک انسان کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

شعبہ تبلیغ مجلس احرار اسلام ہند اسی کام کے لیے وجود میں آیا ہے۔ اس کا ملکی سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ البتہ سیاسی کام کے لیے مجلس احرار موجود ہے۔ امید ہے کہ کشمیر کے بہادر اور غیرت مند بھائی ہمارے ساتھ ان کاموں میں اپنے اپنے ذوق کے مطابق ضرور شامل ہوں گے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہمارے کاموں میں مددگار ہوں۔

آپ کا افضل حق

نئی صورت حال

پنجاب کے حالات میں ہر روز نئی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ کانگریس، مسلم لیگ اور مجلس احرار معہ جمعیتہ علمائے ہند، اپنے اپنے رُخ پر سوچ رہی تھیں۔ وطن کی آزادی کے بہی خواہ اور غیر ملکی حکومت سے وابستہ لوگ وقت کے نازک ترین موڑ پر کھڑے تھے دونوں کی دیانت اور سوچ اپنی اپنی جگہ درست تھیں۔ ان کے مابین ایک تمیز کردہ حق تھا جس کی

رہنمائی ماڈریٹ (MODERATE) قسم کے لوگ کر رہے تھے۔ مسلمانوں میں مسٹر محمد علی جناح اس طبقہ میں نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔

مسلم لیگ پر ان دنوں ٹوڈی مسلمانوں کا قبضہ تھا۔ لیکن مسٹر محمد علی جناح جو ذہنی طور پر ٹوڈی ازم کے خلاف تھے۔ اپنی دانست میں مسلم لیگ کو فعال بنانے میں مصروف تھے۔ وہ ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نفاذ سے ملنے والی صوبائی خود مختاری میں مسلم حقوق کی لڑائی جداگانہ طریق پر لڑنے کے خواہش مند تھے۔ چنانچہ اس غرض سے انہوں نے ۵ جنوری ۱۹۳۶ء کو ایک خط سر فضل حسین کے نام تحریر کیا۔

"مسلم لیگ کونسل کے ممبروں کی یہ عام خواہش ہے کہ آپ سے لیگ کے آئندہ سیشن کی صدارت کرنے کی درخواست کی جائے۔

جونہی میں نے آپ کا نام صدارت کے لیے تجویز کیا۔ اس کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ میں اور میرے کئی ساتھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس مرحلے پر ہندوستان کے مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے آپ سے زیادہ موزوں شخصیت کوئی نہیں۔

آپ اس وقت بہت بڑی خدمت سرانجام دے سکتے ہیں، جو آپ کے کارناموں میں اضافہ کرے گی۔ ہمیں آپ کی قابلیت اور تجربے کی ضرورت ہے۔ شاید میں پوری طرح ظاہر نہیں کر سکا کہ مجھے اس بات کا کتنا احساس ہے کہ مسلمانوں کے مفاد میں آپ کا ہمارے ساتھ تعاون بہت اہم ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ میری اس خواہش کا اندازہ لگا لیں گے۔ اور مجھے جواب میں صرف دو لفظی تار قبول ہے۔ آپ کا انکار ذاتی طور پر میرے لیے سخت مایوسی کا باعث ہوگا۔"

(مارشل لاء سے مارشل لاء تک مصنفہ سید نور احمد ص ۱۶۳)

جواب میں سر فضل حسین نے معذرت لکھ بھیجی۔[1]

اس کے بعد مسلم لیگ کونسل نے سر وزیر حسن کو لیگ کے آئندہ اجلاس کا صدر چنا۔ اس موقعہ پر راجہ غضنفر علی خاں جو اس اجلاس میں موجود تھے کا بیان ہے کہ جیسے ہی سر وزیر حسن کا نام چنا گیا تو مولانا شوکت علی نے اس کی سخت مخالفت کرتے ہوئے کہا۔

---

[1] (مارشل لاء سے مارشل لاء تک ص ۱۶۳، ۱۶۴)

"سر وزیر حسن نے اپنی زندگی میں مسلمانوں کی کوئی خدمت نہیں کی۔ لہٰذا وہ اس اعزاز کے مستحق نہیں۔"

اس کے جواب میں مسٹر محمد علی جناح (قائداعظم) نے راجہ غضنفر علی سے کہا کہ

"وزیر حسن شاید ایک لحاظ سے موزوں ثابت ہوں۔ کیونکہ آئندہ سال کے لیے کانگریس کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو ہیں، جن کے ساتھ وزیر حسن کے ذاتی تعلقات اچھے ہیں۔ شاید یہ بات کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان تعاون کے نقطہ نگاہ سے مفید رہے۔"

(مارشل لا سے مارشل لا تک صفحہ ۱۰۳-۱۰۴)

سر فضل حسین اور قائداعظم محمد علی جناح کے درمیان بنیادی اختلاف تھا اور یہ اختلاف ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نفاذ سے شروع ہوا۔ اختلاف کی حقیقی وجہ یہ تھی کہ مسٹر جناح کے نزدیک اصل اور اہم سوال ملک کی آزادی کا تھا۔ اور سر فضل حسین کی توجہ صوبائی خود مختاری کے مواقع پر مرکوز تھی۔

تصویر کا دوسرا رخ سر فضل حسین پیش کرتے، وہ بھی اپنی جگہ دلچسپ تھا۔ وہ کہتے تھے کہ فرض کیجئے مسٹر جناح کے پروگرام کے مطابق پنجاب میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر میں انتخابی مہم شروع کروں۔ اس کے دو لازمی نتائج ہوں گے۔

۱۔ میں اپنے امیدوار زیادہ سے زیادہ چھیاسی مسلم حلقوں میں نامزد کرا سکوں گا۔

۲۔ فرقہ وارانہ نعرے پر میری انتخابی مہم کا لازمی ردعمل یہ ہو گا کہ ہندوؤں اور سکھوں میں بھی فرقہ وارانہ پارٹیوں کو تقویت حاصل ہو گی۔ اور رائے بہادر چھوٹو رام گروپ کے لیے اپنے حلقوں میں سخت مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ گویا خود اپنے عمل سے میں اس غیر مسلم گروپ کی شکست کے اسباب مہیا کروں گا جو بارہ سال سے مضبوطی کے ساتھ میرا ساتھ دے رہا ہے۔ اس کے بعد کیا ہو گا؟ چھیاسی نشستیں صوبائی اسمبلی کے کل ایک سو چھتر کے ایوان میں پہلے ہی اقلیت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن عملی بات یہ ہے کہ انتہائی کامیابی کی صورت میں بھی مجھے پانچ، دس فیصد حلقوں میں شکست

کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ لہٰذا میری پارٹی انتخابات سے لازماً ایک اقلیت کی صورت میں برآمد ہوگی۔ اس کے بعد میں ایسے گروپ تلاش کروں گا، جو میرے ساتھ کولیشن کرنے کو تیار ہوں۔ اور دوسری پارٹیاں میری پارٹی کے مقابل کولیشن قائم کرنے کی کوشش کریں گی۔ میں، چند ہندو، سکھ ممبروں کو توڑ کر اپنے ساتھ ملا سکوں گا یا دوسری پارٹیاں چند مسلمانوں کو توڑ کر اپنے ساتھ ملا لیں گی۔ ایسے غیر یقینی حالات میں گورنر اگر چاہے گا تو مسلمان لیڈر کی وزارت بنوا دے گا اور اگر چاہے گا تو ہندو اور سکھوں کی وزارت بنوا دے گا۔ دونوں صورتوں میں وزارت اس کے ہاتھ میں کھلونا بنی رہے گی۔ بعینہٖ یہی صورت بنگال میں پیش آئے گی۔ مسلم اکثریت والے یہی دو صوبے ہیں۔ لہٰذا اگر مقصد یہ ہے کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں نئے آئین کے تحت مسلمانوں کو سیاسی اقتدار پر قبضہ کرنے کے جو مواقع ملے ہیں ان سے فائدہ اٹھایا جائے تو یہ طریقہ اس مقصد کو حاصل کرنے کا نہیں بلکہ ضائع کرنے کا ہے۔"

اس کے مقابل سر فضل حسین یونینسٹ پارٹی کے نام سے ایک ایسے پروگرام کی بنیاد پر جو مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں کے ایک پس ماندہ طبقہ کے لیے بھی اقتصادی کشش رکھتا ہو۔ تمام مسلم حلقوں اور کم از کم نصف غیر مسلم حلقوں میں انتخاب لڑنا چاہتے تھے۔ پنجاب کی دیہاتی آبادی کو سود خور مہاجن کے قرضے سے نجات دلانا اس انتخابی مہم کا بنیادی نعرہ تھا۔ سر فضل حسین کی رائے تھی، کہ اس طرح کم از کم مجھے یہ موقعہ ملتا ہے کہ میں ایک قطعی اکثریت رکھنے والی پارٹی لے کر اسمبلی میں جاؤں گا، جس میں مسلمانوں کو غالب اکثریت حاصل ہو۔ اور ایک مضبوط اور فعال وزارت بناؤں گا۔ اس طرح سر فضل حسین کے خیال میں بنگال میں مسلمانوں کے لیے ایک غیر مسلم عنصر کو ساتھ ملانے کے لیے ٹھوس اقتصادی بنیاد موجود تھی یعنی دوامی بندوبست کے تحت قائم شدہ جاگیرداروں کی تنسیخ اور کسانوں کو ان کی زیر کاشت زمینوں کی ملکیت دلانے کا پروگرام۔ ان جاگیرداروں پر ہندوؤں کے ایک طبقہ کی تقریباً مکمل اجارہ داری تھی۔ جس کے بوجھ کے نیچے اس صوبے کے مسلمان اور ان کے ساتھ ہندو کسان بری طرح پس رہے تھے۔

سر فضل حسین کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر مضبوط اکثریت حاصل کرنے اور مضبوط وزارت قائم کرنے کا موقعہ مل سکتا تھا، جو اسمبلی کو فرقہ وارانہ خطوط پر تقسیم کرنے سے نہ ملتا۔ صوبہ سرحد اور سندھ کی اسمبلیوں میں مسلمانوں کو قطعی اکثریت حاصل تھی۔ لیکن سر فضل حسین کے خیال میں وہاں بھی مسلمانوں کے لیے فرقہ وارانہ پارٹیاں بنا کر اسمبلیوں میں جانے سے کوئی خاص فائدہ نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ گورنروں کو اقلیتوں کی حفاظت کے نام پر وزارت سازی میں دخل اندازی کا موقعہ ملے۔

ان دلائل کے پیش نظر سر فضل حسین کی رائے یہ تھی کہ مسلم لیگ کو صوبائی انتخاب میں دخل ہی نہ دینا چاہیے۔ صرف مرکزی اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی بنانی چاہیے۔

(مارشل لا سے مارشل لا تک صفحہ ۱۴۴-۱۴۵)

احرار کا چیلنج

۱۰- جنوری ۱۹۳۶ء کے روزنامہ "مجاہد" میں مولانا مظہر علی اظہر کا ایک مختصر بیان شائع ہوا، جس میں انہوں نے سر فضل حسین اور سر فیروز خاں نون کو چیلنج کرتے ہوئے کہا کہ

"اگر سر فضل حسین اور سر فیروز خاں نون یہ سمجھتے ہیں کہ مسجد شہید گنج مل سکتی ہے جیسے کہ سر فیروز خاں نون خفیہ طور پر مسلمانوں سے کہتے رہے ہیں کہ سول نافرمانی ہو تو مسجد مل سکتی ہے اور اس طرح احرار کو بدنام کیا جا رہا ہے۔ تو میں دونوں حضرات کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ بادشاہی مسجد یا کسی اور مسجد میں آکر مسلمانوں کے سامنے اس خیال کا اظہار کریں اور سول نافرمانی کے بعد مسجد کے حاصل ہونے کا یقین دلائیں۔ پھر اگر وہ کہیں کہ پچاس ہزار مسلمانوں کے جیل جانے سے مسجد مل سکتی ہے، تو میں اس بات کا ذمہ لیتا ہوں کہ میں خود سب سے پہلے جیل کی طرف قدم اٹھاؤں گا اور پچاس ہزار نہیں بلکہ ایک لاکھ آدمی جس مقام سے اور جس عرصہ میں سر فضل حسین اور فیروز خاں نون چاہیں گرفتار کرا دوں گا۔ اور اگر یہ دونوں حضرات فرمائیں کہ پانچ صد آدمیوں کے گولی کھا کر جان دینے سے مسجد مل سکتی ہے تو سب سے پہلی گولی میں کھاؤں گا۔ اور پانچ صد نہیں

ایک ہزار نوجوان گولی کھا لینے والے میدان میں آ جائیں گے، جو اپنی جانیں فدا کر دیں گے۔ ہم اپنا حساب ذاتِ باری تعالیٰ کے سپرد کر چکے ہوں گے۔ پھر وہ مسلمان جو زندہ ہوں گے۔ سر فضل حسین اور سر فیروز خاں نون کی گردن میں کپڑا ڈال کر پوچھ لیں گے کہ لاؤ مسجد کہاں ہے، جس کے لیے ایک لاکھ مسلمانوں کو جیل بھیجا تھا۔"

حبشہ اور اٹلی کی جنگ

۳۔ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو اٹلی نے حبشہ کی کمزور اور مظلوم آبادی پر چڑھائی کر دی تھی۔ یورپ کی طاقتور سلطنتیں دوسری جنگِ عظیم کے خوف سے اپنا پہلو بچاتی رہیں۔ یہاں تک کہ اقوامِ متحدہ خاموش تماشائی بنی رہی۔ آخر جنوری ۱۹۳۶ء کے پہلے ہفتے اٹلی نے حبشہ پر زہریلی گیس کے ایسے بم پھینکے کہ ان کے اثرات سے وہاں کی تمام آبادی مختلف امراض کا شکار ہو گئی۔ جس سے افواجِ حبشہ شکست کھا گئی اور شہنشاہ حبشہ بھاگ کر انگلستان پہنچ گئے۔ اس طرح حبشہ کے دارالحکومت ادیس ابابا پر اٹلی کا قبضہ ہو گیا اور اسے اٹلی میں شامل کر لیا گیا۔ گو روس نے اٹلی کے خلاف احتجاج کرنے کو کہا لیکن ہٹلر نے اس آواز کو ناکام بنا دیا۔ اس ہلکی سی امداد نے موسولینی کو ہٹلر کا طفیلی بنا دیا یہی وہ تاریخی واقعہ ہے کہ جس سے موسولینی اور ہٹلر کے تعلقات استوار ہوئے جو دوسری جنگِ عظیم کے اختتام تک قائم رہے۔

۱۶۔ جنوری کو شہنشاہ جاپان نے حبشہ کی فوجی امداد کا اعلان کیا۔ لیکن آگے چل کر جاپان بھی جرمن اور اٹلی کا اتحادی بن گیا۔

مجلسِ احرار کا مطالبہ

۲۱۔ جنوری کو مجلسِ احرار کی طرف سے ہندوستان بھر کی مسلم انجمنوں سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اپنے اداروں سے مرزائیوں کو خارج کر دیں۔ اس کی سب سے بڑی زد لاہور کی انجمن حمایتِ اسلام پر پڑی۔ علامہ اقبال کے مستعفی ہونے کے باوجود جو مرزائی اس انجمن کے ممبر تھے، انجمن بذا انہیں اپنے سے علیحدہ نہ کر سکی۔ انجمن کی اس حرکت سے تنگ آ کر مجلسِ احرار نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ کے موقعہ پر عوام کی طرف سے ایک قرارداد پیش کر دی کہ مرزائیوں کو انجمن حمایت اسلام سے فوراً خارج

کردیا جائے۔ کیونکہ یہ غیر مسلم ہیں اور غیر مسلم انجمن حمایت اسلام کا ممبر نہیں ہو سکتا۔
اس قرارداد پر مختصر ہنگامہ ہوا۔ بالآخر قرارداد منظور ہو گئی۔

سکھ تحریک ختم ہو گئی

یکم فروری کو حکومت پنجاب نے جس حکم کے تحت کرپان پر ۳۱۔ جنوری تک پابندی عائد کی تھی۔ جیسے ہی وہ متعینہ تاریخ پر حکم نامہ ختم ہوا سکھوں نے اسے اپنی فتح قرار دیا۔ اور تمام دن سکھ لاہور کے بازاروں میں کرپانیں باندھے پھرتے رہے۔ مسلمان بھی اس روز کمر سے تلواریں لٹکائے بازاروں میں پھرتے دکھائی دیے۔ اس طرح یہ واقعہ ایک مضحکہ بن گیا۔

انہی دنوں پنجاب کے دیگر اضلاع سے مسلمانوں کے قافلے شہید گنج کے سلسلہ میں لاہور آنے شروع ہو گئے۔ راولپنڈی، امرتسر اور جالندھر کے اکثر جتھے لاہور پہنچ چکے تھے چودھری مولا بخش نامی ایک نوجوان ان دنوں شہید گنج کا لیڈر تھا۔ اس نے اپنا دفتر شاہی مسجد میں قائم کر لیا تھا۔ یہیں سے قافلے شہید گنج کی طرف جاتے ہوئے گرفتار ہو جاتے۔

جارج پنجم کا انتقال

۲۰۔ جنوری کو رات بارہ بجے برطانیہ کا شاہ جارج طویل علالت کے بعد انتقال کر گیا۔ گو اس کی موت سے ہندوستانی غلاموں پر برطانیہ کی گرفت ڈھیلی نہ ہوئی، تاہم برطانوی تاریخ میں ایک ایسا موڑ آیا، جس کی مثال اس شاہی خاندان میں پیشتر سے دکھائی نہیں دیتی۔

امیر ملت کی جگ ہنسائی

بے نماز غازی اور بے عمل صوفی دونوں قوم کو لے ڈوبتے ہیں۔ پنجاب کے صوفی منش لوگوں نے کہیں پیر کے لباس میں، کہیں لیڈر کے روپ میں[1] رہنما بن کر تن آسان افراد کی تعداد میں اس قدر اضافہ کیا کہ مآلِ کار مسلمان قوم ایک بھیڑ معلوم ہونے لگی اور کہیں جہاد کی ضرورت پڑی تو میدانِ کارزار بے عمل مجاہدوں کا منہ تکنے لگا کہ سالارِ کارواں کو کلو و شرابو کے سوا قرآن حکیم یاد ہی نہیں رہا۔ جب قومیں انحطاط کے اس موڑ پر پہنچتی ہیں۔ تو راستے کی ہلکی سی رکاوٹ پہاڑ دکھائی دینے لگتی ہے۔ پھر محض تسبیح و مصلا کو خدا کی عبادت قرار دینے والے سست اور کاہل امیر قوم بن جاتے ہیں۔ تحریک مسجد شہید گنج میں مسلمانوں نے پیر جماعت علی شاہ کو اپنا امیر منتخب کر لیا۔

---

[1] - اس کی تفصیل آئندہ اوراق میں دیکھیں۔

گوشہ نشین فقیر کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں بندوق دے کر جہاد کی راہ میں لاکھڑا کیا۔ تسبیح کی خوگر انگلیاں نہ ہی تلوار سنبھال سکیں اور نہ ان انگلیوں سے بندوق کی لبلبی دب سکی جرأت ایمانی للکار بن کر سامنے آئی مگر تعویذوں کے سہارے قوم کو دشمن پر فتح دلانے اور پھونکوں سے کفر کے چراغ گل کرنے والے آخر کو خدا کے گھر کی حفاظت سے دست بردار ہو کر بیت اللہ کی زیارت کو چل دیئے۔ سے

وہ چلے جھٹک کے دامن مرے دستِ ناتواں سے
اسی دن کا آسرا تھا مجھے مرگِ ناگہاں سے

۲۔ فروری کو امرتسر خیر الدین کی مسجد میں اتحادِ ملت کی کانفرنس ہو رہی تھی کہ حضرت پیر جماعت علی شاہ نے اعلان کیا کہ

"چونکہ میں حج کے لیے جا رہا ہوں لہٰذا اپنے تمام اختیارات اتحادِ ملت کے سپرد کرتا ہوں۔"

اس پر نوجوان طبقہ میں بے چینی پھیل گئی اور کانفرنس میں شریک لوگ ایک دوسرے کا گریباں نوچنے لگے۔ اس افراتفری میں کانفرنس غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کر دی گئی۔

ان دنوں تحریک شہید گنج عجیب حالات سے گذر رہی تھی۔ ایک گروہ سول نافرمانی کر رہا تھا۔ دوسرا آئین شکنی کے خلاف تھا۔ تیسرا لیڈروں کا گروہ تھا جو اس تحریک کو سیڑھی بنا کر کونسل اور اسمبلی میں جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ انتشار کے دنوں امیر ملت پریشان حال مسلمانوں کے کام آتے مگر۔ ع

یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقتِ قیام آیا

اہلحدیث پنجاب کی قرارداد

دین دار اور حریت پسند طبقہ نے حکومتِ حجاز کے یورپین کمپنیوں کے ساتھ کان کنی کے معاہدے کو اس قدر ناپسند کیا کہ پنجاب اہلحدیث تنظیم کو بھی اپنے ۵۔ فروری کے اجلاس میں حسبِ ذیل قرارداد منظور کرنا پڑی۔

"جمعیۃ تنظیم اہلِ حدیث پنجاب کا یہ نمائندہ اجلاس حکومت حجاز سے

برطانوی کمپنی کے معاہدۂ کان کنی کی شرائط کو حزم واحتیاط پر مبنی سمجھنے کے باوجود برطانوی کمپنیوں کے سابق اعمال کی بنا پر نتائج وعواقب کے خطرات سے خالی نہیں سمجھتا۔ برطانوی عمال کی آمد ورفت اور ان کے طریقۂ معاشرت کے تاثرات سے عرب مزدوروں کا متاثر ہوجانا بھی خطرات سے خالی نہیں۔ اس لیے وہ حکومت حجاز کو قیمتی مشورہ دیتا ہے کہ کمپنی کے عمال پر پورا کنٹرول رکھے تاکہ وہ خطرات پیدا نہ ہوسکیں جن کے متعلق عالم اسلام بیزاری کا اظہار کر رہا ہے۔

اس کے ساتھ ہی یہ اجلاس برطانوی ایمپائر اور کمپنی کے انگریز عمال کو متنبہ کرتا ہے کہ وہ جزیرہ عراق وعرب میں کوئی ایسی حرکت اور ریشہ دوانیاں نہ کریں جس سے برطانوی ایمپائر مثل سابق بدنام ہو۔ اور عالم اسلام میں اضطراب کی لہر دوڑ جائے۔"

محرک مولانا اسماعیل (گوجرانوالہ)
مؤید۔ مولوی عطاء اللہ (کوٹ کپورہ)
} الجمعیۃ دہلی

جمعیۃ علمائے ہند کی قرارداد

یکم، دو، تین فروری ۱۹۳۶ء کو جمعیۃ علمائے ہند کی مجلس عاملہ کا اجلاس مرادآباد میں ہوا۔ جس میں حسب ذیل قرارداد منظور کی گئی۔

"جمعیۃ علمائے ہند کی مجلس عاملہ کا یہ جلسہ اس معاہدے کو جو حکومت سعودیہ اور ایک انگلش کمپنی کے درمیان حجاز میں کان کنی کے متعلق ہوا ہے سخت خطرہ کی نظر سے دیکھتا ہے۔

یورپین طاقتوں کی استعماری پالیسی کے خطرناک اور تباہ کن اثرات جمعیۃ علماء کے سامنے ہیں۔ جن کی بنا پر جمعیۃ جزیرۃ العرب میں ان طاقتوں کے دخلے کو خواہ وہ کسی شکل میں ہو اطمینان کی نظر سے نہیں دیکھ سکتی۔

جزیرۃ العرب کا تقدس اور بالخصوص حجاز کی غیر مسلم اثرات سے حفاظت مسلمانان عالم کے نزدیک اہم ترین مسئلہ ہے اور اس کو کسی حال میں نظر انداز

نہیں کیا جا سکتا۔ جمعیتہ حکومت عربیہ سعودیہ کی مالی حالت اور وسائل و ذرائع کی بہم رسانی کی اہمیت سے غافل نہیں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ وہ جزیرۃ العرب پر غیر مسلم اقتدار کے قیام کے تصور سے بھی لرزہ براندام ہے۔ جمعیتہ کو یہ بھی یقین ہے کہ جلالتہ الملک سلطان عبدالعزیز بن فیصل السعود بھی اہلِ یورپ کی استعماری ہوس سے خوب واقف ہیں اور یہ کہ جزیرۃ العرب کا تقدس اور ممالک عربیہ کی حفاظت بھی ان کے نزدیک عزیز متاع ہے۔ باوجود اس کے وہ اپنی طرف سے اور مسلمانانِ ہند کی طرف سے جلالتہ الملک کی خدمت میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتی ہے کہ جزیرۃ العرب کی غیر مسلم اثرات سے حفاظت ان تمام فوائد و منافع سے جو معاہدہ کے ذریعے حاصل ہو سکتے ہیں زیادہ قیمتی اور اہم و مقدّم ہے۔

("جمعیتہ علماء کیا ہے" - حصہ دوم ص ۱۹۷-۱۹۸)

شاہِ حجاز کا اعلان

جیسے ہی اگست ۱۹۳۵ء کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ حکومت سعودی عرب کا کان کنی کا ایک معاہدہ انگریز کمپنیوں سے ہوا ہے تو احرار رہنماؤں کی دوررس نگاہوں نے اس معاہدے کو نہ صرف جزیرۃ العرب کے لیے بلکہ مذہبی اور سیاسی اعتبار سے اسلامی اصولوں کے منافی جان کر سارے ہندوستان میں اس کے خلاف احتجاجی مظاہرے کیے کہ یہ معاہدہ بہر طور منسوخ ہونا چاہیے۔ اس پر ملک کی ذمہ دار سیاسی اور غیر سیاسی جماعتوں نے بھی احرار کی ہم نوائی کی۔ آل انڈیا احرار کانفرنس سیالکوٹ کے آخری اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعے شاہ حجاز سے درخواست کی گئی کہ وہ اس معاہدے پر نظر ثانی فرمائیں۔ اس پر ۱۴۔ فروری ۱۹۳۶ء کے سہ روزہ "الجمعیۃ دہلی" میں سلطان حجاز کا سید امین المدنی الحسینی سیاح ہند کی معرفت ایک اعلان شائع ہوا۔

"ہمارا مقصد انسانیت اور قوانین شریعت کی ترویج ہے۔ ہمارے کسی فعل پر اگر کسی کو شبہ ہو تو وہ بلا تکلف پیش کرے۔ ہم اس کے قول کا پورا احترام کرتے ہوئے غلطی کی اصلاح کرنے کی پوری کوشش کریں گے اور معترضین کو ہر طرح مطمئن کریں گے۔"

احرار وفد کی حجاز کو روانگی سلطان عبدالعزیز بن سعود والئی حجاز کے اعلان سے پیشتر ۲۔فروری کو آل انڈیا احرار ورکنگ کمیٹی نے اپنی گذشتہ نومبر کی قرارداد کے مطابق فیصلہ کیا کہ حجاز کے لیے ایک وفد کی تشکیل کی جائے۔چنانچہ اس اجلاس میں اعلان کر دیا گیا کہ مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا مظہر علی اظہر اور مولانا ظہور احمد بگوی پر مشتمل ایک وفد حجاز روانہ کیا جائے گا۔مولانا داؤد غزنوی وفد کے قائد اور مولانا مظہر علی اظہر سیکرٹری ہوں گے اس اعلان کے بعد احرار وفد کو پاسپورٹ کے حصول میں کافی پریشانی اٹھانی پڑی۔تاہم وفد ۸۔فروری کو لاہور سے کراچی کے لیے روانہ ہوا۔اسٹیشن پر بے پناہ ہجوم تھا جو وفد کو الوداع کہنے کے لیے جمع ہو چکا تھا۔ ۱۱۔فروری کے روزنامہ "مجاہد" میں چودھری افضل حق نے حجاز وفد کی روانگی پر حسب ذیل اداریہ تحریر کیا۔

"مسلمانوں کا شکستہ عزم محتاج دلیل نہیں۔کیونکہ اس سرزمین کی آزادی محل بحث ہے جو ہماری قوت کا مرکز اور برکتوں کا سرچشمہ ہونی چاہیے تھی۔احرار کے رئیس وفد مولانا محمد داؤد غزنوی کو الوداع کہنے کے لیے احباب اسٹیشن پر اکٹھے ہوئے وفد احرار اس لیے جا رہا ہے تاکہ جلالۃ الملک کی خدمت میں حاضر ہو کر انہیں فریب فرنگ سے آگاہ کرے۔غلام آباد ہند کے مسلمان وفد سے بہتر کوئی استعمار مغرب کی پر پیچ چالوں کو کیا بیان کر سکتا ہے۔یہ دردناک داستان اس کی آپ بیتی ہوگی۔آپ بیتی، جگ بیتی سے اکثر مؤثر ہوتی ہے۔

دورِ حاضر کے فرزندانِ توحید پر زمانہ نے ان کی برداشت سے زیادہ بوجھ ڈال دیا ہے۔جدھر نظر اٹھتی ہے عالیشان محلات اور شاہی عمارتوں کے شکستہ بام و در عظمتِ گذشتہ کو زبانِ حال سے بیان کرتے دکھائی دیتے ہیں۔وہ غلامی کی زنجیروں میں بندھا ہوا ہے۔ہندوستان احساس آزادی کھو چکا ہے عراق و فلسطین مغربیوں کے حکم بردار ہیں۔ترکی اور ایران ابھی خطرات میں گھرے کھڑے ہیں۔افغانستان کا اللہ مالک ہے۔جلالۃ الملک سلطان ابن سعود کے گرد ڈورے ڈالے جا رہے ہیں۔اگر اسلام کی یہ آخری متاع بھی لٹ گئی پھر مسلمانوں

کی زندگی میں کیا دلچسپی رہ جائے گی۔ خدا مسلمانوں کو وہ روزِ بد نہ دکھائے۔
یاس انگیز حالات میں ہی اللہ فضل کی بارش شروع کرتا ہے، جس سے
کشتِ امید ہری ہو جاتی ہے۔ خدا ایسے مردِ مجاہد پیدا کر دیتا ہے جو قوموں کی
قسمت کو پلٹ دیتے ہیں۔ احرار کا وفد خدا کے بھروسہ پر جا رہا ہے ذاتی
نفع و نقصان سے بے نیاز ہے۔ اس کے پیشِ نظر وہ کام ہے جس سے
دنیائے اسلام کو یکساں دلچسپی ہے۔ اگرچہ بعض سرکاری آدمی ہمارے خلاف
مصروفِ تگ و دو ہیں۔ لیکن ان کی مخالفانہ سرگرمیاں ہماری سچائی کی دلیل ہیں۔
معلوم ہوا ہے کہ حجاز میں ہمارے خلاف زہر اگلنے اور معاندانہ پروپیگنڈے کے وسیع
انتظامات ہو رہے ہیں۔ جو لوگ پریشان حالی میں کسی نیک کام کے لیے کمر ہمت
باندھ کر نکلتے ہیں وہ جھوٹے پروپیگنڈا کی کیا پرواہ کرتے ہیں مجلس احرار کے نزدیک
استقلال عرب وقت کا اہم ترین مسئلہ ہے۔ اسلامی تاجدار کی خدمت میں مسلمانانِ عالم
کے خیالات کا اظہار نہایت ضروری ہے۔ اس وقت تساہل سے کام لینا بدترین
گناہ ہے۔ سرزمین عرب میں غیر مسلم کا اثر و اقتدار ناقابل برداشت ہے۔
انگریزی حکومت احرار کے وفد کی اہمیت کو خوب سمجھتی ہے۔ وہ بغور معائنہ
کر رہی ہے کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ ہماری مخالفت میں جو شور اٹھا تھا
وہ دب چکا ہے۔ اسلامی ہند میں پورا اتحاد خیال ہے۔ انگریزی حکومت اب پیدا شدہ
حالات کو نظر انداز نہ کر سکے گی۔

لاہور ریلوے اسٹیشن پر مسلمانوں نے مولانا محمد داؤد کو الوداع کہی اور وفد کی کامیابی
کے لیے دعا مانگی۔ مخلص مسلمانوں کی دعائیں انشاء اللہ قبول ہوں گی۔ گو مجلس احرار کو مخالفت
کے اور بھی بہت سے طوفانوں میں سے گزرنا پڑے گا۔ لیکن خدا کے فضل و کرم سے
یقین ہے کہ بالآخر احرار کو کامیابی ہوگی۔ تشویش کا کچھ وقت گزرنے کے بعد مسلمان
اطمینان حاصل کر سکیں گے۔ ہمیں حضرت مولانا محمد داؤد غزنوی کے خلوص پر کامل
اعتماد ہے کہ وہ ہر حال میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی خوشنودی کو مدِ نظر رکھیں گے۔

صعوبت سفر برداشت کر کے دیارِ حبیب کو جانے والو! غلافِ کعبہ تھام کر رب کعبہ سے دعا کرنا کہ مسلمانوں کی ہمتوں میں برکت دے۔ ہمارے نوجوان آہنی عزم لے کر دنیا میں نکلیں۔ نہ صرف خود آزادی حاصل کریں بلکہ غلام قوموں میں روحِ آزادی پھونک دیں۔ جلبِ منفعت اور ترقی درجات کے شخصی خواب نہ دیکھیں بلکہ دنیا کی نجات کے ارادوں کو جامۂ عمل پہنانے کے لیے زندگی وقف کر دیں۔ مخالف ممالک اسلامی کے گرد تیندوے کی طرح جال پھیلا رہا ہے۔ خدا ہم میں ایسے صاحبِ عزم پیدا کرے جو دشمن کا تار پود بکھیر دیں اور مایوسیوں میں کرنِ امید بن جائیں۔

حجاز کی موجودہ گتھیاں بجز فضلِ ایزدی سلجھانا آسان کام نہیں۔ دشمن کے پاس اژدہام توپیں۔ تباہ کن جہاز، منوں بم پھینکنے والے ہزاروں طیارے ہیں۔ ادھر دنیا کا بے دست و پا غلام مسلمان ہے۔ ہو تو کیا ہو۔ ہمارے وفد کے ساتھ سلطان خواہ برا سلوک بھی کرے تو بھی ہمیں ضبط و تحمل سے کام لینا چاہیے۔ زمانۂ حال میں مسلمان سلاطین کی مجبوریاں ہندوستان کا غلام مسلمان بہتر سمجھ سکتا ہے۔ آج اسلامی سلطنتوں کے تاجداروں کی حالت نیم غلام لوگوں کی سی ہے۔ سلطان ابن سعود کی حالت تو کچھ دیر سے غیر مسلموں کی ریشہ دوانیوں کے باعث بہت ہی ناقابلِ رشک کر دی گئی ہے۔

مسلمانوں کی موجودہ نسل کے لیے کیا اضطراب انگیز دور آ گیا ہے صیدافگنوں نے حرم کو اپنی توجہ کا مرکز بنا لیا ہے۔ عرب ان کی سرگرمیوں کا میدان ہے مسلمانانِ عالم میں سے جو بیدار ہیں وہ اپنی مصیبتوں میں مبتلا ہیں، اور باقی خوابِ گراں میں دنیا و مافیہا سے بے خبر حالت میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارا حامی و مددگار ہو۔

"افضل حق"

کراچی سے روانگی

انگریز جس انداز سے اقوامِ عرب پر کمندیں پھینک رہا تھا۔ احرار اس سے غافل نہیں تھے۔ والیِ حجاز کو برطانوی ہتھکنڈوں سے آگاہ کرنا احرار نے اپنا فرض سمجھا۔ چنانچہ احرار کا یہ قدم حکومت کے لیے نیا چیلنج تھا۔ لیکن آئینی طور پر حج کے لیے جانے پر بظاہر روک ٹوک نہیں تھی۔ اس پر بھی کئی حیلے بہانوں سے ٹال مٹول ہوتا رہا۔

آخر زادِ راہ اور پاسپورٹ کے لیے قریباً ایک ہفتہ کراچی ٹھہرنا پڑا۔ اس طرح احرار کا یہ وفد ۱۸ فروری کو "سفینہ اکبر" کے ذریعے کراچی سے روانہ ہوا۔

کراچی سے خان فقیر خاں کو وفد میں شامل کر لیا گیا۔ اب یہ وفد چار افراد پر مشتمل تھا۔ دو نئے ارکان میں مولانا ظہور احمد بگوی اور حاجی خان فقیر خان ایم۔ ایل۔ اے ۱۹۳۵ء میں مجلس احرار میں شامل ہوئے تھے۔ اوّل الذکر بھیرہ ضلع سرگودھا کے معروف دینی اور علمی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام مولانا عبدالعزیز بگوی تھا۔ خلافت تحریک میں یہ قومی کاموں میں شامل ہوتے۔ قید و بند کے مصائب بھی جھیلے۔ مرزائیت پر انہیں خاصہ عبور حاصل تھا۔ اپنے علاقہ سے باہر بھی احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور آخرالذکر ضلع ہری پور ہزارہ تحصیل مانسہرہ کے قومی کارکن تھے۔ آزادیٔ وطن کے لیے ان کے عزائم غیر ملکی حکومت سے ہمیشہ ٹکرائے اور اس جرم کی پاداش میں انہیں اکثر جیل خانوں کے مصائب برداشت کرنا پڑے۔

ایک اور وفد کبھی کبھار بادِ سموم اچھے بھلے موسم کا مزاج بگاڑ دیتی ہے۔ کانٹے اپھول پتیوں سے دست و گریباں ہوتے ہیں۔ لالہ و گل لہولہان ہو جاتے ہیں۔ باغبان لاکھ سر پٹخے، شبنم آنسوؤں کا دریا بہا دے۔ لیکن موسم کی بوقلمونیاں بہار کا مزہ کرکرا کیے بغیر نہیں رہتیں۔

مجلس احرار کا وفد جس بحری جہاز میں حجاز جا رہا تھا اسی میں ایک اور وفد بھی حجاز جا رہا تھا، جس کی رہنمائی مولوی اسماعیل غزنوی کر رہے تھے۔ یہ وفد احرار کے خلاف مؤقف لیے ہوئے تھا۔

اسماعیل غزنوی، مولانا سید محمد داؤد غزنوی کا عم زاد بھائی تھا۔ اس کی والدہ مرزا غلام احمد قادیانی کے خلیفہ اوّل حکیم نورالدین کی حقیقی بیٹی تھی۔ اس رشتہ سے اسماعیل غزنوی، حکیم نورالدین (مرزائی) کے نواسے ٹھہرے۔ شاہِ حجاز سے ان کے خاندانی مراسم کیا تھے؟ تاریخ کا اس سے کوئی تعلق نہیں، لیکن ننھال کے ناتے سے انہیں مجلس احرار سے خاصی عداوت تھی۔ اسی بنا پر تحریک مسجد شہید گنج میں انہی کے مکان پر احرار کے خلاف جعلی چٹھیاں بھی مرتب کی گئیں۔

اسماعیل غزنوی ۱۸۹۰ء کو امرتسر میں مولانا عبدالواحد کے ہاں پیدا ہوئے۔ اور ۱۲۔ جون ۱۹۶۱ء کو لاہور میں ان کا انتقال ہوا۔

احرار کے خلاف جو لوگ اسماعیل غزنوی کے وفد میں شامل تھے ان میں غلام حسین میر کاشمیری، مولانا عبداللہ روپڑی (اہلحدیث) صوفی عبدالعزیز (تنظیم اہلحدیث امرتسر) حکیم مولوی محمد اشرف (پتوکی) مولوی عبدالجبار اہلحدیث کنڈیال) مولوی عبدالخالق (پتوکی ضلع لاہور) قابلِ ذکر ہیں۔

۲۶۔ فروری کو سفینۂ اکبر جدہ کے ساحل پر لنگر انداز ہوا۔ مولوی اسماعیل اور ان کے ہمراہی سرکاری انتظام کی سپرداری میں چلے گئے۔ اور احرار وفد عام حجاج کی طرح لاری کے ذریعے مکہ مکرمہ روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچنے پر اپنی آمد کی اطلاع سلطان عبدالعزیز بن سعود والیٔ حجاز کو کر دی۔

سر آغا خاں کی آمد ۱۴۔ فروری کو سر آغا دہلی پہنچے تو ریلوے اسٹیشن پر ان کا استقبال کرنے والوں میں سر ظفر اللہ شامل تھا۔ مخالفین کے مظاہرے کے خوف سے اسٹیشن کے اردگرد پولیس کا خاصہ انتظام تھا۔ آپ نے وائسرائے کلاج میں قیام کیا۔

سر آغا خاں نے ۱۶۔ فروری کو مسلم کانفرنس کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کہا
"انیسویں صدی کے پہلے نصف حصے میں ہندوستان کی سیادت مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل کر انگریزوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔

۱۸۵۷ء کے واقعات کی تمام تر ذمہ داری مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے اور اس واقعہ نے مسلمانوں کو اس امر کی طرف مائل کیا کہ وہ ہندوستان میں اپنے مستقبل پر غور کریں۔ آخر ۱۹۰۶ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد پڑی۔ پھر کانگریس اور مسلم لیگ کے معاہدے ہوئے۔ اس طرح بیسویں صدی کے پہلے دس سالوں میں مسلمانانِ ہند نے اپنی پالیسی پر دوبارہ غور کیا۔ اگر اس سال جنگِ عظیم شروع نہ ہوتی تو ۱۹۲۰ء کے بعد دوسرے دس سال مزید بہتر ہوتے۔

آخر میں آپ نے کہا،

اگر صوبجاتی آزادی، فرقہ وارانہ سپرٹ پر مبنی رہی تو سی۔پی، یو۔پی، بہار، اڑلیسہ، مدراس بمبئی اور آسام میں ہمیں انتہائی بربادی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بایں ہمہ مسلمان ان بہتر حالات کی توقع رکھتے ہیں، جن کے مطابق تمام فرقے وطن کی بہبودی کے طلبگار ہوں۔

مسلمانوں کا مطالبہ تھا کہ صوبہ سرحد، پنجاب، سندھ اور بنگال میں ان کی اکثریت کو تسلیم کیا جائے۔ مسلمانوں پر واضح ہو چکا ہے کہ پنجاب اور بنگال میں ان کی اکثریت محض برائے نام ہے۔ نیز یہ بھی واضح ہو چکا ہے کہ صوبہ سرحد اپنی جغرافیائی حیثیت اور اقتصادی پوزیشن کی بنا پر صوبجاتی آزادی سے کما حقہ استفادہ نہ کر سکے گا۔

ان حالات و کوائف سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی حالت میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی۔ ان کا مطالبہ تھا کہ چار صوبوں کی مجالس آئین سازی میں انہیں اکثریت دی جائے۔ اگرچہ بعض صوبوں میں اکثریت مل گئی ہے مگر بنگال میں انہیں اکثریت سے محروم کر دیا گیا ہے۔

ان تمام واقعات کے پیش نظر ہندوستان کی تمام قوموں کے فرقہ وارانہ تعلقات بہتر ہونے چاہییں۔ اور تمام فرقوں کو ملک کی بہبودی کی طرف مائل ہو کر اپنے اختلاف دور کر دینے چاہییں۔"

اس تقریر کے بعد ۱۸۔ فروری کو نیو دہلی میں مسٹر محمد علی جناح، سر آغا خاں سے ملے اور ہندوستان کے سیاسی حالات اور مسلم لیگ کی پالیسی پر بحث ہوتی رہی۔

مسٹر جناح لاہور پہنچ گئے

۲۴۔ فروری کو قائداعظم محمد علی جناح لاہور پہنچ کر گورنر پنجاب سر ہربرٹ ایمرسن سے ملے۔ اس ملاقات کے بعد گورنر پنجاب نے اعلان کیا:

"قضیۂ شہید گنج کے سلسلے کو حل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اگر کوئی فوری تصفیہ نہ ہو سکے تو صوبے میں ایسی فضا پیدا کی جائے، جس سے دونوں فرقوں کے درمیان تصفیہ ہو سکے۔ حکومت پنجاب کئی بار اس امر کی وضاحت کر چکی

ہے کہ حکومت کی کوشش ہے کہ دونوں قوموں کے درمیان باعزت اور عملی طور پر کوئی سمجھوتہ ہو سکے۔ لہٰذا گورنمنٹ نے فیصلہ کیا ہے کہ زیر دفعہ ۱۳ پنجاب کریمنل امینڈمنٹ ایکٹ مجریہ ۱۹۳۲ء کے تحت اس ایجی ٹیشن کے سلسلے میں جو نظر بند کیے گئے تھے ان پر سے قیود ہٹالی جائیں۔ اور اس ضمن میں احکام جاری کر دیے گئے ہیں۔"

قائداعظم کا بیان گورنر کے مندرجہ بالا اعلان کے بعد مسٹر محمد علی جناح نے اپنے پریس بیان میں کہا:

"میں حکومت پنجاب کے اس اقدام پر خوش ہوں۔ نظر بندوں کی رہائی کے بعد میرا بہت سا کام آسان ہو جائے گا۔ میں مسلمانوں کے تمام طبقوں کی آراء سے واقف ہوں۔ میں مسلمان بھائیوں کو اس پر راضی کر لوں گا کہ وہ باعزت تصفیہ کے لیے میرے ساتھ تعاون کریں۔ میں ہندو اور سکھوں کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے میرے متعلق خیر سگالی کا اظہار کیا۔"

اس بیان کے دوسرے روز ملک عنایت اللہ نے شاہی مسجد میں اعلان کیا کہ مسٹر جناح کے ارشاد کے مطابق جدید تحریک مسجد شہید گنج کے سلسلے میں سول نافرمانی ملتوی کر دی گئی ہے۔

ایک اہم سوال ۵۔ مئی ۱۹۳۷ء کے "نوائے وقت" لاہور میں ایک مضمون کے دوران لکھا گیا۔

"فروری ۱۹۳۶ء کو جب مسٹر محمد علی جناح تحریک مسجد شہید گنج کے سلسلے میں لاہور تشریف لائے تو ان کی قیام گاہ پر چند طلباء نے ان سے سوال کیا کہ "اگر منتشر مسلم قوم کو پاکستان کے نام پر ایک جگہ جمع کیا جائے تو؟"

اس کے جواب میں مسٹر جناح نے سوال کیا۔ پاکستان کس طرح بنے گا؟ اور کون بنائے گا؟"

ڈیفنس کمیٹی کا فیصلہ مسٹر جناح کی آمد اور گورنر پنجاب کے اعلان کے بعد تحریک مسجد شہید گنج کے رہنماؤں نے مسجد کے بارے میں ایک اور مقدمہ تیار کیا اور اسے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں دائر کر دیا۔ نیز اعلان کیا کہ آج کے بعد ہمیں اپنی تمام تر توت

فی الحال تنظیم اور مقدمہ کو کامیاب کرنے پر صرف کرنی چاہیے۔ اور دوسری تمام ترجدوجہد ملتوی کر دی جائے۔

اس ڈیفنس کمیٹی کے ذمہ دار ارکان یہ تھے۔

۱۔ خان بہادر مرزا ظفر علی ریٹائرڈ جج ہائیکورٹ۔ صدر ڈیفنس کمیٹی۔ ۲۔ نواب شاہنواز آف ممدوٹ۔ ۳۔ ڈاکٹر عبدالرحیم بی اے۔ سابق سول سرجن افغانستان۔ ۴۔ سید محسن شاہ بی اے ایل ایل۔ بی ہائیکورٹ لاہور۔

(روزنامہ الجمعیۃ دہلی ۲۰۔ فروری ۱۹۳۶)

سر آغاخاں کا مشورہ

۲۵۔ فروری کو آل مسلم پارٹیز کانفرنس کا ایک اجلاس زیر صدارت سر آغاخاں ہوا جس میں سر آغاخاں نے زور دیا کہ

"ہندوستان، مسلمانوں کا بھی ویسے ہی ملک ہے۔ جیسا ہندوؤں کا۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اور قوموں سے مل کر نئے آئین کو چلائیں۔ اور ڈومینین کا درجہ حاصل کریں"

یہ جلسہ میاں سر فضل حسین نے بلوایا تھا۔

("نامۂ اعمال" حصہ اول مصنفہ سر محمد یامین ص۲۶۱)

مسٹر جناح کی دہلی روانگی

۷۔ مارچ کو مسٹر محمد علی جناح لاہور سے تحریک شہید گنج اور دوسرے امور سے فارغ ہو کر دہلی روانہ ہوئے۔ انہیں اسٹیشن پر الوداع کہنے والوں میں احرار رہنما چودھری افضل حق اور مولانا مظہر علی کے علاوہ مرتضیٰ احمد میکش، فضل الٰہی قربان اور روزنامہ "احسان" کے مالک ملک نور الٰہی بھی شامل تھے۔

مسٹر جناح نے روانگی سے قبل حسب ذیل حضرات پر مشتمل ایک کمیٹی ترتیب دی جو تحریک شہید گنج کے سلسلے میں کام کو آگے بڑھائے۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال۔ مولانا عبدالقادر قصوری۔ میاں عبدالعزیز ایڈووکیٹ۔ میاں احمد یار خاں دولتانہ۔ راجہ نریندر ناتھ۔ پنڈت نانک چند۔ سر بہادر بوٹا سنگھ۔ سردار اجل سنگھ۔ سردار سپورن سنگھ۔

عالمی حالات اور ہٹلر

حبشہ اور اٹلی کی جنگ نے یورپین سیاستدانوں کو دوسری جنگ کے قریب تر کر دیا تھا۔ ہر گھڑی ان کے دل و دماغ آنے والے

بھیانک قسم کے واقعات پر سوچنے لگے۔ اس دوران مظلوم اور غلام قوموں کا تصور تک ان کے ذہنوں سے محو ہو چکا تھا۔ البتہ ہندوستان کا ردِعمل انہیں پریشان کیے ہوئے تھا۔ یا پھر جنوب مشرقی ایشیا کی سرخ ہوائیں ان کے نقشوں پر مٹی ڈال رہی تھیں۔

فرانس، جرمن کے خوف سے برطانیہ کی پناہ ڈھونڈ رہا تھا۔ روس اپنی ضرورت کے لیے فرانس کی قرابتداری چاہتا تھا۔ اٹلی حبشہ پر فتح پانے کے باوجود غیر مطمئن تھا حالانکہ لیگ آف نیشنز (LEAGUE OF NATIONS) اس کی ہمنوا تھیں۔ جرمن اس تماشے میں شامل نہیں تھا۔ لیکن جیسے ہی ۵۔ مارچ (۱۹۳۶) کو یہ خبر اخبارات میں شائع ہوئی کہ جینوا میں فرانس اور برطانوی باشندوں کی ایک کانفرنس میں فرانسیسی مسودہ منظور کر لیا گیا ہے، جس میں حبشہ اور اطالیہ سے اپیل کی گئی ہے کہ دنیا کے امن کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی لڑائی ملتوی کر دیں اور باہم مل کر صلح کی گفتگو کریں۔ نیز حبشہ اور اطالیہ کے معاملات کو ۱۳ ارکان کی ایک کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا۔

مندرجہ بالا خبر پر ہٹلر نے ۸ مارچ کو اپنے پروپیگنڈہ وزیر کو ہدایت کی کہ وہ پارلیمنٹ کا فوری اجلاس بلائیں، جس میں تقریر کرتے ہوئے ہٹلر نے کہا،

"میرے ملک کے لوگ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ اجلاس اہم امور پر فیصلہ کرنے والا ہے۔

اس وقت عالم میں ایسی کشیدگی پیدا ہو چکی ہے کہ تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ جنگ کے دیوتا نے اپنے جنگی ہتھیاروں کو اپنے ہاتھوں سے ہر چیز کو مسلح کر دیا ہے۔ دنیا ان حرکات کی ذمہ داری جرمن پر عائد نہیں کر سکتی۔ گذشتہ سال کے دوران جرمن کی حالت ایک حکمران قوم کی نہ تھی۔ بلکہ وہ غلام قوموں میں شمار ہوتا تھا۔ معاہدہ ورسائی اصول پر مرتب نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ اسے منافرت کی فضا میں ترتیب دیا گیا۔ اس معاہدے میں کوئی دفعہ ایسی موجود نہیں، جس سے امید کی جا سکے کہ جرمن ممالک کے تعلقات کو دائمی طور پر خوشگوار رکھنے میں کامیاب ہوگا۔ جرمن کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ یورپ کے امن کو خراب کرے۔ لیکن اگر یورپ کے سیاستدانوں نے کلچر اور نسلی امور کو نظر انداز

کر کے یورپ کے تصفیہ کی کوشش کی تو اس صورت میں فضا زیادہ خراب ہو جائیگی۔
اس وقت جرمن پر بحث کی جا رہی ہے۔ یہ موضوع نہ صرف ہماری طرزِ حکومت سے متعلق ہے۔ بلکہ اس کا تعلق براہِ راست چھ کروڑ جرمن باشندوں سے ہے جن کی ضرورت ویسی ہی ہے جیسی کہ فرانسیسیوں کی ہے۔ جس کے لیے وہ جدوجہد کرنے کا حق رکھتے ہیں۔"

اسی شام کو ہٹلر نے اپنے فوجی مشیروں کو طلب کیا اور رہائن لینڈ پر قبضہ کرنے کی تجویز ان کے سامنے رکھی۔ مارشل بلومبرگ جو ان دنوں چیف آف سٹاف تھا۔ وہ اپنی فوج کو جنگ کے قابل نہ سمجھتا تھا۔ اس نے رہائن لینڈ میں اقدام کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ فرانس اور برطانیہ سے جنگ ہو جائے گی اور ہم عہدہ برآ نہ ہو سکیں گے۔

مگر ہٹلر کے جاسوس اپنا کام کر چکے تھے۔ اور ان کا پروپیگنڈہ ہر طور کامیاب تھا۔ اس بنیاد پر ہٹلر نے کہا کہ فوجی کارروائی کی کوئی ضرورت نہ ہوگی، نہ فرانس اور نہ ہی کوئی اور جنگ کرے گا۔ ہمیں ایک گولی چلائے بغیر قبضہ مل جائے گا۔

مارشل فرش نے جو سالارِ اعظم تھا۔ ہٹلر سے کہا کہ اس وقت ہماری فوج تو تنہا فرانس کی فوج کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتی۔ میں اس اقدام کی ذمہ داری اپنے سر نہیں لے سکتا۔

ہٹلر فوجی افسران کی گفتگو سے پریشان تو ہوا لیکن اس کی فطرت اس کو سہارا دے گئی۔ اس نے کہا۔ کہ

"اگر فرانس کی فوج مقابلہ کرے گی تو میں خودکشی کر لوں گا۔ اور تم میرے مرنے کے بعد فوجوں کو واپسی کا حکم دے کر جھگڑے کو ختم کر دینا اور فساد سے بچنے کے لیے فوجوں میں کوئی سامانِ جنگ تقسیم نہ کرنا۔"

۷۔ مارچ صبح کے وقت جرمن سفیر نے پیرس میں فرانس کے وزیر خارجہ کو ایک یادداشت جو جرمن زبان میں تھی، حوالے کی۔ پیشتر اس کے کہ وزارت اس پر غور کر سکے دس اور ساڑھے دس بجے صبح کے درمیان فرانس اور برطانیہ کے سفیروں اور بلجیم کے نمائندے کو جرمن کے وزیر نے یکے بعد دیگرے برلن میں ملاقات کر کے ایک یادداشت حوالے کی۔ ان یادداشتوں میں کہا

تھا۔ کہ جرمنی میثاقِ لوکارنو سے بیزاری کا اعلان کرتا ہے ۔ اور رہائن لینڈ پر فوراً قبضہ کر رہا ہے ۔

دوپہر کے وقت جرمن فوجیں رہائن لینڈ میں بڑھیں اور سارے علاقہ پر قبضہ کر لیا ۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جرمن فوجوں کو کوئی کارتوس یا سامانِ جنگ نہیں دیا گیا تھا ۔ اس طرح جرمنی نے ایک گولی چلائے بغیر معاہدہ وارسائی کی ایک اور پابندی ختم کر دی ۔

(" دنیا کی بساطِ سیاست " مصنفہ مولانا مظہر علی اظہر صہ ۹۰-۹۱)

گذشتہ دنوں کی اس خبر کی حبشہ نے تردید کر دی کہ حبشہ اور اٹلی کے درمیان عارضی صلح ہو چکی ہے ۔ حبشہ آخری وقت تک جنگ کرے گا ۔ اور اس میدان میں اٹلی نے پانچ ہزار حبشیوں کو روپیہ اور اسلحہ دے کر بغاوت پر آمادہ کرنا چاہا تھا ۔ لیکن انہوں نے شہنشاہ حبشہ کے روبرو روپیہ اور ہتھیار ڈال کر اپنی وفاداری کا حلف اٹھایا ۔

جمعیۃ اقوام کو جرمن کا جواب

لندن ۱۶ ۔ مارچ یہ افواہ گرم تھی کہ جرمن نے لیگ کونسل کی دعوت کو مشروط طور پر قبول کر لیا ہے ۔ یعنی

" جرمن لیگ کونسل کے اجلاس میں مساوی حیثیت اور خود مختار حکومت کی حیثیت سے شامل ہوگا "

جارج پنجم کا سوگ

امسال ۲۰ ۔ جنوری کو برطانوی شہنشاہ جارج پنجم کا انتقال ہو گیا تھا ۔ ان کی جگہ ایڈورڈ ونڈسر نے بطورِ بادشاہ ایڈورڈ ہشتم کے نام سے اختیارات سنبھال لیے تھے ۔ لیکن بین الاقوامی صورتِ حال کے پیشِ نظر ہندوستان میں سرکاری طور پر ان کا سوگ ۷ ۔ مارچ کو منایا گیا ۔ چنانچہ اس روز سنٹرل اسمبلی کا اجلاس جس میں وائسرائے ہند خود شامل ہو کر تقریر کرنے والے تھے ملتوی کر دیا گیا ۔

سر فضل حسین کی کامیابی

سیاسی میدان میں اگر باپ اور بیٹا آمنے سامنے ہوں تو اس راہ میں یہ رشتہ بھی ٹوٹ کر رہ جاتا ہے ۔ دونوں اقتدار کے حصول میں ایک دوسرے کے حریف ہوتے ہیں ۔ رفاقت کیسی ہی کیوں نہ ہو ۔ یہ مقام اس بوجھ کا متحمل نہیں ہوتا ۔

سر فضل حسین ، سر سکندر حیات خاں اور سر فیروز خاں نون ، برطانوی راج کی پائیداری

میں ان سب کا خون برابر وزن میں شامل رہا۔ اگر ایک نے اسلامی اصولوں سے بغاوت کرتے ہوئے یونین جیک تھام رکھا تھا تو دوسروں نے افواج فرنگی میں شامل رہ کر بلادِ اسلامیہ کو تاخت و تاراج کرنے میں کوئی کمی نہیں کی۔ اس ہم آہنگی اور ہمراہی کے باوجود جیسے انہیں راستے کی ناہمواری پر شبہ ہوا تو اپنے آنگن کے پھول بھی کانٹے نظر آنے لگے۔

سر فضل حسین نئے آئین کے تحت پنجاب کے وزیرِ اعظم بننے کی خواہش میں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل سے مستعفی ہو کر پنجاب پہنچے تو سر سکندر حیات کو اپنے راستے کا روڑا سمجھ کر انہیں ریزرو بنک کا ڈپٹی گورنر بنا کر بمبئی بھجوا دیا۔ حالانکہ یونینسٹ پارٹی میں بجائے خود اس وقت تک کوئی جان نہیں تھی اور نہ ہی سکندر حیات پنجاب کی عوامی سیاست میں کوئی شخصیت سمجھے جاتے تھے۔ یہی حال سر فیروز خاں نون کا تھا۔ وہ پنجاب کے وزیر تعلیم ہوتے ہوئے بھی کوئی شخصیت نہیں تھے۔ ؎

آنے والے کسی طوفان کا رونا رو کر
ناخدا نے مجھے ساحل پہ ڈبونا چاہا

آخر سر فضل حسین نے سر فیروز خاں نون کو اپنے راستے سے کیسے ہٹایا یہ کہانی سر محمد یامین کی زبانی سنیے۔

"میاں سر فضل حسین کی ایک بڑی سیاسی کامیابی یہ ہوئی کہ فیروز خاں نون کو ہائی کمشنر انگلستان مقرر کرا دیا۔

اب تک یہ چلا آتا تھا کہ جو ایگزیکٹو کونسلر انڈسٹریز و لیبر کا ہوتا تھا وہ میعاد ختم ہونے پر انگلینڈ میں ہندوستان کا ہائی کمشنر ہوتا تھا۔ سر بی این مہترہ کی میعاد ختم ہونے پر یہ طے تھا کہ سر جوزف بھور مقرر ہوں گے جو گذشتہ سال ریٹائر ہوئے۔ معاملہ بالکل طے ہو گیا تھا اور اعلان ہونے والا تھا کہ سر ایچ ایمرسن گورنر پنجاب نے میاں سر فضل حسین سے کہا آپ پنجاب میں ایگزیکٹو کونسل کے ممبر ہو جائیں۔ انہوں نے کہا، میں وزارت پسند کرتا ہوں گورنر نے کہا آپ کے رشتہ دار ملک فیروز خاں نون وزیر ہیں۔ تو ایک ہی

خاندان میں تو سب وزارتیں نہیں ہو سکتیں۔ اس پر میاں سر فضل حسین نے کہا اچھا میں مخالف بنچوں پر بیٹھ جاؤں گا۔ گورنر بولا اگر آپ مخالف بنچوں پر جا بیٹھیں گے تو گورنمنٹ بنچوں پر کون رہ جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ یہ تو آپ سوچیں۔

گورنر نے کہا کہ اچھا میں فیروز خاں نون کو برخاست کر کے آپ کو (وزیر) کیسے دیتا ہوں۔ سر فضل حسین نے کہا کہ برخاست کرا کے میں آنا نہیں چاہتا۔ لہٰذا فیروز خاں نون کو ہائی کمشنر بنوا دو۔ گورنر نے کہا، وقت فیصلہ ہو چکا ہے۔ سر فضل حسین نے کہا کہ ابھی ٹیلیفون کرو اور وائسرائے سے جا کر ملو۔ اور مسلمانوں کے حق کا سوال پیش کرو۔ گورنر نے ٹیلیفون وائسرائے کو کیا کہ کل جو اعلان ہونے والا ہے، اس کو لندن اور دہلی میں روک دیا جائے۔ میں دہلی کے لیے روانہ ہوتا ہوں۔

گورنر نے دہلی میں وائسرائے سے کہا، میں پنجاب میں حکومت نہیں چلا سکتا اگر فیروز خاں نون کو ہائی کمشنر نہ کیا گیا۔ وائسرائے مشکل سے راضی ہو گیا اور سیکرٹری آف سٹیٹ سے اس کو منظور کرا دیا، کہ فیروز خاں نون ہائی کمشنر ہو جائیں۔

اس میں کئی باتوں کی جیت ہوئی۔ اوّل تو یہ کہ مسلمان کو ہائی کمشنر کروا دیا دوم یہ کہ سر جوزف بھور کو جو مسلمانوں سے سخت تعصب رکھتا تھا نیچا دکھایا اور ہائی کمشنر کے جو خواب دیکھ رہا تھا وہ ختم کرا دیے۔ خود پنجاب کے وزیر اعظم ہو گئے اور سر سکندر حیات کو ریزرو بنک کا ڈپٹی گورنر بنوا دیا۔ جس کے ہاتھ میں تمام عملہ کا تقرر ہوا"

("نامۂ اعمال" صفحہ ۶۲۶-۶۲۷)

مدینہ منورہ میں مرزائیوں کو شکست

گو زیر نظر تاریخ اس سے لاتعلق ہے۔ کہ غیر مقلد لوگوں نے مرزا غلام احمد کے کفریہ عقائد

ابتداً کیوں کر اپنائے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ مرزا غلام احمد اور اس کا خلیفہ اوّل (حکیم نور الدین) باطل عقاید اختیار کرنے سے پیشتر یہی ذہن اور عقائد رکھتے تھے۔ شاید اسی لیے مولانا ثناء اللہ امرتسری نے اپنی تحریروں اور مناظروں میں مرزائیوں کو منافق تو کہا لیکن غیر مسلم کہنے سے احتراز کرتے رہے۔

جب غزنوی خاندان کا ایک فرد (مولوی اسماعیل غزنوی) عزیزداری میں مرزائیوں کے قریب تر پہنچا تو اسلام کے واضح اصول بھی مجروح ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

مرزائی غیر مسلم ہونے کی حیثیت سے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ لیکن مولوی اسماعیل غزنوی کی چونکہ سعودی حکومت سے قریبی رسم و راہ تھی۔ اس اعتماد پر اسماعیل غزنوی کی وساطت سے مولوی احمد نامی ایک غیر مقلد نے مدینہ منورہ میں مدرسہ دار الحدیث قائم کر رکھا تھا۔ یہ شخص حکومتِ حجاز کا وظیفہ خوار بھی تھا۔ اس تعلق کی بناء پر اکثر مرزائی حج کے بہانے حجاز پہنچ کر سادہ لوح مسلمانوں کے ایمان خراب کرتے رہتے۔ حکومتِ حجاز اس راز سے ناآشنا تھی۔

ویسے بھی ۱۹۳۶ء تک مرزائیت اس قدر واضح نہیں تھی کہ مسلمان اس سے نفرت کرنے لگتے۔ ۲۰۔ مارچ ۱۹۳۶ء کو احرار کا وفد مناسکِ حج سے فراغت کے بعد مدینہ منورہ پہنچا تو نہ جانے اسے یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ مدرسہ دار الحدیث میں ہندی اور مصری حجاج کا اجتماع ہو رہا ہے۔ جس میں مدرسہ ہٰذا کی مالی امداد کے لیے اپیل کی جائے گی۔ جب احرار وفد مدرسہ دار الحدیث میں داخل ہوا تو مدرسہ کے مہتمم مولوی احمد نے مختصر الفاظ میں مدرسہ کی روئداد سنائی۔ مدرسہ کے مختلف طلباء نے مختلف مضامین پڑھے۔ اس دوران لائلپور کے ایک مرزائی نے مدرسہ کی امداد کے لیے ایک سو روپیہ نقد پیش کیا۔ اور سورۃ العصر کی مرزائیانہ تفسیر سنا کر انگریزی تعلیم کی ضرورت پر زور دیا۔ تاکہ یورپ میں تبلیغ اسلام کی جائے۔ اس دوران مرزائی نے اپنے فرقے کی خوبیوں کا تذکرہ بھی کیا۔ اس کے بعد ایک اور مرزائی اٹھا، اس نے پادریوں کے انداز میں دعا مانگی۔ حاضرین آمین کہتے رہے۔ مرزائی گرجا کے پادریوں کی طرح ہاتھ اٹھائے بغیر کہہ رہا تھا۔

"اے خدا! کفر کا زور ہے۔ کفر دنیا کے کناروں تک پہنچ گیا ہے۔ اسلام بےکس اور بے چارہ رہ گیا ہے۔ تو نے اس زمانے میں اپنے لطف و کرم سے کفر کے استحصال کے لیے ایک مقدس وجود ظاہر کیا ہے۔ جس کی طفیل ایک پاک گروہ تیرے دین کی خدمت میں مصروف ہے۔ وہ دنیا کے کناروں تک تیرا نور پھیلا رہا ہے۔ اے اللہ! اس گروہ کو ترقی دے اور اس گروہ کے ہر فرد کو محمد رسول اللہ اور اس کے صحابہ جیسا بنا دے۔"

اس تقریر سے صاف واضح ہو رہا تھا کہ یہ مرزائی ہے۔ چنانچہ ارکان وفد میں سے مولانا ظہور احمد بگوی نے فوراً اٹھ کر صدر جلسہ سے تقریر کی اجازت چاہی اور پھر اس مرزائی کی تمام تقریر اور اصلیت عوام پر واضح کی۔ جب لوگوں پر حقیقت واضح ہوئی تو مجمع میں سخت اشتعال پھیل گیا۔ اس موقعہ پر مولوی احمد نے مرزائیوں کو بچانا چاہا لیکن دار الحدیث کے مصری صدر مدرس نے کہا یہ لوگ (مرزائی) واجب القتل ہیں۔ اس پر کافی ہنگامہ ہوا اور مجلس درہم برہم ہو گئی۔ دوسرے دن پتہ چلا کہ مرزائی جدہ پہنچ کر ہندوستان روانہ ہو گئے ہیں۔

(ماہنامہ شمس الاسلام "ختم نبوۃ نمبر" بابت شمارہ مارچ اپریل ۱۹۷۵ء ص۱۱۳ تا ص۱۱۵)

سلطان حجاز سے احرار وفد کی ملاقات

تقریبات حج کی سرکاری ذمہ داریوں سے فراغت کے بعد سلطان عبد العزیز والئی حجاز نے ۲۲۔مارچ (۱۹۲۶) کو احرار وفد کو شرف ملاقات بخشا۔ اس سے پیشتر مولوی اسماعیل غزنوی بمعہ اپنے رفقاء کے شاہ حجاز سے ملاقات کر چکا تھا۔ اور احرار کے خلاف اپنے تاثرات سے والئی حجاز کے مزاج پر اثر انداز ہو چکا تھا۔ اس بناء پر جیسے ہی احرار وفد والئی حجاز کے روبرو پیش ہوا۔ شاہ کے تیور بدل گئے۔ اور وہ سب سے زیادہ مولانا داؤد غزنوی پر ناراض ہوئے کہ وہ اس وفد کے ساتھ کیوں آئے ہیں۔ والئی حجاز کا یہ گلہ غزنوی خاندان پر چند ذاتی احسانات کی بنا پر تھا۔ اس کے بعد سلطان عبد العزیز بن سعود نے فرمایا:

"میرا ملک زرخیز نہیں۔ ہمیں صرف حاجیوں کی آمدن پر گذر بسر کرنی پڑتی ہے اور حاجیوں کی تعداد ہر سال غیر ملکی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے کم ہوتی رہتی ہے۔"

جس کی بناء پر میرا ملک مالی مشکلات میں الجھا ہوا ہے۔ جب مجھے تحقیقات پر معلوم ہوا کہ میرے ملک میں خدا نے تعالیٰ کا دیا ہوا خزانہ موجود ہے تو میں کیوں نہ اس سے استفادہ کروں اور اس طرح میرا ملک مالی مشکلات سے نجات حاصل کرتے

والئ حجاز سے اس گفتگو کے علاوہ اور کیا باتیں ہوئیں، اس کی تحقیق نہیں ہو سکی تاہم مولانا مظہر علی اظہر نے حجاز سے واپسی پر اس قدر بتایا:

"ہم نے شاہ عبدالعزیز بن مسعود سے ملاقات کی اور عرب کے مسائل پر تبادلۂ خیال کیا۔ جس سے حالات کا بہترین نقشہ فریقین کے ذہنوں میں آگیا۔ اندر کی باتیں کچھ اس انداز کی ہیں کہ ان کا اظہار مناسب نہیں اور نہ ہی ان کا ڈھنڈورا پیٹنا درست ہوگا۔ لیکن آنے والا وقت بتائے گا کہ ہمارے خدشات درست تھے۔"

مفتی کفایت اللہ کا بیان

۲۳۔ مارچ کو ہندوستان کے مفتئ اعظم اور جمعیۃ علمائے ہند کے صدر مولانا مفتی کفایت اللہ نے لاہور کی ایک عدالت میں مسجد شہید گنج کے مقدمہ میں شہادت دیتے ہوئے کہا:

"مسجد کی شرعی حیثیت واضح ہے۔ اگر ایک دفعہ کسی جگہ پر مسجد تعمیر ہو جائے تو پھر قیامت تک وہ مسجد ہی رہتی ہے۔ اس پر نہ تو کوئی دوسری عمارت تخلیق ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس کی ہیئت بدلی جا سکتی ہے۔"

کانگریس نے بحث ختم کر دی

۲۴۔ مارچ کو دہلی ہری جن کالونی میں آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس شروع ہوا، جس میں کمیونل ایوارڈ زیر بحث تھا۔ لیکن شروع اجلاس میں تمام ممبران نے بغیر کسی گفتگو کے اس پر ہمیشہ کے لیے بحث ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔

ہندوستان میں ہٹلر کے خلاف پروپیگنڈہ

جرمن قوم کو جس عاجلانہ طریق پر ہٹلر نے زندہ قوموں کی صف میں لا کھڑا کیا تھا۔ اقوام یورپ اور خاص کر برطانیہ اس سے زیادہ پریشان تھا۔ یورپ کے بعد ہندوستان کے اخبارات نے سرکاری سطح پر ہٹلر کے خلاف یہ پروپیگنڈہ شروع کیا کہ اس نے تحریک آزادئ ہند اور ہندوستانیوں کے

خلاف زہر اگلا ہے ۔اس پر ہٹلر کے خلاف ہندوستانیوں میں ہوا پھیلنے لگی ۔لیکن سیکرٹری جماعت اسلامیہ جرمن مسٹر حبیب الرحمٰن قریشی نے فوراً اس کی سختی سے تردید کر دی اور ساتھ ہی جرمن کے پروپیگنڈہ سیکرٹری ڈاکٹر گوبلز نے بھی ۲۱۔مارچ کے ایک بیان کے ذریعے اس کو غلط قرار دیا۔

انتخابات کی سرگرمیاں

اپریل کا مہینہ ہندوستان میں انتخابی ہنگامہ آرائی کا اہم اور سرگرم مہینہ قرار دیا جا سکتا ہے ۔کانگریس اور مسلم لیگ کے علاوہ دیگر سیاسی جماعتیں ایک دوسرے سے گفتگو، معاہدات یا گٹھ جوڑ کرنے میں مصروف تھیں ۔ ۱۹۳۵ء ایکٹ کے ذریعے جو صوبائی خود مختاری ہندوستان کو ملی ، ہر فرد کسی نہ کسی طریق پر اس سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا خواہ انفرادی یا اجتماعی ۔ہندوستان کی معروف سیاسی پارٹیاں اپنا اپنا منشور اور مستقبل کے لیے طرزِ حکومت کا نقشہ لیے پھر رہی تھیں۔

کانگریس ، مسلم لیگ ، جمعیتہ علمائے ہند اور مجلس احرار ان دنوں عوام کے ذہنوں پر قابض تھیں ۔رجعت پسند اور سرکار پرست طبقہ بھی کسی نہ کسی انداز میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا غیر ملکی اقتدار اپنے استحکام کی سوچ میں تھا ۔ایسے میں والیانِ ریاست دوہری مشکلات میں تھے اپنی رعایا سے ان کا برتاؤ حاکمانہ غرور پر تھا ۔اور دوسری طرف ان کا برطانوی سہارا دم توڑ رہا تھا ۔ان حالات میں ریاستی نظام کے وارث نواب مسلم لیگ کا تکیہ چاہتے تھے اور مہاراجگان کانگریس کی عبا اوڑھے پھرتے رہتے ۔

انتخاب کے دن جیسے جیسے قریب آتے گئے ۔دانشوروں کے ذہن اور صلاحیتیں نکھر کر سامنے آتی گئیں ۔یکم اپریل (۱۹۳۶ء) کو سندھ بمبئی سے الگ صوبہ قرار دے دیا گیا تو سندھی سیاستدان بھی پر پرزے نکالنے لگے ۔سمرو ، کھوڑو اور بھٹو خاندان کے وڈیرے اپنا اپنا چھپارا اٹھائے سندھی عوام کے نقش پا ڈھونڈنے لگے ۔ورنہ یہ لوگ محلاتی سازشوں کے ذریعے اپنے مقدر سنوارنے کے عادی تھے ۔

ایکٹ ۱۹۳۵ء اقوامِ ہند کے ہر طبقے نے ناپسند کیا ۔البتہ وجوہ مختلف تھے ۔

۱۔ کانگریس چونکہ ۱۹۲۹ء کے اجلاس لاہور میں آزادی کی قرارداد منظور کر چکی تھی ۔اور وجوہ آئینی درجہ نو آبادیات تک محدود نہ تھا ۔

۲۔ مسلم لیگ اس وقت تک غیر مقبول جماعت تھی۔ عوام سے اس کا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ اور نہ کوئی پروگرام۔ مسلم لیگ وفاق میں ریاستوں کی شمولیت کے خلاف تھی کہ اس طرح مسلمانوں کا تناسب آبادی مزید کم ہو جاتا تھا۔ نیز اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے گورنروں کو دیے گئے خصوصی اختیارات کو ناکافی تحفظ خیال کرتی تھی، جیسا کہ بعد کے واقعات نے ثابت بھی کر دیا۔ اس کے علاوہ مسلم لیگ کو پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کو اقلیت میں بدل دینے پر بھی اعتراض تھا تاہم مسلم لیگ نے اس سکیم کو عارضی طور پر تسلیم کر لیا۔

۳۔ وفاقی کونسل میں ریاستی عوام کی بجائے والیانِ ریاست کو نمائندگی دی گئی تھی۔ کانگریس اور مسلم لیگ اس طرزِ عمل کے خلاف تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دستورِ نو کا وفاقی حصہ نافذ نہ ہو سکا۔

کانگریس بظاہر اپنے کو اقوامِ ہند کی نمائندہ سمجھتی رہی لیکن مہاسبھائی گروہ اس کی انتظامیہ پر قابض ہوتا جا رہا تھا۔ نیشلسٹ مسلمانوں کی اکثریت کانگریس کے اندرونی ماحول سے دل برداشتہ ہو کر بھاگنے لگی۔ مجلسِ احرار اور جمعیتہ علمائے ہند گاہے گاہے آزادیٔ وطن کے لیے کانگریس کی ہمنوا ضرور تھیں۔ ورنہ ان کا کانگریس سے کوئی سیاسی رشتہ نہیں تھا۔

نئے انتخاب کے موقعہ پر مسلمانانِ ہند کا باہم مل بیٹھنا ضروری سمجھا گیا اس کے بغیر انگریز اور ہندو کی سیاسی گیم کامیاب ہو رہی تھی۔ لیکن مسلمان تین حصوں میں منقسم تھے۔ مسلم لیگ تن آسان اور ماڈریٹ قسم کے مسلمانوں کو پناہ دیے ہوئے تھی۔ سیاسی دل و دماغ کا مسلمان انگریز دشمنی کے باعث ہندوستان بھر میں الگ حیثیت سنبھالے ہوئے تھا۔ انگریز سے وابستہ بوڑھی مسلمان کا دولت مند طبقہ اپنی تقدیر غیر ملکی وقار سے سمجھے ہوا تھا۔ اس انفرادیت سے ہر گروہ کی سیاسی ضد ایسی جڑ پکڑ چکی تھی کہ ان کا ایک محور پر جمع ہونا دشوار نظر آ رہا تھا۔ اس مشکل راستے میں ایک موڑ آیا کہ دہلی میں یونٹی بورڈ کی مجلس عاملہ نے ایک اجلاس طلب کیا۔ اس میں مسٹر محمد علی جناح خود شریک تو نہ ہوئے مگر ان کا حسبِ ذیل پیغام تین چودھری نے پڑھ کر سنایا۔

"بجائے یونٹی بورڈ کے تحت الیکشن لڑنے کے مسلم لیگ کے نام پر الیکشن لڑا جائے اور اس میں پرانی جماعتوں کو اکٹھا کیا جائے۔"

اس مشورے پر ہاؤس کی یہ رائے ٹھہری کہ مسٹر جناح کو خود آ کر اپنی بات کی وضاحت کرنی

چاہیے۔ چنانچہ دوسرے روز سہ پہر کے اجلاس میں مسٹر جناح کی موجودگی میں مفصل بحث ہوئی۔ اس جلسہ میں یونٹی بورڈ کے علاوہ جمعیۃ علمائے ہند کے ارکان بھی خاص دعوت پر شریک اجلاس تھے۔ اس دوران یہ سوال سامنے آیا کہ

"جو لوگ اپنا مسلک کامل آزادی رکھتے ہیں، وہ مسلم لیگ کے ممبر کیسے بن سکتے ہیں؟"

جواب میں مسٹر محمد علی جناح نے کہا

"جو لوگ آگے ہیں ان کا پیچھے والوں کے ساتھ شامل ہو جانا کوئی قابلِ اعتراض عمل نہیں۔"

بالآخر طے پایا کہ مسلم لیگ کی بجائے مسلم پارلیمنٹری بورڈ پر الیکشن لڑا جائے، جس میں تمام جماعتیں شریک ہوں۔ نیز مولانا احمد سعید ناظم اعلیٰ جمعیۃ علمائے ہند کی تجویز پر قائد اعظم محمد علی جناح کو اختیار دیا گیا کہ وہ پارلیمنٹری بورڈ کے ممبر خود نامزد کریں۔ اجلاس کے خاتمے پر حسبِ ذیل الیکشن مینیفسٹو شائع کیا گیا۔

۱۔ تمام جابرانہ قوانین منسوخ کرائے جائیں گے۔

۲۔ ملک کی اقتصادی لوٹ مار کو روکا جائے۔

۳۔ ملک کے بھاری اخراجات کو گھٹایا جائے۔

۴۔ ملکی صنعت و حرفت کو ترقی دی جائے گی۔

۵۔ سکہ و شرح تبادلہ کا خیال رکھا جائے گا۔

۶۔ غیر ملکی قرضوں کا بوجھ کم کیا جائے گا۔

۷۔ ابتدائی تعلیم کو مفت کیا جائے گا۔

۸۔ مسلمانوں کے مذہب اور زبان کی حفاظت کی جائے گی۔

۹۔ ملک میں رائے عامہ کو بیدار کیا جائے گا۔

۳ اپریل کے اجلاس میں طے پایا کہ ۱۰ اپریل کو بمبئی مسلم لیگ کے اجلاس میں سب مسلم جماعتوں کو شرکت کی دعوت دی جائے۔

کانگریس کی قرارداد مسلم یونٹی بورڈ کے اجلاس منعقدہ دہلی کے بعد، ۷ اپریل کو آل انڈیا کانگریس کی مجلس عاملہ کے آئندہ انتخاب کے لیے اپنی واضح پالیسی کا اعلان کرتے ہوئے حسب ذیل قرارداد منظور کی۔

"کانگریس ورکنگ کمیٹی کا یہ اجلاس ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نئے آئین کو غیر تسلی بخش اور ملک کی آزادی کے لیے باعثِ خطرہ قرار دیتے ہوئے اسے بالکل نامنظور اور مسترد کرنے کی سفارش کرتا ہے، نیز قرار پایا کہ کوئی ایسا آئین جسے کوئی غیر ہندوستانی طاقت وضع کرے اور ہندوستانیوں کے اس حق کو تسلیم کرنے سے انکار کرے، جس سے ہندوستانیوں کو اپنے سیاسی اور اقتصادی مستقبل کی تکمیل کا حق حاصل نہیں، وہ آئین قطعاً ناقابلِ قبول ہے۔

ہندوستان کے لیے کانسی ٹیوٹ اسمبلی کا تیار کردہ آئین ہی قابل قبول ہو سکتا ہے۔

اس حقیقت کے پیش نظر کہ نئے آئین کے تابع صوبجاتی مجالس وضع قوانین کے انتخاب کانگریس کے آئندہ اجلاس سے قبل ہوں گے ایسی صورت میں کانگریس انتخابات میں ایسے امیدوار کھڑے کرے جو کانگریس کی اعلان کردہ پالیسی اور فرمان کے مطابق عمل کرے۔"

نئے وائسرائے کی آمد ۸۔ اپریل کو ہندوستان کے نئے وائسرائے مسٹر لارڈ لنلتھگو نے اپنے عہدے کا چارج سنبھالا تو حالات میں نئی تبدیلی آئی۔ نئے حاکم نے نئی پالیسی وضع کی، جس سے غلام ہندوستان کا احساس غلامی نئے جذبات سے ابھرا اور آئندہ انتخاب میں ہر سیاسی جماعت نے اپنی ذمہ داری کو محسوس کیا۔ نئے وائسرائے کا پہلا وار مسٹر سبھاش چندر بوس پر ہوا کہ وہ یورپ سے واپسی پر جہاز سے اترتے ہی ریگولیشن ۱۸۱۸ء کی دفعہ ۳ کے تحت گرفتار کر لیے گئے۔

قائد اعظم کی تقریر یونٹی بورڈ کی گذشتہ روز کی میٹنگ کے بعد جمعیۃ علمائے ہند کے ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے صدر مسلم لیگ نے کہا:

"حکومت نے یہ آئین تمام پارٹیوں کی مرضی کے خلاف اس ملک پر محض اس وجہ سے ٹھونس دیا ہے کہ ہندوستانی آپس میں متحد نہ تھے اور اپنے خانگی اختلافات کا تصفیہ خود نہ کر سکتے تھے۔ تاہم مسلمان آزادی کی جنگ میں بھی ساتھ چلنے کو تیار ہیں۔ صرف اپنا تحفظ چاہتے ہیں۔ چونکہ وہ اقلیت میں ہیں۔ یہ کوئی مذہبی سوال نہیں بلکہ خالص سیاسی مسئلہ ہے۔ میں ہندوؤں سے اپیل کرتا ہوں کہ کمیونل ایوارڈ پر بحث کا دروازہ بند کریں تاکہ ہم سب مل کر آگے بڑھ سکیں اور ملک کے بڑے مسئلے کی طرف توجہ دیں۔

ہندو اور مسلمانوں کو الگ الگ منظم ہونا چاہیے۔ اگر دونوں منظم ہو گئے تو انہیں تعاون کے راستے پر چلنے میں دیر نہ لگے گی۔

(مارشل لاء سے مارشل لاء تک ص ۱۷۱)

علیگڑھ یونیورسٹی کا وائس چانسلر

ملک کی سیاسی جماعتیں انگریز اور غیر مسلم کا جواب دینے میں مصروف تھیں۔ اس بنیاد پر مسلم لیگ سمیت مسلم جماعتوں کا باہم اتحاد ہو رہا تھا۔ انہی دنوں کا ذکر ہے کہ

"چودھری سر ظفر اللہ (مرزائی) کو نواب حیدر آباد دکن کی سفارش پر علیگڑھ یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنایا جا رہا تھا"

اگر یہ عہدہ کسی غیر مسلم کے قبضے میں چلا جاتا تو اس اہم تعلیمی ادارے کا کیا حشر ہوتا؟ جہاں ہزاروں کی تعداد میں مسلمان طلباء تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ان کے ایمان اور عقیدہ ختم نبوۃ کس بری طرح مجروح ہوتے۔ احرار اپنی سیاسی مصروفیت کے باوجود اس فتنے سے غافل نہیں تھے۔ چنانچہ جیسے ہی یہ اطلاع احرار رہنماؤں تک پہنچی۔ صدر آل انڈیا مجلس احرار مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی نے ایک برقیہ والئی حیدر آباد کو بھیجا۔

"علیگڑھ یونیورسٹی ایک اسلامی درسگاہ ہے۔ اس کا وائس چانسلر کسی مسلمان کو تجویز کریں"

اس خبر کو بڑی حد تک مخفیہ رکھا گیا لیکن جیسے ہی صدر مجلس احرار کے برقیہ کا متن اخبارات

میں شائع ہوا۔ روزنامہ انقلاب کے ایڈیٹر نے اس پر غصے کا اظہار کرتے ہوئے ۴ اپریل کے شمارہ میں ایڈیٹوریل لکھ مارا، جس کے نتیجہ پر یہ آگ دور تک پھیل گئی۔ آخر والئی دکن اور حکومت برطانیہ کے دماغوں کی یہ تجویز اپنی موت مرگئی۔

نیا امیر ملت

امیر ملت پیر جماعت علی شاہ کے حج پر چلے جانے کے بعد ۱۰ اپریل کو لاہور شاہی مسجد میں ایک اجتماع ہوا، جس میں مسٹر عزیز ہندی نے جو ان دنوں افغانستان سے لاہور آئے تھے، ایک تجویز پیش کی کہ مسلمانوں کو ایک سردار منتخب کرنا چاہیے۔ اس پر مجمع سے ایک آواز آئی کہ پیر جماعت علی شاہ کی موجودگی میں دوسرا کوئی سردار منتخب نہیں ہوسکتا۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ پیر صاحب چونکہ کانوں کے کمزور ہیں اور وہ ہر ایک کی بات مان لیتے ہیں، چاہیے بات کیسی ہی ہو، لہٰذا ہمیں نئے امیر ملت کی تجویز پر غور کرنا چاہیے۔ اس پر کافی ہنگامہ ہوا اور اجلاس ہنگامے کی نذر ہوگیا۔

انسانیت پر سب سے بڑا ظلم

طاقت دولت کی ہو یا ہتھیاروں کی، انسان جب اس پر قابض ہوتا ہے تو اسے راستہ سجھائی نہیں دیتا۔ وہ اندھے کی لاٹھی بن کر چاروں طرف گھومتا ہے۔ اپنے پرائے اس کی چوٹ سے محفوظ نہیں رہتے حبشہ کی مظلوم آبادی جب اپنے دفاع کے لیے اٹالیہ کے سامنے آئی تو طاقت نے مظلوم کی بجائے طاقت کی ہمنوائی کی۔ لیگ آف نیشنز نے ظالم کو سزا دینے کی بجائے مظلوم کی موت کا تماشہ کیا۔ اس کی شہ پاکر ۱۲۔ اپریل (۱۹۳۶ء) کو اٹلی نے حبشہ پر ایسی زہریلی گیس پھینکی جس سے ہزاروں انسان اندھے اور اپاہج ہوکر رہ گئے۔ رہی سہی کسر بمباری نے پوری کر دی۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم تاریخ کی بڑی لڑائی قرار دی جارہی ہے۔ لیکن اس قدر ظالم ہتھیار اس لڑائی میں بھی استعمال نہ ہوا جو اطالیہ نے اپنے سے کئی درجہ کمزور حبشہ پر استعمال کیا۔ حالانکہ حبشہ اٹلی کے مقابل کوئی بڑی طاقت نہیں تھا۔ لیکن برا ہو ہوسِ ملک گیری کا کہ انسان اس کے لیے انسانیت کی تمام راہیں روندھ ڈالتا ہے۔ زہریلی گیس کے استعمال سے یورپ اور ایشیا کانپ اٹھے۔ برطانیہ، فرانس، امریکہ اور غلام ہندوستان نے بھی اپنے ردِ عمل کا اظہار کیا۔ اور مسولینی کو اس انسانیت سوز حرکت پر اس نے لعن طعن کی لیکن اب ہو بھی کیا سکتا تھا۔

مسلم لیگ کا اجلاس دہلی کے فیصلے کی روشنی میں ۱۰ اپریل کو بمبئی میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس سر وزیر حسن کی صدارت میں شروع ہوا، جس میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے سر وزیر حسن نے کہا: کہ

" ہر آزمائش میں تاج برطانیہ سے ہماری وفاداری مستحکم ثابت ہوئی ہے۔ یہاں تک ہماری وفاداری کو آتشیں آزمائشوں سے گذرنا پڑا۔ ہماری مساجد اور مندر منہدم کر دیے گئے۔ اندھا دھند لاٹھیاں اور گولیاں چلائی گئیں۔ ہمارے رہنماؤں کو مقدمات چلائے بغیر جیل خانوں میں بند کر دیا گیا۔ تحریک آزادی میں ہمارے کارکنوں پر بے جا تشدد کیا گیا۔ بغیر کسی ثبوت کے نقل و حرکت پر پابندیاں عائد کی گئیں۔ تقریر و تحریر کی آزادی سلب کر لی گئی۔ اس طرح کثیر تعداد میں متشددانہ قانون بنائے گئے اور آرڈیننس نافذ کیے گئے۔ میں بلا تردید کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان کے بیاض آئین کے حواشی پر تاج برطانیہ نے ہماری وفاداری کا ثبوت تحریر کرنے کے لیے کوئی گنجائش نہیں رکھی۔"

(روزنامہ "انقلاب" لاہور ۱۴ اپریل ۱۹۳۶ء)

اس اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے مسٹر محمد علی جناح نے کہا، کہ

" اس آئین کے پردے میں ہم سے دھوکہ کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے مسلمان اس دستور اساسی کے خلاف علم جہاد بلند کریں گے۔ اگر ہندوؤں نے اس قومی جنگ میں مسلمان کا ساتھ دیا تو بہتر ورنہ مسلمان اکیلا ہی اس راہ پر گامزن ہوگا۔

کانگریس کو دیگر اقوام کی کوئی پرواہ نہیں لیکن مسلمانوں کا تعاون حاصل کیے بغیر کانگریس کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اگر کانگریس اپنی اس پالیسی کے پیش نظر چاہتی ہے کہ ملک میں برطانوی حکومت کو دوام حاصل ہو تو اسے یہ نظریہ مبارک ہو۔ مسلمان اپنا فرض ادا کریں گے۔"

مسلم لیگ کے اس اجلاس میں مسٹر محمد علی جناح کے دہلی والے اختیارات کی تصدیق

کردی گئی کہ وہ کم از کم پینتیس آدمیوں کا ایک مسلم پارلیمنٹری بورڈ بنائیں جو ملک بھر میں انتخابات کی تیاریاں کرے۔اس اجلاس میں ترقی پسند جماعتوں کی آمد اور شمولیت کے باعث کوئی زمیندار اور تعلقہ دار شریک نہیں ہوا۔اس اجلاس میں نوابزادہ لیاقت علی خاں کو مسلم لیگ کا جنرل سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ اگرچہ اس عہدے کیلئے راجہ غضنفر علی بھی امیدوار تھے لیکن مسٹر محمد علی جناح نے انہیں اس ارادے سے باز رکھا۔

دیگر فیصلوں کے علاوہ یہ بھی طے پایا کہ ۲۶ اپریل تک مسٹر جناح تمام صوبوں کے رہنماؤں سے رابطہ پیدا کریں۔

یونینسٹ پارٹی

بمبئی مسلم لیگ کے اجلاس میں جو کچھ کہا سنا گیا۔اس کے فوراً بعد ڈاکٹر سر ضیاالدین احمد، سر محمد یعقوب اور سر عبداللہ ہارون مسٹر جناح سے الگ ہو گئے۔ یہ اسمبلی میں ان کے ہمنوا تھے۔ سر وزیر حسن اور مسٹر محمد علی جناح نے جو تقریریں کیں، ٹوڈی مسلمان ان کا متحمل نہیں تھا۔ ویسے بھی مسلم لیگ کی تاریخ میں یہ پہلا اجلاس تھا جس میں برطانوی حکومت کو اپنے خلاف باتیں سننا پڑیں۔ ورنہ آج تک یہ جماعت جی حضوریوں کا گروہ چلی آرہی تھی۔اس اجلاس کے بعد رجعت پسند گروہ نے مسلم لیگ سے الگ ہو کر یونینسٹ پارٹی کی طرز پر اپنے اپنے گروہ منظم کیے۔ مثلاً سر عبدالقیوم نے شمال مغربی سرحدی صوبہ میں فرنٹیر یونائیٹڈ پارٹی بنائی۔ سندھ میں سر عبداللہ ہارون نے سندھ یونائیٹڈ فرنٹ قائم کیا اور یوپی میں ایگریکلچر پارٹی بنالی۔ اس کے رہنما نواب چھتاری تھے۔

مشترک اپیل

بمبئی مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارتی تقریر کے بعد آل انڈیا کانگریس کے صدر راجندر پرشاد اور مسلم لیگ کے صدر محمد علی جناح کے دستخطوں سے ملک کی مجوزہ سیاسی جماعتوں کے نام ایک اپیل شائع ہوئی، جس میں ہندوستان کی آزادی کے پرامن اور آئینی جدوجہد کرنے پر ان کی معلوم کرنی چاہی۔ اس پر کانگریس کے صدر راجندر پرشاد نے صدر مسلم لیگ کو ایک خط لکھا، جس کا متن یونائیٹڈ پریس کے ذریعے چودہ اپریل کے اخبارات میں شائع ہوئی۔

"ڈیر جناح! تمام مختلف فیہ مسائل کا حل سوچنے کے

لیے کانگریس اور مسلم لیگ میں اتحاد ہونا چاہیے۔ خواہ ان مسائل کا تعلق آئین سازی سے ہو یا اس کے ماسوا (اس خط میں صدر کانگریس نے فرقہ وارانہ فیصلہ اور مخلوط انتخاب کی پیشکش بھی کی۔

یونائیٹڈ پریس نے دوسری اطلاع دی۔

"مسٹر جناح نے راجندر پرشاد کی اس تجویز سے اتفاق کیا ہے کہ تمام مسائل کے حل کے لیے کانگریس سے اتحاد عمل ہونا چاہیے۔"

(روزنامہ "انقلاب" ۱۴۔ اپریل ۱۹۳۶ء)

کانگریس کا اجلاس

اسی روز (۱۴۔ اپریل) آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ (راجندر پرشاد کی بیماری کے باعث) اجلاس کی صدارت پنڈت جواہر لال نہرو نے کی۔ صدر اجلاس نے برطانوی حکومت کو ہندوستان سے فوراً نکل جانے کو کہا۔ نیز ہندوستان کے باہمی اختلاف اور تفرقات پر اظہار افسوس کیا۔

اس اجلاس میں کونسلوں کے داخلے کی حمایت کی گئی۔ لیکن وزارتیں قبول کرنے کی مخالفت کی گئی اور ساتھ ہی کمیونل ایوارڈ کے اصولوں کی مخالفت بھی کی گئی۔

سر فضل حسین کی تقریر

۱۹۔ اپریل کو یونینسٹ پارٹی کے دفتر کی افتتاحی تقریب جو نواب شاہنواز خاں والئی ممدوٹ کی کوٹھی میں منعقد ہوئی، میں تقریر کرتے ہوئے پارٹی لیڈر سر فضل حسین نے کہا:

"اس کے سوا ہمارے پاس کوئی چارہ کار نہیں کہ ہم آئندہ اصلاحات سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔ کچھ عرصہ کے لیے برطانوی حکومت نے ایک آخری فیصلہ دیا ہے۔ ہمیں اس کو بہر طور مان لینا چاہیے۔ اگرچہ کوئی ہندوستانی اس سے مطمئن نہیں تاہم ہماری کوشش درجہ نوآبادیات حاصل کرنے کے لیے جاری رہنی چاہیے۔"

اس افتتاحی تقریب میں حسب ذیل افراد شریک تھے۔

خان مظفر خاں۔ سر فیروز خاں نون۔ چودھری سر چھوٹو رام۔ بیگم سر شاہنواز خان بہادر احمد یار خاں دولتانہ۔ ڈاکٹر محمد عالم ایڈووکیٹ۔ غلام جیلانی صدر مجلس اتحاد ملت۔ چودھری منگھو رام

صدر دھرم منڈل جالندھر۔ سر سندر سنگھ مجیٹھیہ۔ سردار اُجل سنگھ، رائے بہادر مکند لال پوری۔ مسٹر بھگت رام پوری بیرسٹر، میاں عبدالحئی ایڈووکیٹ لدھیانہ، ملک زمان مہدی خاں، میاں عبدالعزیز ایڈووکیٹ لاہور۔ رائے بہادر رام جوایا مل کپور صدر لاہور ہندو سبھا۔ خواجہ فیروزالدین احمد میر مقبول احمد۔ نواب خضر حیات ٹوانہ۔ چودھری سر شہاب الدین، خاں بہادر حبیب اللہ۔ نوابزادہ خورشید علی خاں۔ مسٹر محمد علی امیر جماعت احمدیہ لاہور۔ مولانا سید حبیب مدیر روزنامہ "سیاست" لاہور۔ مولانا عبدالمجید سالک۔ اور مولانا غلام رسول مہر مدیران روزنامہ "انقلاب" لاہور۔

(۲۰۔ اپریل۔ روزنامہ "انقلاب" لاہور)

احرار اور دیگر رہنماؤں میں بات چیت

دہلی ۷۔ اپریل کا اجلاس بمبئی ۱۰۔ اپریل کا اجلاس ان کے بعد یو پی، پنجاب، سندھ اور شمال مغربی صوبہ سرحد میں سرکار پرست افراد کا اتحاد اور مسلم لیگ کی دعوت پر حریت پسندوں کا اجتماع حالات کی واضح غمازی کر رہے ہیں کہ نئی اصلاحات کے تحت ہونے والے انتخابات اپنے اندر کس قدر اہمیت رکھتے ہیں اور ان حالات میں ہندوستان کس نازک موڑ پر آن پہنچا ہے۔

شہید گنج تحریک کو جنم دینے والا عنصر کس بری طرح اپنے مؤقف سے انحراف کر رہا ہے۔ گو مجلس احرار ایسی فعال جماعت پر یہ تحریک اپنا اثر ڈالے بغیر نہ رہ سکی۔ اسے وقتی طور پر منزل سے دور رکھنے کی کوشش کی گئی، تاہم شہید گنج کا ملبہ انہی لوگوں کے سر مٹی ڈال کر رہ گیا، جنہوں نے یہ خاک مجلس احرار کے لیے اُڑائی تھی۔

احرار ایک واضح نصب العین لیے ہوئے عارضی رکاوٹوں کو پرکاہ کے برابر جان کر اپنا سفر جاری کیے ہوئے تھے۔ مسلم لیگ اور جمعیۃ علماء ہند کے رہنماؤں سے احرار کی بات چیت اندر خانے چل رہی تھی۔ یونینسٹ پارٹی کی میٹنگ کے بعد احرار رہنما راجہ غضنفر علی اور تین چودھری سے دہلی میں ملے۔ اس ملاقات کے بعد ۲۴ اپریل کو مسٹر محمد علی جناح نے احرار رہنماؤں کو مسلم لیڈروں کے اجلاس میں شمولیت کے لیے ۲۶ اپریل کو دہلی آنے کی دعوت دی۔ اس سے پیشتر ۹۔ فروری کو لاہور میں مسٹر جناح احرار رہنماؤں سے مل چکے تھے۔ مولانا حبیب الرحمٰن، مولانا مظہر علی اظہر اور چودھری افضل حق نے مسلم لیگ کے صدر پر اپنا مؤقف

واضح کرتے ہوئے کہا:

"ہم آپ سے ہم آہنگ ہیں اور آپ کے ساتھ مل کر رجعت پسند پارٹی کے مقابل ہر طرح کا تعاون کرنے کو تیار ہیں۔ لیکن اس شرط پر کہ آپ مرزائیوں کو مسلم لیگ سے باہر رکھیں۔"

مسٹر محمد علی جناح نے احرار رہنماؤں کی قدر کرتے ہوئے ان کی یہ شرط مان لی۔ مگر ساتھ ہی کہا اگر آپ لوگ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تو مرزائی آپ سے آپ بھاگ جائیں گے۔

مندرجہ بالا خبر ایک نامہ نگار کی اطلاع پر ہے جو مراسلے کی صورت میں ۱۲ مئی ۱۹۳۶ء کے سہ روزہ "الجمعیۃ" دہلی میں شائع ہوا۔

نامہ نگار نے آخر میں لکھا:

"اگر ایسا ہو جاتے تو پنجاب میں مسلمانوں کی ایک منظم جماعت سر فضل حسین اور سر سکندر حیات کے مقابل تیار ہو سکتی ہے اور اس کا اثر ہندوستان کے دیگر صوبوں پر بھی پڑ سکتا ہے۔"

ان دنوں سر فضل حسین اور مرزا بشیر الدین محمود کی ملاقات کے عام چرچے تھے۔ جس سے مسلمانوں میں بے چینی پائی جاتی تھی۔

احرار وفد کی واپسی ۲۴ اپریل کو مجلس احرار کا وفد شاہ حجاز سلطان عبدالعزیز سے مل کر کراچی واپس پہنچا۔ بندرگاہ پر کثیر حلقہء احباب نے ان کا استقبال کیا۔ نیز دوسرے روز لاہور پہنچنے پر وفد کا شاندار استقبال کیا گیا۔ ان سے ایک ہفتہ بعد احرار کے مقابل وفد کے ارکان بھی کراچی پہنچ گئے۔ ان کے پاس شاہ سعود کے تحفے موجود تھے۔ جن میں گھڑیاں، رومال اور شاہی چوغے شامل تھے۔ ریال کس قدر تھے اس کا اندازہ نہیں ہو سکا۔ بہر حال یہ لوگ اپنے دنیاوی مقصد میں کامیاب لوٹے۔ جبکہ احرار وفد کے ارکان کو قریباً دو برس لگ گئے کہ وہ اپنا قرض دوستوں کو چکاتے رہے، جو حج کرنے اور جماعتی ذمہ داریاں نبھانے کے لیے حجاز لے کر گئے تھے۔

۲۶ اپریل: تاریخ میں بعض دن مؤرخ کے لیے متاع عزیز ثابت ہوتے ہیں۔ اور یہی

دست پھر آئندہ نسلوں کے لیے عنوانِ زندگی قرار دی جاتی ہے۔ قومیں اسی سنگِ میل کی نشاندہی پر اپنی منزل تلاش کرتی ہیں۔ البتہ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ بے راہرو انسانوں کے ڈگمگاتے قدم ان لکیروں کو مٹا دیتے ہیں۔ پھر صدیوں بعد شہداء کا خون ان نشانات کو اجاگر کرتا ہے جو قافلہ ہائے زلیست ان راہوں پر چھوڑ گیا تھا۔

۲۶ اپریل (۱۹۴۶ء) تاریخ برصغیر میں مسلمانانِ ہند کے لیے نایاب دن تھا جب کانگریس کے مقابل ملّتِ اسلامیہ کا فعال گروہ دہلی میں جمع ہوا۔ اگر صیّاد کی نظر اس نومولود پودے کو کھا نہ جاتی اور بہار آنے سے پیشتر اس کی پھول پتیاں بکھیر نہ دی جاتیں تو ممکن ہے یہی پودا تن آور درخت بن کر برصغیر میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا باعث ہوتا۔ ؎

ہائے فلک نے تاک کر توڑا اسے
میں نے جس ڈالی کو تاڑا آشیانے کے لیے

مسٹر محمد علی جناح (قائداعظم) کی دعوت پر ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کے قریباً سبھی رہنما ۲۶ اپریل کو امپیریل ہوٹل دہلی میں ان سے ملے اور یہ ملاقاتیں ۲۸ اپریل تک جاری رہیں۔ جمعیتہ علماء ہند کے رہنما مولانا حسین احمد مدنی، مولانا کفایت اللہ، مولانا احمد سعید مسلم لیگ کے صدر سے ملے۔ اسی شام احرار رہنما مولانا حبیب الرحمٰن اور چودھری افضل حق نے ان سے ملاقات کی۔ اس وقت سر فیروز خاں نون قائداعظم کے پاس بیٹھے تھے انہوں نے طنزاً احرار رہنماؤں سے کہا "جناح صاحب کو کامیاب کرائیں"۔ اس پر مسٹر جناح نے مولانا حبیب الرحمٰن کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا "اگر آپ مسلم لیگ میں آجائیں تو میں ان سرکار پرستوں کو سزا دے سکتا ہوں"۔ مولانا حبیب الرحمٰن نے فوراً کہا "مسٹر جناح! آپ ہمارے ساتھ شریک نہیں ہوں گے اور جلد ہمارا ساتھ چھوڑ جائیں گے"۔ سیاسیات میں کسی پر سوا اپنے آپ کے یقین نہیں کیا جا سکتا ہے۔

اس سے پیشتر دوسری جماعتوں کے رہنما بھی ان سے مل چکے تھے۔ آئندہ الیکشن اور ملّتِ اسلامیہ کی فلاح اس تمام گفتگو کا محور تھا۔

مولانا احمد سعید ناظم جمعیتہ علمائے ہند مشروط طور پر مسٹر جناح کے ساتھ متفق ہو گئے۔

لیکن مولانا حبیب الرحمٰن نے مسلم لیگ کے مشترک محاذ میں شریک ہونے سے انکار کر دیا۔ تاہم لاہور آنے تک بات حتمی فیصلے کے لیے ملتوی کر دی گئی۔

اس کارروائی سے فارغ ہو کر قائداعظم ۲۹ اپریل کو تیسری مرتبہ لاہور آئے۔ ان دنوں آپ نواب احمد یار خاں دولتانہ کی کوٹھی پر ٹھہرے۔ اب کی بار شہید گنج کے لیے نہیں بلکہ انتخاب کے سلسلے میں سر فضل حسین اور مجلس احرار سے مذاکرات ان کے پروگرام کا اہم جزو تھا۔

قائداعظم محمد علی جناح کی احرار رہنماؤں سے اس سے پیشتر بھی یاد اللہ تھی۔ اگر منزل ایک ہو تو راستے کے مسافروں کا کسی نہ کسی موڑ پر مل بیٹھنا غیر ممکن نہیں۔ چنانچہ ماسٹر تاج الدین انصاری سابق صدر مجلس احرار اسلام پاکستان اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں۔

"آج سے تقریباً چالیس برس پہلے کی بات ہے، جب مسلم لیگ کے عظیم رہنما قائداعظم محمد علی جناح "ابھی صرف "محمد علی جینا" کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ ان دنوں کانگریس اور مسلم لیگ میں کٹا چھنی یا چپقلش کی بہت کم گنجائش تھی۔ غالباً ۲۸ء کا ذکر ہے کلکتہ میں مسلم لیگ کا اجلاس ہونے والا تھا۔ مسلم لیگ دو متحارب گروہوں میں تقسیم تھی۔ ایک گروپ کی سرداری مولانا محمد شفیع داؤدی مرحوم کر رہے تھے۔ دوسرا مضبوط گروپ مسٹر جناح کا تھا۔ مولانا محمد شفیع داؤدی بڑی شدومد سے مسٹر جناح کی مخالفت پر کمربستہ تھے۔ بظاہر مولانا شفیع داؤدی کا پلّہ بھاری نظر آرہا تھا۔ پرایا گنڈے کے زور پر وہ مسٹر جناح کو شکست دینے کے لیے ہنگامہ آرائی پر تُل چکے تھے۔ کلکتہ کے بعض شوریدہ سر مولانا شفیع داؤدی کی حمایت میں پستولیں لیے پھرتے تھے۔ مسٹر جناح آئین شکنی اور ہنگامہ آرائی سے کوسوں دور بھاگتے تھے اس صورت حال سے وہ کسی قدر گھبرائے ہوئے تھے۔ ہم اس اجلاس میں مسلم لیگ کے کونسلر کی حیثیت سے موجود تھے مجھے یاد پڑتا ہے کہ ہم میں سے بعض ارکین کی فیس بھی آخری وقت میں ادا کی گئی تھی۔ رسید کے طور پر ہمیں بارہ بارہ روپے میں سینے پر آویزاں کرنے کے لیے خوبصورت بیج

دیئے گئے تھے۔ یہی بیج کونسلری کی رسید اور گیٹ پاس کا کام دیتے تھے۔ مولانا شفیع داؤدی کا گروپ سرمایہ پرست اور ٹوڈی قسم کے لوگوں پر مشتمل تھا۔ ہماری ہمدردیاں مسٹر جناح کے ساتھ تھیں۔ مسٹر جناح کانگرس سے باہر آکر بھی ذہنی کانگرسی تھے۔ بہرحال ہمارا دلی لگاؤ انہی کے ساتھ تھا۔

انتظامات کی ذمہ داری ہندوستان کے سابق وزیر خارجہ بمبئی والے عبدالکریم چھاگلا کے سپرد تھی۔ مسٹر چھاگلا ان دنوں مسٹر جناح کے دستِ راست تھے۔ وہ خوبصورت، دبلے پتلے اور شرمیلے سے نوجوان تھے۔ مسٹر جناح کو ان پر بڑا اعتماد تھا۔ اسی اعتماد کے صدقے میں مسٹر چھاگلا پروان چڑھے۔ ہم نے مسٹر جناح سے درخواست کی کہ وہ مسٹر چھاگلا سے کہہ کر گیٹ کی ذمہ داری ہمارے آدمیوں کے سپرد کر دیں۔ ہمارے پنجابی ساتھی گیٹ کی پوری ذمہ داری سنبھال لیں گے، جو ہنگامہ ہونا ہے گیٹ ہی پر ہو جائے گا۔ ہم بہرحال اس سے بخوبی نپٹ لیں گے اور ووٹنگ کے وقت ہم آپ کے پاس اندر پہنچ جائیں گے۔ مسٹر جناح نے ہماری خواہش کے مطابق گیٹ کی پوری ذمہ داری ہمیں سونپ دی۔ خواجہ عبدالرحیم عاجز، ان کے امرتسری نوجوان ساتھی اور دوسرے پنجابی نوجوانوں نے بحیثیت رضاکار گیٹ کا انتظام مضبوطی سے سنبھال لیا۔ مسٹر جناح ہمارے انتظام سے بالکل مطمئن ہو گئے۔ دوسرے دن اجلاس شروع ہونے سے ایک گھنٹہ پیشتر ہی کرایہ پر لائے ہوئے فریقِ مخالف کے غنڈا عناصر ٹولیاں بنا کر گیٹ کے گرد گھومنے پھرنے لگے۔ مگر جب ان لوگوں نے پنجابی نوجوانوں کو گیٹ پر پرا جمائے اور چاق و چوبند کھڑے دیکھا تو وہ بے حوصلہ ہو کر پیچھے ہٹنے لگے اور گیٹ سے دور جا کھڑے ہوئے۔ اجلاس شروع ہونے سے قبل مسٹر جناح نے صدرِ جلسہ کی حیثیت سے اعلان کیا کہ جن لوگوں کے پاس داخلے کے نشان یعنی بیج نہیں ہیں وہ حضرات باہر تشریف لے جائیں۔ مگر حاضر اراکین میں سے کوئی بھی بیج کے بغیر نہیں تھا۔ اتنے میں مولانا داؤدی

گیٹ میں داخل ہوئے۔ ہم سب گیٹ کو مضبوط اور بہادر ساتھیوں کے حوالے کر کے مولانا داؤدی کے ساتھ ہی اندر پنڈال کی طرف بڑھے! ابھی ہم کرسیوں سے دور ہی تھے کہ اندر کے رضا کار ہم سب کو روک کر کھڑے ہو گئے۔ وہ چیک کر کے آگے جانے کی اجازت دیتے تھے۔ یہ ضابطے کی بات تھی، جونہی مولانا داؤدی آگے بڑھ کر ایک رضا کار کے قریب پہنچے، رضا کار نے انہیں روک لیا اور کہا کہ آپ کا بیج کہاں ہے؟ اگر جیب میں ہے تو نکال کر سینے پر لگا لیجئے تاکہ چیکنگ میں آسانی رہے۔ مولانا موصوف نے حیرانی سے اپنے سینے کی جانب نگاہ ڈالی تو بیج غائب تھا۔" ارے گیٹ پر آیا ہوں تو بیج میرے سینے پر موجود تھا، خدا جانے گیٹ پر گرا یا اندر آ کر گر گیا"۔ رضا کار نے مولانا سے ادب کے ساتھ کہا آئیے مولانا! گیٹ پر چل کر معلوم کر لیتے ہیں۔ رضا کار مولانا کو اپنے ہمراہ لے کر پنڈال سے باہر گیٹ پر چلا گیا۔ دس منٹ بعد گیٹ پر ہنگامہ ہوا۔ مولانا اور ان کے باہر والے ساتھی ہمارے رضا کاروں سے اُلجھ پڑے۔ مگر ضابطہ کے مطابق انہیں بیج کے بغیر اندر آنا نصیب نہ ہوا۔ وہ اندر آ بھی جاتے تو ان کے ہم خیال ووٹ ہی کتنے تھے؟ اس طرح سرکاری ٹولی اور ان کے لگے بندھے مسٹر جناح سے شکست کھا گئے۔ چند ووٹ تھے جو مسٹر جناح کے خلاف آئے۔ باقی اراکین کی بہت بڑی اکثریت کے ووٹ مسٹر جناح کے حق میں تھے۔ ہماری اور قائداعظم کی یاد اللہ اس وقت سے تھی جبکہ آج کے اکثر لیگی رہنما اس دنیا میں تشریف بھی نہ لائے تھے۔ مگر —— اس حقیقت کو کون جھٹلا سکتا ہے کہ سیاسی میدان میں ہماری اور ان کی راہیں جدا جدا ہو گئیں، اس کے باوجود فریقین نے بارہا کوشش کی کہ بیچ کا پردہ ہٹے تو باہمی مشورہ اور اشتراک سے مسلمان قوم کی برتری کے لیے متحدہ محاذ قائم کیا جائے! اس سلسلہ میں متعدد ملاقاتیں ہوئیں مگر بے نتیجہ۔

سنہ ۳۶ء میں پنجاب کی مسلم لیگ پر معدودے چند سرکار پرستوں کا قبضہ

تھا۔ آزاد خیال لوگ خال خال نظر آتے تھے۔ ساری کارروائی کاغذی ہوتی تھی۔
مسٹر جناح پنجاب میں ایسی جاندار لیگ بنانا چاہتے تھے جو سرکاری اثرات
سے پاک ہو، مگر میاں کا ٹوڈی طبقہ اوپر کے اشارے پر جب چاہتا لیگ میں
داخل ہو کر بیان بازی کر لیتا اور جب اشارہ ملتا خاموش ہو کر بیٹھ جاتا۔ سر
فضل حسین حکومت برطانیہ کے قابلِ اعتماد، ذہین اور طاقتور مہرے تھے۔
ان دنوں سر فضل حسین کا طوطی بولتا تھا۔ پنجاب پر دو طاقتوں کا قبضہ تھا عوام
کی نمائندگی میں احرارؒ اور سرکار کی نمائندگی میں سر فضل حسینؒ۔ احرار رہنماؤں سے
سر فضل حسین کے تعلقات میں بظاہر کوئی کشیدگی نہ تھی۔ فضل حسین بے حد
ذہین سیاسی شاطر اور منتقم مزاج انسان تھے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا مسٹر جناح
پنجاب مسلم لیگ کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنا چاہتے تھے۔ وہ سرکار پرستوں
سے چھٹکارا چاہتے تھے۔ مگر انہیں عوام تک رسائی حاصل نہ تھی۔ وہ اس ارادے سے
پنجاب میں تشریف لائے تاکہ آئندہ الیکشن کے لیے میدان درست کیا جائے۔
وہ سر فضل حسین سے بھی مسلم لیگ کے بارے میں تبادلہ خیال کرنا چاہتے تھے
ادھر سر فضل حسین بھی مسٹر جناح سے ملاقات کرنے کے لیے بے تاب تھے۔
وہ چاہتے تھے کہ مسٹر جناح کو پنجاب کے پالٹیکس میں داخل ہونے سے
حتی الوسع روکا جائے چنانچہ ان دونوں بڑے آدمیوں نے ملاقات کی۔
اس ملاقات میں سر فضل حسین نے نہایت عیاری سے کام لیتے ہوئے ملاقات
کے کمرے میں پردے کے پیچھے دو برطانوی جاسوسوں کو بٹھا دیا تاکہ وہ بھی
مسٹر جناح کے خیالات اپنے کانوں سے سن لیں۔ گفتگو کا نچوڑ یہ تھا کہ
مسٹر جناح بہر حال مسلم لیگ کو الیکشن کے میدان میں اتاریں گے خواہ انہیں
کانگریس سے کوئی سمجھوتہ ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ سر فضل حسین نے مسٹر جناح کو
بے حوصلہ، دل برداشتہ اور مایوس کرنے کی انتہائی کوشش کی اور آخر میں انہیں
کہا کہ آپ پنجاب میں جلسہ کرنے کی ہرگز کوشش نہ کریں۔ جلسہ کامیاب نہ

ہو سکے گا۔ یہاں کون آپ کی بات سُنے گا؟ اور کس نے ساتھ دینا ہے"؟

قائداعظم کی بے بسی

ان حالات میں مسٹر محمد علی جناح کے سیاسی مستقبل کا انحصار صرف آزاد خیال مسلمانوں سے وابستہ تھا۔ لیکن رجعت پسند گروہ اور برطانوی ذرائع نے مسلم عوام میں انہیں ہندو کا زر خرید ظاہر کر کے اس قدر رسوا کر دیا تھا کہ جیسے ہی مسٹر جناح نے جمعیتہ علمائے ہند، مجلس احرار اور دیگر آزادی پسند مسلم جماعتوں سے تعاون کی راہیں ہموار کرنا چاہیں، چاروں طرف سے ٹوڈی مسلمان ان پر ٹوٹ پڑے دوسری طرف نیشلسٹ مسلمانوں نے کانگریس سے ناراض ہو کر مسٹر جناح سے اپنا ناتا جوڑنا چاہا تو کانگریس سمیت سارا ہندو پریس ان کے گلے پڑ گیا۔ چنانچہ اس لڑائی میں مسٹر جناح پر سب سے بڑا حملہ سر محمد یامین نے ایک پریس بیان کے ذریعے کیا۔

"۲۶-۲۷ اپریل (۱۹۳۶) کو مسٹر جناح نے خود غرض لوگوں کی باتوں میں آن کر چونکہ وہ خود سوائے شہر بمبئی کے دوسرے صوبوں کے اندرونی حالات سے واقف نہیں اور کئی سال انگلستان رہ کر ابھی ڈیڑھ سال ہوا کر واپس آئے ہیں۔ اس لیے یو پی کے حالات سے قطعی ناواقف ہیں۔ وہ چند سازشی لوگوں کے اس لالچ میں آ گئے کہ اگر لیگ کے ٹکٹ پر الیکشن لڑے گئے تو وہ ہندوستان کے سب سے زیادہ زوردار پولیٹیشن ہو جائیں گے۔

درحقیقت یہ وہ لوگ ہیں جن کا مسلمانوں میں کوئی اقتدار باقی نہیں ہے اور ساری پبلک جانتی ہے کہ یہ کانگریس کے پٹھو اور کانگریس کے آلہ کار ہیں اگرچہ بھیڑیے ہیں، لیکن بھیڑ کی کھال پہن کر پبلک کو دھوکا دینا چاہتے ہیں اور مسٹر جناح کی شخصیت سے لیگ کے نام سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں اگرچہ سالہا سال سے لیگ کے مخالف رہے ہیں۔

مسٹر جناح نے ان کی باتوں میں آن کر یہ ارادہ ظاہر کیا ہے کہ تمام ہندوستان میں ایک ہی اصول پر تمام صوبوں میں لیگ الیکشن لڑے۔

چونکہ میں صوبائی اسمبلی سے تعلق نہیں رکھتا تھا اور گذشتہ سال ہی کانگریسیوں

کو شکست فاش دے چکا تھا۔ اس لیے میں نے زیادہ توجہ نہیں کی۔ مگر اس کو یوپی کے لیے سخت مضر سمجھا کہ اس سے مسلمان زمینداروں کی وزارت ختم ہو جائے گی اور لیگ کی وزارت کبھی نہ بنے گی۔"

("اعمال نامہ" مصنفہ سر رضا علی ص ۶۳۱ - ۶۳۲)

سر محمد یعقوب نے بھی پریس بیان میں کہا:

(دہلی اجلاس کے سلسلے میں سر محمد یعقوب نے جناح پر سخت نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا۔)

"جناح ان لوگوں کو ساتھ لے کر نکلنا چاہتے ہیں، جو ان سے راستے میں اتفاق نہیں کرتے۔ مثلاً مسلم لیگ کا نصب العین آئینی طریق پر درجہ نوآبادیات حاصل کرنا ہے۔ جبکہ احرار اور جمعیۃ مکمل آزادی کی دعویدار ہیں۔ ان حالات میں کون سا سول میرج مطلوب ہے، جو انہیں اور مسٹر جناح کو متحد کر سکتا ہے۔ مسٹر جناح خواب دیکھ رہے ہیں کہ ان کا پلان کامیاب ہوگا حالانکہ اس خواب کی کوئی تعبیر نہیں ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ قبل از انتخابات ہی یہ عمارت دھڑام سے گر جائے۔"

(سہ روزہ "الجمعیۃ دہلی" - یکم مئی ۱۹۳۶)

راجہ غضنفر علی نے بھی انہی دنوں ایک نئی پارٹی کا اعلان کیا۔

ان دنوں دہلی اور پنجاب کے سیاسی حلقوں میں ایک افواہ عام تھی کہ راجہ غضنفر علی نے پنجاب میں نئی سیاسی جماعت بنائی ہے، جس کے مقاصد حسب ذیل ہوں گے۔

"پنجاب میں محض اقتصادیات کی بنا پر حکومت قائم نہیں ہو سکتی، جب تک اسے نیشنل لائنوں پر نہ چلایا جائے گا، اس کا چلنا ممکن نہیں۔ راجہ صاحب کی رائے میں سکھوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک مشترک پارٹی ہی وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اور یہی پارٹی پنجاب میں کامیاب حکومت کر سکتی ہے۔" (روزنامہ "انقلاب" لاہور ۲۸۔ اپریل ۱۹۳۶ء)

یو۔پی کے زمیندار اور تعلقہ دار قسم کے لوگ پیشتر سے الگ ہو چکے ہیں۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ بھی جناح سے ناراض تھا۔ سندھ کے وڈیرے اپنا ڈیرہ الگ بنائے بیٹھے تھے۔ پنجاب میں سر فضل حسین جناح کے قدم جمنے نہیں دینا چاہتے تھے۔ اس بے کسی اور بے بسی کے عالم میں مجلس احرار کے رہنماؤں نے قائداعظم کا پنجاب میں استقبال کیا۔

احرار پر نیا عتاب

انہی دنوں امرتسر میں پنجاب پراونشل احرار کانفرنس کا اجلاس ہونے والا تھا۔ صوبائی سطح پر اس کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ سر فضل حسین نے احرار رہنماؤں کو قائداعظم کو خوش آمدید کہنے کی سزا دینا چاہی۔

۸۔ مئی (۱۹۳۶ء) کو کانفرنس کے منتخب صدر چودھری افضل حق کا جلوس امرتسر کے بازاروں سے گذر رہا تھا۔ جیسے ہی وہ کٹڑہ کرم سنگھ (قلعہ بھنگیاں) میں پہنچا تو ایک مکان سے اینٹوں اور پتھروں کے علاوہ گرم تارکول چودھری افضل حق پر پھینکا گیا جس سے ان کے چہرے اور آنکھوں پر اثر پڑا۔ چودھری صاحب کو قریب کے ہسپتال پہنچا دیا گیا مگر اہل جلوس بپھرے ہوئے شیر کی طرح اس مکان کی طرف لپکے جہاں سے تارکول پھینکا گیا تھا۔ قریب تھا کہ احرار رضاکار اس عمارت کو آگ لگا دیتے جس سے محلے کے باقی مکانوں کو بھی نقصان پہنچتا۔ احرار رہنماؤں نے آگے بڑھ کر حالات کو خراب ہونے سے بچا لیا۔

اس سے ایک ہفتہ پیشتر اسی محلہ کے ایک نوجوان محمد رفیق نے احرار رہنما شیخ حسام الدین پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ شیخ صاحب کی بجائے محمد یٰسین ایک احرار رضاکار شہید ہو گیا۔

گو اس حادثہ کی وجہ سے اس علاقے کی فضا احرار کے لیے سازگار نہیں تھی مگر ؎

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے

جلوس چار گھنٹے تک محل وقوع پر رکا رہا۔ حملہ آور تلاش کے باوجود نہ مل سکے۔ اہلِ محلہ نے اس ذمہ داری سے اپنے کو مبرا قرار دیا۔ یہاں تک کہ صاحب مکان بھی

لرزہ براندام تھا۔ اب شام ہو چکی تھی۔ جیسے جیسے چراغوں کی روشنی تیز ہوتی گئی۔ خونِ احرار کی حرارت میں اسی تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔

ان دنوں پنجاب جیوش احرار کی کمان صاحبزادہ سید فیض الحسن سجادہ نشین آلو مہار کے سپرد تھی۔ وہ برہنہ تلوار لیے موٹر کار کی چھت پر کھڑے احرار رضاکاروں کو احکام دے رہے تھے۔ سارا علاقہ احرار رضاکاروں کے غصے کی زد میں تھا۔ اگر وہ چاہتے تو مکان اور مکین محفوظ نہیں رہ سکتے تھے۔ اتنے میں اطلاع آئی کہ چودھری افضل حق ہر طرح کے خطرہ سے باہر ہیں۔ آنکھوں پر ذرا افیکٹ ہوا ہے اگر اتنا نہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد چودھری صاحب خود چل کر اپنی کار میں آن بیٹھے اور جلوس آگے روانہ ہوا۔

اس حادثہ کے باعث کانفرنس کا پہلا اجلاس ایک گھنٹہ تاخیر سے شروع ہوا۔ اپنی علالت کے باعث چودھری صاحب کی بجائے خطبہ صدارت شیخ حسام الدین نے پڑھا۔ جو حسب ذیل تھا۔

"عزیز نوجوانو اور احرار کارکنو!

احرار آزادی کے علمبردار ہیں، اور عالم اسلام کی ترقی کے خواہاں۔ اس بنا پر محبانِ وطن کے لیے زندگی کی روح اور دشمنانِ دین کی نظروں میں خار کی طرح ہیں۔ احرار جمہوری نظام کے قائل ہیں۔ ہمارے نزدیک باہمی مشاورت ترقی کی بہترین ضمانت ہے۔ ہم بات بات میں باہم مشورہ کرتے ہیں اور پھر جماعتی فیصلے پر مضبوطی سے قائم رہتے ہیں۔ ہم میں برسوں سے برادرانہ روابط قائم ہیں۔ اس لیے مخالفت کے طوفانوں میں چٹان کی طرح قائم رہتے ہیں۔

مجلس احرار غریبوں کی جماعت ہے اور اس کے لیے خدا خود بے سر و سامان ہے
غیر ہمدرد نکتہ چین ہماری حوصلہ مندیوں کا طنزاً ذکر کرتے ہیں۔ وہ ایسا کرتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ کرگس، شاہسوار کا پتہ دیتی ہے۔ ہم نے چند سالوں میں ایک مہتم بالشان کام کیا ہے۔ خدا کے فضل و کرم سے پوری توقع ہے کہ ملک کی تقدیر میں خوشگوار انقلاب پیدا کرنے میں ہماری قربانی سب سے اہم چیز ثابت

ہو گی۔ دولتِ دنیا کی کمی ان لوگوں کی ہمتوں کو کہاں تک پست کر سکتی ہے، جو دل و دماغ کی دولت سے مالا مال ہوں۔

مجلسِ احرار میں خطیب، ادیب، عالم اور شاعر شامل ہیں۔ اور مسلسل قربانی ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ بغیر قربانی کے جذبہ کے علم اور دولت بے حساب سیدپ ہے۔ ملک کو جو کچھ بھی ملا قربانی سے اور جو کچھ ملے گا، وہ بغیر قربانی کے نہیں ملے گا۔ یہ امر ہمارے لیے کم اطمینان کا باعث نہیں کہ ملکی قربانیوں کے سلسلے میں ہمارا حصہ کسی سے کم نہیں۔ انشاءاللہ آئندہ جنگِ آزادی میں ہم بے پناہ طاقت کے ساتھ دوسری حریت پسند جماعتوں کے دوش بدوش چلیں گے۔

کانگریس ملک میں ایثار پیشہ لوگوں کی سب سے بڑی جماعت ہے۔ مجلسِ احرار کے اکثر کارکنوں نے کانگریس کے ساتھ مل کر آزادی کی جدوجہد کی ہے۔ ہم نے اپنے پلیٹ فارم سے کانگریس کی مذمت کی کبھی اجازت نہیں دی بلکہ جہاں تک ہو سکا، کانگریس کے وقار کو صدمہ پہنچانے سے بچایا۔ بحالاتِ موجودہ ضرورت اس امر کی ہے کہ کوئی ایسا پروگرام وضع کیا جائے جو دونوں جماعتوں ہندو اور مسلمان کے لیے مفید ہو۔ جس پر کم سے کم اختلاف اور زیادہ سے زیادہ اتفاق ہو سکے۔

پنجاب میں سوشلسٹ پارٹی علیحدہ گروپ کی حیثیت سے قائم ہے یہ امر موجبِ اطمینان ہے کہ اس نے اب آزاد خیال جماعتوں کے ساتھ انتخاب میں تعاون کا اعلان کر دیا ہے۔ اس طرح سے مدعیانِ سرکار کا زور بھی کمزور ہو جائے گا۔ مجھے کامل امید ہے کہ آئندہ پنجاب میں رجعت پسندوں کا مضبوط قلعہ نہیں بنے گا بلکہ آزاد خیال لوگوں کا اس پر قبضہ ہو جائے گا۔

اگرچہ مجلسِ احرار کے عزائم کانگریس کے زیادہ قریب ہیں لیکن مسلم لیگ کے نصب العین اور احرار کے نصب العین میں نمایاں فرق [illegible] مسٹر جناح کے موجودہ طرزِ عمل سے ہم میں سے بعض زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔

بمبئی لیگ کا ریزولیشن کانگریس اور احرار کے قریب ہے۔ کانگریس احرار اور مسلم لیگ کے نزدیک آئین نو کی سکیم بعض لحاظ سے ناقابل عمل ہے۔ یہ اتحادِ خیال اور خود مسٹر جناح کے افکار اس قابل ضرور ہیں کہ مجلس احرار اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرے۔ اس طرح ممکن ہے کونسل کے کاروبار کے لیے ہم مل کر کوئی متحدہ محاذ قائم کر سکیں اور آئین نو میں حسب منشا ترامیم کرا سکیں تاکہ ملک کی آزادی قریب اور افلاس دور ہو سکے۔

مجلس احرار نے سیالکوٹ کے تاریخی اجلاس میں ترقی پسند جماعتوں کو متحد ہو کر رجعت پسندوں کا مقابلہ کرنے کی دعوت دی تھی۔ اس ریزولیشن کے مطابق مجلس احرار نے عام ترقی پسند دوستوں اور جماعتوں سے خط و کتابت بھی کی۔ ہر طرف سے جوابات حوصلہ افزا تھے۔ مجھے خدا کے فضل سے کامل یقین ہے کہ طول و عرض ملک میں آئین نو پر آزاد طبقہ کا قبضہ ہو جائے گا۔ میں تمام دوستوں سے جو ملک کی آزادی کے لیے بھی تڑپ رکھتے ہیں، درخواست کرتا ہوں کہ اس زریں موقعہ کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ ان لوگوں کو جو، رجعت پسند ہیں موقع نہ دیں کہ وہ ہمارے چھوٹے چھوٹے اختلافات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر صوبجاتی اسمبلیوں میں چلے جائیں اور سرکارِ برطانیہ کے حسب منشا قوانین بنا کر ملک کے مفاد کو تباہ کر دیں۔ ایسے لوگوں کے لیے ایک سیٹ بھی چھوڑنا بہت بڑا قومی گناہ ہوگا۔ ہم پورے سولہ برس سے کونسلوں کو ایسے لوگوں پر چھوڑ کر خود مصیبتوں میں مبتلا رہے ہیں۔ انہی رجعت پسندوں کے ذریعے حکومت نے بدترین قوانین پاس کرائے اور ملک کے آزاد خیال لوگوں کو جیلوں میں ٹھونسا۔

یہی رجعت پسند عناصر ملک کی ترقی کے راستے میں شدید روڑے بنے رہے۔ آج پھر کیل کانٹے سے لیس ہو کر قربانی کرنے والی جماعتوں کے حاصل کیے ہوئے حقوق پر بغیر شکریے کے قبضہ کرنے کی فکر میں ہیں۔ ان

کی خواہش یہ ہے کہ ماضی کی طرح مستقبل بھی انہی کے ہاتھ میں رہے اور آزادی
طلب لوگ بدستور جیلوں میں نیم بسمل کا تماشہ دکھائیں۔ ان کی یہ خواہش قدرتی
ہے۔ لیکن اب کی بار قدرت کو کچھ اور منظور ہے۔ اسمبلی میں ترقی پسند جماعتوں
کے داخل ہونے کے عزائم ان کی آرزوؤں کو خاک میں ملانے کا باعث ہو
رہے ہیں۔ اس لیے وہ غریبوں کو سبز باغ دکھانے میں مصروف ہیں۔ غریب پروری
کا وہ ہزار یقین دلائیں، لوگ ان کے دعوے کو ووٹ لینے کی ترغیب ہی
سمجھیں گے۔ جھونپڑیوں میں رہنے والوں کے لیے محلات کے خواب روایتی
طور پر خوشگوار ہوتے ہیں، لیکن محلات میں بسنے والوں کے لیے جھونپڑیوں
کا تصور خواب پریشاں کے سوا کچھ اور نہیں۔

یوں تو محنت کو سرمایہ سے ہمیشہ اور ہر جگہ شکایت رہی ہے۔ لیکن
ہندوستان کی کیفیت اور بھی بدتر ہے۔ یہاں کے اکثر امراء دنیا سے غیر حاضر
اور بعض حال مست فقیر کی طرح اپنے عشق کی دنیا آباد کیے بیٹھے ہیں۔
عوام الناس غیر ہمدرد دفتری حکومت کے باعث جہالت اور افلاس کے
عمیق گڑھے میں پڑے ہیں۔ حکومت اور امراء دونوں عوام کے مصائب سے
بے پرواہ ہیں۔

غلامی بے شک ملک اور قوم کے لیے سب سے بڑی مصیبت ہے
غلام ملک میں جہالت جب افلاس کے ساتھ شامل ہو جائے تو بدنصیبی کی انتہا
ہو جاتی ہے۔ قوم احساس سے عاری اور نفع نقصان سمجھنے سے معذور ہو
جاتی ہے۔ انسان بدتر از حیوان ہو جاتا ہے۔ یاد رکھو! ملک میں معزز اور محترم
وہ جماعت ہے جو غلامی کی زنجیروں کو توڑے اور ابنائے وطن کو افلاس اور
جہالت کے گڑھے سے نکالے۔

بے شک مجلس احرار کے کارکن ملک کے بے باک سپاہی ہیں لیکن
آزادی کے نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے ابھی بھی جدوجہد کی ضرورت

ہے۔ اس کٹھن کام میں دماغ کے ساتھ دل کی سانجھ ضروری ہے۔ غلام ہو کر آزاد ہونا، ڈوب کر ابھرنا اور مر کر زندہ ہونا ہے۔ ہتھیار ڈال دینا آسان ہے لیکن ہتھیار اٹھانا مشکل ہے۔ خدا سے دعا کرو کہ وہ قوم کی مشکلیں ہماری وساطت سے آسان کرے۔ اپنے ارادوں کو قوی رکھو۔ ہمتوں کو پست نہ ہونے دو۔ کم ہمت اور مردہ دلوں کی باتیں نہ سنو۔ ارباب عزم کی کہانیاں پڑھو۔ خدا ہمت میں برکت دے گا۔"

قائداعظم کی احرار رہنماؤں سے ملاقات

سر فضل حسین سے مایوس ہو کر مسٹر محمد علی جناح احرار رہنماؤں سے ملنے آئے یہ ملاقات ڈاکٹر عبدالقوی لقمان کے مکان (۷، میکلوڈ روڈ) پر ہوئی۔ رہنماؤں میں چودھری افضل حق عبدالقادر ایڈووکیٹ سیالکوٹ اور ڈاکٹر عبدالقوی لقمان (جو ان دنوں مرکزی مجلس احرار کے خازن تھے) موجود تھے۔ یہ تمام گفتگو اردو زبان میں ہوئی۔ کہیں کہیں قائداعظم انگریزی میں گفتگو کرتے۔ مگر عام طور پر ساری باتیں جو ایک گھنٹہ تک ہوتی رہیں اردو میں ہوئیں۔ اس ملاقات میں احرار رہنماؤں نے مسٹر جناح سے ہمدردی کا اظہار کیا اور انہیں پنجاب کے مسلم لیگیوں اور سر فضل حسین کی صحیح پوزیشن بتائی۔ نیز انہیں یقین دلایا کہ آپ جلسۂ عام میں ضرور تقریر کریں۔ احرار جلسہ کی پوری ذمہ داری لیتے ہیں۔

چنانچہ جلسہ ہوا۔ مسٹر جناح نے دل کھول کر تقریر کی اور احرار رضاکاروں نے اس موقعہ پر بغیر وردی کے اس جلسے کا انتظام کیا۔

باہم گفتگو میں احرار نے قائداعظم کو مشورہ دیا کہ،

"آپ مسلم لیگ کو ٹوڈیوں اور سرکار پرست رؤسا کے پنجہ سے نکالیں اور اسے عوامی جماعت بنائیں۔ مسلم لیگ کا موجودہ طبقہ آپ کی بجائے برطانوی اشاروں پر چلتا ہے۔ جب اشارہ ملتا ہے مسلم لیگ زندہ باد کہنے لگتے ہیں، تب مسلم لیگ میں جان پڑ جاتی ہے۔ جب دوسرا اشارہ ملتا ہے، خاموش ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور مسلم لیگ کی جان نکل جاتی ہے۔ یہ لوگ مسلم لیگ کے

کے گلے میں چکی کا پاٹ ہیں۔ یہ آپ کو نہیں چلنے دیں گے۔"

جواب میں مسٹر جناح نے کہا:

"اگر احرار میرا ساتھ دیں تو وہ فضل حسین سے ٹکر لینے کو تیار ہیں۔"

احرار۔ "بشرطیکہ آپ مرزائیوں پر مسلم لیگ کے دروازے بند کر دیں۔ نیز ہندوستان کی مکمل آزادی کو اپنا نصب العین بنائیں۔"

اس پر مسٹر جناح نے کہا کہ اس کا فیصلہ آل انڈیا مسلم لیگ کرے گی۔

سر فضل حسین نے چونکہ ملاقات کے وقت دو انگریز آفیسروں کو پس پردہ چھپا رکھا تھا اور مسٹر محمد علی جناح، سر فضل حسین کی اس حرکت سے سخت برہم تھے۔ وہ واقعی سر فضل حسین کو مزہ چکھانا چاہتے تھے۔

اس گفتگو میں یہ بات طے پا گئی کہ احرار آئندہ انتخابات میں مسلم لیگ کے ہمنوا ہوں گے۔ یہ فیصلہ ہوتے ہی قائداعظم چند دن کے لیے سری نگر چلے گئے۔ مگر سر فضل حسین اور احرار کے مابین ایک مستقل لکیر کھنچ گئی۔ اور آگے چل کر احرار کو جناح کی دوستی بڑی مہنگی پڑی خصوصاً روزنامہ انقلاب لاہور نے جو یونینسٹ پارٹی کا آفیشل آرگن تھا، مجلس احرار کے خلاف مسلسل اداریے لکھے۔ نیز قائداعظم محمد علی جناح کے خلاف ۵ مئی کے اداریہ میں لکھا

"ہماری تمام اطلاعات کا ملخص یہ ہے کہ مسٹر جناح نے مسلمانوں کی خواہش اور آرزوؤں کے مطابق کام نہیں کیا، بلکہ ہر قدم ہندوؤں کی خواہش کے مطابق اٹھایا۔ جس کا اقرار (بقول انقلاب) روزنامہ "ٹریبون" نے یکم مئی کے مقالہ افتتاحیہ میں کیا ہے۔ یعنی انہوں (مسٹر جناح) نے مسلمانوں کو متحد کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان تمام عناصر کو اکٹھا کیا ہے، جو اب تک مختلف وجوہ کی بنا پر اتحاد پارٹی سے علیحدہ تھے یا اس کی مخالفت کر رہے تھے۔ یا ان مخالفوں اور بدر بانتوں کو تقویت پہنچائی ہے، جو ہماری اطلاع کے مطابق اتحاد پارٹی (یونینسٹ پارٹی) کو نقصان پہنچانے کے موجب بن سکتے تھے۔ اگر اسی کا نام مسلمانوں کا اتحاد ہے، تو نہیں معلوم تفرقہ اور کس کو کہا جاسکتا ہے۔"

اسی شمارے میں ایک خبر ہے کہ راولپنڈی میں اتحاد ملت کے ایک اجتماع میں کہا گیا کہ،
"مسلمانو! احرار اور جناح کے اتحاد سے پہلے پہلے اپنی اصلاح کی کوشش کر لو۔
ورنہ مسجد شہید گنج کا کام ادھورا رہ جائے گا"

(روزنامہ "انقلاب" لاہور۔ ۵ مئی ۱۹۳۶)

انہی دنوں سر محمد اقبال صدر پنجاب مسلم لیگ نے احرار رہنماؤں سے مسٹر جناح کی ملاقات کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے، بمبئی کے اخبارات میں اپنے مختصر بیان میں کہا کہ
"مخالفین کی یہ رائے غلط ہے کہ مسٹر جناح کو پنجاب میں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ اور احرار کے سوا کوئی مسلم جماعت مسٹر جناح کی جماعت میں شامل نہیں حالانکہ یہ حقیقتاً نہیں۔ میں مسٹر محمد علی جناح کی پنجاب میں کامیابی کا خیر مقدم کرتا ہوں۔
ڈاکٹر اقبال کے علاوہ اس بیان پر جناب برکت علی، خلیفہ شجاع الدین، غلام رسول خاں اور پیر تاجدین کے دستخط بھی تھے"

ڈاکٹر عبدالقوی لقمان

دوہرا اور گٹھیلا جسم، درمیانہ قد، خوبصورت خدوخال، چہرے کی سفید رنگت میں ہلکی سی سیاہی نے ایسا امتزاج پیدا کیا ہے کہ بار بار دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ گفتگو میں تغزل کا رنگ، غصے میں ہوں تو چمن میں خزاں کی طرح سارا ماحول بے رونق ہو جاتا ہے، اپنے فن میں اس قدر ماہر کہ مریض دیکھتے ہی سارا مرض آپ سے آپ بولنے لگتا ہے اور کہیں نظر سنبھال کر دیکھ لیں تو نصف بیماری دور ہو جاتی ہے۔ طبیعت میں خاندانی شرافت، رکھ رکھاؤ اس زوال کے دور میں بھی قائم ہیں۔

یہ ہیں ڈاکٹر محمد عبدالقوی لقمان۔ آپ ۶۔ نومبر ۱۹۰۱ء میں مولانا ابو محمد احمد کے ہاں لاہور میں پیدا ہوئے۔ والد محترم مولانا عبیداللہ سندھی کی جمعیۃ انصار کے ناظم تھے۔ اور اس نسبت سے حضرت سندھی کے مرشد پیر جھنڈا (سندھ) کی خدمت میں ایک مدت گذار کر جب واپس آئے تو ڈاکٹر عبدالقوی لقمان لاہور میڈیکل کالج سے فارغ ہو چکے تھے۔ انہوں نے تین ماہ مدرسہ دیوبند میں حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب کی خدمت میں گذارے اور وہیں سے روحانی

تربیت کے لیے حضرت پیر جھنڈا کی خدمت میں چلے گئے۔

۱۹۳۱ء میں جب مجلس احرار کی بنیاد پڑی تو آپ احرار میں شامل ہو گئے۔ جماعت نے انہیں مقامی جماعت کا خازن مقرر کر دیا۔ ان دنوں ڈاکٹر صاحب کا لاہور پرانی کوتوالی کے چوک میں ذاتی کلینک تھا۔ اور خوب پریکٹس تھی۔ اس پر بھی مجلس احرار کے لیے وقت نکالتے رہے۔ تحریک آزادی کشمیر میں مولانا ظفر علی خاں نے یکایکی تحریک سے علیحدگی کا اعلان کرتے ہوئے تمام تر ذمہ داری ڈاکٹر عبدالقوی پر ڈال دی، جسے آپ نے باحسن طریق نبھایا۔

۱۹۳۵ء میں زلزلہ کوئٹہ کے مصیبت زدگان کے لیے جب احرار نے اپنا کیمپ قائم کیا تو آپ اس کے میڈیکل کے انچارج تھے۔

ڈاکٹر عبدالقوی لقمان مولانا عبیداللہ سندھی کے قرابت داروں میں سے ہیں اور حضرت مولانا احمد علی لاہوری کے سمدھی بھی۔ آپ کی نور نظر مولانا عبیداللہ انور کے حرم میں ہے۔

جن دنوں راقم کی ملاقات (۲۹ ﷲ) کو ڈاکٹر صاحب سے ان کی رہائش گاہ گلبرگ لاہور میں ہوئی، ان دنوں وہ عمر کی چھترویں بہار گذار رہے تھے۔ آپ پر فالج کا حملہ ہو چکا تھا اور علاج کے لیے کینیڈا جانے کی تیاریوں میں تھے۔

ایک نئی انقلابی تحریک

غلاموں کے ذہنوں میں نہ ربط ہوتا ہے، نہ ٹھہراؤ۔ ان کے دل و دماغ اپنے کسی فیصلے پر قناعت نہیں کرتے وہ اپنے ارادوں کی آگ سے غلامی کی زنجیروں کو راکھ کر دینے کی تمنا میں وقت کے کسی عاجلانہ فیصلے کو جس میں بغاوت کے آثار نہ ہوں، قبول نہیں کرتے۔

ہندوستان کی سیاسی جماعتیں نئے آئین کو بہر طور پروان چڑھانے پر بضد تھیں۔ ان کے نزدیک ملک کی آزادی ایکٹ ۱۹۳۵ء کے الیکشن میں تھی۔ کبھی وائسرائے کی ٹرین پر بم مار کر، کبھی کسی انگریز کو قتل کر کے اور کبھی خود پھانسی کے تختے پر لٹک کر انقلاب زندہ باد کا نعرہ بلند کر کے اس یقین اور ارادے کو پختہ کرنا چاہا کہ کبھی سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلے گا۔

کانگریس، مسلم لیگ اور دیگر سیاسی جماعتیں انتخاب کے جوڑ توڑ میں مصروف تھیں

کہ انہی دنوں پنجاب میں ایک نئی اور انوکھی تحریک نے جنم لیا۔ وہ یہ کہ سرکاری لیٹر بکسوں میں تیزاب ڈال کر تمام خطوط جلا دیے جاتے تھے۔ یہ سلسلہ سارے پنجاب میں چل نکلا۔ اس تحریک کے رہنما معروف لوگ نہیں تھے بلکہ انجانے نوجوان اس آگ کو ہوا دے رہے تھے۔

امرتسر میں اس تحریک کا لیڈر ایک کھاتے پیتے گھرانے کا محمد سلیم نامی تھا۔ اسی طرح لاہور میں اوم پرکاش، امی چند اور ایک ہندو لڑکی (افسوس ہمیں اس کا نام معلوم نہیں ہو سکا) اس تحریک کو چلا رہے تھے۔ محمد سلیم گرفتار ہوا مگر اس تحریک کے اکثر کارکن پس منظر میں رہے۔ اگرچہ پولیس اپنی تمام کارگزاری پر نازاں تھی۔ لیکن ہر موڑ پر انہیں نوجوانوں نے شکست دی۔

انہی دنوں ہری کشن نام کا ایک نوجوان رات کو کاریں جلا دیا کرتا تھا۔ اس کارسوز کا طریقہ واردات یوں تھا کہ وہ اوورکوٹ اور ہیٹ پہنے، جیب میں پٹرول کی شیشی اور لائٹر ڈالے سینماؤں کے گرد گھومتا رہتا۔ جہاں کوئی کار کھڑی دیکھی۔ ڈرامائی انداز میں اس کی سیٹ پر پٹرول چھڑک کر لائٹر لگا کر چل دیتا۔ اس کا لباس ایسا تھا کہ پولیس کو ایک مدت اس پر شبہ نہ ہوا۔ حالانکہ وہ جلتی کار دیکھنے والے ہجوم میں شامل ہوتا۔

عام طور پر لاہور کے سینماؤں میں ہر روز ایک آدھ کار ضرور جل جاتی۔ اس ڈر کے مارے سرمایہ داروں نے اپنی کاریں گیراجوں میں بند کر دیں۔

بالآخر یہ نوجوان گرفتار ہو گیا اور اسے پندرہ سال کی سزا ہوئی۔

ریل گاڑیاں روک کر ان میں موجود سرکاری خزانہ لوٹ لیا جاتا اور اس سرمائے سے انقلابی پارٹیاں اپنا کام کرتیں۔ چنانچہ دوران سال کے ان واقعات میں پٹنہ کے قریب ادھو پور ریلوے اسٹیشن اور پنجاب میں جالندھر کے قریب کرتارپور میں ایسے حادثے پیش آئے جس نے حکومت کو نئی الجھنوں میں ڈال دیا۔ اگرچہ اس تحریک سے آئین پسند پارٹیاں متاثر ہوئیں، لیکن نوجوان طبقہ ان تحریکوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

مجلس اتحادِ ملت مولانا ظفر علی خاں کی جماعت اتحادِ ملت چونکہ سر فضل حسین کی رہنمائی میں شہید گنج کا ڈرامہ کھیل چکی تھی۔ ہنوز اس ڈرامے کے کچھ پلاٹ باقی تھے، اس لیے وہ باوجود تمام کوششوں کے مسٹر محمد علی جناح سے ہم آہنگ نہ ہو سکے۔ اور

حسب ذیل بیان دے کر مسلم پارلیمنٹری بورڈ سے الگ ہو گئے۔

"چونکہ مسٹر جناح مکمل آزادی کے حامی نہیں ہیں اور اتحادِ ملت مکمل آزادی کی حامی ہے، بنابریں ہم مسٹر جناح کا ساتھ نہیں دے سکتے۔"

حالانکہ یہ بات نہیں تھی.......

اس سے پیشتر ۹ مئی کو سر محمد یامین نے میرٹھ سے ایک پریس بیان میں محمد علی جناح کی موجودہ پالیسی پر اعتراض کرتے ہوئے کہا:

"یہ پالیسی میری سمجھ میں نہیں آئی کہ تمام مسلمان ایک ہی ٹکٹ پر انتخاب لڑیں اور کونسل میں جا کر کسی ہندو پارٹی سے گفت و شنید کر کے نئی اصلاحات میں ترمیم کرائی جائے اور وہاں نیک نیتی سے ملت اور ملک کے مفاد کے لیے کام کیا جائے۔

مسٹر جناح کی یہ پالیسی مجھے پسند نہیں۔ کیونکہ جہاں تک یو پی کا تعلق ہے مجھے اس امر کی اچھی طرح واقفیت ہے کہ یہاں کے مسلمان اور ہندو سینکڑوں سالوں سے ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو بڑے آرام سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ درست ہے کہ بعض دفعہ ان میں کشیدگی ہوتی ہے۔ لیکن جناح کی مروجہ سکیم پر عمل کرنے سے وہ ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے ایسے لوگ مسٹر جناح کو گمراہ کر رہے ہیں۔"

(روزنامہ انقلاب لاہور۔ ۸ مئی ۱۹۳۶)

۱۱ مئی کو الہ آباد سے سر شفاعت احمد نے کہا:

"مجھے مسٹر جناح کی کامیابی مشکوک نظر آتی ہے اور میں اس امر کا سخت مخالف ہوں کہ مجلس آئین ساز میں فرقہ وارانہ اصول کے تحت پارٹیاں تشکیل کی جائیں۔ اگر مسٹر جناح کی پالیسی ہی کو مان لیا جائے تو یہ امر ملک کے عام فساد اور فرقہ وارانہ امور کے سبب بے حد نقصان دہ ثابت ہوگا۔

صوبجاتی آئین سازی میں میرے ذاتی تجربات واضح کر رہے ہیں کہ ایسی پارٹیوں کی تشکیل دوسرے مذاہب کے لیے زبردست ہیجان کا باعث ہوا کرتی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلم ارکان کے حقوق کے بارے میں اتحاد و اتفاق کا ثبوت بہم پہنچانا چاہیے اگرچہ جس حد تک اقتصادی اور معاشرتی سکیم کا تعلق ہے مسلم ممبروں کو اپنی ہم خیال پارٹیوں میں شامل ہونے سے نہیں روکنا چاہیے۔

مجھے امید نہیں کہ کوئی صوبہ بھی مسٹر جناح کے پروگرام پر عمل پیرا ہونے پر آمادگی ظاہر کرے گا۔"

یوپی مجلس احرار کا اجلاس

۱۰ مئی کو یوپی مجلس احرار کے اجلاس میں جو مولانا سید احمد کاظمی ایم۔ایل۔اے کی صدارت میں منعقد ہوا۔ علی گڑھ کالج میں مرزائیوں کی بڑھتی ہوئی بے دینی حرکات پر سخت پریشانی کا اظہار کیا گیا۔ نیز امرتسر میں احرار کے جلوس پر تارکول پھینکنے کی مذمت کی گئی۔ اس اجلاس میں یوپی مجلس احرار کا آئندہ سال کا انتخاب بھی عمل میں لایا گیا۔ جس میں صدر مولانا محمد احمد کاظمی، نائب صدر مولانا ابوالوفا شاہجہانپوری اور جنرل سیکرٹری خاں محمود علی خان رئیس کیلاش پور (سہارنپور) منتخب ہوئے۔

امرتسر کے واقعہ پر اظہار افسوس

روزنامہ "انقلاب" لاہور نے اپنی ۱۲ مئی کی اشاعت میں مجلس احرار کے جلوس پر تارکول پھینکنے کی مذمت کرتے ہوئے لکھا:

"امرتسر میں احرار کانفرنس کے صدر چودھری افضل حق کے جلوس پر بعض لوگوں نے تارکول ڈال کر اسلامی اخلاق و شرافت کی رسوائی کا سامان مہیا کیا ہے۔ ہمیں احرار سے ہزار اختلاف ہوں، لیکن ہم اس امر کو ہرگز گوارہ نہیں کرتے کہ محض اختلاف رائے کی بنا پر جسمانی حملے کیے جائیں۔ اگر اس قسم کے طرز عمل کی حوصلہ افزائی کی گئی تو ہماری پبلک زندگی ناقابل برداشت ہو جائے گی اور کسی قومی کارکن کی عزت محفوظ نہیں رہے گی۔

بعض غیر ذمہ دار جوشیلے نوجوان سیاسی جماعتوں کے اختلاف کی وجہ سے جوش میں آکر ایسی حرکتیں کر بیٹھتے ہیں اور اپنی جماعت کے لیے بدنامی کا باعث ہوتے ہیں۔ ہر سیاسی جماعت کو چاہیے کہ ایسے عناصر کی حوصلہ افزائی نہ کریں۔

غنڈہ پن سے آج تک نہ کوئی مقصد پورا ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

ہم رہنمایانِ احرار سے اس حادثے پر دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں "۔

روزنامہ مجاہد کی ضمانت ۱۵۔مئی کو احرار کے ترجمان روزنامہ "مجاہد" کی ایک ہزار روپے کی ضمانت مانگ لی گئی اور ساتھ ہی نورانی الیکٹرک پریس سے بھی ایک ہزار روپے کی ضمانت طلب کر لی گئی، جہاں سے یہ روزنامہ شائع ہوتا تھا۔ یہ کارروائی یکم مئی (۱۹۳۶ء) کے ایک مضمون کی بناء پر عمل میں آئی تھی۔ اس مضمون کا عنوان تھا "ہمارے جاسوس کا کارنامہ۔ بشیر الدین محمود اور سر ظفر اللہ کی خفیہ ملاقات"۔

نوابزادہ لیاقت علیخاں کی علیحدگی یوپی ایگریکلچر پارٹی کا قیام ہوتے ہی، ۱۱مئی کے تمام اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ مسٹر لیاقت علی خاں جنہیں ۲۶۔اپریل کو دہلی اجلاس میں مسلم لیگ کا جنرل سیکرٹری مقرر کیا گیا تھا مسٹر محمد علی جناح کی موجودہ پالیسی کے خلاف ان سے الگ ہو کر ایگریکلچر پارٹی میں شامل ہو گئے ہیں۔ یہ پارٹی یوپی میں اپنے ٹکٹ پر کانگریس کا مقابلہ کرے گی۔ اس جماعت کی شاخیں یوپی میں قائم کی جا رہی ہیں۔

نواب چھتاری، سر محمد یعقوب، نوابزادہ لیاقت علیخاں، سر شفاعت احمد اور سر محمد یوسف اس جماعت کے خصوصی رہنما ہیں۔

مسلم لیگ کے پارلیمانی بورڈ کا اعلان مسٹر محمد علی جناح پنجاب کے مختلف رہنماؤں سے گفتگو کے بعد کچھ دن سستانے کے لیے لاہور سے سرینگر چلے گئے تھے۔ یہاں وہ سرکاری مہمان رہے۔ اس دوران وہ کشمیری رہنماؤں سے بھی ملے۔ ریاستی انتظامیہ کے بارے میں بھی گفتگو ہوتی۔ اس دوران وہ مولانا میرواعظ محمد یوسف سے بھی ملے۔ جب پنجاب کے پالیٹکس کا ذکر آیا۔ تو مجلس احرار کی تحریک کشمیر کی قربانیوں کا تذکرہ چل نکلا۔ اس پر بہت دیر باتیں ہوتی رہیں۔

اس کارروائی کی رپورٹ ۱۳مئی کو یونائیٹڈ پریس نے اخبارات کو بھیجی۔ ۲۱۔مئی کے اخبارات نے سری نگر سے اطلاع دی کہ مسٹر محمد علی جناح نے آل انڈیا مسلم لیگ کے پارلیمانی بورڈ کے ارکان کے ناموں کا اعلان کر دیا۔

بنگال: نواب آف ڈھاکہ مسٹر مزمل حسین، خان بہادر عبدالرحمٰن - مولانا کرم دین خاں، مسٹر شہید سہروردی، مسٹر عبدالرحمٰن صادق، مسٹر ایچ۔ایم اصفہانی ۔مسٹر مجیب الرحمٰن۔

مدراس: سید مرتضیٰ حسن، مسٹر عبدالمجید، مسٹر جان محمد ۔مسٹر بی بوکر۔

یو پی: نواب محمد اسماعیل چھتاری، نوابزادہ لیاقت علیخاں، مہاراجہ محمود آباد، مولانا شوکت علی مسٹر خلیق الزمان، مولانا حسین احمد مدنی، نواب محمد یوسف۔

بہار: آنریبل عبدالعزیز، مولانا محمد سجاد، مسٹر اے ۔حفیظ شاہ، مسعود احمد ۔مولانا مفتی کفایت اللہ

سی۔پی: ایم رؤف شاہد، مسٹر شریف۔

سندھ: شیخ عبدالمجید سندھی، حکیم فتح محمد شیروانی، مولوی محمد صادق، مسٹر محمد ہاشم گزدر۔

سرحد: ملک پیر بخش، مولانا اللہ بخش یوسفی، مولانا عبدالرحیم غزنوی، ملک خدا بخش ایم ایل سی

پنجاب: مسٹر محمد اقبال، مولانا ظفر علی خاں، مولانا محمد اسحاق مانسہروی، میاں عبدالعزیز۔ بیرسٹر سید زین العابدین، مولانا عبدالقادر قصوری، شیخ حسام الدین، چودھری افضل حق ایم۔ایل سی۔ چودھری عبدالعزیز بیگووالیہ، خواجہ غلام حسین ایڈووکیٹ لائل پور اور راجہ غضنفر علی۔

آسام: مسٹر عبدالمتین چودھری۔ ایم اے ۔فاروقی۔

دہلی: مولانا احمد سعید۔

بمبئی: سر سلیمان قاسم، مسٹر آر ایم۔ چنبوائے، ابوبکر بیگ محمد ۔مسٹر چندریگر، ٹھاکر دادا ایم۔ایل سی، خان بہادر سلیم الدین۔

تحریک شہید گنج کا نتیجہ

——— ہم نہ کہتے تھے؟ ———

۲۸- جون ۱۹۳۵ء کو جس تحریک کا آغاز سر فضل حسین کے اشارے اور مرزا بشیر الدین محمود کے ایماء پر ہوا تھا جس کے نتیجے پر سکھ مزدور سے مسجد شہید کرائی گئی۔ مسلمان نوجوانوں نے گولیاں کھائیں، جیلوں میں گئے، ایک فعال سیاسی جماعت کو مطعون کیا گیا بحیثیت قوم مسلمان رسوا ہوئے، صوبے کا امن خراب ہوا، اقوام پنجاب دست و گریباں ہوئیں اور کشیدگی بڑھتی رہی۔

۱۹ مئی (۱۹۳۶) کو اس کا نتیجہ نکھر کر سامنے آ گیا۔ یعنی مجلس اتحادِ ملت کی عاملہ نے اپنے ارکان کو اجازت دے دی کہ وہ مسجد شہید گنج کے ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کا انتخاب لڑیں۔ اس اجلاس میں چند نوجوانوں نے اعتراض اٹھایا کہ مقدمہ کے فیصلہ تک کونسلوں کا تذکرہ کرنے سے اتحادِ ملت کے وقار کو نقصان پہنچے گا۔ لیکن اس مختصر آراء کو کوئی اہمیت نہ دی گئی۔ اور اکثریت سے یہ قرارداد منظور ہو گئی۔ اس قرارداد کی حمایت پر ڈاکٹر محمد عالم، مولانا ظفر علی خاں اور مولانا عبدالقادر قصوری نے زیادہ زور دیا۔

لاہور کی اکثر انجمنوں نے اس قرارداد کے خلاف مظاہرے کیے اور لاہور کی تمام فضا لیڈروں کے خلاف ہو گئی۔

۲۲ مئی کو لاہور شاہی مسجد میں جلسۂ عام ہوا، جس میں اس قرارداد کی سخت مخالفت کی گئی۔

۲۶ مئی کے روزنامہ "انقلاب" کا اداریہ پنجاب میں ان دنوں روزنامہ "انقلاب" (جس کے ایڈیٹر غلام رسول مہر اور عبدالمجید سالک تھے) یونینسٹ پارٹی کا واحد ترجمان تھا۔ وہ ہر روز مسلم لیگ اور مسٹر جناح کے خلاف اداریہ لکھتا۔ چنانچہ ۲۶ مئی کے انقلاب کے اداریہ کے چند اقتباس ملاحظہ ہوں۔

"مسٹر جناح جب لیگ پارلیمنٹری بورڈ کی سکیم لے کر پنجاب آئے۔ تو ہمارا خیال تھا کہ وہ مسلمانوں کے اہم مقاصدِ ملّی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اتحادِ بین المسلمین کا وہ مفہوم سامنے رکھیں گے جو بعض دوسرے احباب لیتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تشریف آوری سے قبل یا ان کے قیامِ لاہور کے درمیان ان کی مساعی کے خلاف ایک حرف بھی نہ لکھا۔ لیکن جب ہمیں معلوم ہو گیا کہ مسٹر جناح بھی صرف چند عناصر کے اتحاد کو اتحاد بین المسلمین قرار دے رہے ہیں تو پھر ہمیں رنج و قلق کے ساتھ ان کی مساعی کو تفرقہ انگیز قرار دینا پڑا"۔۔

"پنجاب کے متعلق مسٹر جناح کے تجویز کردہ ارکان بورڈ کی فہرست

سامنے دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ یہ اتحادِ مسلمان نہیں، بلکہ تفرقہ بین المسلین کو تقویت پہنچانے اور مضبوط و مستحکم بنانے کی ایک افسوسناک صورت ہے۔"

●

غرض صاف ظاہر ہے کہ مسٹر جناح نے پنجاب میں جو پارٹی بنائی ہے یا بنانے کی سعی فرمائی ہے وہ اتحاد بین المسلین کی اس اساس پر مبنی نہیں ہے۔"

۳۰ مئی کے ایڈیٹوریل میں ارکانِ بورڈ کے ایک ایک ممبر کا نام لے کر ان میں کیڑے نکالے گئے۔

مقدمہ کا فیصلہ

۲۵ مئی کو مسٹر رسل ڈسٹرکٹ سیشن جج لاہور نے مزار حضرت کاکو شاہؒ اور شہید گنج کے مقدمات کو زائد المیعاد قرار دے کر خارج کر دیا۔ اس سلسلے میں جن لوگوں کو سزائیں ہوئی تھیں، وہ رہا کر دیے گئے۔ اس فیصلے کے خلاف لاہور کے مسلمانوں نے مظاہرے کیے اور ہڑتال بھی ہوئی۔ اس مقدمے کی پیروی ڈاکٹر محمد عالم کر رہے تھے۔

حمایت کا اعلان

۲۷ مئی کو مفتی کفایت اللہ صدر جمعیۃ علمائے ہند اور مجلس احرار اسلام ہند کے صدر مولانا حبیب الرحمٰن اور مسلم یونیٹی بورڈ کے ارکان نے ایک مشترک اعلان میں کہا کہ وہ مسٹر محمد علی جناح کے مرتب کردہ مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے امیدواروں کی حمایت کریں گے۔

سر فضل حسین کا بیان

لاہور۔ ۲۸ مئی میاں سر فضل حسین نے مسجد شہید گنج اور مزار کاکو شاہ کے فیصلوں کے متعلق بیان دیتے ہوئے کہا:

۱۔ "مسلمانوں نے عدالت سے رواداری کا مطالبہ کیا تھا۔

۲۔ حکومت نے مقدمات کی سماعت کے لیے ایک سینئر جج مقرر کیا اور آسائشیں بہم پہنچائیں۔

۳۔ تاہم فیصلہ مسلمانوں کے خلاف ہوا مسلمانوں کو جج کی نیت پر شبہ نہ کرنا چاہیے۔ وہ قانون کے خلاف اعتراض کر سکتے ہیں لیکن جج کا بھی فرض ہے کہ جو کچھ

قانون کہے، اس کی پیروی کرے۔

۴۔ اب کیا کرنا چاہیے۔؟

د۔ وکلا، جو مقدمہ کی پیروی کرتے رہے ہیں ان سے مشورہ لینا چاہیے اور اس پر عمل کرنا چاہیے۔

ب۔ مسٹر جناح نے اس مسئلہ کے لیے جو کمیٹی بنائی تھی، اس سے بھی مشورہ کرنا چاہیے۔

پنجاب کے مسلمانوں نے یہ معاملہ مسٹر جناح کے سپرد کیا تھا، اب انہیں مسٹر جناح سے مشورہ لینا چاہیے اور جہاں تک ممکن ہو اس پر عمل کرنا چاہیے۔

ان حالات میں میں مسلمانوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنے ہمسایوں کے خلاف نفرت یا غصہ کے جذبات نہ رکھیں، لیکن اپنے حقوق پر ڈٹے رہیں "

(روزنامہ "انقلاب" ۳۰۔ مئی ۱۹۳۶ء)

یہ خاموشی کیوں؟ ایک ہفتہ گزرنے پر بھی سیشن جج کے فیصلے کے خلاف نہ تو کسی لیڈر نے بیان دیا اور نہ ہی اتحادِ ملت کی طرف سے کوئی جلسۂ عام ہوا بلکہ سر فضل حسین کے مشورے پر راولپنڈی میں ہونے والی اتحادِ ملت کانفرنس جس میں اس کے متعلق کوئی مشورہ ہونا تھا، ملتوی کر دی گئی۔

ایک اخباری افواہ اخبار اسٹیٹس مین کے نامہ نگار کا ایک بیان ۳۰۔ مئی کے روزنامہ "انقلاب" نے نقل کیا۔

"احرار نے قطعی فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ مسٹر جناح کی انتخابی مہم میں مسلم لیگ کے ساتھ تعاون نہیں کر سکیں گے۔ دوسری طرف مولانا ظفر علی خاں کی اتحادِ ملت کے ساتھ احرار کے اتحاد کے امکانات ختم ہو چکے ہیں۔ جہاں تک مسٹر جناح کی سکیم کا تعلق ہے۔ مسٹر جناح کی سکیم کم از کم اپنی ہیئت

کے اعتبار سے ایک کمیونل پارٹی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی طرح مولانا ظفر علیخاں کی جماعت کا مقصد خدمت خلق ہے۔ ان دونوں پارٹیوں کے ساتھ اتحاد سے احرار کا گریز یہاں یہ معنی رکھتا ہے کہ احرار اپنی پالیسی کے تحت (جو آزادیٔ وطن اور مرزائیوں کے خلاف ہے) الگ رہنا چاہتے ہیں"

پنڈت جواہر لال نہرو لاہور میں

۲۹ مئی کی صبح یکایک یہ خبر پنجاب کے اخبارات میں شائع ہوئی کہ کانگریس کے رہنما پنڈت جواہر لال نہرو لاہور پہنچ گئے۔ اپنے قیام کے دوران وہ مجلس احرار کے رہنما چودھری افضل حق اور اتحاد ملت کے رہنما مولانا ظفر علی خاں سے ایک بند کمرے میں تقریباً دو گھنٹے گفتگو کرتے رہے۔ یہ بات چیت اس قدر خفیہ رہی کہ کوشش کے باوجود پریس کو بھی پتہ نہ چل سکا کہ دونوں جماعتوں سے پنڈت جی نے کیا باتیں کیں۔ البتہ ۳۱ مئی کے پنڈت جی کے بیان سے اس قدر اندازہ ہو سکا کہ انہیں اپنے مشن میں ناکامی ہوئی ہے۔

(روزنامہ "انقلاب" ۲ جون ۱۹۳۶ء)

مہاتما گاندھی کا لڑکا مسلمان ہو گیا

۲۹ مئی کو مہاتما گاندھی کے بڑے لڑکے ہیرا لال گاندھی نے بمبئی جامعہ مسجد میں اسلام قبول کر لیا اور ان کا نام محمد عبداللہ گاندھی رکھا گیا۔ اپنے اعلان میں مسٹر عبداللہ نے کہا،

"میں نے اسلام قبول کیا ہے، اس لیے کہ یہ ایسا بہترین مذہب ہے کہ اخوت کی تعلیم دیتا ہے۔ اور تمام مذاہب کا نچوڑ ہے۔ میں اسلام میں زندہ رہوں گا اور اسی پر مروں گا"

مہاتما گاندھی کا بیان

۲ جون۔ بنگلور سے مہاتما گاندھی نے اپنے بیٹے کے مسلمان ہونے پر حسب ذیل بیان دیا۔

"اخبارات کے بیان سے پتہ چلا ہے کہ میرے بڑے لڑکے مسمی ہیرالعل (عمر تقریباً پچاس سال) نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اور

اس نے ۲۹ مئی کو جامعہ مسجد بمبئی میں مسلمانوں کے ایک بھرے اجلاس میں اپنے اسلام قبول کرنے کا اعلان بھی کر دیا ہے۔

اگر ہیرالعل نے بصمیم قلب اسلام قبول کیا ہو اور اس میں دنیاوی امور کا کچھ فعل نہ ہو تو مجھے اس کے مسلمان ہونے پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ میرا یقین ہے کہ اسلام بھی میرے مذہب کی طرح ایک سچا مذہب ہے۔ مگر مجھے شبہ ہے کہ اس کا اسلام قبول کرنا ذاتی اغراض سے مبرّا نہیں۔

جو لوگ ہیرالعل سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ مدت سے شراب پینے کا عادی ہے اور قہوہ خانوں میں جانے کا شیدا ہو چکا ہے۔ اور کچھ عرصہ سے وہ ایسے احباب کے تعاون سے زندگی بسر کرتا آرہا ہے، جنہوں نے اس کی بڑی مالی اعانت کی ہے۔ ہیرالعل چند پٹھانوں کا بھی مقروض ہے اور ان پٹھانوں نے اسے بھاری شرح سود پر روپیہ بطور قرض دے رکھا ہے۔ ابھی چند روز کا ذکر ہے کہ اسے ایک پٹھان سے بھی جان کا خطرہ تھا۔

ہیرالعل کی بیوی بڑی وفادار تھی اور اس نے ہمیشہ یہی کوشش کی کہ ہیرالعل کے طریق زندگی کو نظرانداز کیا جائے۔ چنانچہ اس عورت نے اپنے خاوند کے وفادار ہونے میں کبھی پہلو تہی نہیں کی۔ ہیرالعل کے تین بچے بھی ہیں، جن میں دو لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ مگر اس نے کبھی ان کی پرواہ نہیں کی۔

چند روز پیشتر ہیرالعل نے اخبارات میں ایک مضمون لکھ کر ہندوؤں کو دھمکی دی تھی کہ وہ ہندو مذہب ترک کر کے عیسائی یا مسلمان ہو جائے گا۔ اس کے بعد ناگپور میونسپل کمیٹی کے ایک ہندو رکن نے اسے میونسپل کمیٹی میں ملازمت دلا دی۔ اس کے بعد اس نے اخبار میں ایک اور مضمون شائع کرایا۔ جس سے پہلے بیان کی تکذیب ہو گئی تھی اور اس نے اپنے آباؤ اجداد کے مذہب پر قائم رہنے کا اظہار کیا تھا۔ مگر یہ خیال مکمل ہو چکا ہے کہ اس کی

دنیاوی ضرورتوں کی تسکین نہیں ہوئی اور انہی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے اس نے اسلام قبول کیا ہے۔

میرے پاس اور بھی بہت سے دلائل ہیں، جو میرے بیان کی تائید کرتے ہیں۔ گذشتہ دنوں مجھے ناگپور جانے کا موقعہ ملا تو وہاں ہیرالعل میری ملاقات کے لیے آیا۔ اس وقت اس کی والدہ نے مجھے بتایا کہ ہیرالعل کہتا ہے کہ بہت سے مذاہب کے لوگ اسے اپنے اپنے مذہب میں لانے کی تبلیغ کر رہے ہیں۔

میں نے اپنے تمام بچوں کو آزادی کی تعلیم دی ہے کہ وہ اپنے مذہب کی طرح دوسرے تمام مذاہب کو بھی محترم خیال کریں۔ اگر ہیرالعل کے دل میں اسلام قبول کرنے کا شوق تھا تو اسے مجھ کو مل کر بتا دینا چاہیے تھا۔ اس صورت میں مجھے کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ اور میں اس کے ارادے میں ہرگز مزاحم نہ ہوتا۔ مگر اس نے مجھے یا اپنے لڑکے جس کی عمر بیس سال ہے اور جو اس وقت میرے پاس ہے۔ اس بارے میں بالکل مطلع نہیں کیا۔ مجھے اس کے اسلام قبول کرنے کا علم اس جمعہ کے اعلان میں ہوا۔

میرے خیال میں ہیرالعل کو جن لوگوں نے مسلمان کیا ہے انہوں نے معمولی سی احتیاط بھی نہیں کی، جو ان کے لیے نہایت اہم اور ضروری تھی۔ میرا خیال ہے کہ ہیرالعل کا ہندو مذہب سے جانا ہندو مذہب کے لیے موجب خسارہ نہیں ہوگا اور اگر ہیرالعل بدستور سابق حرکات پر قائم رہا تو اسلام کو بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔"

آخر میں گاندھی جی نے کہا:

"میں اپنے لاتعداد مسلمان احباب کو مشورہ دوں گا کہ وہ ہیرالعل کو اس کے برے افعال سے روکیں اور اسے نیک بنانے کی کوشش کریں۔ تاکہ وہ شیطانی اور نفسی خواہشات سے بچا رہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ وہ

صحیح طور پر اللہ کا بندہ بن جائے۔ مجھے اس سے کوئی واسطہ نہیں کہ لوگ اسے عبداللہ کہہ کر پکاریں یا ہیرا لعل کہیں۔

(روزنامۂ "انقلاب" ۴۔ جون ۱۹۳۶ء)

مسٹر جناح کی کشمیر سے واپسی

۶۔ جون کو مسٹر محمد علی جناح کشمیر سے واپسی پر لاہور ٹھہرے تاکہ مسلم لیگ کا جنرل اجلاس بلایا جا سکے۔ یونینسٹ پارٹی نے ان کی آمد پر سیاہ جھنڈیوں سے ان کا استقبال کرنا چاہا۔ لیکن بروقت اس کی اطلاع ڈاکٹر سر اقبال اور ان کے توسط سے احرار کو بھی اس کی خبر مل گئی۔ اس پر احرار رضا کار چوکس ہو گئے۔ جس کے باعث یونینسٹ پارٹی کو یہ ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔

۸۔ جون کو مسلم لیگ اور پارلیمنٹری بورڈ کا اجلاس حبیبیہ ہال (اسلامیہ کالج) میں کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ لیکن عین وقت پر انجمن حمایت اسلام لاہور کے صدر نواب مظفر خاں نے اس کی اجازت نہ دی (نواب مظفر خاں یونینسٹ پارٹی کے سرگرم رکن تھے۔)

آخر مجبوراً یہ اجلاس برکت علی محمڈن ہال (بیرون موچی دروازہ لاہور) میں ہوا۔ اس اجلاس میں پنجاب کی طرف سے انیس ارکان نے شرکت کی۔ جن میں غالب اکثریت یونینسٹ ممبروں کی تھی۔ دیگر لوگوں میں نواب احمد یار خاں دولتانہ، سردار حبیب اللہ، مولانا غلام محی الدین قصوری، نوابزادہ خورشید علی خاں، بیگم شاہنواز اور ....

احرار کی جانب سے چودھری افضل حق، شیخ حسام الدین، چودھری عبد العزیز بیگووالیہ اور خواجہ غلام حسین ایڈووکیٹ قابل ذکر ہیں۔

اس اجلاس میں مسلم لیگ کا الیکشن مینی فیسٹو منظور کیا گیا۔ اور مولانا ظفر علی خاں اور ان کے ساتھیوں نے اسی اجلاس میں اپنے مستعفی ہونے کا اعلان کیا۔ مولانا کا یہ عذر لنگ تھا کہ مسلم لیگ کا نصب العین درجہ نوآبادیات ہے اس لیے ہم میں اور ان میں تعاون نہیں ہو سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر محمد عالم مولانا پر چھائے ہوئے تھے۔ اور انہوں نے مسجد شہید گنج کی بازیابی کا دیوانی دعویٰ بھی دائر کر رکھا تھا، لہٰذا وہ اتحادِ ملت کا علیحدہ پارلیمانی بورڈ قائم کر کے شہید گنج کے نام پر الیکشن لڑنا چاہتے تھے۔ بدیں وجہ ڈاکٹر عالم نے نہایت

ہوشیاری سے اتحادِ ملت، روزنامہ زمیندار، مولانا ظفر علیخان اور شہید گنج کو سراسر اپنے الیکشن کے لیے استعمال کیا۔ مسلم لیگ کے اس اجلاس میں جمعیتہ علمائے ہند کے صدر مفتی کفایت اللہ اور مولانا حسین احمد مدنی نے مسٹر جناح کی حمایت کرتے ہوئے کہا:

"ہم مسٹر جناح کی حمایت کرتے ہوئے، اس بات کا خیر مقدم کرتے ہیں کہ انہوں نے مسلم لیگ کو زندہ اور فعال جماعت بنا کر میدان عمل میں داخل کر دیا ہے"

مرزا ابوالحسن اصفہانی نے اپنی کتاب "مسلم لیگ" میں پارلیمنٹری بورڈ کے اس اجلاس کا حال بیان کرتے ہوئے ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔ جس سے ایک طرف ہماری قومی جدوجہد کی ابتدائی بے سروسامانی اور دوسری طرف ہمارے علمائے کرام کی سنگدلی پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ اصفہانی صاحب فرماتے ہیں۔

"پارلیمنٹری بورڈ کے اس اجلاس میں بہت سی تقریریں ہوئیں۔ یہ تقریریں کرنے کی عادت اب ایک طرح روایت اور کمزوری بن گئی ہے۔ پہلے روز مفتی کفایت اللہ اور مولانا حسین احمد مدنی نے اپنی تقریروں میں مسٹر جناح کی حمایت کرتے ہوئے اس بات کا خیر مقدم کیا کہ انہوں نے مسلم لیگ کو زندہ اور فعال سیاست کے میدان میں داخل کر دیا ہے۔ لیکن آخری روز انہی علمائے کرام میں سے ایک نے تجویز پیش کی کہ چونکہ انتخاب میں مسلم لیگ کو کامیاب کرانے کے لیے پروپیگنڈے کی مہم کا بڑی سرگرمی اور خوش اسلوبی سے چلانا بہت ضروری ہے، لہذا ہمارا خیال ہے کہ دیوبند کو اس پروپیگنڈے کا مرکز بنایا جائے، بشرطیکہ اس مہم کا تمام خرچ مسلم لیگ برداشت کرے۔ اس کے بعد انہوں نے فرمایا کہ پروپیگنڈے کی اس مہم کا آغاز کرنے کے لیے پچاس ہزار روپوں کی ضرورت ہوگی۔

لیگ کے پاس اس وقت پچاس پیسے بھی نہ تھے۔ صدر اور سیکرٹری دونوں بغیر تنخواہ کے مفت کام کر رہے تھے اور دفتر بھی گویا ان کے ہینڈ بیگ

ہی میں تھا۔ ان علمائے کرام کو ہم سے کہیں زیادہ مسلم لیگ کی اس کمزوری کا علم تھا۔ بظاہر انہیں معلوم ہونا چاہیے تھا کہ ان کی اس تجویز کا جواب سوائے انکار اور معذوری کے اور کیا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ مسٹر جناح نے انہیں بتایا کہ مسلم لیگ کے پاس کوئی سرمایہ نہیں اور مستقبل قریب میں بھی کسی چندے کی توقع نہیں رکھنی چاہیے ہم سب کو دل لگا کر خلوص سے کام کرنا چاہیے۔ یہ سن کر علمائے کرام سخت مایوس ہوئے اور آہستہ آہستہ ہندو کانگریس کی طرف کھسکنے لگے۔ بالآخر انہوں نے اپنے آپ کو کانگریس کے پراپیگنڈے کے لیے وقف کر دیا"

"(اقبال کے آخری دو سال" مصنف عاشق حسین بٹالوی ص ۳۲۷-۳۲۸)

اسی طرح کے ایک دوسرے اجلاس کی کارروائی جس کا تعلق یوپی کے انتخاب سے ہے ایک دوسرا مصنف مولانا عزیز الرحمٰن جامعی اپنی کتاب "رئیس الاحرار" کے ص ۱۹۴، ۱۹۵ پر یوں رقمطراز ہے۔

"سلیم پور ہاؤس لکھنؤ میں کانگریس، مسلم لیگ کے اتحاد کا مشورہ زیر بحث تھا۔ رمضان المبارک میں مولانا ابو الکلام آزاد الیکشن کی تیاریوں کے سلسلے میں لکھنؤ تشریف لائے۔ سلیم پور ہاؤس میں قیام کیا۔ چودھری خلیق الزماں کے ذریعے یو۔پی کے مسلم لیگیوں سے کانگریس، لیگ مشترک محاذ کی گفتگو شروع ہوئی۔ یو۔پی میں جمعیۃ علمائے ہند کا بے پناہ اثر تھا۔ اس لیے یوپی کا الیکشن بلا جمعیۃ علمائے ہند کی امداد کے جیتا نہیں جا سکتا تھا۔ چنانچہ جمعیۃ علمائے ہند کے رہنما بھی اس گفتگو میں شامل تھے۔ مولانا حبیب الرحمٰن صدر مجلس احرار سلیم پور ہاؤس میں مولانا آزاد کے ساتھ ٹھہرے۔ چودہ روز تک قیام کیا۔ اس دوران مولانا حبیب الرحمٰن کی چودھری خلیق الزماں سے بارہا گفتگو ہوئی۔ آخر یوپی میں کانگریس، مسلم لیگ اور جمعیۃ علمائے ہند کا اتحاد ہو گیا۔

سوال یہ تھا کہ الیکشن میں مسلم لیگ کے امیدواروں پر روپیہ کون خرچ

کرے؛ اس بارے میں پنتھ جی اور خلیق الزمان میں بات چیت طے ہو گئی، کہ کانگریس مسلم لیگ کے امیدواروں کی ہر طرح مدد کرے گی۔ الیکشن پر کوئی پچاس ہزار کے خرچ کا تخمینہ تھا۔ مسلم لیگ الیکشن کے نگران چودھری خلیق الزمان بنائے گئے۔ چودھری صاحب اس وقت تک کانگریسی تھے۔ انہیں صرف کانگریس نے الیکشن کی کامیابی کے لیے مسلم لیگی بنوایا تھا۔

سیّد حبیب کا استعفیٰ

مولانا سید حبیب مالک روزنامہ "سیاست" لاہور نے ۸۔ جون کو مجلس اتحادِ ملّت سے استعفیٰ دے دیا۔ استعفیٰ کی وجوہ بیان کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

"اس وقت اتحادِ ملت کے پروگرام میں مجلس احرار کی مخالفت یا کونسلوں میں جانے کے سوا کوئی پروگرام نہیں ہے جسے میں پسند نہیں کرتا۔ میں خلوص نیتی سے حصولِ مسجد کے لیے اتحادِ ملّت میں شامل ہوا تھا۔ لیکن یہ جماعت اپنے موقف سے منحرف ہو چکی ہے۔"

روزنامہ "انقلاب" کی رائے

۸۔ جون کے مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ لاہور پر تبصرہ کرتے ہوئے ۱۱۔ جون کے روزنامہ "انقلاب" نے بغیر کسی نام کے ایک مراسلہ شائع کیا، جس میں مسٹر جناح اور مسلم لیگ کی ایک نئے انداز سے مخالفت کی گئی اور یہ تجویز پیش کی کہ:

"مسلم لیگ کا سنٹرل پارلیمنٹری بورڈ توڑ دیا جائے۔ اور صوبائی لیڈروں کو اپنے اپنے صوبوں میں کام کرنے کی اجازت دی جائے۔ اس ضمن میں یہ بھی کہا گیا کہ پنجاب میں پارلیمانی بورڈ کی کامیابی کی کوئی گنجائش نہیں۔"

احرار یونٹی بورڈ اور جمعیۃ علمائے ہند کا اجلاس

۱۰۔ جون کو لاہور مرکزی مجلس احرار کے دفتر میں جمعیۃ علمائے ہند، یونٹی بورڈ اور مجلس احرار کا مشترک اجلاس ہوا، جس میں دیگر جماعتوں کے نمائندے بھی شریک تھے۔ یعنی مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا محمد اسماعیل دیوبی، چودھری افضل حق

چودھری خلیق الزمان، مولانا سید محمد احمد کاظمی ایم۔ ایل اے۔ عبدالمتین چودھری، خواجہ عبدالرحمٰن غازی، ایم سجاد، شیخ عبدالحمید سندھی، ایم مسعود، مولانا داؤد غزنوی، خواجہ غلام حسین اینڈ وکیٹ لائلپور، مولانا شوکت علی، شیخ حسام الدین، مولانا مظہر علی اظہر قابلِ ذکر ہیں۔

اس اجلاس میں انتخابی بورڈ کے متعلق بعض اہم فیصلوں پر بحث کی گئی۔ چونکہ پریس کو اجلاس میں شرکت کی اجازت نہیں تھی، لہٰذا کوئی فیصلہ سامنے نہ آسکا۔

(یونائیٹڈ پریس، روزنامہ انقلاب لاہور ۱۱۔ جون ۱۹۳۶)

ایک خبر رائے بہادر چھوٹو رام یونینسٹ پارٹی کے رہنماؤں میں شامل تھے۔ ان کی روہتک سے بھیجی ہوئی ایک خبر ۱۱۔ جون (۱۹۳۶ء) کے روزنامہ انقلاب میں شائع ہوئی، جو حسب ذیل ہے۔

روہتک۔ ۳۔ جون کو عید میلاد النبی کا جلوس نکالا گیا۔ مسلمانانِ روہتک نے اس تہوار کو بڑی شان و شوکت سے منایا۔ سب سے بڑی مسرت اس بات پر ہے کہ عید میلاد النبی ہندو، مسلمانوں کی باہمی اخوت و محبت کا موجب ثابت ہوا ہے۔ مقامی مسلمانوں نے پیشتر اپنے سالانہ جلوس کو اس لیے ملتوی کر رکھا تھا کہ مقامی حکام نے اس پر پابندی لگا رکھی تھی۔ آخر بڑی مشکل سے حکومت نے اس جلوس کی اجازت دی تو شہر کے مسلمانوں نے جلوس کے لیے شربت، پان اور دوسرے لوازمات کا انتظام کیا تھا۔

یہ فروری یا مارچ کی بات ہے۔

۳۔ جون کو جب مسلمانوں نے سرورِ کائنات کا یوم پیدائش منایا اور جلوس نکالا تو ہندوؤں نے راستے میں پانی کی سبیلیں لگائیں، جس میں شربت اور پان وغیرہ سے جلوس کی تواضع کی گئی۔ اس موقعہ پر دونوں قوموں کے درمیان مسرت اور خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

مولانا مظہر علی کا بیان مسلم لیگ کی جنرل کونسل سے مستعفی ہونے پر مولانا ظفر علی خاں نے جو بیان دیا اس کے جواب میں مولانا مظہر علی جنرل سیکرٹری

مجلس احرار السلام ہند نے مندرجہ ذیل بیان پریس کو دیا۔

"گذشتہ سال مسجد شہید گنج کی آڑ میں مجلسِ احرار کو نیست و نابود کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنے کے بعد کل مولانا ظفر علی خاں نے مسلم لیگ کے پارلیمانی بورڈ میں ایک سنسنی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے بیان شائع کیا ہے کہ

"وہ مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ سے تعاون نہیں کر سکتے۔ کیونکہ لیگ کا سیاسی عقیدہ درجہ نو آبادیات کا حصول ہے"

اگر ان کا اختلاف محض اس بناء پر ہوتا کہ ان کا عقیدہ مکمل آزادی حاصل کرنے کا ہے تو نہایت خوشی کی بات تھی۔ لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا ظفر علی خاں مسلم لیگ سے ایک بچے کی طرح روٹھ گئے ہیں تو معلوم ہوتا ہے یہ لیگ پارلیمانی بورڈ سے علیحدگی کا ایک بہانہ ہے اور اندر خانہ کچھ اور وجہ ہو سکتی ہے۔ خاص کر مسٹر جناح نے جب ان سے کہہ دیا ہے کہ ان کے علاوہ اور اشخاص بھی ایسے ہیں، جو مکمل آزادی چاہتے ہیں، لیکن وہ مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ سے تعاون کر رہے ہیں۔ کیونکہ پارلیمانی بورڈ ان سے یہ نہیں کہتا کہ وہ اپنا عقیدہ ترک کر دیں یا اس کے حصول کی کوشش نہ کریں۔

پارلیمانی بورڈ کی منشا صرف یہ ہے کہ آزاد خیال لوگوں کا تعاون حاصل کیا جائے اور اس طرح رجعت پسند طاقتوں کا مقابلہ کیا جائے۔ بہت سے مسلمان مجلسِ احرار سے کہہ رہے تھے کہ مولانا ظفر علیخاں اور اتحاد ملت میں مفاہمت اور تعاون کریں۔ مسٹر جناح کے پارلیمانی بورڈ نے اس کے لیے بہت اچھا موقعہ پیدا کر دیا تھا۔ مگر مولانا ظفر علی خاں نے اس سے فائدہ اٹھانے سے انکار کر دیا۔ آج وہ جن سہاروں پر بڑی بڑی امیدیں باندھے ہوئے ہیں، انہیں جلد پچھتانا پڑے گا کہ یہ سہارے ریت کے سہارے ہیں"

(روزنامہ "انقلاب" لاہور ۱۳۔ جون ۱۹۳۶)

سر سکندر اور فضل حسین کے درمیان کشمکش

سیاست میں رشتے ناطے اور دوستانہ تعلقات چراغِ سحری معلوم ہوتے ہیں

یا اس کی عمر اس پھول کی سی ہوتی ہے، جو بادِ سموم کے ایک ہی جھونکے سے مرجھا جاتا ہے۔

سر فضل حسین پنجاب کی وزارتِ عظمیٰ کے شوق میں وائسرائے کی کونسل سے مستعفی ہو کر پنجاب آئے تو سر سکندر حیات انہیں اپنے راستے کی دیوار نظر آئے۔ چنانچہ انہوں نے بظاہر سر سکندر حیات پر یہ احسان کیا کہ انہیں ریزرو بنک کا ڈپٹی گورنر بنا کر کلکتہ بھیج دیا۔ سر سکندر حیات حاتم طائی کی اس خیرات کو بخوبی سمجھتے تھے، تاہم وہ با دلِ نخواستہ صوبہ سے باہر چلے گئے۔ لیکن اندر خانہ اس بساط پر اپنی چال سوچتے رہے۔ گو ۲۹۔ اپریل سے بظاہر سر سکندر حیات اور سر فضل حسین کے مابین صلح ہو چکی تھی اور انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ بہت جلد بنک کی گورنری سے مستعفی ہو کر پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کی تنظیم نو میں مصروف ہو جائیں گے، لیکن یہ بھی ایک سیاسی چال تھی۔ وہ اس میں کہاں تک کامیاب ہوئے، اس کہانی کو ایک دوسرے مصنف کی زبانی سنیئے۔

عین جس وقت آل انڈیا مسلم لیگ، ہندوستان کے مسلمانوں میں فکر و عمل کی وحدت پیدا کرنے کے لیے پروگرام مرتب کر رہی تھی، سر سکندر حیات خاں پنجاب کی ریونیو ممبری کی پانچ سالہ میعاد ختم کر کے ہندوستان کے ریزرو بنک کے ڈپٹی گورنر بن چکے تھے، جہاں وہ ساڑھے پانچ ہزار روپیہ مشاہرہ لیتے تھے۔ ان کی جگہ نواب مظفر خاں پنجاب کے ریونیو ممبر بن گئے تھے۔ میاں فضل حسین کو معلوم تھا کہ یونینسٹ پارٹی کا ایک طاقتور عنصر ان کے خلاف ہے، اور سر سکندر اس باغی فریق کے لیڈر ہیں۔ تاہم وہ اس پارٹی کے منتشر عناصر کو یکجا کرنے کی فکر میں شب و روز کام کر رہے تھے۔ پنجاب میں نواب مظفر خاں، میاں احمد یار خاں دولتانہ اور میر مقبول، سکندر کے بہت بڑے حامیوں میں شمار ہوتے تھے۔

سر سکندر کو معلوم تھا کہ میاں فضل حسین سے نبرد آزما ہونا کوئی آسان کام نہ تھا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ فضل حسین بیمار تھے اور کام کی شدت جس قسم کی جسمانی طاقت و توانائی اور صحت کی طلب گار تھی، وہ انہیں حاصل نہ تھی۔ لیکن فضل حسین کی غیر معمولی قوت ارادی اور ذہانت

ایک ایسا حربہ تھا جس کا لوہا ان کے حریف بھی مانتے تھے اور سر سکندر کو یقین تھا کہ اگر ان کے اور میاں فضل حسین کے درمیان مقابلے کی نوبت آئی تو انجام کار یونینسٹ پارٹی فضل حسین ہی کو اپنا لیڈر منتخب کرے گی۔ اس صورت میں سر سکندر کے سامنے دو راستے کھلے تھے۔ اول یہ کہ میاں فضل حسین کے تحت ایک وزیر کی حیثیت سے کام کرنا قبول کر لیں۔ دوم یہ کہ یونینسٹ پارٹی سے اپنا رشتہ منقطع کر کے کسی نئی پارٹی کی داغ بیل ڈالیں۔ سر سکندر بیک وقت ان دونوں راستوں پر گامزن تھے۔

ادھر وقتاً فوقتاً میاں فضل حسین کو اپنے خلوص اور نیاز مندی کا یقین دلاتے رہتے تھے۔ ادھر فضل حسین کے خلاف ایک نئی پارٹی کی طرح ڈالنے کی دوڑ دھوپ بھی کرتے رہتے۔ سر سکندر خود تو بنک کی ملازمت کی وجہ سے کلکتہ اور بمبئی میں مقیم تھے۔ لیکن میاں احمد یار خاں دولتانہ اور میر مقبول ان کے نائب سالار کی حیثیت سے برابر لاہور میں کام کر رہے تھے۔

جونہی سر سکندر کو معلوم ہوا کہ مسلم لیگ آئندہ انتخابات میں حصہ لینے کا عزم رکھتی ہے انہیں فوراً یہ ڈھارس بندھی کہ شاید لیگ ہی ان کی پریشانیوں کا مداوا بن سکے۔ اور وہ مسلم لیگ ہی کے توسط سے میاں فضل حسین کے خلاف اپنی پارٹی مضبوط کر سکیں۔ چنانچہ انہوں نے احمد یار خاں دولتانہ کو لیگ کے اجلاس میں شرکت کے لیے بمبئی بھیجا اور ۱۲۔ اپریل کو مذکورہ بالا قرارداد میاں احمد یار خاں دولتانہ کی موجودگی میں اور ان کی رضامندی سے منظور ہوئی۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ جس وقت مسٹر جناح اس تذبذب میں تھے کہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر انتخاب کی جنگ لڑی جائے یا نہ لڑی جائے تو سر سکندر نے مسٹر جناح سے وعدہ کیا تھا کہ وہ پنجاب میں مسلم لیگ کے نام پر اپنی جماعت منظم کریں گے اور مسلم لیگ کے ٹکٹ پر میاں فضل حسین کا مقابلہ کر کے انہیں شکست دیں گے۔

سر سکندر کے راجہ نریندر ناتھ سے بھی بہت خوشگوار تعلقات تھے اور راجہ صاحب ہر اس شخص کی مدد کرنے کو تیار تھے جو میاں فضل حسین کے خلاف خم ٹھونک کر کھڑا ہو سکے چنانچہ سر سکندر جب لاہور آتے تو راجہ نریندر ناتھ سے ضرور ملتے۔ ان کا اندازہ تھا کہ یونینسٹ پارٹی کا وہ عنصر جو ان کا حامی تھا، اگر راجہ نریندر ناتھ کی پارٹی سے تعاون کرے تو اس طرح

غالباً ان کی جماعت کے ارکان کی تعداد میاں فضل حسین کے حامیوں سے بڑھ جائے گی۔
میاں فضل حسین، سر سکندر کی ان سازشوں سے سخت پریشان تھے اور محسوس کرتے تھے کہ حالات و واقعات پر ان کی گرفت پہلے کی طرح مضبوط نہیں رہی۔ ایک خط میں چودھری شہاب الدین کو لکھتے ہیں:

"دوست، عزیز اور رشتے دار اس قدر خود غرض، حاسد اور ناشکرے ہو گئے ہیں کہ ان کی کمینہ حرکات دیکھ کر دل پاش پاش ہو جاتا ہے لیکن کیا کیا جائے۔ صبر و شکر کرنے اور رواداریوں کو برداشت کرنے کے سوا کیا چارہ ہے۔ اب تو زندگی کا صرف یہی مقصد رہ گیا ہے کہ جو کام شروع کیا تھا اسے بالخیر انجام تک پہنچایا جائے۔"

میاں فضل حسین اس بات پر بھی آمادہ ہو گئے تھے کہ اگر سر سکندر ان کی قیادت میں کام کرنا نہیں چاہتے تو وہ بخوشی سیاسیات سے کنارہ کش ہونے اور لیڈری کا منصب سکندر کے حوالے کرنے کو تیار ہیں۔ چنانچہ ایک خط میں سر سکندر کو لکھتے ہیں۔

"اگر آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں تو میں صرف پارٹی کی قیادت ہی سے نہیں بلکہ پبلک زندگی اور سیاسی کاموں سے کلیتاً دستبردار ہونے کو تیار ہوں۔ آپ بنک سے نور استعفیٰ ہو کر یہاں آ جائیے اور پارٹی کی زمام قیادت سنبھال لیجئے۔ میں چونکہ سیاسیات سے بالکل کنارہ کش ہو رہا ہوں، اس لیے آپ کو غالباً اس بات پر چنداں اعتراض نہیں ہو گا کہ میں ایک بیان شائع کر کے عوام کو ان حالات و کوائف سے مطلع کر دوں جن کے تحت مجھے یہ فیصلہ کرنا پڑا ہے۔ میری تمنا ہے کہ آپ اور آپ کے دوست اور آپ کی پارٹی کو ہر قسم کی کامیابی نصیب ہو۔"

جب کشیدگی یہاں تک پہنچ گئی تو سر سکندر نے بطور مصلحت خود لاہور آ کر میاں فضل حسین سے معذرت کی اور اپنی وفاداری کا یقین دلا کر جملہ خدشات رفع کرنے کی کوشش کی۔ احمد یار خاں دولتانہ نے بھی منت سماجت کر کے فضل حسین کو خوش کرنا چاہا۔

آخر میاں فضل حسین اس قسم کی نیازمندانہ گذارشات سے مطمئن ہو کر بظاہر پھر کام کی طرف متوجہ ہو گئے۔ لیکن اس مصالحت پر ابھی چند ہی روز گزرے تھے کہ ایک اور شگوفہ کھلا۔

میڈیکل کالج لاہور کے پرنسپل کرنل ہارپرنلسن، فضل حسین کے معالج تھے اور نواب مظفر خاں
چپکے چپکے ہارپرنلسن کے پاس جا کر پوچھتے تھے کہ فضل حسین کی زندگی کے کتنے دن باقی ہیں۔
ہارنلسن نے ایک ذمہ دار معالج کی حیثیت سے نواب مظفر خاں کو تو کچھ بتانے سے انکار
کر دیا۔ لیکن انہوں نے میاں فضل حسین کو فوراً آگاہ کر دیا کہ ان کے حریف اب ان کی زندگی
کی گھڑیاں شمار کر رہے ہیں۔ فضل حسین کو نواب مظفر خان کی اس حرکت سے اس قدر
صدمہ پہنچا کہ انہوں نے رنج والم کی شدت میں خودکشی کا ارادہ کر لیا۔ اور آخر ایک کرب انگیز
ذہنی کشمکش کے بعد اس مذموم ارادے سے باز آئے۔"

("اقبال کے آخری دو سال" بمصنف عاشق حسین بٹالوی ص ۲۹۴ تا ص ۲۹۵)

پنجاب اقتدار کی ان اندرونی سازشوں نے پنجاب کو مختلف دھڑوں میں منقسم کر دیا۔
میاں سر فضل حسین اپنے مستقبل کے لیے یونینسٹ پارٹی کو منظم کر رہے
تھے۔ سر سکندر حیات پس منظر میں بیٹھے اپنے اقتدار کی تلاش میں تھے۔ ان کی دو رخی
پالیسی باغباں سے بھی یارانہ گانٹھے ہوئے تھی۔ اور صیاد کی مزاج پرسی بھی کر رہی تھی۔ اتحادِ
ملت کا علم اٹھائے مولانا ظفر علی خاں کا دل و دماغ فضل حسین کی منڈھیر پر تھا۔ اور
ڈاکٹر محمد عالم انہیں آئندہ الیکشن کے لیے اپنی مرضی کے تابع رکھنا چاہتے تھے۔ دونوں
مل کر شہید گنج کی اینٹیں مجلسِ احرار کی طرف پھینک رہے تھے۔

مجلسِ احرار ان صبر آزما لمحات سے گذر کر بھی توانا تھی اتاہم شہید گنج کے زخم ہنوز
تازہ تھے۔ اس پر بھی احرار رہنماؤں نے مسٹر محمد علی جناح کی آواز پر لبیک کہا۔ اور
پنجاب میں ان کا سہارا بنے۔ ورنہ رجعت پسند گروہ قدم قدم پر ان کا راستہ روکے
ہوئے تھا۔

یوپی پنجاب جیسے حالات یوپی میں بھی پیدا کر دیے گئے تھے۔ چنانچہ انہی دنوں سر فضل حسین،
نواب چھتاری کو ایک خط کے ذریعے مشورہ دیتے ہیں۔

"مسلم لیگ کے ٹکٹ پر انتخاب لڑ کر مسلمان گورنمنٹ میں شریک نہیں ہو سکتے
اس لیے زمیندارہ یا ایگریکلچرسٹ پارٹی بنا کر الیکشن لڑے جائیں، تاکہ ایسی پارٹی

میں سب ہی گورنمنٹ میں آجائیں گے"

("نامۂ اعمال" حصہ اوّل ص ۹۳۷)

سر محمد یامین خاں ایم۔ایل۔اے سے جب مسلم لیگ کے مینی فیسٹو کی بابت، جو پارلیمنٹری بورڈ نے شائع کیا ہے، رائے دریافت کی گئی، تو انہوں نے کہا مینی فیسٹو سے صاف ظاہر ہے کہ بورڈ مسلمانوں کے ایک طبقہ سے خاص کر زمینداروں سے تعاون کرنا نہیں چاہتا۔ اور ان پر الزام لگایا ہے کہ انہوں نے گورنمنٹ پر قبضہ کر رکھا ہے۔

اور ممبران بورڈ حکومت پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں، اپنا اقتدار بڑھانا چاہتے ہیں ۔ مسلمانوں کے لیے اس سے زیادہ تکلیف دہ بات کون سی ہو سکتی ہے کہ مسٹر جناح مسلمانوں کو متحد کرنے میں قطعی ناکام ہو گئے ہیں۔ بلکہ متحد کرنے کی بجائے ان کے درمیان ایک بڑی خلیج بلاوجہ زمینداروں پر مینی فیسٹو میں حملہ کر کے پیدا کر دی۔ مینی فیسٹو سے ان لوگوں کی ذہنیت اور خواہش جاہ صاف عیاں ہے، جنہوں نے یہ مینی فیسٹو بنایا ہے۔

مسلمان پبلک کو مذہب اور اتحاد کے نام پر یہ چالاک لوگ عرصہ سے دھوکہ دے کر اپنے لیے اپنی خواہشات کو پورا کرنے اور اقتدار و شہرت حاصل کرنے کے واسطے استعمال کرتے رہے ہیں۔

اب پھر اعلیٰ الفاظ استعمال کر کے اپنا مقصد پورا کرنا چاہتے ہیں۔ تمام ایماندار اور قوم کے سچے بہی خواہوں کو اس کا افسوس ہے۔ مسٹر جناح اور مسلم لیگ کا نام استعمال کر کے وہ لوگ ذاتی فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں، جن کی غلط پالیسی نے گذشتہ بیس سال کے عرصہ میں مسلمانوں کو تباہی کے گڑھے میں ڈالنے کے سوا کوئی کسی قسم کا فائدہ نہیں پہنچایا۔ اب اس طرح اپنا کھویا ہوا اقتدار اپنی ذاتی وجاہت کے لیے مسلمانوں کو بیوقوف بنا کر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

اس دن کے پرچے ۲۲-جون میں چودھری خلیق الزمان جو کہ سازشیوں کے سرگروہ ہیں اور جواب تک کانگریسی رہے ہیں اور انتخاب حلقہ کانگرس کے جو مسلمانوں نے بڑی مشکل اور کوشش سے حاصل کیا ہے سخت مخالف رہے ہیں۔ اور اب بھی ہیں۔ اور اس حق کو چھینوانا چاہتے

ہیں۔ اور اب کانگریس کے جاسوس کی حیثیت سے مسلم لیگ میں شامل ہو کر اندر سے خلفشار پیدا کرنا چاہتے ہیں، ان کا حسب ذیل بیان چھپا۔

" چودھری خلیق الزمان نے نواب چھتاری اور نواب سر محمد یوسف کے مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ سے استعفیٰ دینے پر جاری کیا اور کہا کہ مجھ کو ان کے استعفیٰ پر کوئی تعجب نہیں ہوا۔ یہ تو دیر سے یا جلد ہونے ہی والا تھا۔ جو وجوہ بیان کی گئی ہیں یہ تو صرف پرانی اور قدامت پسندیت کو چھپانے کے لیے دی گئی ہیں۔

(خلیق الزمان کے بیان میں مزید کہا گیا ہے کہ)

نیشنل ایگریکلچرسٹ پارٹی مسلمانوں اور ہندوؤں کو مشترک طور پر غلط کاموں کا موقعہ دے گی لیکن نواب چھتاری یہ بھول گئے ہیں کہ انہوں نے ۲۶ اپریل کو مسلم لیگ کے ممبروں کو باور کرایا تھا کہ نیشنل ایگریکلچرسٹ پارٹی کے آئین میں ایک دفعہ ہے جس کی رو سے ہندو اور مسلمان ممبروں کو یہ حق حاصل ہے کہ فرقہ وارانہ رائے دینے پر آزاد ہیں، چاہے جدھر رائے دیں۔

ایسی پارٹی جو اپنے ممبروں کو یہ سہولت دیتی ہے اس کو نیشنلسٹ ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ اس پارٹی کا اصل منشا یہ ہے کہ مل کر کانگریس کی مخالفت کریں اور ترقی پسند مسلمانوں کی مخالفت کریں، چاہے کتنا ہی پوشیدہ رکھ کر یہ کیا جائے رائے دہندگاں سے یہ بات چھپ نہ سکے گی کہ مشترک پارٹیاں اشتراک عمل کے لیے جب ہی کامیاب ہو سکتی ہیں، جب انتخاب بھی مشترک ہو۔

مسلمان وہ دن نہیں بھولے ہیں کہ جب نیشنلسٹ مسلمان انتخاب مشترک کے واسطے کوشاں تھے۔ اور ان کی سخت مخالفت کی جاتی تھی۔ اور نواب سر محمد یوسف ٹرین بھر کر اپنے ساتھیوں کو مسلم میٹنگ میں انتخاب مشترک کی مخالفت کرنے کے لیے لے جاتے تھے۔ اب جبکہ انتخاب جداگانہ کی بنیاد پر الیکشن ہونے والے ہیں، تو نواب صاحب مشترک پارٹی بنانے کے حامی نہیں اگر پالیٹکس میں کوئی ایمان داری ہے تو ان صاحبان کو چاہیے کہ مکان کی چھت

سے باآواز بلند اعلان کریں کہ وہ انتخاب مشترک کے حامی نہیں یا اگر یکلچرسٹ پارٹی کے آئین سے یہ دفعہ نکال دیں کہ فرقہ وارانہ معاملات میں ہندو اور مسلمان ممبر آزاد ہوں گے یا جس طرح چاہیں رائے دیں۔"

خلیق الزمان کا یہ بیان صاف ظاہر کرتا ہے کہ بھیڑ کی کھال پہن کر بھیڑیا بول رہا ہے اس سے صاف عیاں ہے کہ کانگریس کا جاسوس مسلم لیگ میں داخل ہو کر مسلمانوں کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔

("نامۂ اعمال" حصہ اول ص۶۳۷ تا ص۶۳۹)

یہی حالات ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے مسلمانوں کے تھے۔ وہ انتشار اور پریشان حالات سے گذر رہے تھے۔

آپ ڈلہوزی کیوں گئے تھے؟

۱۰۔ جون کو لاہور میں ایک جلسۂ عام کے موقعہ پر، جو بیرون موچی دروازہ میں ہوا۔ اس میں مولانا ظفر علیخاں تقریر کے لیے کھڑے ہوئے تو چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں۔

"آپ ڈلہوزی کیوں گئے تھے؟ آپ وہاں سر فضل حسین اور مرزا بشیرالدین محمود سے کیوں ملے تھے؟"

(ان سوالات کے جواب میں مولانا ظفر علیخاں نے کہا)

ان کا جواب مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، چودھری افضل حق یا مولانا مظہر علی اظہر دے سکتے ہیں۔

میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ سر فضل حسین، مولانا مظہر علی اظہر سے ہزار درجہ بہتر ہیں۔ میں مسلمانوں کو سول نافرمانی کا مشورہ نہیں دے سکتا میرا فضل حسین کے پاس جانا مسجد شہید گنج کے سلسلہ میں تھا مجھے اس سلسلے میں چھوٹو رام یا گورنر پنجاب سے بھی ملنا پڑے تو ملوں گا۔"

(روزنامہ "انقلاب" لاہور۔ ۱۲۔ جون ۱۹۳۶ء)

اس جلسے میں دس ہزار کے قریب مسلمان جمع تھے، مگر جلسہ ہنگامے کی نظر ہو گیا۔

جناح کی لاہور سے روانگی

۰ جون کو مسٹر محمد علی جناح نے پارلیمنٹری بورڈ کا جو اعلان کیا تھا، اس کی وضاحت کرتے ہوئے پریس بیان میں کہا۔

"میں نہایت مخلصانہ طریق پر مسلمانانِ ہند سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہو کر لیگ کے امیدواروں کے علاوہ کسی کو ووٹ نہ دیں۔ کیونکہ مسلم لیگ کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو اتحاد و اتفاق کی دولت سے مالامال کرے اور انہیں صوبجاتی ساز باز کرنے والی جماعتوں میں منقسم نہ ہونے دیں۔"

مسلم لیگ کے مقاصد بیان کرتے ہوئے مسٹر جناح نے کہا

۱۔ مسلمانانِ ہندوستان کے مذہبی اور سیاسی اور دوسرے حقوق کی حفاظت کے لیے کوشش کرے

۲۔ ہندوستانی مسلمانوں اور ہندوستان کی دوسری اقوام میں دوستانہ روابط کا قیام۔

۳۔ ہندوستانی مسلمانوں اور دنیا کے ممالک کے مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق کا قیام اور ان کے باہمی تعلقات کے استحکام کی کوشش۔

مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے ممبر بین کونسلوں میں جا کر دستورِ اساسی سے وسیع استفادہ کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ جس طرح ہو سکے قومی زندگی کی حالت کو سدھارنے اور عوام الناس کی ترقی کے لیے کوشش کی جائے۔

مسلم لیگ پارٹی کو جداگانہ انتخاب کے اصول پر قائم ہونا چاہیے۔ مگر یہ پارٹی کونسلوں میں جا کر ایسی پارٹی سے تعاون کر سکے گی، جس کے اغراض و مقاصد لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے منشا سے مشابہت رکھتے ہوں۔

لہٰذا مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ مسلمانوں سے ملتمس ہے کہ اقتصادی اور دوسرے اہم معاملات کے بارے میں دوسروں کا راستہ نہ روکیں۔ اتحاد و اتفاق کے اصول پر کاربند رہیں۔"

مسٹر محمد علی جناح کے اس اعلان کے خلاف روزنامہ "انقلاب" نے ۱۲-۱۴ اور ۱۹ جون کے شماروں میں پارلیمنٹری بورڈ کے خلاف مسلسل اداریے لکھے اور ۲۰ جون کے اداریہ میں لکھا کہ

"مسٹر جناح اور اس کا پارلیمنٹری بورڈ ہندو اور مسلمانوں کی پوزیشن کمزور کرنے کی خواہش رکھتا ہے"۔

بنگالی پارٹی لیگ بورڈ سے الگ ہوگئی

گذشتہ دنوں یونائیٹڈ مسلم پارٹی نے مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ سے اتحاد کر لیا تھا۔ لیکن ۱۵۔ جون کو اس پارٹی کی اکثریت نے الگ ہو کر اور مسٹر فضل الحق و خان بہادر عبدالمومن نے پرجا پارٹی کے قیام کا اعلان کر دیا۔

نینی تال کی ایک اطلاع کے مطابق کر نواب چھتاری اور سر محمد یوسف نے مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ سے اپنا استعفیٰ دے دیا۔ ۱۸۔ جون کو پٹنہ سے ایک مراسلہ اخبارات میں شائع ہوا۔ کہ مسٹر حسین امام بھی پارلیمنٹری بورڈ سے الگ ہو گئے۔

لال ڈھنڈورا

جیسے کہ زیر نظر کتاب کے گذشتہ اوراق میں یہ بات آچکی ہے کہ انقلاب پسند نوجوان ملک کی سیاسی جماعتوں سے الگ تھلگ اپنی ڈگر پر رواں دواں تھے۔ لیڈر بکسوں میں تیزاب ڈالنے کی تحریک پنجاب سے نکل کر ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں پھیل چکی تھی۔ انہی دنوں ایک اشتہار نے حکومت اور عوام کے ساتھ پولیٹیکل جماعتوں کو بھی ہراساں کر دیا۔ اشتہار کا عنوان تھا "لال ڈھنڈورا" اس میں درج ہوتا تھا کہ یہی وقت ہے انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کا۔

یہ اشتہار ریلوے اسٹیشنوں اور لاری اڈوں پر خاص طور سے چسپاں کیے جاتے اشتہار کے نیچے نام درج تھا "رشید حیدر" دراصل اس کا مصنف درگا داس نامی ایک نوجوان تھا، جو ان دنوں لاہور ہسپتال روڈ پر رہتا تھا۔

کمال یہ ہے کہ "لال ڈھنڈورا" اس انداز سے تقسیم اور چسپاں کیا جاتا کہ پولیس کے تمام انتظامات کے باوجود کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی۔

کار سوزی کا سلسلہ ہنوز جاری تھا۔ حالانکہ اس کا ایک مجرم سزا پا چکا تھا۔

سندھ بھی گیا

۱۶۔ جون کو حاجی سیٹھ عبداللہ ہارون کی کوشش سے سندھ یونائیٹڈ فرنٹ قائم کر دیا گیا۔ اور اس کے اغراض و مقاصد وہی تھے جو پنجاب میں یونینسٹ پارٹی

کے تھے۔

سید گیلانی کا استعفیٰ راولپنڈی میں اتحادِ ملت کے سرگرم کارکن سید سرور شاہ گیلانی نے اتحادِ ملت سے مستعفیٰ ہوتے ہوئے اپنے استعفیٰ میں کہا

"اتحادِ ملت کے نزدیک اب حصولِ مسجد نہیں بلکہ کونسلوں کی ممبری زیادہ عزیز ہے۔ ان حالات میں میں اس جماعت سے الگ ہوتا ہوں"۔

حکومتِ پنجاب کا اعلان جون کے دم توڑتے دنوں حکومت پنجاب نے اعلان کیا کہ

"۱۵ جولائی کو مسجد شاہ چراغ[1] مسلمانوں کے حوالے کر دی جائے گی"۔

ایکٹ ۱۹۳۵ء کی منظوری ۲۔ جولائی ۱۹۳۶ء کو لندن سے ملک معظم نے جدید آئین کی منظوری دیتے ہوئے اعلان کیا

"نیا آئین (۱۹۳۵ء) آئندہ یکم اپریل ۱۹۳۷ء سے نافذ کر دیا جائے گا"۔

سکھ لیڈر کا اعلان ۸۔ جولائی سکھ لیڈر ماسٹر تارا سنگھ نے اعلان کیا کہ "جب تک کانگریس شہید گنج کے متعلق سکھوں کی حمایت کا فیصلہ نہیں کرتی میں ہر اس سیٹ پر سکھ امیدواروں کی مخالفت کروں گا، جو کانگریس ٹکٹ پر الیکشن میں حصہ لے گا"۔

سر فضل حسین کا انتقال ۷۔ جولائی کی صبح روزنامہ "انقلاب" نے چوکٹھے میں یہ خبر صفحہ اوّل پر شائع کی کہ

"وزیر تعلیم پنجاب کی سابقہ بیماری پھر سے عود کر آئی ہے۔ قارئین ان کی صحت کے لیے دعا کریں"۔

لیکن ۹۔ جولائی رات ساڑھے دس بجے پنجاب کے وزیر تعلیم اور یونینسٹ پارٹی کے

---

[1] یاد رہے تحریک مسجد شہید گنج کے ابتدائی دنوں میں حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے لاہور شاہی مسجد میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "لاہور میں ایک اور مسجد بھی ہے، جس پر حکومت کا قبضہ ہے وہ مسجد شاہ چراغ ہے۔ وہ بھی آزاد کرانی ہے"۔

رہنما اپنی طویل بیماری (دمہ) کے باعث انتقال کر گئے۔ اِنّا للہ و اِنّا الیہ راجعون۔

انسان نیند میں ہو کہ بیداری کے عالم میں اپنے مستقبل کے کئی محل استوار کرتا ہے۔ میاں سر فضل حسین مرحوم بڑے زیرک سیاستدان تھے۔ اپنے حریف کو شکست دینے کے لیے بساط پر اس انداز سے مہرے چلتے کہ شکست خوردہ نہ تو ہاتھ کی شناخت کر سکتا تھا اور نہ ہی فاتح کو موردِ الزام دے سکتا تھا۔

میاں سر فضل حسین بٹالہ ضلع گورداسپور کے رہنے والے تھے۔ ابتدائی زندگی میں غیر ملکی حکمرانوں کے مخالف رہے اور ۱۹۱۹ء کی مارشل لاء کے دنوں میں مجرم بھی ٹھہرائے گئے تھے۔ مگر اپنی دانشمندی سے اس راہ سے ایسے فرار ہوئے کہ پھر انہیں انگریز کی چوکھٹ پر ہی دیکھا گیا۔ وہ موت تک اسی تگ و دو میں رہے کہ فرنگی راج کو کس طرح دوام حاصل ہو۔ ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت ہندوستان کو صوبائی خود مختاری ملنے لگی تو ان دنوں آپ وائسرائے ہند کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر تھے۔ مگر وزارتِ عظمیٰ کی خواہش لے کر پنجاب آن پہنچے اور اپنے راستے کی تمام دیواریں ایک ایک کر کے گراتے چلے گئے۔ اس طرح انہیں یقین ہو گیا تھا کہ "اب میں ہی ہوں، اور کوئی نہیں"۔ لیکن موت کا ایک دن مُعیّن ہے۔

فطرت انسانی حرکات پر مسکراتی ہے کہ باولا خرد آشنا ہو کر دیوانوں کی طرح صحراؤں میں ریت کے محل تعمیر کر رہا ہے، یہ جانتے ہوئے کہ تند و تیز ہوائیں آنکھ جھپکنے میں ان ریت کے ذرّات کو اڑا لے جائیں گی۔ پھر بھی اپنے ہیولے کے سائے کو پائیدار خیال کرتا ہے۔ اور جب اس دیوار میں دراڑ آنے لگتی ہے تو پھر سہارے ڈھونڈتا ہے۔ مگر تا کجے؟

سر فضل حسین کی موت سے ایوانِ حکومت میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ حکومتِ ہند کے دفاتر بند کر دیے گئے۔ یہ دن حکومت نے ماتمی دن کے طور پر منایا۔ روزنامہ "انقلاب" نے نمازِ جنازہ کی روئداد میں لکھا۔

> "بٹالہ کے نواحی دیہات کے مسلمان بھی اپنے قائدِ اعظم اور اپنے جلیل القدر ہموطن کی آخری عقیدت کے اظہار کے لیے آئے ہوئے تھے۔"

(ضمیمہ روزنامہ "انقلاب" لاہور ۱۲۔ جولائی ۱۹۳۶ء)

یونینسٹ پارٹی کا نیا لیڈر

۱۰ جولائی کو یونینسٹ پارٹی نے اپنے تعزیتی اجلاس میں سر فضل حسین کی جگہ رائے بہادر چودھری چھوٹو رام کو یونینسٹ پارٹی کا عارضی لیڈر منتخب کر لیا۔ نیز سر سکندر حیات کو پنجاب واپس آنے کی درخواست کر دی۔

اس اجلاس کے ساتھ ہی یونینسٹ پارٹی کے اندر خانہ جنگِ اقتدار شروع ہو گئی۔ نواب مظفر خاں اور سر سکندر حیات میں کشمکش تھی کہ پارٹی لیڈر کون بنے؟ سر فضل حسین مرحوم چونکہ وزیر تعلیم تھے، اس پر بھی ٹکراؤ تھا کہ یہ عہدہ کون لے؟ نواب احمد یار خاں دولتانہ وزارتِ تعلیم کے امیدوار تھے۔

مدیرانِ "انقلاب" کو اپنا غم کھائے جا رہا تھا کہ وزارتِ تعلیم کا قلمدان اگر کسی غیر یونینسٹ کے ہاتھ چلا گیا تو ان کا کیا بنے گا؟ چنانچہ انہوں نے ۱۱ جولائی کی اشاعت میں اس پر اداریہ لکھ مارا کہ یہ عہدہ یونینسٹ پارٹی کے ممبر کو ہی ملنا چاہیے۔

مسلمانوں کا قبرستان

مجلسِ احرار کے نزدیک مرزائی چونکہ غیر مسلم تھے۔ اس اعتبار سے ان کا ہر قسم کا مقاطعہ اہم اور ضروری تھا۔ قومی اور ملکی معاملات کے علاوہ موت و حیات کے سلسلے میں بھی احرار کا مؤقف تھا کہ مرزائی کی لاش مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں ہونی چاہیے۔ آخر ۱۹ جولائی کو امرتسر میں بلا کا سنگھ کے قبرستان میں ایک مرزائی کو دفن کرنے پر ہنگامہ ہو گیا۔ پولیس نے اس موقعہ پر مداخلت کی۔ احرار رضاکاروں پر لاٹھی چارج ہوا۔ گرفتاریاں ہوئیں، لیکن آخر کو مرزائی کی لاش ایک دوسرے قبرستان میں دفن کی گئی، جس میں امتیازِ مذہب کے بغیر بچوں کو دفن کیا جاتا تھا۔

اس سے پیشتر ۵ جولائی کو سیالکوٹ میں مدیر انقلاب مولانا عبدالمجید سالک کے والد منشی غلام قادر کا انتقال ہوا تو مقامی احرار کارکنوں نے اس پر قدغن لگا دی کہ وہ انہیں مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں ہونے دیں گے۔ منشی غلام قادر سیالکوٹ میونسپل کمیٹی کے سیکرٹری رہ چکے تھے، لہٰذا میونسپل کمیٹی نے انہیں اپنی تحویل میں لے کر قبرستان سے باہر سڑک کے کنارے دفن کیا۔

احرار اور یونینسٹ کے مابین اختلاف کی لمبی لکیر تھی۔ اس ضمن میں روزنامہ "انقلاب" یونینسٹ پارٹی کا آفیشل آرگن تھا۔ وہ احرار کی ہر بات میں کیڑے نکالنے کا عادی ہو چکا تھا۔

۵ جولائی کے حادثے کو مدیر انقلاب نے ہوا دینا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن امرتسر کے واقعہ کی آڑ میں اپنے دل کا غبار نکالا، گو اس کا روئے سخن دوسرا تھا یعنی احرار کی عسکری قوت! جیسا کہ زیر نظر کتاب کے گذشتہ اوراق میں آچکا ہے کہ احرار نے اپنے دفاع کے لیے رضا کاروں کی تنظیم کو شدت سے محسوس کیا اور اپنا عسکری منظام قائم کیا۔ جب تک احرار رہنماؤں کی پگڑیاں اچھلتی رہیں یہ خوش رہے۔ مگر جیسے ہی احرار رضاکاروں نے سنبھالا لیا۔ اور اپنے سیاسی حریفوں کی گوشمالی شروع کی، تو مدیرانِ انقلاب چیخ اٹھے۔

۱۹ جولائی کے روزنامہ "انقلاب" نے احرار کے خلاف "احرار کی عسکری تنظیم" کے عنوان سے اداریہ لکھ دیا۔

سودیشی نبی کی تلاش ۱۵ جولائی کو حکومت پنجاب کے ایماء پر مقامی پولیس نے لائلپور مجلس احرار کے صدر حکیم نورالدین کے مکان پر چھاپہ مارا۔ انہیں "سودیشی نبی" نامی ایک پمفلٹ کی تلاش تھی، جو مرزا غلام احمد کے خلاف لکھا گیا تھا۔ مگر یہاں سے انہیں اس پمفلٹ کی کوئی کاپی دستیاب نہ ہوئی۔

مسجد شاہ چراغ کی واپسی ۱۷ جولائی کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ حکومت پنجاب نے مسجد شاہ چراغ خالی کر دی ہے۔ لیکن ابھی تک انجمن اسلامیہ نے اسے اپنے قبضے میں نہیں لیا۔ کیونکہ حکومت پنجاب نے مسجد کے سلسلے میں جو شرائط عائد کی ہیں وہ ایسی ہیں کہ انجمن کو منظور نہیں۔ شرط یہ ہے کہ اس مسجد میں کوئی مذہبی یا سیاسی جلسہ یا کوئی دوسری کارروائی نہیں ہو سکتی۔

عبداللہ ہارون کا استعفیٰ ۱۸ جولائی کو شملہ سے اطلاع آئی کہ سیٹھ عبداللہ ہارون نے جو اسمبلی میں مسٹر جناح کے انڈیپنڈنٹ لیڈر تھے۔ مسٹر جناح کی موجودہ پالیسی سے اختلاف کرتے ہوئے مستعفی ہو گئے ہیں۔

امرتسر کے علما کا فتویٰ

۱۹۔ جولائی کو مرزائی کی لاش پر قبرستان میں جو ہنگامہ ہوا تھا اس میں احرار کی تائید میں امرتسر کے علماء نے حضرت مولانا مفتی محمد حسین کی معیت میں اس فتویٰ پر دستخط کیے کہ مرزائی چونکہ غیر مسلم ہیں، انہیں مسلمانوں کے قبرستانوں میں دفن نہیں کیا جا سکتا۔ علماء کا یہ فتویٰ ۲۰۔ جولائی کے جلسۂ عام میں پڑھ کر سنایا گیا جس کی صدارت مولانا عبد الغفار غزنوی کر رہے تھے۔ اس جلسہ میں ۱۹ تاریخ کو قبرستان میں پولیس کے لاٹھی چارج اور رضاکاروں کی گرفتاری پر احتجاج کیا گیا۔

تحریک مدح صحابہ

متحدہ ہندوستان کے یہ دن سیاسی رہنماؤں کی مصروفیت کے اہم ترین دن شمار ہوتے ہیں۔ کانگریس اپنی انفرادی پالیسی کے تحت دوڑ دھوپ میں تھی۔ مسٹر محمد علی جناح مسلم لیگ کے قلب میں نئی روح پھونک رہے تھے۔ جمعیۃ علمائے ہند مسلم لیگ سے تعاون کو اپنے بہتر مستقبل کی سیڑھی سمجھے ہوئے تھی۔ مجلس احرار ہند تحریک مسجد شہید گنج سے زخم خوردہ ہونے کے باوجود پنجاب میں قائداعظم کا سہارا تھی۔ یونینسٹ پارٹی اپنی نہج پر رجعت پسند اور سرمایہ داروں کی نمائندگی کر رہی تھی۔ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں مختلف عنوانات سے ٹوڈی مسلمان غیر ملکی حکومت کی شہ پر الیکشن کے ڈنڑ پیل رہے تھے۔ انہی دنوں یوپی کے شہر لکھنؤ میں تبرا ایجی ٹیشن کے مردے کو قبر سے نکال کر اس میں جان ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ اس ضمن میں مولانا مظہر علی اظہر اپنی کتاب تحریک مدح صحابہ کے صفحہ ۵۸ تا ۶۰ پر لکھتے ہیں۔

> "لکھنؤ کے شیعہ حضرات بھی جانتے تھے کہ مدح صحابہ کی تحریک کو تقویت دینے والی قوت شیعان یوپی کی باہمی کشمکش بھی تھی۔
>
> لاہور سے بعض شیعہ احباب تحریک تبرا کے سلسلہ میں کام کرتے ہوئے لکھنؤ گئے اور لاہور واپس آکر انہوں نے مجھ سے اور دیگر احباب سے دوران گفتگو اس حقیقت کا اظہار کیا کہ اب تو لکھنؤ کے شیعہ حضرات فرماتے ہیں کہ مدح صحابہ کے معاملے میں مہاراجہ محمود آباد اور سر وزیر حسن کے خاندان کی باہمی رنجش کا بھی دخل ہے۔

موجودہ مہاراجہ محمود آباد کے ایک بھائی ہیں، جو وزیر حسن کے خاندان سے قرابتداری کے تعلق رکھتے ہیں جب سابق مہاراجہ محمود آباد وفات پا گئے تو دونوں بھائیوں میں تعلقہ کی وراثت کا قصہ چلا، جس کے سبب سے دونوں بھائیوں اور ان کے طرفداروں میں رقابت ہوگئی۔ موجودہ راجہ صاحب کو، جو مسلم لیگ کے رکن رکین تھے اور ہیں، کامیابی ہوئی اور اس طرح ان میں اور سر وزیر حسن کے خاندان میں ناچاقی ہوگئی۔ ہر دو فریق کے تعلقات سُنّی احباب سے تھے جیسے کہ ہر مقام پر صاحب اثر اور صاحب جائیداد لوگوں کے ہوتے ہیں۔
راجہ محمود آباد نہیں چاہتے تھے کہ وزیر حسن کے فرزند مسٹر علی ظہیر لکھنؤ سے اسمبلی کے ممبر منتخب ہو سکیں۔ اس لیے انہوں نے اپنے دوست چودھری خلیق الزمان کو، جو خود مسلم لیگ کے مقتدر لیڈر تھے، اور یوپی اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر رہیں، سید علی ظہیر کے مقابلے پر کھڑا کیا۔
لکھنؤ کے سُنّی مدّت کی باہمی کشمکش کے باوجود سید علی ظہیر کو اپنا نمائندہ چنتے رہے۔ لیکن اب ان کی شکست کے لیے سنیوں کو ان سے برگشتہ کرنے کی ضرورت تھی۔ اس لیے شیعوں کی باہمی رنجش نے ایک فریق کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ شیعہ سنی کشمکش کو بڑھا کر اپنے حریف کو شکست دیں اور اس بات کا انتظام ہو جائے کہ سنّی علی ظہیر کو ووٹ نہ دیں، بلکہ چودھری خلیق الزمان کے لیے امداد کریں"

حالانکہ صدیوں پرانی اس تحریک کا اب کوئی جواز نہیں تھا۔ لیکن عقل عیّار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے۔ شیعہ عقیدہ رکھنے والوں نے لکھنؤ میں اپنی اکثریت کے مان پر خاندانی رقابت کو استعمال کرنا ضروری سمجھا۔ اہلِ سُنّت نے اپنی جگہ اسلام کے بُنیادی عقیدہ کی محافظت میں خلفائے راشدین کا تحفّظ جزوِ ایمان سمجھا۔ اس کشمکش میں جو ہاتھ پس منظر میں کام کر رہا تھا اسے کسی نے نہ دیکھا۔ مدح صحابہ کی تحریک کیونکر وجود میں آئی اس سلسلہ میں چودھری خلیق الزمان اپنی کتاب "شاہراہِ پاکستان" کے صفحہ ۶۱۴ تا ۶۱۵ پر لکھتے ہیں کہ

"بدقسمتی سے ایک صاحب مقبول احمد نامی رام پور سے ۱۹۰۲ء میں لکھنؤ آئے۔ اور انہوں نے نئے انداز سے شیعوں کو مخاطب کرنا شروع کیا میونسپل اور دیگر انتخابات میں شیعہ سنی سوال کھڑا ہو جاتا تھا، جس سے شیعہ امیدواروں کو ناکامیابی ہوتی تھی۔ اس لیے قدرتی طور پر مقبول احمد صاحب کو اپنے مواعظ میں دبے ہوئے جذبات کو ابھارنے کا اچھا موقعہ مل گیا تھا۔ اور یہ انہی کے مواعظ کا نتیجہ تھا کہ شیعوں کو اعتراض ہوا کہ سنی اپنے تعزیے تال کٹورے شیعہ کربلا میں نہ لے جائیں، کیونکہ سُنی تعزیوں کے ساتھ عشرہ کے دن کچھ ایسے اعمال بھی کرتے ہیں جو محرم جیسے دن کے لیے نہایت قبیح ہیں۔ سنیوں نے اپنی کربلا پھول کٹورا کے نام سے لکھنؤ سے تین میل دور کاکوری روڈ پر ۱۹۰۳ء میں بنالی۔

اس تفریق سے لکھنؤ کے محرم کا رنگ جسے دیکھنے کے لیے ہندوستان بھر سے لوگ آیا کرتے تھے، نسبتاً بہت پھیکا ہو گیا۔

شیعہ کربلا کچھ ویران سی ہو گئی اور سنی کربلا آہ و بکا کے مظاہرے کی بجائے محض تماشا گاہ بن کر رہ گئی۔ مناقشات میں شدت اور تیز ہوئی تو شادی بیاہ بھی شیعہ اور سُنیوں میں بند ہو گئے۔ ملنے جلنے میں بھی آپس میں خلیج حائل ہونے لگی۔ یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے ۱۹۰۸ء میں ایک شیعہ سنی بلوا بھی ہو گیا۔ اور یہ اس شہر میں ہوا، جہاں اس وقت تک کوئی ہندو مسلم فساد بھی نہیں ہوا تھا۔"

اس واقعہ کو مولانا مظہر علی اظہر اپنی کتاب "تحریک مدح صحابہؓ" کے ص ۲۳ تا ۲۹ میں یوں رقمطراز ہیں

"۱۹۰۵ء سے قبل لکھنؤ میں شیعہ سنی اور ہندو اکٹھے مراسم تعزیہ داری ادا کرتے تھے اور مجالس اور جلوسوں میں شریک ہوتے تھے۔ اس زمانے میں لکھنؤ میں باہر سے واعظ آئے، جن میں سے ایک شیعہ عالم کے متعلق سنیوں کو ہمیشہ شکایت رہی کہ انہوں نے اختلاف کی بنیاد ڈالی۔

بہرحال ابتداءً لکھنؤ کے شیعہ اور سنی باہمی کشمکش کے درپے نہ تھے بلکہ جو کچھ ہوا بیرونی اثرات کے تحت ہوا۔ وہ اثرات آمدہ تھے یا آوردہ۔ اس کا اندازہ

مجھ سے بہتر لکھنؤ کے حالات جاننے والے لگا سکتے ہیں۔

۱۹۰۴ء تک شیعہ، سنی اور ہندو تعزیہ کے جلوس میں شامل ہو کر تال کٹورا کی کربلا میں جاتے تھے۔ اس وقت تک کئی پشت سے یہ دستور چلا آتا تھا کہ کچھ لوگ ننگے سر اور ننگے پاؤں جلوس میں شامل ہوتے اور کچھ لوگ سر پر ٹوپی اور پاؤں میں جوتا پہن کر جلوس کے ہمراہ ہوتے تھے۔ اور کربلا تال کٹورا میں جاتے تھے۔

۱۹۰۵ء میں محرم کے موقعہ پر بظاہر شیعوں کے ایماء پر یہ حکم دیا گیا کہ کوئی شخص جو پا برہنہ اور سر برہنہ نہ ہو وہ کربلا تال کٹورا میں داخل نہ ہو سکے گا۔ اس حکم کے ساتھ اور پابندیاں بھی تھیں۔

سنی حضرات نے ان احکام پر الگ ہونے کا فیصلہ کیا۔ یہ بھی تیس برس سے زیادہ مدت کی ایک غلط فہمی ہے کہ سنی حضرات نے ان امور پر الگ ہونے کا فیصلہ کیا۔ بلکہ ۱۹۰۵ء میں جب یہ احکام نافذ ہوئے تو سنیوں نے علیحدگی کا کوئی مطالبہ نہیں کیا بلکہ ۱۹۰۵ء کا محرم جیسے بھی ہوا۔ خواہ سنیوں اور ہندوؤں نے احکام کو پسند کیا یا نہ کیا، امن سے گذر گیا۔

ہ ۔ جس چیز پر سنیوں کو اعتراض تھا وہ یہ تھی کہ کربلا میں ننگے پیر اور ننگے سر جانا چاہیے۔

ہ ۔ فاقے کی سی صورت سب کے لیے بنانا ضروری ہے۔

ہ ۔ جلوس میں سوائے ماتم کے اور کچھ نہیں ہونا چاہیے۔"

غرضیکہ ایسی چیزیں، جن سے جلوس میں خالص شیعہ طریق رسم کا غلبہ ہو ان پر سنی رضامند نہ تھے۔ چنانچہ سنیوں کا ایک وفد ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ انگریز کے پاس ان پابندیوں کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے گیا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ان پابندیوں کے بارے میں معذوری کا اظہار کیا اور ان سے کہا کہ اگر وہ بھی اپنی علیحدہ کربلا کا انتظام کر لیں تو جداگانہ جلوس کا انتظام کر دیا جائے گا۔ چنانچہ سنیوں نے لکھنؤ سے تقریباً آٹھ میل کے فاصلے پر ایک اراضی کا

بطورِ کربلا کے انتظام کیا اور اس کی اطلاع ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو دے دی اور وہاں پر تعزیہ وغیرہ لے جانے کا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے انتظام کر دیا۔

سابقہ کربلا کا نام تال کٹورا تھا اور نئی کربلا کا نام پھول کٹورا رکھا گیا۔ سنیوں اور شیعوں کے دونوں جلوسوں کے لیے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے مختلف راستے اور مختلف اوقات مقرر کر دیے۔ تاکہ باہم تصادم نہ ہو سکے۔ چنانچہ ۱۹۰۶ء میں ہر دو جلوس علیحدہ علیحدہ نکالے گئے۔

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ سُنّیوں کی شیعوں سے علیحدگی اور سنّیوں کے تعزیوں کے لیے نئے راستوں کا تعین اور ان کے لیے نئی کربلا کا تقرر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لکھنؤ کے ارشادِ گرامی کا رہینِ منت ہے۔

یہاں پر صاحبِ فہم یہ دریافت کرے گا کہ کوئی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ایسا اہم قدم اپنی ذمہ داری پر اٹھا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ ایسی تجویز کے لیے صوبہ کی حکومت کی منظوری شرطِ اوّل ہے اور کوئی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ صاحبِ اختیار ہونے کے باوجود حالاتِ موجودہ میں اس قدر اہم تغیر اپنے افسرانِ اعلیٰ کے مشورہ اور ان کی رضامندی کے بغیر نہیں کر سکتا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور یو پی کی حکومت نے ایسا کیوں کیا؟ - یہ وہی بتا سکتے ہیں۔

بنائے فساد ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد انگریز نے ہندوستان کی دو غالب قوموں کے درمیان خلیج حائل کرنے اور انہیں باہم متصادم کرانے کی حکمتِ عملی سے فارغ ہو کر مسلمانوں کو متحارب گروہوں میں تقسیم کرنا بھی اپنی بقا کے لیے ضروری سمجھا۔ چنانچہ قادیانیوں کی تخلیق اور ان کے نئے مذہب کی بنیاد، اس کے ساتھ ساتھ شیعہ سنی اختلاف اور اہلِ حدیث کو لفظ وہابی میں تبدیل کر کے قریباً ڈیڑھ سو سال جو تماشہ انگریز نے متحدہ ہندوستان میں کیا اس کی مثال تاریخِ عالم میں شاید ہی کہیں مل سکے۔

۲۰۔ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو حکومت یو پی نے شیعہ سُنّی اختلاف کو ختم کرنے کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا۔ مسٹر پگٹ اس کمیشن کے صدر تھے۔ اس بنا پر تاریخ میں یہ پگٹ کمیشن کے نام سے

معروف ہے۔ اس نے ، جنوری ۱۹۰۹ء کو اپنی رپورٹ حکومت کے سامنے پیش کی۔ جس میں کہا گیا کہ

۱۔ آئندہ تعزیہ کے جلوس کو شیعہ سُنّی جلوس کی بجائے صرف تعزیہ کا جلوس کہا جائے۔

۲۔ پھول کٹورا اور تال کٹورا جانے والے تعزیے ایک ہی راستے پر چلیں اور آگے جا کر اپنی اپنی کربلا کو چلے جائیں۔

۳۔ عشرہ محرم، چہلم اور ۲۱۔ رمضان کے دنوں مدح صحابہ پر پابندی عائد کر دی اس کی وضاحت میں کہا گیا کہ ان تین دنوں میں کوئی شخص ایسے اشعار یا نظمیں نہ پڑھے، جن میں (حضرت) ابوبکر، (حضرت) عمر اور حضرت عثمان کی تعریف یا مدح کی گئی ہو۔ یہاں تک کہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی نہیں کہہ سکتا۔

۴۔ اشعار یا نظمیں تعزیوں یا کسی اور اسلامی جلوس کے راستے میں نہ پڑھے جائیں۔ اور کسی ایسی جگہ بھی نہ پڑھے جائیں، جہاں سے جلوس تک ان اشعار کی آواز پہنچ سکے۔

۵۔ کسی مجمع یا پبلک مقام پر ایسے مدحیہ اشعار نہ پڑھے جائیں۔

۶۔ اگر کسی شخص نے مذکورہ بالا احکام کی خلاف ورزی کی تو اسے فوراً گرفتار کر لیا جائے گا۔ اور اس پر دفعہ ۲۹۸ یا کسی اور مناسب دفعہ تعزیراتِ ہند کے تحت مقدمہ چلایا جائے گا۔"

پگٹ کمیشن کی تائید میں حکومت یوپی نے حسبِ ذیل بیان جاری کیا۔

"بہت پرجوش سنّی کے لیے بھی اس امر پر استدلال کرنا ممکن نہیں کہ لکھنؤ میں ان کے ہم مذہبوں کو یہ اختیار حاصل ہے کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کی یادگار میں جو جلوس لکھنؤ کی سڑکوں پر نکالے جاتے ہیں اور جن میں شرکت کی اس کو اجازت دی گئی ہے، ان جلوسوں کو بے وقوف اور بلا اختیار حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان کی مدح سرائی کے جلوس میں مبدل کر دے

کمیشن کی اکثریت کی رائے جس سے لفٹیننٹ گورنر کو کلّی اتفاق ہے، یہ ہے کہ اس خرابی کو اس حد تک دور کیا جائے، جہاں تک کہ اس سے کوئی غیر ضروری مداخلت سُنّیان لکھنؤ کے اس حق میں نہ ہو، جو ان کو ہز مجیسٹی کی رعایا ہونے کی حیثیت سے تمام دیگر رعایا کے ساتھ حاصل ہے کہ وہ مناسب مقامات کے اوپر اپنے عقاید کے خصوصی اصولوں کا اعلان کریں۔ اگر سنی گواہان، جن کی شہادت کمیٹی کے سامنے ہوئی ہے ان کا ہر لفظ بھی مان لیا جائے پھر بھی یہ سوال باقی رہے گا کہ جس کی وجہ سے لکھنؤ کے محرم کا طریق کلیتہً بدلنے کا اندیشہ ہے۔ وہ کسی ایسی کارروائی سے رفع ہو سکتی ہے کہ جو تجویز متذکرۃ الصدر سے کم ہو۔
پیراگراف ۱۲: مذکورہ بالا بحث سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ پگٹ کمیشن اور حکومت یو پی نے محض تین ایام یعنی عشرہ محرم، چہلم اور ۲۱۔ رمضان کو مدح صحابہؓ پر پابندی عائد کی ہے۔"

(تحریک مدح صحابہ ص۲۴ تا ۲۵)

اس کے برعکس شیعان لکھنؤ کا مطالبہ تھا کہ ۲۸۔ ذوالحجہ سے ۸۔ ربیع الاول تک، جب تک وہ (شیعہ) مراسم عزہ داری ادا کرنے میں مصروف ہوں مدح صحابہ بالکل بند کر دی جائے۔
مذکورہ بالا واقعات نے ۱۹۳۶ء کے انتخابات میں ایسی شکل اختیار کی کہ ذمہ دار شیعہ حضرات محض الیکشن جیتنے کے لیے کھلم کھلا حالات کے بگاڑ پر اتر آئے۔ اس پر یو پی مجلس احرار نے مداخلت مناسب سمجھی۔ کیونکہ لکھنؤ کے بازاروں میں صحابہ کرام کی توہین ہونے لگ پڑی تھی۔

احرار کی سول نافرمانی

مرکزی مجلس احرار نے یو پی مجلس احرار کی رپورٹ پر اس قضیے پر غور شروع کیا تو اس دوران حالات مزید خراب ہوتے چلے گئے۔ کیونکہ اس کے پس منظر میں شیعہ امراء اور حکومت کی سیاسی ضرورت کارفرما تھی۔ یہ حالات یہاں تک بڑھ گئے کہ اگر کوئی شخص گھر میں یا چار دیواری میں صحابہ کرام کو رضی اللہ عنہ بھی کہے تو اسے بھی گرفتار کر لیا جاتا تھا۔ اکثر احرار کارکن اس سلسلہ میں گرفتار ہوئے۔ لیکن اجتماعی سول نافرمانی یا مدح صحابہ کی تحریک کا کسی کو گمان تک نہیں تھا۔ حکام کو بھی یقین تھا کہ احرار نے شہید گنج میں

سول نافرمانی نہیں کی لہٰذا وہ اس تحریک میں بھی عملی طور پر آگے نہیں آئے گی۔ لیکن یوپی مجلس احرار نے مرکز کے مشورے پر تحریک سول نافرمانی شروع کر دی اور ۱۰۔ جولائی ۱۹۳۶ء کو ذمہ دار احرار کارکن مدح صحابہ پڑھ کر گرفتار ہونا شروع ہو گئے۔ احرار رضا کار حسب ذیل شعر پڑھتے اور انہیں گرفتار کر لیا جاتا۔ ؎

جن کا ڈنکا بج رہا ہے چار سو لیل و نہار
وہ ابوبکر و عمر و عثمان و حیدر چار یار

اس سے پیشتر یہ تحریک جمعیۃ علمائے ہند کی تحویل میں آئینی انداز میں چل رہی تھی یوپی میں جمعیۃ علمائے ہند کا بھی خاصا اثر تھا اور وہ آئندہ الیکشن میں مسلم لیگ سے اتحاد کر رہی تھی۔ لہٰذا اس نے اپنی طاقت کو منتشر کرنا مناسب نہ سمجھ کر یہ تحریک صوبائی مجلس احرار کے سپرد کر دی۔

سکندر حیات کی آمد

بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ سر فضل حسین کی موت کیا ہوئی کہ سر سکندر حیات کے لیے میدان صاف ہو گیا۔ اور وہ جھٹ سے لاہور پہنچ گئے۔ ۲۳۔ جولائی کو یونینسٹ پارٹی کا اجلاس سر سکندر حیات کی صدارت میں منعقد ہوا، جس میں ایک سو پچاس ارکان نے شرکت کی اور تیس کے قریب پنجاب کونسل کے ممبر بھی آئے ہوئے تھے۔ اس اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے سر سکندر حیات نے کہا۔

"سر سید احمد کے بعد، سر فضل حسین دوسرے آدمی تھے۔ اب ان کی موت کے بعد مسلمانوں میں کوئی لیڈر ایسا نظر نہیں آتا، جو ملت کی رہنمائی کر سکے۔"

اس اجلاس میں سر سکندر حیات کو یونینسٹ پارٹی کا مستقل لیڈر منتخب کر لیا گیا۔ اس سے ایک روز پیشتر آپ نے گورنر پنجاب سے ملاقات کر کے یونینسٹ پارٹی سے متعلق مشورہ کیا۔ اور ۲۴۔ جولائی کو سر فضل حسین کی جگہ سر شہاب الدین کو وزیر تعلیم مقرر کر دیا گیا۔ سرکاری طور پر یہ اعلان ۲۶۔ جولائی کے اخبارات میں آیا۔

۲۶۔ جولائی کے روزنامہ "انقلاب" لاہور نے سر سکندر حیات کو پارٹی کا لیڈر نامزد ہونے پر سر سکندر کو قائد اعظم کا خطاب دیا۔ یاد رہے یہی خطاب سر فضل حسین کو دیا گیا تھا۔

متحدہ محاذ

۲۷۔جولائی کو لاہور برکت علی ہال میں احرار اور مسلم لیگ کا پنجاب کے لیے متحدہ محاذ قائم کر دیا گیا۔اس فیصلے میں دونوں جماعتوں کے پارلیمانی ممبر شریک ہوئے۔صدارت میاں عبدالعزیز ایڈووکیٹ نے کی۔بورڈ نے سترہ آدمی مزید پارلیمانی بورڈ کے لیے نامزد کیے۔اس اجتماع میں چندہ فراہم کرنے کے لیے کمیٹیاں بھی بنائی گئیں اور فیصلہ کیا گیا کہ مسلمانوں کی ہر نشست پر محاذ اپنے آدمی کھڑے کریگا۔

کانگریس اور ہندو مہاسبھا

ٹائمز آف انڈیا نے شملہ سے اطلاع دی کہ سر گوکل چند نارنگ صدر ہندو مہاسبھا کی رائے ہے کہ وہ براہِ راست کانگریس سے مقابلہ نہ کرے بلکہ یونینسٹ پارٹی کے امیدواروں کی کانگریس کے مقابل امداد کرے۔اس کے برعکس سندھ کے ہندوؤں نے فیصلہ کیا کہ وہ کانگریس کی سخت مخالفت کریں گے۔اس کے لیے بھائی پرمانند ڈاکٹر مونجے اور دیگر ہندو سبھائی لیڈروں کو سندھ آنے کی دعوت دی گئی ہے۔کانگریس نے سندھ میں ہندو سبھا کا مقابلہ کرنے کے لیے ڈاکٹر خاں صاحب، بابو راجندر پرشاد اور بھولا بھائی ڈیسائی کو سندھ بھیجنے کا فیصلہ کیا۔

مولانا ظفر علی خاں کی تقریر

مجلس اتحادِ ملت کے صدر مولانا ظفر علی خاں نے ۳۰۔جولائی کو پٹنہ میں اخباری نمائندوں سے ملاقات کے دوران کہا:

"ممکن ہے اتحادِ ملت کے طرزِ عمل سے کانگریس کو کوئی غلط فہمی پیدا ہو گئی ہو۔ میں اس غلط فہمی کو واضح الفاظ میں رفع کر دینا چاہتا ہوں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اتحادِ ملت ایسی جماعت پیدا کرنا چاہتی ہے۔جو ہندوستان کے لیے مکمل آزادی کی طرفدار ہو۔مگر اس قسم کی مجلس کا قیام کانگریس کے راستے میں روڑے نہیں اٹکا سکتا۔کیونکہ کانگریس بھی ملک کو آزاد کرانے کے اصولوں پر کاربند ہے اور ہم آخری سمجھوتے کے لیے میدان صاف کر رہے ہیں۔"

(روزنامہ "انقلاب" یکم۔اگست ۱۹۳۶ء)

یونائیٹڈ پریس کی اطلاع

جیسے کہ یہ اطلاع آ چکی ہے کہ ۱۰۔جولائی کو مجلس احرار یوپی نے مدح صحابہ پر پابندی کے خلاف سول نافرمانی شروع کر رکھی ہے

۳۱- جولائی کو لکھنؤ کے مسلمانوں نے دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی میں ایک جلوس نکالا- یہ دفعہ مدح صحابہؓ کرنے والوں پر لگائی گئی ہے- کیونکہ اس سے شیعہ فرقہ کے جذبات مجروح ہوتے ہیں- لیکن مجلس احرار نے اس دفعہ کو قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے سے انکار کر دیا تھا-

جلوس کے دوران ایک گولہ پھٹا جس سے کئی سنی مسلمان زخمی ہوئے- آج کا جلوس چالیس ہزار افراد پر مشتمل تھا- ان میں سے اکثر کو گرفتار کر لیا گیا- شہر میں مسلسل گرفتاریوں کے خلاف بطورِ احتجاج کے کئی روز سے ہڑتال ہے اور کسی قسم کا کوئی کاروبار نہیں ہو رہا-

اسمبلی میں تحریک اُلتوائ

۲- اگست کو مسٹر ستیہ مورتی نے اسمبلی کے اجلاس میں ایک تحریک التوا کا نوٹس دیا کہ

"حکومت نے دیدہ دانستہ ریزرو بنک کے ایک ڈپٹی گورنر (سر سکندر حیات) کو پنجاب میں اپنی پارٹی کے لیے سیاسی پروپیگنڈا کرنے کی کیوں اجازت دی؟"

احرار رہنماؤں کی گرفتاری

۴- اگست کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ آل انڈیا مجلس احرار کے صدر مولانا حبیب الرحمن کو گرفتار کر لیا جائے گا- جبکہ صاحبزادہ فیض الحسن سجادہ نشین آلو مہار کو گرفتار کر لیا گیا ہے-

۴- اگست کے روزنامہ انقلاب لاہور نے یہ خبر شائع کی کہ اس قسم کی افواہ عام ہے کہ یونینسٹ پارٹی کو مزید مضبوط کرنے کے لیے سر سکندر حیات اور ہندو مہاسبھا کے رہنما سر گوکل چند نارنگ کے درمیان کوئی سیاسی سمجھوتہ ہونے والا ہے-

قبل از مرگ واویلا

حکومت پنجاب نے انتخاب کے سلسلے میں ابھی سے تیاریاں شروع کر دی ہیں- خصوصاً یونینسٹ پارٹی کے مخالفین کے لیے ایک سرکلر تمام مجسٹریٹوں کو بھیج دیا گیا کہ وہ الیکشن پروپیگنڈہ کے لیے پوری طرح تیار رہیں- اور اس سلسلے میں اگر انہیں بغاوت کا امکان ہو یا فرقہ وارانہ حالات پیدا ہونے کا خطرہ ہو تو انہیں دبانے کے لیے دفعہ ۱۲۴ الف، ۱۵۳، ۱۰۷، ۱۰۸ ضابطہ فوجداری سے گریز نہ کیا جائے-

تحریکِ رواں

۳- اگست کو لکھنؤ میں چودھری خلیق الزمان نے جلسہ عام کی صدارت کرتے ہوئے حکومت کے اس فعل کی مذمت کی کہ وہ مسلمانوں کو صحابہ کی مدح کرنے

سے روک رہی ہے۔ جلسے کے اختتام پر بیس احرار کارکنوں نے صحابہ کی مدح میں یہ شعر پڑھا۔

ہیں کرنیں ایک ہی مشعل کی بوبکر و عمر، عثمان و علی

ہم مرتبہ ہیں یارانِ نبی کوئی فرق نہیں ان چاروں میں

اس پر انہیں گرفتار کر لیا گیا۔

یوپی پارلیمانی بورڈ کا اجلاس

۴۔ اگست کو لکھنؤ میں مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ کا اجلاس راجہ سلیم پور کی صدارت میں سلیم پور ہاؤس میں ہوا۔ جس میں راجہ محمود آباد، مولانا شوکت علی، نواب اسماعیل خاں اور نوابزادہ لیاقت علی خاں نے خاص طور پر شمولیت کی۔ اجلاس کے شروع میں نوابزادہ لیاقت علی خاں رکن نیشنل ایگریکلچر پارٹی، اجلاس سے واک آؤٹ کر گئے۔

یہ مظاہرہ انہوں نے مسٹر جناح کی موجودہ پالیسی کے خلاف بطور احتجاج کیا۔ کیونکہ اس اجلاس میں فیصلہ ہونے والا تھا کہ ۱۵۔۱۶۔ اگست کو صوبہ بھر کے مسلمانوں کا ایک نمائندہ اجلاس بلایا جائے اور اس اجلاس کے افتتاح کے لیے مسٹر محمد علی جناح کو دعوت دی جائے۔

بورڈ میں اس فیصلے پر سخت اختلاف پایا گیا۔ اس اجلاس میں یہ افواہ بھی گشت کر رہی تھی کہ راجہ سلیم پور اور راجہ محمود آباد نے نیشنل ایگریکلچر پارٹی سے مستعفی ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

(یونائیٹڈ پریس ۵۔ اگست ۱۹۳۶ء)

بنگال کے ہندوؤں کو جواب

بنگال کے ہندوؤں نے گذشتہ کئی ماہ سے کمیونل ایوارڈ کے خلاف تحریک شروع کی ہوئی ہے کہ انہیں اس قانون سے سخت نقصان پہنچنے کا احتمال ہے، لہٰذا اسے فوراً بدل دیا جائے۔ اس کے لیے ہندوؤں کا ایک وفد بھی انگلستان گیا کہ وزیرِ ہند سے مل کر یہ درخواست کریں۔ لیکن ۴۔ اگست کو بنگال کے گورنر کی طرف سے اس کا جواب وصول ہوا۔

"وزیرِ ہند نے کہا ہے کہ ملکِ معظم کی گورنمنٹ کمیونل ایوارڈ میں کوئی تبدیلی نہیں کرے گی۔ اور وہ اپنی پالیسی پر قائم ہے۔"

مدراس کے مسلمان

مدراس کے مسلم اکابر کی ایک کانفرنس ۷۔ اگست کو منعقد ہوئی۔ اس میں ایک ممبر کی یہ تجویز دیر تک زیر بحث رہی کہ اس جماعت کے رکن کسی غیر مسلم پارٹی کے ساتھ اتحاد نہ کریں۔ مگر اس تجویز کی سخت مخالفت کی گئی اور کہا گیا کہ مسلمانوں کا فائدہ اسی میں ہے کہ وہ اپنے سیاسی فائدے کے لیے مشترک پارٹیوں میں شریک ہوں۔ مذہب یا فرقہ کی بنا پر پارٹی بنانا سراسر نامناسب ہوگا۔ (روزنامہ انقلاب ۹۔ اگست ۱۹۳۶ء)

نوابزادہ لیاقت علیخاں کا استعفیٰ

۷۔ اگست کو نوابزادہ لیاقت علی خاں نے حسب ذیل بیان کے ذریعے مسلم لیگ کے منتخب پارلیمنٹری بورڈ سے مستعفی ہونے کا اعلان کر دیا۔

"مسٹر جناح نے پارلیمنٹری بورڈ میں صرف ایک خیال کے لوگوں کو کثرت سے بھر دیا ہے، جن کا کوئی وقار قوم میں نہیں ہے اور ان لوگوں کو نظر انداز کر دیا ہے جو مسلمانوں کے اصل لیڈر ہیں۔ اور انتخاب میں الیکشن کے ذریعے آئے ہیں۔ میرا ایسے بورڈ میں ہونا فضول ہے، جس میں اکثریت اس ایک پارٹی کے ممبران کی ہو، جو عرصہ دراز سے مسلمانوں سے دور ہیں۔ اور اپنے اپنے پٹھوؤں کو لیگ کا ٹکٹ دلوا کر مسلمانوں میں رخنہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ آپس میں طے کر کے ایک ساتھ ووٹ دیتے ہیں۔ اس لیے میرا اس بورڈ کا ممبر ہونا بیکار ہے۔ میں اس میں شریک نہیں رہ سکتا۔ اور اس کو ملک و ملت کے خلاف سمجھتا ہوں۔ لہٰذا میں استعفیٰ دیتا ہوں۔" ("نامۂ اعمال" حصہ اول ص ۶۹۳-۶۹۴)

بے بنیاد افواہیں

انتخابات کے دنوں اور زمانہ جنگ میں عوام پر اثر انداز ہونے کے لیے افسانے اور جھوٹ کی عمارت استوار کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ یہ ایک ایسا فن ہے، جس میں دلائل سے زیادہ عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر جھوٹ بولنے والا دانشور ہو تو افترا کے تمام تلغے حقیقت معلوم ہونے لگتے ہیں۔ سراب دور سے سمندر دکھائی دینے لگتا ہے لیکن قریب پہنچ کر ریت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

ہنوز انتخابات میں چھ ماہ کا عرصہ پڑا تھا، مگر یار لوگوں نے افواہوں کی ایسی آندھیاں اٹھائیں

کہ سچائی بیٹھ کر رہ گئی۔ کاغذ کے پھولوں پر ایسا عطر چھڑکا کہ لالہ و گل شرم محسوس کرنے لگ پڑے۔ انسانے پر حقیقت کا ایسا رنگ چڑھایا کہ وہ حقیقت معلوم ہونے لگا۔

اس ضمن میں اگست کے وسط کی دو خبریں ملاحظہ ہوں۔

"نئی دہلی کی اطلاع — دہلی کے مقتدر لیڈروں (نام کسی کا نہیں بتایا گیا) دیگر مسلم زعماء کے نام ایک خط لکھا کہ ہزہائی نس سر آغا خاں کی زیر صدارت ایک اور آل انڈیا مسلم کانفرنس کے انعقاد کی تجویز کی گئی ہے۔ اس ضمن میں کہا گیا ہے کہ سر آغا خاں نے یہ جواب دیا ہے: "میں مسلم قوم کی خدمت کے لیے ہر وقت تیار ہوں مگر میں مسلمانوں کو ایسی کانفرنس طلب کرنے کی دعوت کو حق بجانب قرار نہیں دیتا۔ اگر سر سکندر جیسا مقتدر لیڈر اور دوسرے بارسوخ پنجابی، سندھی، بنگالی اور سرحدی مسلمان قائدین جنہیں انتخابات کے بعد اکثریت کا یقین ہو۔ اگر ایسی کانفرنس کے انعقاد کی دعوت دیں تو میں یقیناً کانفرنس میں شریک ہوں گا۔"

لاہور۔ ۱۲ اگست پنجاب مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ خطرات سے دوچار ہے۔ سر محمد اقبال نے جو بورڈ کے صدر ہیں اپنا استعفیٰ پیش کر دیا ہے۔ بورڈ کا ایک اجلاس پنج شنبہ کے دن طلب کیا گیا ہے تاکہ صورت حال پر غور کیا جا سکے۔

اندازہ کیا جا رہا ہے کہ اس صورت حال کے پیچیدہ ہونے کی اصل وجہ یہ ہے کہ مسلم لیگ اور احرار کے ارکان میں اس قدر اختلاف رائے پیدا ہو گیا ہے۔ احرار کی رائے ہے کہ جس حلقۂ انتخاب میں کامیابی کی امید ہو وہاں بورڈ کے ٹکٹ پر احرار اپنا نمائندہ کھڑا کرے۔ احرار کی اس تجویز سے شبہ ہو رہا ہے کہ مسلم لیگ کو لاہور کے صرف دو حلقوں تک محدود رہنا پڑے گا۔ باقی شہری حلقے احرار اپنے پاس رکھے گی اور اس بارے میں بورڈ کے ٹکٹ سے فائدہ اٹھائیں گے۔"

(روزنامہ "انقلاب"۔ ۱۴-۱۲ اگست ۱۹۳۶ء)

مندرجہ بالا دونوں خبروں سے اندازہ کرنا کوئی مشکل نہیں کہ رجعت پسند طبقہ اور ان کی صحافت ان دنوں برطانوی استعمار کے مستقبل کی ضمانت کس طرح فراہم کر رہے تھے۔ حالانکہ

تاریخ کے کسی گوشے میں سر آغا خاں کا مندرجہ بالا خط یا اس کا کوئی مفہوم نہیں ۔۔۔ اور نہ ہی اس وقت تک احرار کے ذہن میں ایسی کوئی تجویز تھی ۔ لیکن جھوٹ بنانے والوں کے قربان جائیے کہ محض اپنے دانے دنکے کے لیے شفاف پانی کو کس طرح گدلا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے ۔

حکومت حجاز کو تشویش زعمائے احرار نے حکومت حجاز کے برطانوی کمپنیوں سے کان کنی کے معاہدے پر جس تشویش کا اظہار کیا تھا اور انہیں جس طرح کے خدشات تھے ، حسب ذیل خبریں اس کی تائید کرتی ہیں ۔

○ " حکومت برطانیہ جزیرہ بحرین کے شیوخ کو متحد کرنے اور انہیں ایک نظم میں منسلک کرنے میں لگی ہوئی ہے ۔ حکومت حجاز کو برطانیہ کے اس اقدام سے سخت تشویش پیدا ہو گئی ہے ۔ سلطان ابن سعود نے اس جدید صورت حال پر غور کرنے کیلئے اپنی سلطنت کے امراء کی مجلس مشاورت طلب کی ہے ۔ اس میں شیوخ کے اس اتحاد کے نتائج پر سرحدی مسائل کی روشنی میں غور کیا جائے گا "

○ " امیر بحرین شیخ احمد بن علی نے انگلستان کا ایک وسیع سفر کر کے واپس بحرین پہنچ گئے ہیں ۔ اگرچہ امیر بحرین کا یہ سفر پرائیویٹ حیثیت رکھتا ہے لیکن معلوم ہوا کہ اس سفر میں امیر بحرین کے اور برطانیہ کے مقتدر رہنماؤں کے ساتھ ملک کو زیادہ پر رونق بنانے کے امکان پر بحث کی گئی ہے ۔

مزید برآں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ امیر کے ایک بلند حوصلہ رشتہ دار نے ایک نہایت ہی وسیع پیمانے پر پریس لگانے اور ایک روزنامہ شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے ۔ جس کے لیے مشرق سے خاص طور پر ایک اخبار نویس کو بلایا گیا ہے تاکہ پروپیگنڈہ کا کام شروع کر دیا جائے " (روزنامہ انقلاب ۔۔۔ ۱۹۳۔)

پنجاب پارلیمنٹری بورڈ کا اجلاس لاہور ۔ ۱۲ اگست کو برکت علی محمڈن ہال میں پراونشل مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کا اجلاس ملک برکت علی کی صدارت میں ہوا جس میں تقریباً چالیس افراد نے شرکت کی ۔ جن میں سے کچھ نام یہ ہیں ۔

لہ ۔ ان دنوں مصر پہ انگریز کا اثر تھا ۔ ۲ ۔ (ابھی دیکھئے اور کیا ہوتا ہے ۔ مصنف)

غلام رسول خاں ایڈووکیٹ، سید عطاء اللہ شاہ بیرسٹر جالندھر، ملک محمد دین ایڈووکیٹ خان بہادر ملک زمان مہدی خاں، میاں عبدالعزیز ایڈووکیٹ، میاں عبدالمجید بیرسٹر، ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین بیرسٹر، شیخ غلام حیدر ایڈووکیٹ، شیخ اکبر علی ایڈووکیٹ، چودھری افضل حق ایم ایل اے (احرار) شیخ حسام الدین بی اے (احرار) میر عبدالقیوم پلیڈر (احرار) صاحبزادہ فیض الحسن سجادہ نشین آلو مہار (احرار) چودھری عبدالعزیز بیگھو والیہ (احرار) خواجہ غلام حسین ایڈووکیٹ لائلپور (احرار) مولانا مظہر علی اظہر ایڈووکیٹ (احرار)۔

اجلاس کے ابتدا میں ڈاکٹر اقبال کی ایک چٹھی پیش کی گئی، جس میں ان کے استعفیٰ کا کوئی ذکر تک نہیں تھا۔ بلکہ اخبار انقلاب کی خبر کو غلط قرار دیا گیا تھا۔ اجلاس میں ایک سب کمیٹی ترتیب دی گئی۔ جس کے ذمہ تھا کہ وہ امیدوارانِ اسمبلی کے حلف نامے کا مسودہ تیار کرے۔ اس کمیٹی میں ڈاکٹر اقبال، ملک زمان مہدی، غلام رسول، چودھری افضل حق اور مولانا مظہر علی اظہر شامل تھے۔ لیکن بعد میں چار مزید ممبران کا اضافہ کیا گیا، جن میں مولانا حبیب الرحمٰن، میاں عبدالمجید، ملک برکت علی اور عاشق حسین بٹالوی تھے۔ (مسلم نیوز سروس)

مولانا ابوالکلام آزاد کا جواب

تحریک مسجد شہید گنج کے سلسلے میں منتخب امیر پیر جماعت علی شاہ کے حج پر چلے جانے کے بعد ماہِ رواں کے پہلے ہفتے شاہی مسجد لاہور میں ایک جلسے کے دوران مسٹر عزیز ہندی نے امیر ملت کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد کا نام تجویز کیا تھا۔ اس کے جواب میں مولانا آزاد نے عزیز ہندی کے نام حسب ذیل مراسلہ ارسال کیا۔

"لاہور کے اخبارات سے معلوم ہوا کہ بعض حضرات نے ایک جلسہ میں یہ تجویز پیش کی ہے کہ کوئی امیر منتخب کرنا چاہیے۔ اور اس کے لیے میرا نام پیش کیا گیا ہے۔ میں ان صاحبوں کا شکر گذار ہوں لیکن انہیں بتانا چاہتا ہوں کہ اس طرح مسائل حل نہیں کیے جا سکتے۔ البتہ ایک بات ضرور کی جا سکتی ہے، یعنی ان کی ہنسی اڑائی جا سکتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان حضرات کو اس کا خواہش مند نہیں ہونا چاہیے۔

ان صاحبوں کو شاید معلوم نہیں کہ میں اب سے پندرہ برس پہلے نہ صرف اس پر غور و فکر کر چکا ہوں، بلکہ بطور ایک انتہائی تجربے کے ایک صوبے میں

اسے قائم بھی کر چکا ہوں۔ بایں ہمہ ۱۹۱۲ء میں مجھے یہی رائے قائم کرنا پڑی کہ موجودہ حالات میں اس طرح کے کسی نظام کی مزید سعی سودمند نہ ہوگی۔

بہر حال اگر میری رائے سے انہیں اتفاق نہ ہو تو ایک بات انہیں یاد رکھنی چاہیے۔ وہ یہ کہ اس سلسلے میں میرا نام نہ تجویز کیا جائے۔

(ابوالکلام آزاد کلکتہ ۔۱۳۔ اگست ۱۹۳۶ء)

حلف نامہ

مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کی طرف سے اسمبلی میں جانے والے ممبران یا الیکشن میں بطور امیدوار کے حصہ لینے والوں کے لیے حسب ذیل حلف نامہ تیار کیا گیا۔

ا۔ بخدمت آنریری سیکرٹری پرونشل مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ لاہور میں اپنے کو آئندہ اسمبلی کے انتخابات کے لیے حلقہ ۔۔۔۔۔۔ کے لیے پیش کرتا ہوں۔

ب۔ میں مبلغ پچاس روپے بذریعہ منی آرڈر یا چیک یا نقد اس درخواست کے ساتھ بھیجتا ہوں۔

ج۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ پنجاب پرونشل مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے فیصلے کا اپنی نامزدگی کے متعلق پابند رہوں گا۔

د: میں حلفاً اقرار کرتا ہوں کہ میں آل انڈیا مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے پروگرام کو منظور کرتا ہوں اور ہر ممکن طریقے سے اس پروگرام کو کامیاب بنانے کی کوشش کروں گا۔

س۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ پنجاب پرونشل مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ نے مجھے آئندہ کے لیے اپنا امیدوار نامزد نہ کیا تو میں کسی اور پارٹی کے ٹکٹ پر یا اپنے طور پر اسمبلی کے انتخاب کا خواہاں نہیں ہوؤنگا۔

و۔ میں اقرار صالح کرتا ہوں کہ میں اپنی حیثیت میں اسلامی اوقاف کی حفاظت حسب شریعت کروں گا۔

ہ۔ میں اقرار صالح کرتا ہوں کہ میں ہر ممکن طریق سے مسجد شہید گنج کی واگذاری کے لیے کوشاں رہوں گا۔"

جب تمام حلف نامہ پڑھ کر سنایا گیا تو مولانا حبیب الرحمٰن نے اعتراض اٹھایا کہ اس میں ایک اور شق بڑھا دیجئے کہ:

"مسلم لیگی امیدوار کو اقرار صالح کرنا چاہیئے کہ وہ اسمبلی میں جاکر مرزائیوں کو مسلمانوں سے خارج کرا کے ایک علیحدہ اقلیت قرار دیئے جانے کی پوری کوشش کرے گا۔"

اس موقعہ پر مسلم لیگی پارلیمنٹری اجلاس میں کیا ہوا۔ اس کی روئداد عاشق حسین بٹالوی اپنی کتاب اقبال کے آخری دو سال کے صفحہ ۴۴۸۔۴۴۹ پر لکھتے ہیں۔

"سچی بات یہ ہے کہ مولانا حبیب الرحمٰن نے نئی شق پیش کر کے ہمیں حیران ہی نہیں پریشان کر دیا تھا۔ ہم میں سے کوئی شخص مرزائیت یا غیر مرزائیت کے جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ یوں بھی مسلم لیگ جیسی قومی اور سیاسی جماعت سے توقع رکھنا کہ مرزائیت کے بارے میں اپنے عقیدے کا اعلان کرے، ایک لایعنی بات تھی۔

اس اجلاس کی صدارت زماں مہدی خان کر رہے تھے۔ انہوں نے مولانا حبیب الرحمٰن سے کہا کہ بے سود جھگڑا نہ کیجئے۔ یہ نئی شق پیش کرنے کا یہاں کیا موقعہ محل ہے؟ اس پر مولانا حبیب الرحمٰن نے کہا، جس طرح مسجد شہید گنج کی بازیابی آج پنجاب کے تمام مسلمانوں کا متفقہ مطالبہ ہے۔ اسی طرح یہ بھی متفقہ مطالبہ ہے کہ مرزائیوں کو مسلمانوں سے خارج کر کے ایک علیحدہ اقلیت قرار دیا جائے۔ اگر آپ کو میری بات پر یقین نہیں، تو چلیے اسی وقت ہم موچی دروازہ کے باغ میں ایک جلسۂ عام کر کے مسلمانوں سے استصواب کرا لیتے ہیں۔

مولانا کی یہ رائے درست تھی۔ احرار نے سالہا سال کے پروپیگنڈے سے عام مسلمانوں میں مرزائیت کے خلاف سخت نفرت پیدا کر دی تھی۔ اگر اس امر سے متعلق کسی جلسۂ عام میں استصواب کیا جاتا تو مسلمان یقیناً مرزائیت کے خلاف رائے دیتے۔ چنانچہ مجبوراً غلام رسول خاں کو حلف نامہ میں ایک نئی شق کا اضافہ کرنا پڑا۔ یعنی

"میں اقرار صالح کرتا ہوں کہ اگر میں آئندہ پنجاب اسمبلی میں نامزد ہو کر کامیاب ہو گیا تو اسلام اور ہندوستان کے مفاد کی خاطر مرزائیوں کو دیگر مسلمانوں سے ایک علیحٰدہ اقلیت قرار دیے جانے کی انتہائی کوشش کروں گا"

یہ ۲۴۔اگست کے اجلاس کی کارروائی ہے۔

دوسرے روز غلام رسول خاں حلف نامہ کا مسودہ لے کر علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہیں سارا واقعہ کہ سنایا تو ڈاکٹر صاحب نے مرزائیت کے متعلق نئی شق بڑھائے جانے پر کسی تعجب کا اظہار نہ فرمایا اور نہ ہی کوئی اعتراض کیا۔

پارلیمنٹری بورڈ کی نئی شرائط

۲۵۔اگست کو مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے اجلاس میں گذشتہ اجلاس کی کارروائی کی تصدیق کرتے ہوئے امیدواروں کو نئی شرائط پیش کر دی گئیں کہ جو شخص پارلیمنٹری بورڈ کے ٹکٹ پر اسمبلی کے لیے کھڑا ہونا چاہے وہ اپنی درخواست کے ساتھ ایک سو پچاس روپے پیش کرے۔ اگر اس کی درخواست منظور نہ ہو تو یہ رقم اسے واپس نہیں کی جائے گی۔ نیز جس کی درخواست منظور ہو جائے اس سے ایک مہینے کے اندر اندر پانصد روپیہ فنڈ کے طور پر وصول کیا جائے گا۔

مسلم لیگ بورڈ کے اس نئے فیصلے پر احرار ممبران نے ترمیم کرتے ہوئے ایک سو پچاس کی بجائے ایک سو روپیہ وصول کرنے کی تجویز پیش کی۔ جسے اجلاس کی اکثریت نے نامنظور کر دیا۔

چودھری افضل حق: یہ پانصد روپے کس مقصد کے لیے جمع کرائے جائیں؟

غلام رسول: بورڈ کے تمام امیدواروں کے الیکشن کے سلسلے میں مختلف قسم کے اشتہارات اور پمفلٹ شائع کرنے ہوں گے۔ مسلم لیگ کے امیدواروں کی حمایت کے لیے مسلم لیگ کے لیڈروں کو ان کے انتخابی حلقوں میں دورہ کرنا ہو گا۔ آخر ان تمام کاموں کے لیے روپیہ کہاں سے آئے گا۔

چودھری افضل حق: پانصد روپیہ صرف اشتہاروں اور پمفلٹوں کے لیے اور الیکشن کے لیے رقم الگ ہو گی؟ مگر پانصد روپیہ میں میں تمام الیکشن لڑ سکتا ہوں۔ گذشتہ انتخاب میں میں نے اپنے حلقے میں کام کرنے والے کارکنوں کو دو صد روپیہ دیا تھا۔ انہوں نے آخر میں مجھے تیس روپے

واپس کر دیئے تھے۔

اس اجلاس کے اختتام پر چودھری افضل حق نے ایک پریس بیان میں کہا۔

"بورڈ کی نئی شرائط نے احرار کو الجھن میں ڈال دیا ہے۔ احرار مخلص اور درمیانے طبقے کی نمائندہ جماعت ہے۔ مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ نے جس قدر روپے کا مطالبہ کیا ہے احرار اس کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ بہرحال جماعت بورڈ کی نئی شرائط پر غور کرے گی"

احرار کی پارلیمنٹری بورڈ سے علیحدگی

تقسیم کائنات میں فطرت نے جن اصولوں کو نمایاں طور پر اپنایا ہے ان میں ــــــ تواناؤں اور ناتوانوں کے درمیان ایسی حدِ فاصل قائم کر دی گئی ہے کہ ان حدود کو توڑنا یا انہیں پھاندنے کی کوشش کرنا نظامِ خداوندی میں مداخلت کے مترادف سمجھا جائے گا۔ نہ تو غریب کا دل امیر سے مطابقت رکھتا ہے اور نہ ہی دولت مند کا ضمیر، غریب سے قرابت داری پسند کرتا ہے۔ جس طرح دریا آب جُو میں نہیں سما سکتا یا سمندر، دریا کی روانی کو خاطر میں نہیں لاتا، عین اسی طرح غریب اور امیر کے خانے جُدا جُدا مٹی سے تعمیر کیے ہیں۔ زندگی کے سفر میں کہیں اگر ان اصولوں میں ملاپ ہو جائے تو اس کی عمر اتنی مختصر ہوتی ہے جتنی کہ شبنم کی پھول کی پتی پر۔ جیسے ہی سورج کی پہلی کرن آنکھ کھولتی ہے یہ آبگینہ پانی پانی ہو کر بہہ جاتا ہے۔

لوہا اور لکڑی ایک ساتھ سطحِ آب پر نہیں تیر سکتے۔ دونوں چند لمحے ایک ساتھ چلتے ہیں، لیکن آخر کو یہ ساتھ ٹوٹ جاتا ہے۔

ایمان اور دولت جب ایک جگہ جمع ہو جائیں تو دونوں میں سے ایک کی موت لازمی ہے۔ ورنہ زمانے کی نظروں میں دونوں مشکوک ہو جائیں گے۔ دونوں کا چلن روایات کے خلاف بغاوت سمجھا جائے گا۔ اگر ان میں نبھا ہو سکتا تو داعیِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم، فقر کے ضابطے پر سختی سے پابند رہنے کی تاکید نہ کرتے اور نہ ہی زکوٰۃ کو اسلام کے ارکان میں شامل کیا جاتا۔ یہی دلیل کافی ہے کہ امیر اور غریب دو الگ الگ دھڑے ہیں۔

سرمایہ دار کے اصولوں میں غریب کے لیے کوئی لچک نہیں۔ مساوات تو دور کی بات ٹھہری مزاج کا باہمی رنگ بھی نہیں ملتا۔ ذاتی اغراض ہوں تو سرمایہ دار موسمی ہواؤں کی طرح مل کی گرمیوں

میں اتر جاتا۔ لیکن ضرورت نہ ہو تو فرعون کے سنگھاسن پر بیٹھ کر خدائی دعوے کرنے لگتا ہے۔

مجلسِ احرار نے مسلم لیگ کو پنجاب میں اس وقت سہارا دیا، جب یونینسٹ پارٹی اس کے وجود سے بھی انکاری تھی۔ لاہور میں مسٹر محمد علی جناح کا ہر میزبان منافقانہ چال چل رہا تھا۔ ان کے دل قائداعظم کے ساتھ نہیں تھے۔ ان کا ایک قدم مسلم لیگ اور دوسرا یونینسٹ پارٹی کے دفتر میں ہوتا۔ سروں اور خان بہادروں کا یہ ٹولہ سر فضل حسین اور انگریز کے اشارے پر قائداعظم کا سیاسی حریف تھا۔ یہاں تک کہ انہیں لاہور میں جلسہ کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ ایسے وقت میں احرار رضاکاروں نے قائداعظم کا حوصلہ بڑھایا، ان کے راستے کے تمام کانٹے صاف کیے۔ جب زمین ہموار ہو گئی تو کرگس، شہباز کا لبادہ اوڑھے پرواز کرنے لگے۔

احرار کا خلوص انہیں راس نہ آیا۔ مفلس مگر ایثار پیشہ لوگوں کا تعاون رجعت پسند امراء کے لیے وبالِ جان بن گیا اور ہر گھڑی انہیں اپنی محفل سے اٹھانے کی تدبیریں سوچنے لگے۔ مولانا حبیب الرحمٰن کا یہ اعتراض کہ حلف نامہ میں مرزائیت کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی شق کا اضافہ کیا جائے، اس گروہ کے لیے پہلا بہانہ تھا۔ نمبر دو یہ کہ درخواست کے ساتھ پچاس روپے پھر ایک سو پچاس روپے اور پھر امیدوار کے لیے مزید پانصد روپے فنڈ میں جمع کرانے کی نئی تجویز صاف ظاہر کرتی ہے کہ یہ بہانہ تھا کہ احرار کے پاس نہ اس قدر سرمایہ ہوگا، نہ ہمارے ساتھ چل سکیں گے۔ لامحالہ وہ پارلیمنٹری بورڈ سے الگ ہو جائیں گے۔

اُمراء کی اس سازش سے احرار نے دل برداشتہ ہو کر چار ماہ مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ میں رہنے کے بعد ۳۰۔ اگست ۱۹۳۶ء کو بورڈ سے علیحدگی اختیار کر لی۔ آل انڈیا احرار ورکنگ کمیٹی نے اس علیحدگی کی وضاحت میں حسبِ ذیل بیان پریس کو دیا۔

"گذشتہ ماہ مئی میں احرار ورکنگ کمیٹی نے مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ سے تعاون کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس وقت سے احرار نے مسلم لیگ بورڈ سے پورا پورا تعاون کیا۔ بورڈ کے دوسرے گروپ کی اس حرکت کی مخالفت بھی نہ کی کہ وہ بورڈ میں اپنا پریذیڈنٹ وائس پریذیڈنٹ اور سیکرٹری بھی اپنا بنانا چاہتے تھے۔ لیکن بتدریج چند دوستوں نے ایسی صورتحال پیدا کر دی، جس نے احرار کو تمام مسائل پر از سرِ نو غور کرنے پر

مجبور کر دیا۔ آغاز میں بھی ہمارے لیگ کے دوستوں نے پروفنشل بورڈ کی بہت سی نشستیں لاہور کے لیے ہی مخصوص کر دی تھیں۔ جب کہ بورڈ میں لاہور کی نمائندگی پہلے ہی زیادہ ہے۔ لیکن بورڈ میں مزید ایک یا دو احرار ممبر کے لیے انکار کر دیا گیا۔ تمام حلقوں سے ایک یا دو ممبر لینے کی تجویز کی گئی تھی۔ احرار ممبروں نے اس سکیم پر بھی رضامندی ظاہر کر دی۔ حتی کہ ڈیرہ غازیخان، مظفر گڑھ، راولپنڈی اور دوسرے دور افتادہ اضلاع سے اشخاص کے نام تجویز کیے۔ یہ تجویز سراسر زیادتی سمجھی گئی۔ حالانکہ پہلے ہی دوسرے گروپ کی غالب اکثریت تھی۔

احرار کارکن ہر مقام پر لیگ کے ٹکٹ پر اپنے امیدوار کھڑا کرنا چاہتے تھے اور انہوں نے پنجاب کے ہر حصے میں پروپیگنڈہ کیا لیکن دوسرے گروپ کے ارکان نے لیگ بورڈ میں ایسا عناصر داخل کر لیا۔ جس نے مجلس احرار کے خلاف کھلم کھلا پروپیگنڈہ کرنا شروع کر دیا اور بورڈ سے احرار کے اخراج کا مطالبہ ہونے لگا۔

۱۴ اگست کو مختلف امور پر غور کے لیے بورڈ کی میٹنگ بلائی گئی۔ تمام نئے ممبروں کی نامزدگی کا سوال ایجنڈے کے آخر میں تھا تاہم جن اشخاص کو بورڈ میں لیا جانا تھا، ان کی فہرست جو صدر کی طرف بھیجی گئی پہلے اس پر غور کیا گیا۔ حالانکہ وہ ایجنڈے کی آخری شق تھی۔ اور یہ فہرست پاس کر دی گئی۔ احرار ممبران اس وقت موجود نہ تھے، وہ ذرا دیر سے آئے۔ کیونکہ میٹنگ کا وقت پانچ بجے تھا۔ لیکن یہ حضرات ساڑھے چار بجے ہی فیصلہ کر چکے تھے۔ اس جگہ یہ امر قابل ذکر ہے کہ گذشتہ میٹنگ میں احرار ممبران نے دوسرے ممبروں کے لیے اکتالیس منٹ انتظار کیا تھا۔

صدر والی فہرست میں اٹھاون ممبر تھے، جن میں انتالیس صرف لاہور کے تھے حالانکہ بورڈ میں لاہور کے ممبران کی پہلے ہی اکثریت تھی۔

بورڈ میں اس پر بھی مزید اضافہ کیا گیا کہ بورڈ ممبری کی فیس ۵۰۰ روپے درخواست دینے والے سے اور امیدوار سے ایک سو پچاس روپے اور نامزد امیدوار کے لیے

پانصد روپے مقرر کر دیے گئے۔

احرار نے اس کمیٹی کی میٹنگ میں، پھر بورڈ کی میٹنگ میں صاف طور پر کہہ دیا کہ احرار ممبران یا امیدوار اس بوجھ کو برداشت کرنے کے ناقابل ہیں۔ مگر دوسرے گروپ کے ارکان نے اعلان کر دیا کہ جو اتنی رقم ادا نہیں کر سکتے، ان کو اسمبلی کی ممبری کے لیے کھڑے ہونے کا کوئی حق نہیں۔ بدیں حالات احرار ورکنگ کمیٹی کافی غور کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہے۔

۱۔ گذشتہ چار مہینے عملی طور پر ضائع کیے گئے ہیں۔ اس وقت بھی اگر بورڈ سے قطع تعلق نہ کیا گیا تو اس سے قوم کے نقصان کے علاوہ مزید وقت ضائع ہونے کا احتمال ہے۔

۲۔ یہ کہ چند اشخاص جو کہ غالباً الیکشن کے لیے کھڑے نہیں ہوں گے، صرف اس لیے میدان میں لائے گئے ہیں کہ ترقی خواہ جماعتوں کو پاؤں پر کھڑا نہ ہونے دیں۔

۳۔ ان حالات میں احرار مجبور ہیں کہ پنجاب اسمبلی کے انتخاب میں شامل ہونے کے لیے احرار کی طرف سے ایک جداگانہ انتخابی بورڈ قائم کیا جائے۔"

احرار پارلیمنٹری بورڈ

احرار ورکنگ کمیٹی نے مندرجہ ذیل ارکان کو پارلیمنٹری بورڈ کی حیثیت سے منتخب کیا اور انہیں مزید ارکان کے منتخب کرنے کا اختیار بھی دیا گیا۔

چودھری افضل حق ایم۔ ایل۔ سی، مولانا مظہر علی اظہر ایم۔ ایل۔ سی، مولانا محمد داؤد غزنوی، خواجہ غلام حسین ایڈووکیٹ لائلپور، میر عبدالقیوم پلیڈر لائلپور، شیخ غلام حیدر پلیڈر فیروزپور، سردار محمد شفیع رئیس عثمان والا ضلع لاہور، میاں قمرالدین رئیس اچھرہ لاہور، سردار احمد خان پتافی جامپور ڈیرہ غازیخاں، شیخ حسام الدین میونسپل کمشنر امرتسر، چودھری عبدالعزیز بیگھووالیہ کپورتھلہ، سردار گل محمد خاں ڈیرہ غازیخاں، مولانا عبدالرحمٰن ضلع جالندھر، مہر شوق محمد باگڑ سرگانہ ضلع ملتان، مولانا ظہور احمد بگوی ضلع سرگودھا۔

اس طرح کل پندرہ ارکان ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی بورڈ کو ہدایت کی گئی کہ وہ درخواستیں طلب

کرے اور ۱۵ ستمبر تک پہلے قافلے کو نامزد کر دے۔ نامزد امیدواروں کے پہلے گروپ پر غور کرنے کے لیے احرار پارلیمنٹری بورڈ کا اجلاس ۲۲ ستمبر کو لاہور احرار آفس میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

اس واضح حقیقت کے باوجود روزنامہ "انقلاب" نے ۵ ستمبر کی اشاعت میں لکھا۔ عنوان تھا "ان تلوں میں تیل نظر نہ آیا"

"چونکہ مسلم لیگ احرار کی خواہش کے مطابق انہیں کوئی روپیہ نہ دے سکتے تھے۔ لہٰذا وہ بہانہ تراش کر الگ ہو گئے"

روزنامہ انقلاب کی یہ رائے اس قدر دلخراش نہیں۔ کیونکہ یہ پیشہ ور لوگ تھے! افسوس عاشق حسین بٹالوی پر ہے کہ وہ تمام کارروائی میں برابر کے شریک چلے آ رہے تھے۔ احرار کو پارلیمنٹری بورڈ سے الگ کرنے کی سازش ان کا آنکھوں دیکھا حال ہے۔ اس پر بھی وہ لکھتے ہیں:

"یوں تو احرار مسلم لیگ کے پارلیمنٹری بورڈ میں شریک ہو گئے تھے۔ لیکن کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس بورڈ سے جو توقعات انہوں نے قائم کر رکھی تھیں وہ بظاہر پوری نہیں ہوئیں۔ انہیں سب سے بڑی غلط فہمی یہ تھی کہ جناح نے بمبئی کے تاجروں اور اودھ کے تعلقہ داروں سے کئی لاکھ روپے جمع کیے ہیں، جو الیکشن میں لیگی امیدواروں کے کام آئیں گے۔ اس مغالطے میں مبتلا ہو کر چودھری افضل حق اور مولانا حبیب الرحمٰن وغیرہ یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ اس فنڈ سے کم از کم ایک لاکھ روپیہ پنجاب کے حصے میں ضرور آئے گا اور یہ رقم جلسے، جلوسوں کے علاوہ اخباری پراپیگنڈے پر خرچ ہو گی۔

احرار کا یہ بھی خیال تھا کہ ملک برکت علی، غلام رسول خاں، خلیفہ شجاع الدین وغیرہ مصروف آدمی ہیں، انہیں ہائیکورٹ کی پریکٹس سے فرصت ہی کہاں ہے کہ وہ پنجاب کا دورہ کریں اور شہر بہ شہر دھوم دھامی جلسے منعقد کر کے دھواں دھار تقریروں کا جادو بکھیریں۔ ادھر احرار اس فن میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور سالہا سال سے ان کی زندگیاں انہی ہنگاموں کے لیے وقف ہو چکی تھیں۔ اس لیے ان کا اندازہ تھا کہ جناح کے فنڈ میں سے پنجاب کو جو ایک لاکھ روپیہ ملے گا، اس کا بیشتر

حصہ انہی کی مرضی اور صوابدید سے خروج ہوگا۔"

("اقبال کے آخری دو سال" ص۲۴۳)

عاشق حسین بٹالوی نے سارا کچھ جانتے ہوئے سیاسی ضرورت کے تحت ایک تو اپنی شخصیت کو گدلا کیا، دوسرا تاریخ سے "ناانصافی کی جس سے آئندہ نسلوں کے گمراہ ہونے کا ڈر ہے اور ساتھ ہی انہوں نے جھوٹ بول کر اپنی عاقبت بھی خراب کی۔

پلول کا ڈاکٹر قتل کر دیا گیا

ہندو مہا سبھا کی سوچی سمجھی سکیم تھی کہ ہندوستان میں پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی توہین کی جائے۔ ۱۹۲۹ء میں اس سازش کے تحت لاہور میں راجپال نے پہل کی، جسے غازی علم الدین نے قتل کر دیا۔ قصور کے پالا رام کا قتل، کراچی میں نتھو رام کا قتل اور دہلی میں شردھانند کا قتل اسی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔

گذشتہ سال روہتک ضلع حصار کے موضع پلول کا ڈاکٹر رام گوپال نے حیوانات کے ہسپتال میں ایک گدھے کا نام احمد (نعوذ باللہ) رکھا، اس پر ہنگامہ ہوا اور چودھری افضل حق ایم۔ایل سی نے حکومت پنجاب کو اس پر متوجہ کیا۔ اس پر ڈاکٹر مذکور نے یہ کہا کہ میں نے گدھے کا نام احمق رکھا ہے اور ساتھ ہی مسلمانوں سے معذرت کر لی اور بظاہر یہ بات ٹل گئی۔ لیکن مجرم جرم سے باز نہ آیا۔ آخر انیس سال کے ایک مسلمان نوجوان مرید حسین نے موقع پا کر ڈاکٹر رام گوپال کو قتل کر دیا۔

منشی احمد دین کی گرفتاری

پنجاب کے معروف سوشلسٹ لیڈر منشی احمد دین کو حکومت پنجاب نے راولپنڈی سے لاہور آتے ہوئے جہلم کے پل پر دفعہ ۱۲۴ ا کے تحت گرفتار کر لیا۔ انہوں نے اپنی تقریر میں مسجد شہید گنج کے انہدام کی تمام تر ذمہ داری حکومت پنجاب پر عائد کی تھی۔ یہ ۳۱۔ اگست کا واقعہ ہے۔

لکھنؤ میں گرفتاریاں

۱۰۔ ستمبر کو پولیس نے یوپی مجلس احرار کے مرکزی دفتر پر چھاپہ مار کر مدح صحابہ کے سلسلے میں پمفلٹ اور اشتہار اپنے قبضے میں لے کر آفس سکرٹری مسٹر ریاض الدین کو گرفتار کر لیا۔ اس سے پیشتر بہت سے احرار کارکنوں کو زیر دفعہ ۱۰۹ گرفتار کیا جا چکا تھا۔

اتحادِ ملت کا پارلیمنٹری بورڈ

لاہور ۱۶ ستمبر کو شیخ صادق حسن امرتسری کی صدارت میں مجلس اتحادِ ملت کا ایک اجلاس ہوا، جس میں ایک پارلیمنٹری بورڈ قائم کیا گیا۔ جس کے ارکان حسب ذیل ہیں۔

مولانا ظفر علی خاں، مولانا عبدالقادر قصوری، ڈاکٹر محمد عالم، مولانا محمد اسحٰق (مانسہرہ) سید زین العابدین (ملتان) شیخ صادق حسین (امرتسر) چودھری غلام حسن، ڈاکٹر محمد نواز، ملک علی بہادر صدر میونسپل کمیٹی حافظ آباد، ملک لال خاں میونسپل کمشنر گوجرانوالہ، ملک لال دین قیصر (لاہور) میاں فیروز الدین احمد، ظہیر الدین ایڈووکیٹ (انبالہ) سید عظمت علی وارثی ایڈووکیٹ (کرنال) سید دیوان علی شاہ ایڈووکیٹ لائلپور، مولانا غلام محی الدین احمد بی۔اے، راجہ عبدالرحمٰن ایڈووکیٹ (راولپنڈی) شیخ عبدالرحمٰن (ترنتارن، ضلع امرتسر) پروفیسر ملک عنایت اللہ، خان محمد نواز میونسپل کمشنر فیروزپور، پیرزادہ عبدالحمید ایڈووکیٹ جالندھر، ملک نصر اللہ خاں عزیز مدیر "زمیندار"، کامریڈ یعقوب الحسن۔ کل بیس ارکان۔

مسجد شاہ چراغ کا قبضہ دیدیا گیا

۱۶ ستمبر کو مسجد شاہ چراغ کا قبضہ انجمن اسلامیہ کو دے دیا گیا۔ جہاں اسی وقت نماز ظہر ادا کی گئی۔ یہ مسجد (اسّی) سال کے بعد مسلمانوں کے قبضہ میں آئی۔

مجلس احرار کا مرکزی اجلاس

۲۵ ستمبر کو مولانا مظہر علی اظہر کی صدارت میں مجلس احرار کا مرکزی اجلاس ہوا، جس میں دیگر امور کے علاوہ آئندہ اکتوبر میں آل انڈیا احرار پولیٹیکل کانفرنس لاہور میں کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

جمعیۃ علمائے ہند کا اجلاس

نیو دہلی، ۲۷ ستمبر کو مرکزی جمعیۃ العلمائے ہند کا ایک اجلاس ہوا۔ جس میں برادرانِ وطن کے اس رویّے کے خلاف اظہار ناراضگی کیا گیا کہ انہوں نے کمیونل ایوارڈ کے خلاف بلاوجہ پروپیگنڈہ شروع کر رکھا ہے، جس سے ملک میں مزید فرقہ وارانہ اختلاف کو آگے بڑھنے کا موقعہ ملے گا۔

پنجاب تقسیم ہو گیا

اپنی ثقافتی زندگی میں پنجاب مخصوص باغ و بہار کا مالک ہے۔ اس کے لیل و نہار میں آبشاروں کا ترنم، کوہ و بیاباں کی رونقیں، نہروں اور دریاؤں

کے ہنگامے، سرسبز اور لہلہاتی کھیتیاں، ہواؤں میں موسیقی، جوان دوشیزاؤں کی طرح جوانی کے ابھار پر دکھائی دیتی ہے۔ پنجاب کے گھبرو بسنت بہار کی طرح اپنے چہروں پر جوان موسم کا رنگ جمائے جب راوی اور چناب کے کناروں پر محو گل گشت ہوتے ہیں تو فضاؤں میں ہزاروں لہریں اور سوہنیاں ان کی بلائیں لیتی ہیں۔ ان کے قدم ڈھول اور چمٹے کی لے پر متحرک ہیں تو سارا پنجاب ناچنے لگتا ہے۔ مگر آہ یہ پنجاب مر چکا۔ اس کی بہاریں چرالی گئیں۔ اس کے دریاؤں کا پانی دکھی آنکھوں سے آنسو بن کر بہہ گیا۔ اس کے جوان جوانمرگ ہو گئے اور اس کی لہلہاتی کھیتیوں میں خاک اڑنے لگی۔ اس کے تمدن پر منوں ریت ڈال دی گئی۔ تاکہ اس کے گل بوٹے جوانمرگی کا شکار ہو جائیں۔

کوئی رجل الرشید ہے جو گم کردہ بہاروں کو ڈھونڈ لائے؟ کوئی ان راہوں کی نشاندہی کر سکتا ہے، جن راہوں سے پنوں کے بھائی سسی کا سہاگ لوٹ کر لے گئے ہیں؟ اگر نہیں تو ان قبروں کے نشان تلاش کرو۔ جن میں پنجاب کی ثقافت دفن کر دی گئی۔ شمشان بھومیوں کی راکھ ڈھونڈو! شاید کوئی چنگاری سلگتی ہو۔ لیکن نہیں۔ سنگلاخ وادیوں کی ہر چیز بے آب وگیاہ زمین کی طرح خشک ہو چکی ہے۔

اتحاد پنجاب کی آخری پونجی تھا۔ لیکن تن آسان لوگوں کا ٹولہ اسے بھی اپنی خواہش کی بھینٹ چڑھا چکا۔ اب یہ شاخ ٹوٹ کر گر چکی ہے۔ سال ۱۹۴۷ء اس کے برگ و بار بھی سمیٹ کر لے گیا۔

اگر پنجاب کے رجعت پسند ذرا حوصلے سے کام لیتے تو پنجاب کا اتحاد برصغیر کا نقشہ جدید انداز سے بکھیرتا۔ مگر سیاسی طالع آزماؤں نے برطانوی سامراج کے کہنے پر ان کا ایسے واقعات کو جنم دیا کہ اس صوبے کے مسلمان چار ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر رہ گئے۔ مجلس احرار، مسلم لیگ، اتحاد ملت اور یونینسٹ پارٹی کے مسلم ارکان جدا جدا راہوں پر سفر کرنے لگے۔ حالانکہ یہ سب صراط مستقیم کے مسافر تھے۔ مگر ان کی سوچ اور فکر نے انہیں اپنی اغراض کے لیے ایسا کر اسی راہ پر ڈال دیا کہ انہیں منزل کا نشان نہ مل سکے۔

مسلم لیگ اور مجلس احرار اگر اکیٹ ۱۹۴۵ء کے الیکشن ایک ساتھ رہ کر لڑتے تو پنجاب کی وزارت یہ ترتیب دیتے۔ اس طرح نہ یونینسٹ کو اقتدار ملتا، نہ پنجاب تقسیم ہوتا۔ مگر آہ اس لوگوں کو مارا جگر کے شعروں نے ۔ جگر کو شراب نے مارا

تیزاب ڈالنے کی تحریک کا خاتمہ

کوئی بھی تحریک ہو۔ جب تک اس کے رہنماؤں میں عزم اور باہمی اعتماد نہ ہوگا۔ کامیابی نہیں ہوگی۔

سالِ رواں کے شروع میں امرتسر میں ایک نیم دہشت پسند تحریک کا آغاز ہوا۔ لیٹر بکسوں میں تیزاب ڈالنا اس تحریک کے کارکنوں کا مقصد تھا۔ رات کے اندھیرے میں چھپ کر یہ لوگ شہر کے مختلف، سرکاری لیٹر بکسوں کو جلا دیتے، جس سے حکومت کی پریشانی میں اس قدر اضافہ ہوا کہ اس کی شہری انتظامیہ معطل ہو کے رہ گئی۔ اس تحریک کے کسی مجرم کا گرفتار نہ ہونا حکومت کے لیے اور بھی حیرانی کی بات تھی۔ صرف ایک کارکن شیخ سلیم اللہ گرفتار ہوا۔ یہ نوجوان امرتسر کا باشندہ تھا۔ اس کے والد شیخ حبیب اللہ الائیڈ بنک امرتسر کے خزانچی تھے۔

۲۹ ستمبر کو اس تحریک کا ایک اور نوجوان خواجہ منظور احمد امرتسر سے گرفتار کر لیا گیا۔ یہ کانگریس کے مشہور لیڈر خواجہ عبدالرحمٰن کا بھانجا تھا۔ خواجہ منظور احمد ۱۹۲۲ء کو امرتسر میں مولوی محبوب احمد المعروف خیر شاہ کے ہاں کٹڑہ بگھیاں میں پیدا ہوا۔

گرفتاری کے بعد منظور احمد نے پولیس کے روبرو بیان دیتے ہوئے کہا کہ ہم ایم۔ بی۔ ہائی سکول کے چند طالب علم تھے جنہیں سردار بھگت سنگھ کے کارناموں نے متاثر کیا تھا۔ چنانچہ ہم نے شیخ سلیم اللہ کو اس گروپ کے لوگوں سے ملاقات کے لیے لاہور بھیجا کہ وہ ہمیں اپنی پارٹی میں شامل کریں۔ مگر انہوں نے آزمائش کے طور پر ہمارے سپرد یہ کام کیا۔ ابھی ہم ابتدائی منزلوں میں تھے کہ ہمارے ایک ساتھی کامریڈ پنالال نے مخبری کر دی اور ہم سب گرفتار کر لیے گئے۔

رہائی کے بعد خواجہ منظور احمد کا کہنا ہے کہ میرے بیان کے بعد جب مقدمہ عدالت میں لے جایا گیا تو میں اپنے ابتدائی بیانوں سے منحرف ہو گیا۔ لیکن پنالال بدستور سلطانی گواہ بنا رہا۔ میں نے عدالت میں کہا کہ میرا سابقہ بیان پولیس کے بے جا تشدد کی وجہ سے ہے ورنہ کامریڈ پنالال اس کام کے کرنے والوں میں صفِ اول کا آدمی ہے۔ چونکہ ہمارے مقدمہ میں کوئی عینی شاہد نہیں تھا، للذا عدالت نے مجھے اور دوسرے ساتھیوں کو ایک ایک سال قید کی سزا دی۔ لیکن اپیل میں سب بری کر دیے گئے۔ پنالال بطور سرکاری گواہ کو بھی ابتدائی مراحل میں ہی بری کر دیا گیا۔ رہائی کے بعد میں مجلسِ احرار میں شامل ہو گیا۔ اور اس طرح امرتسر میں یہ تحریک ختم ہو گئی۔

روانِ تحریک | پنجاب اور ہندوستان کے دیگر صوبوں میں تشدد اور الیکشن کی تحریکیں زور پکڑ رہی تھیں۔ دہشت پسند گروہ نہ تو کانگریس کی تحریک کو پسند کرتا تھا، نہ مسلم لیگ کی پالیسی اس کے نزدیک آزادی کے لیے کارآمد تھی۔ آخرالذکر دونوں جماعتیں ایکٹ ۱۹۳۵ء کے آئین کو اپنے روشن مستقبل کا ذریعہ سمجھے ہوئے تھیں۔ جبکہ کمیونسٹ پارٹی کا فیصلہ تھا کہ کھلونے دے کر بہلایا گیا ہوں

احرار ان دنوں لکھنؤ کی سول نافرمانی میں مصروف تھے۔ پنجاب سے شیعہ حضرات کے قافلے لکھنؤ پہنچ کر قدحِ صحابہ کرتے ہوئے گرفتار ہو رہے تھے۔ چنانچہ مسلم لیگ کے شیخ کرامت علی نارووال سے ایک جتھہ لے کر لکھنؤ گئے۔ ان کے مقابل مولانا مظہر علی اظہر کے فرزند اکبر قیصر مصطفےٰ ایڈووکیٹ لاہور سے مدحِ صحابہ کرنے لکھنؤ گئے۔ ان کے علاوہ ہنوز اہلِ سنت کی طرف سے کوئی قافلہ پنجاب نہیں گیا تھا۔ اس تحریک کو ابھی تک یو۔ پی مجلسِ احرار ہی سنبھالے ہوئے تھی۔ لکھنؤ میں دفعہ ۱۴۴ کے تحت گرفتاریاں جاری تھیں۔ ۲۰ اکتوبر کو حسبِ دستور مسجد ٹیلا پر ایک ہزار مسلمانوں کا اجتماع ہوا۔ جنہوں نے ۱۴۴ توڑ کر تحریک کی حمایت میں تقریریں کیں۔ آخر میں احرار سرخپوشوں کے دو قافلے یکے بعد دیگرے مدحِ صحابہ کرتے ہوئے نکلے جنہیں گرفتار کر لیا گیا۔

انہی دنوں شیعہ جماعت نے ایک قرارداد کے ذریعے مجلسِ احرار سے مدحِ صحابہ کرنے پر نفرت کا اظہار کیا اور حکومت پر زور دیا کہ مدحِ صحابہ سے سختی سے روکا جائے۔

([illegible] روزنامہ انقلاب لاہور)

تحریکِ مدحِ صحابہ کے سلسلہ میں مسٹر ... نے مرکزی اسمبلی میں تحریکِ التوا پیش کرنی چاہی لیکن گورنر جنرل نے اسے غیر ضروری قرار دیتے ہوئے ... حکومت سے متعلق ہے۔

احرار پروونشل کانفرنس | ۲ سے ۴ اکتوبر تک ایبٹ آباد (ضلع ہزارہ) میں پروونشل احرار کانفرنس کا اجلاس ہوا۔ مولانا عبدالقیوم پوپلزئی مفتی سرحد اس اجلاس کے صدر تھے۔ کانفرنس کے آخری دن ۴ اکتوبر حکومت سرحد نے دفعہ ۱۴۴ کے تحت کانفرنس کے باقی

اجلاس خلافِ قانون قرار دے دیے۔ نیز حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مرزا غلام نبی جانباز اور مولانا لال حسین اختر کو ضلع ہزارہ سے فوراً نکل جانے کا حکم دیا۔ اس کے ساتھ ہی دو ماہ کے لیے ضلع ہزارہ کے احرار کارکنوں کی تقریروں پر پابندی عائد کر دی گئی۔

اس سے پیشتر کانفرنس کے اجلاس میں سرحدی قبائل پر بمباری، مسجد شہید گنج میں حکومت پنجاب کی جانبدارانہ پالیسی اور لکھنؤ میں مدح صحابہ پر پابندی کے خلاف حکومت یوپی کی مذمت میں قراردادیں منظور کی گئیں۔

مالیر کوٹلہ کے مہاجرین

ریاستوں کے رئیس خواہ کسی عقیدہ یا مذہب سے ہوں۔ اپنی عیاشی کے سوا، رعایا کے حقوق سے انہیں ہمیشہ غافل اور بے تعلق پایا گیا۔ محلات کی اونچی دیواروں کی اوٹ میں جس قدر گھناؤنے جرائم کیے یہ لوگ مرتکب ہوئے ہیں اگر کہیں انہیں انسانیت کی کسی عدالت میں پیش کیا جائے تو ان کی فردِ جرم سے ابن آدم کو شرم آنے لگے۔ لیکن برطانوی سامراج کے سیاسی اغراض نے ایک صدی تک ان کی پردہ پوشی کی، لیکن راجاؤں اور نوابوں کے گناہوں کی سزا میں غریب رعایا کو ہی مجرم قرار دیا گیا۔

ریاست مالیر کوٹلہ کی مسلم رعایا اپنے نواب احمد علی خان بہادر سے ہمیشہ نالاں رہی۔ اس پر غیر مسلم اس قدر سر چڑھے کہ آئے دن مسلمانوں کی مذہبی اور معاشرتی زندگی پریشان ہو کے رہ گئی۔ مسجدوں میں حرام کے گوشت پھینکے جاتے۔ عیدین کی نمازوں پر قدغن لگائی گئی۔ ذرا ذرا سے جھگڑے کو فرقہ وارانہ قرار دے کر مسلمانوں کو مجرم قرار دیا جانے لگا۔ اگر مسلمان احتجاج کرتے تو دادرسی کی بجائے ان پر مقدمات قائم کیے جاتے۔

مجلس احرار نے ان واقعات کا کئی دفعہ نوٹس لیا اور نواب آف مالیر کوٹلہ سے درخواست کی کہ وہ مسلمانوں کے جائز حقوق کی پاسداری کریں اور انہیں ہندوؤں اور سکھوں کے تشدد سے آزادی دلائیں۔ لیکن نواب نواب ہوتے ہیں۔ ان کے کان سونے اور جواہرات کے آویزوں سے اس قدر بوجھل ہو گئے ہوتے ہیں کہ رعایا کی آواز کا وہاں تک رسائی کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

آخر یکم اکتوبر ۱۹۳۶ء کو مالیر کوٹلہ کے مسلمان ریاست سے ہجرت کر کے لاہور پہنچ گئے۔ لاہور کے مسلمانوں نے اپنی روایات کا ثبوت دیا۔ ۲۔ اکتوبر کو حضرت مولانا احمد علی لاہوری کی صدارت میں

مجلس احرار اور اتحادِ ملت کا مشترک اجلاس ہوا، جس میں ایک کمیٹی مرتب کی گئی۔ جس کے صدر میاں عبدالعزیز ایڈووکیٹ قرار پائے۔ باقی ارکان میں چودھری افضل حق، مولانا داؤد غزنوی، فیروزالدین احمد اور شیخ عنایت اللہ شامل تھے۔ روزنامہ "سیاست" کے ایڈیٹر مولانا سید حبیب نے نواب صاحب کے ایماء پر مہاجرین کے خلاف لکھا۔ جس پر لاہور کے علاوہ تمام پنجاب میں ان کے خلاف سخت تنقید ہوئی۔ اس اجلاس میں اخبار مذکور کے خلاف سخت نفرت کا اظہار کیا گیا اور نواب صاحب اور مہاجرین کے درمیان سمجھوتہ کرایا جانا بھی طے پایا۔

سر سکندر حیات کی واپسی

میاں سر فضل حسین کی موت کے بعد یونینسٹ پارٹی کی لیڈرشپ کافی دیر متنازعہ فیہ رہی۔ آخر ۳۔ اکتوبر کو سکندر حیات بنکوں کی ڈپٹی گورنری سے مستعفی ہو کر لاہور پہنچ گئے۔ ۴۔ اکتوبر کو نواب آف ممدوٹ کی قیامگاہ پر یونینسٹ پارٹی کا اجلاس منعقد ہوا۔ جس کی صدارت سکندر حیات نے کی۔ سب سے پہلے اس اجلاس میں سکندر حیات کا شکریہ ادا کیا گیا کہ انہوں نے بھاری تنخواہ کو لات مار کر پارٹی کی عنانِ اقتدار سنبھالی۔ اس قرارداد کی تائید میں خان بہادر حبیب اللہ، ملک فتح خاں، خان بہادر مشتاق احمد گورمانی، چودھری ریاست علی اور رائے بہادر چھوٹو رام نے تقریریں کیں۔

انتخاب کا آغاز

۱۱۔ اکتوبر کو مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح نے اپنی جماعت کی طرف سے الیکشن پروپیگنڈے کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

۱۔ ہم کونسلوں اور اسمبلیوں کے اندر غیر فرقہ وارانہ پارٹیاں بنانے کے لیے تیار ہیں۔

۲۔ پنجاب کا پریس دیدہ دانستہ بورڈ کے مقاصد کو غلط طریق پر پیش کر رہا ہے کہ لیگ فرقہ وارانہ پارٹی ہے۔ میں پوچھتا ہوں، یونینسٹ پارٹی میں کئی ہندو ممبر ہیں۔ کیا وہ غیر فرقہ وارانہ پارٹی ہے؟

۳۔ پنجاب کا حال تو یہ ہے کہ یہاں وزارت پہلے ہی سے بن چکی ہے۔ میں اس وزارت کو توڑنا چاہتا ہوں۔

۴۔ پنجاب میں مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہے۔ پھر میں انہیں اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ دوسرے فرقوں سے ناانصافی کریں۔

۵۔اگر سر سکندر حیات غیر ذمہ دارانہ پارٹی بنانا چاہتے تھے تو کیوں انہوں نے آج سے پہلے ریزرو بنک کی ممبری سے استعفیٰ نہ دیا؟

۶۔میں ایسا آئین تیار کرانا چاہتا ہوں جو آزادیٔ ملک کے لیے ہندوؤں سے تعاون کرے۔
(روزنامہ انقلاب ۱۵۔اکتوبر ۱۹۳۶ء)

روزنامہ "انقلاب" لاہور کے اداریے

قائداعظم کے مندرجہ بالا چھ نکات پر روزنامہ انقلاب نے لکھا:

"لیگ بورڈ اور مسٹر جناح کے ارشادات مسلمانوں کی تنظیم کی بجائے تفرقہ انگیز ہیں۔"

(۱۶۔اکتوبر ۱۹۳۶ء)

مسٹر جناح کی لاہور والی تقریر کے متعلق جو ہم اپنی گذشتہ اشاعتوں میں عرض کر چکے ہیں اور قارئین ملاحظہ فرما چکے ہوں گے۔

"انہوں (مسٹر جناح) نے صوبے کے ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں میں سے ترقی خواہ عناصر کو متنبہ کیا ہے کہ پنجاب میں ایک ایسی وزارت بن چکی ہے جو گورنر کی تجویز پر بنائی گئی ہے۔سب کو چاہیے کہ اس کے مقابل اپنی مرضی کی وزارت قائم کریں۔نیز کہا کہ اتحاد اسی سکیم کا پہلا مرحلہ ہے۔"
(۱۸۔اکتوبر ۱۹۳۶ء)

نواب آف ملیر کوٹلہ کا اعلان

۱۵۔اکتوبر کو مقرر کردہ وفد نے نواب آف ملیر کوٹلہ سے ملاقات کی اور ان کی مظلوم رعایا پر ان کی ریاست میں جو کچھ گذر چکا ہے اس کے متعلق پیش کیا، جو کہ نواب صاحب نے نہایت توجہ سے سنا اور وعدہ فرمایا کہ کوئی ایسی بات نہیں جس پر غور نہ کیا جا سکتا ہو۔میں بہت جلد ایسے لوگوں کو ان کے گھروں میں واپس بلاؤں گا۔اس وعدہ کے چار روز بعد ۱۹۔اکتوبر کو نواب احمد علی صاحب بہادر والیٔ ملیر کوٹلہ نے اعلان کر دیا کہ:

"ریاستی مہاجرین کے تمام مطالبات منظور کر لیے گئے ہیں۔ہجرت کرنے والے اپنے اپنے گھروں کو واپس آ جائیں۔اس ضمن میں تمام قیدی رہا کر دیے جائیں گے اور واپس آنے والوں سے کسی قسم کی باز پرس نہیں کی جائے گی: "تعلقہ پولیس افسروں کو ان کی ذمہ داریوں سے علیحدہ کر دیا جائے گا۔(اسی طرح نواب صاحب

نے کہا، مجھے امید ہے کہ رعایا بھی ریاست کے وقار کا خیال رکھے گی "

(نوٹ)۔ نواب صاحب سے گفتگو کے لیے جو وفد گیا۔ اس میں چودھری افضل حق کی جگہ شیخ حسام الدین شامل کر لیے گئے تھے۔

نئے ریونیو ممبر

۲۰ اکتوبر کے اخبارات میں حکومت پنجاب نے اعلان کیا کہ خان بہادر مظفر خان ریونیو ممبر ۲۰ اکتوبر سے چار ماہ کی رخصت پر جا رہے ہیں۔ ان کی جگہ سر سکندر کو عارضی طور پر پنجاب کا ریونیو ممبر مقرر کیا گیا ہے۔

نواب مظفر خاں سے پیشتر اس عہدے پر سر فضل حسین (مرحوم) متعین تھے۔

حکومت نے سر سکندر حیات کو پنجاب میں ریونیو ممبر کا عہدہ سونپ کر یونینسٹ پارٹی کو آئندہ الیکشن میں کامیاب کرانے کی ایک تجویز سوچی جو بالآخر کامیاب رہی۔

آل انڈیا احرار پولیٹیکل کانفرنس لاہور

بعض نام نہاد مسلم لیگیوں اور یونینسٹ پارٹی کے اغراض پسندوں کی سازش سے جب مجلس احرار اور مسلم لیگ کے راستے جدا جدا ہو گئے تو مجلس احرار نے من حیث الجماعت اپنے وجود کی بقا کے لیے اپنی الگ راہ تلاش کی۔ گو ان دنوں احرار کے راستے میں یونینسٹ پارٹی حکومت سمیت پنجاب مسلم لیگ یونینسٹ کی ہمراہی میں اور اتحاد ملت، پہاڑ کی طرح حائل تھیں۔ مگر کاروان حریت ان سب کو روندتا اور رکاوٹوں سے ماورٰی چلتا جا رہا تھا۔ اور چلتا رہا، تا آنکہ یہ تمام رکاوٹیں ریت کے گھروندے ثابت ہوئیں۔

۲۲-۲۳ اور ۲۴ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو آل انڈیا احرار پولیٹیکل کانفرنس کے عظیم اجلاس لاہور میں ہوئے۔ ۲۲ اکتوبر کو کانفرنس کے منتخب صدر سید محمد احمد کاظمی ایم ایل اے کا جلوس دن کے دو بجے دہلی دروازہ احرار نگر سے روانہ ہوا۔ جلوس کی پذیرائی کرنے والوں میں انجمن خدام المسلمین لاہور چھاؤنی، جیش مجلس احرار اسلام ہری پور ہزارہ، جیش مجلس احرار اسلام مزنگ لاہور، جیش مجلس احرار اسلام امرتسر، جیش مجلس احرار اسلام انبالہ، جیش مجلس احرار اسلام کھیالی (ضلع گوجرانوالہ) جیش مجلس احرار اسلام گجرات، غازی جیش امرتسر، جیش مجلس احرار اسلام فیروز پور۔ جیش مجلس احرار اسلام جھنگ، غازی کور لائلپور، مجاہد کور گوجرہ (ضلع لائلپور)، جیش مجلس احرار اسلام

جا کے (ضلع سیالکوٹ)، جیش مجلس احرار اسلام عثمان والا (ضلع میانوالی)، جیش مجلس احرار اسلام گورداسپور۔

ان جیوش کے بعد گھوڑ سوار تھے اور ان کے بعد سیالکوٹ مجلس احرار کا بینڈ اپنے جیوش کے ساتھ اور خالد کور جو برہنہ تلواریں لیے ہوئے تھی۔ ان کے درمیان صاحب صدر کی کار تھی، جن کے ساتھ مولانا مظہر علی اظہر اور صاحبزادہ فیض الحسن بیٹھے تھے۔

یہ عظیم جلوس اندرون دہلی دروازہ سے شہر میں داخل ہوا اور شام ۷ بجے کے قریب بھاٹی دروازہ سے ہوتا ہوا احرار نگر میں ختم ہوا۔ راستے میں اکثر مقام پر پھولوں کی بارش کی گئی موسم کے مطابق چائے اور پانی سے جلوس کی تواضع کی گئی۔ جلوس کا انتظام احرار گوریلوں کے سپرد تھا۔ بھاٹی دروازہ سے باہر چند غیر ذمہ دار لوگوں نے تلخی پیدا کرنی چاہی، جنہیں احرار نوجوانوں نے درست کر دیا۔

کانفرنس میں پنجاب، یوپی، بمبئی اور بہار کے ڈیلیگیٹوں کی ایک بھاری تعداد موجود تھی۔ ان کے علاوہ پشاور، راولپنڈی اور صوبہ سندھ سے کافی ڈیلیگیٹوں نے بھی شرکت کی۔

۲۲۔ تاریخ بعد نماز عشا مولانا محمد احمد کاظمی کی صدارت میں پہلا اجلاس قرآن کریم کی تلاوت سے شروع ہوا۔ شعراء کی ولولہ انگیز نظموں کے بعد منتخب صدر نے فرمایا۔

"مسلمانانِ ہندوستان اس وقت ایسے مقام پر کھڑے ہیں، جہاں سے دو راہیں نکلتی ہیں۔ ایک اتحاد و اتفاق اور وحدت و تنظیم کی ہے اور دوسری اختلافات و تفریق کی اور فساد کی راہ ہے۔ ایک عزت اور کامرانی کی راہنمائی کرتی ہے اور دوسری ناکامی کی طرف۔

مسلمانوں کی فطرت تمام انسانوں کی طرح جبر و اختیار کے درمیان ہے۔ نہ وہ اتنے مجبور ہیں کہ سیدھی راہ اختیار نہ کر سکیں اور نہ اتنے مختار مطلق ہیں کہ حالات کی مجبوریوں کی وسیع خلیج کو کم کر سکیں۔ اصل چیز ان کی قوت فیصلہ ہے۔ اگر یہ قوت فیصلہ موجود ہے اور پوری طاقت کے ساتھ موجود ہے تو ان کا فیصلہ بہترین فیصلہ ہوگا اور بہترین رفاقت پر مبنی ہوگا۔

دوستو! اب ہمارے سامنے ملک کی آزادی کا ایک اعلیٰ مقصد ہے۔ اور اس کی تکمیل کے لیے ایک پروگرام ہے۔ ہمیں اپنے پروگرام کی رہنمائی حاصل ہے، جو پچھلی صدی کے علماء کی طرح اپنی ذات کے لیے نہیں۔ بلکہ وہ دوسروں کے لیے قربانی کرتے رہے ہیں۔ سر دست جو پروگرام ہمارے سامنے ہے، وہ کونسلوں اور صوبجاتی اسمبلی کے نمائندگان کا انتخاب کا ہے۔ جس کے لیے ہر قسم کی کشمکش ہو رہی ہے۔ مختلف سیاسی جماعتوں کے جھگڑوں کے درمیان کچھ بدگمانیاں ہیں۔ لیکن میرے نزدیک ان بدگمانیوں کی وجہ سے کشمکش زیادہ تر اس جرم پر ہے کہ اسمبلی کی ممبریوں کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اور کہا جا رہا ہے کہ مسلمان سیاسیات میں پیچھے ہیں۔ حتیٰ کہ پچھلی گول میز کانفرنس کے انعقاد کے وقت ہمارے برادرانِ وطن کا خیال یہ ہو گیا کہ مسلمان ان کے دوش بدوش نہیں چل سکتے۔ اس لیے انھوں نے کانفرنس مذکور میں شرکت کرتے ہوئے انگلستان جاتے وقت یہ بھی سمجھ لیا کہ وہ تنہا بلا شرکت مسلمانوں کے سوراج سے آملیں گے۔ اس لیے انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ معاملات طے نہیں کیے۔

مگر حضرات! یہ درست نہیں کہ مسلمان سیاسیات سے دور ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ عرصہ ۱۲۰ سال کا گذرا ہے کہ ہندوستان میں اشاعتِ اسلام کے مضمون پر ایک انگریز نے ایک رسالہ لکھا تھا، جس میں یہ درج ہے کہ مسلمان کی سیاسی تعلیم محض کتابی اور ذہنی ہے۔ لیکن ہماری تعلیم کا سلسلہ ساڑھے تیرہ سو برس پہلے سے ۱۸۵۷ء تک جاری رہا ہے۔ بے شک ہم دھوکے میں رہے۔ مگر اب مسلمان سیاسیات میں سرگرمی سے حصہ لے رہے ہیں؟

آخر میں صدرِ کانفرنس نے مسلمانوں کی مذہبی معلومات، مسئلہ فلسطین اور مدحِ صحابہ پر مفصل تبصرہ کیا۔ نیز مجلسِ استقبالیہ کے معززین کا شکریہ ادا کیا۔

صدرِ کانفرنس سے پہلے صدرِ استقبالیہ مولانا مظہر علی اظہر نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں کہا کہ "ہندوستان کی غلامی قوموں کی باہمی نفرت کا نتیجہ ہے۔ ملک کی اقتصادی بدحالی،

بے کاری، مسئلہ فلسطین، تحریک مدح صحابہ پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔ آخر میں تحریک مسجد شہید گنج کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے کہا:

گذشتہ سال بعض خود غرض افراد نے سکھوں اور حکومت کی مخالفت کی بجائے مجلس احرار کو فنا کرنے کی کوشش کی۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ یہ جماعت آج پھر اپنی شاندار روایات کے ساتھ زندہ ہے۔ اور ایسی ہزاروں سازشوں کے باوجود زندہ رہے گی۔

آپ نے آئندہ الیکشن کا تذکرہ کرتے ہوئے عوام الناس کو مشورہ دیا کہ وہ رجعت پسندوں کی امداد نہ کریں، بلکہ ان بے خوف اور ایماندار لوگوں کو ووٹ دیکر کامیاب کرائیں، جو حکومت اور حکومت کے گماشتوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکیں، جنہیں ملک اور مذہب کی پاسداری کا خیال ہو۔"

رسم پرچم کشائی

۲۲۔ اکتوبر صبح نو بجے احرار کا سرخ پرچم، جس پر سفید چاند تارہ بنا ہوا تھا، صدر کانفرنس نے احرار پارک میں لہرایا۔ اس موقعہ پر مولانا انور صابری، خواجہ عبدالرحیم عاجز اور جانباز مرزا نے اپنی جوشیلی اور جذباتی نظموں سے پرچم کی اہمیت واضح کی۔ دس ہزار سے زائد سرخپوش رضا کاروں نے بلینڈ کی فوجی دھنوں کے ساتھ پرچم کو سلامی دی۔

۲۴ تاریخ کو رات دو بجے کانفرنس کی کارروائی ختم ہوئی، جس میں حسب ذیل قراردادیں منظور کی گئیں۔

قراردادیں

۱۔ آل انڈیا احرار پولیٹیکل کانفرنس لاہور کا یہ اجلاس اس حقیقت کا اعادہ کرتا ہے کہ ہندوستان کی اخلاقی، سیاسی، اور معاشرتی مشکلات کا واحد حل آزادی ہے اور مسلمانانِ ہند سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ حصولِ آزادی کے لیے ہر ممکن کوشش کریں مزید برآں یہ اجلاس اس حقیقت کا بھی اعلان کرتا ہے کہ اسلامی اور ایشیائی مقبوضات کی نجات بھی ہندوستان کی آزادی سے وابستہ ہے۔

۲۔ آل انڈیا احرار پولیٹیکل کانفرنس لاہور کا یہ اجلاس حکومت ہند اور صوبجاتی حکومتوں کی ہندوستان کے بے کاروں کے متعلق غفلت شعاری پر اظہار مذمت کرتا ہے اور اس

مجرمانہ غفلت کو اصولِ حکومت کی صریح خلاف ورزی تصور کرتے ہوئے مطالبہ کرتا ہے کہ
(حکو)مت بلاتاخیر مزید تمام ہندوستان میں تعلیم دغیر تعلیم یافتہ ماہر اور غیر ماہر بیکاروں کی
فہرستیں تیار کروائے اور ان کو کام پر لگانے کے لیے مناسب تدابیر اختیار کرے۔
۳۔ آل انڈیا احرار پولیٹیکل کانفرنس لاہور کا یہ اجلاس حکومت کی اس متشددانہ پالیسی
پر جس کے ماتحت مولوی عنایت اللہ امیر جماعت احرار قادیاں اور دیگر کارکنوں کو
مختلف سزائیں دی گئیں ہیں، اظہارِ مذمت کرتا ہے اور صریح مداخلت فی الدین
تصور کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ مسلمان، قادیانی فتنہ کو کسی صورت میں برداشت
نہیں کر سکتے۔ نیز صوبہ سرحد میں جو غیر معمولی تدابیر قادیانیوں کی حفاظت کے لیے
حکومت کی طرف سے اختیار کی جارہی ہیں، ان پر اظہارِ نفرت کرتا ہے۔
۴۔ آل انڈیا پولیٹیکل کانفرنس لاہور کا یہ اجلاس فلسطین کے مسلمانوں کے ساتھ موجودہ
مصائب میں پوری ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے حکومت برطانیہ کی استعمار پرستی اور
یہود نوازی کی سخت مذمت کرتا ہے اور تحقیقاتی کمیشن کے تقرر کو یورپین اقوام
کی مخصوص چال تصور کرتا ہے، جس سے کسی صورت میں بھی انصاف کی توقع نہیں
ہو سکتی۔
۵۔ آل انڈیا احرار پولیٹیکل لاہور کا یہ اجلاس اس وقت جبکہ ملک میں سول نافرمانی
اور بے چینی کی بجائے بالکل امن وسکون ہے۔ سرخپوشان سرحد پر پابندیوں کو
سراسر خلافِ انصاف تصور کرتا ہے۔ اور حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ ان پابندیوں
کو جلد از جلد دور کردے۔

نیز یہ اجلاس فخرِ افاغنہ خاں عبدالغفار خاں صاحب کے صوبہ سرحد میں داخلہ پر
پابندی کے خلاف اظہارِ مذمت کرتا ہے اور حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ اس
پابندی کو فوراً دور کر دیا جائے۔
۶۔ آل انڈیا احرار پولیٹیکل کانفرنس لاہور کا یہ اجلاس حکومت ہند اور حکومت برطانیہ
کو متنبہ کرتا ہے کہ انہوں نے ہندوستان کے تمام اسلامی اداروں اور عامۃ المسلمین

کے زبردست احتجاج کے باوجود ظفراللہ خاں مرزائی کو جس کی جماعت نہ اپنے نئے مذہب کی رو سے چند ہزار مرزائیوں کے ماسوا دنیا کے ستر کروڑ مسلمانوں کو کافر سمجھتے ہوئے ان کا مذہبی اور سوشل بائیکاٹ کر رکھا ہے۔ گورنر جنرل کی مجلس منتظمہ کا رکن منتخب کر کے مسلمانان ہند کو گورنر جنرل کی کابینہ میں نمائندگی سے محروم کر دیا ہے۔ انگریزی حکومت کے لیے اب بھی وقت ہے کہ وہ اپنی اس غلطی کا فوری انسداد کرے ورنہ مسلمانانِ ہندیہ سمجھنے پر مجبور ہوں گے کہ حکومت مسلمانوں کے دینی اور دنیاوی مخالف کو ان کی گردن پر مسلط کر کے مرزائے قادیان کی نبوت کو فروغ دینے کی خواہاں ہے۔

نیز یہ اجلاس حکومت کی بے اعتنائی اور جمیع مسلمانانِ ہند کے متفقہ مطالبہ سے بے توجہی کے پیشِ نظر تجویز کرتا ہے کہ ایک اینٹی ظفراللہ ڈے تمام ملک میں منایا جائے، جس میں اس مطالبہ کا اعادہ کیا جائے۔

۷۔ آل انڈیا احرار پولیٹیکل کانفرنس کا یہ اجلاس کسانوں اور زمینداروں کی مفلوک الحالی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس امر کا پر زور مطالبہ کرتی ہے کہ گورنمنٹ شرح معاملہ اراضی کو کم از کم پچاس فیصدی کم کر دے اور آئندہ کے لیے اس اصول کو جو انکم ٹیکس گذاروں پر عائد ہے کہ دو ہزار آمدنی سے کم والے اشخاص مستثنیٰ ہیں۔ اسی طرح زمین سے جب تک زمیندار کو دو ہزار کی سالانہ آمدنی نہ ہو اس پر معاملہ اور لگان بھی منسوخ کیا جائے۔"

سیکرٹری استقبالیہ آل انڈیا احرار پولیٹیکل کانفرنس کے سیکرٹری استقبالیہ شیخ بشیر احمد رضوانی تھے۔ امرتسر کے یہ مشہور قومی رہنما، جن کی بیشتر زندگی آزادیٔ وطن کی راہ میں مصائب جھیلتے گذری۔ آپ ہوشیار پور کے رہنے والے ہیں لیکن زندگی کا بیشتر حصہ امرتسر میں گذارا۔ ذاتی کاروبار کے علاوہ آپ مقامی کانگریس کے جنرل سیکرٹری اور پنجاب کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے۔ ۱۹۳۱ء میں قیام مجلس احرار کے بعد آپ مجلس میں شامل ہو گئے۔ آپ مخلص ترین اور محنتی لوگوں میں شمار ہوتے رہے۔ تادمِ تحریر آپ اوکاڑہ میں مقیم ہیں۔

ان کے زیر اہتمام آل انڈیا احرار کانفرنس نہایت کامیاب اور باحسن طریق سے ختم ہوئی تاریخ

میں شیخ بشیر احمد رضوانی کا کردار ہمیشہ زندہ رہے گا۔

اچھوت تبلیغ کانفرنس آل انڈیا احرار پولیٹیکل کانفرنس کے پنڈال میں ۲۴ ؍اکتوبر کو دن کے گیارہ بجے حضرت امیر شریعت کی صدارت میں تبلیغ کانفرنس شروع ہوئی۔ خطبہ مسنونہ کے بعد شاہ جی نے اچھوتوں میں تبلیغ اسلام کے موضوع پر اڑہائی گھنٹے تقریر کی:

"اس وقت ہمارے سامنے تین مسئلے سب سے زیادہ اہم اور غور طلب ہیں۔ پہلا مسئلہ انتخاب کا ہے جس کا ظاہر اتنا دلفریب ہے کہ بڑے سے بڑا تارک الدنیا گوشہ نشین بھی اس کے حسن فریب کی تاب نہ لاسکا اور بے چین ہو کر میدان عمل میں نکل آیا۔ نہ کوئی ہندو بچا، نہ سکھ، نہ عیسائی۔ مسلمان بھی اس سے بے نیاز نہیں۔ کوئی بھی جماعت ایسی نہیں جو مسئلہ انتخاب میں دلچسپی نہ لیتی ہو۔

دوسرا مسئلہ ختم نبوت کا ہے۔ چونکہ مسلمان سیاسی الجھنوں میں پڑ گئے ہیں اس لیے انہوں نے اس طرف توجہ نہیں کی اور ہندوستان کو ابدی غلامی میں جکڑے رکھنے کے لیے قادیانی نبوۃ اپنا جال پھیلا رہی ہے۔ مسلمانوں کو اس دائمی لعنت سے بچنے کے لیے کوئی راہ سوچنی ضروری ہے۔

تیسرا مسئلہ جو اہم ہے اچھوت کا مسئلہ ہے، اور اس وقت تمام ہندوستان کی توجہ ڈاکٹر امبیدکار کے اعلانات کی طرف مرکوز ہے۔ وہ پولیٹیکل اچھوت ہے۔ وہ ہندوؤں سے بخوبی واقف ہے اور وہ جانتا ہے کہ ہندوؤں کو دبانے سے کچھ نہ کچھ مل جائے گا۔ اب وہ ٹاٹ پر بیٹھنا نہیں چاہتا۔ لیکن ہندوستان کے آٹھ کروڑ اچھوت جو ہزاروں سال سے حیوانوں کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں اور اگر ان کا کوئی پرسان حال نہیں۔ اگر ان کو مساوات و انسانیت کا درجہ کسی مذہب میں حاصل ہو سکتا ہے تو وہ مذہب اسلام ہے۔ اسلام کے سوا دنیا کا کوئی مذہب اچھوت کو اپنے میں جذب نہیں کر سکتا۔

کائنات میں سب سے بڑا غلام اچھوت ہے۔ غلام کا جسم اور اس کی کمائی اپنی نہیں ہوتی، بلکہ مالک کی ہوتی ہے۔ لیکن اسلام نے اگر دنیا میں غلام کا درجہ

بلند کر دیا اور اچھوت پر سب سے بڑا احسان کرنے والے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جنہوں نے اپنی پھوپھی زاد ہمشیرہ زید سے منسوب کر دی، جو غلام تھا۔

مذہب اسلام نے مذہب کے معاملہ میں جبر واکراہ سے کام نہیں، بلکہ اپنے عمل سے اسلام کی تلقین کی کہ ایسے لوگوں سے کیا سلوک کیا جائے جو مسلمان نہیں "نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے" لیکن بغیر نشے کے کسی کو پچھاڑنا کام رکھتا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اپنے عمل سے اور اپنے مذہب کی خوبیوں کے ذریعہ اچھوتوں کے ساتھ ایسا سلوک کریں کہ وہ اسلام قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں اور سوائے مذہب اسلام قبول کرنے کے ان کے لیے کوئی چارہ نہ رہے گا۔

کروٹ بدلو اور پکڑلو ان گرے ہوئے اچھوتوں کو اور اپنے سینے سے لگاؤ۔ ہم روپیہ دے کر کبھی بھی ان کی اصلاح نہیں کر سکتے۔ اسلام، اسلام ہے۔ تشنگی بجھانے کے لیے دریا کسی کے گھر نہیں جاتے۔ پیاسے ہی دریا پر جاتے ہیں۔ اگر دریا کسی کے گھر جاتے ہیں تو راوی بن کر جاتے ہیں۔ کوئی تلوار کارگر نہیں ہوتی۔ اخلاق کی تلوار انسان کو ہمیشہ کے لیے رام کر لیتی ہے۔ اس لیے اچھوتوں کو ساتھ ملانے اور دائرہ اسلام میں داخل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ تم اس خلقِ عظیم کو اختیار کرو جو اسلام نے بخشا ہے۔"

مجلسِ احرار کا انتخابی منشور

امرتسر پراونشل احرار پولیٹیکل کانفرنس کے موقعہ پر مفکر احرار چودھری افضل حق نے جو تقریر بطور صدر کی۔ احرار کی ورکنگ کمیٹی نے اسی تقریر کو آئندہ انتخابات کا انتخابی منشور قرار دے دیا جو حسب ذیل ہے۔

"جماعت احرار اگر اپنا انتخابی پروگرام مرتب کرنے کی مجھے اجازت دے تو میں لفظوں میں مطلب کو نہ چھپاؤں۔ بلکہ صاف صاف اعلان کر دوں کہ غریب ہی غریب کی مصیبت کو سمجھ سکتا ہے۔ غریب جماعتوں کے بھیجے ہوئے نمائندے ہی ملک کی ۹۵ فی صدی غریب آبادی کی حالت کو بہتر بنانے کا سچا دکھ درد رکھ کر کام کر سکتے ہیں۔ ہندوستان دنیا کا بہترین زرخیز علاقہ ہے۔ لیکن ملک کی دولت اور تمام کمائی غیر ملکی سرمایہ دار مختلف حیلوں اور بہانوں سے لوٹ کر لے گیا ہے۔ اب بھی اگرچہ لوٹ کھسوٹ

کو بند کرنے کی کوشش کی جائے تو اہلِ ملک فارغ البال ہو سکتے ہیں۔ ان در یں حالات مجلس احرار ہند کے نمائندے ہی ایسے ہو سکتے ہیں، جو انگلستان کے مفاد کے مقابلہ میں کبھی ہندوستانی مفاد کو قربان نہیں کریں گے۔

اگر ہمارا انتخابی حریف یہ اعتراض کرے کہ اقتصادی آزادی سیاسی آزادی حاصل کیے بغیر ممکن نہیں تو میں جواب دوں گا کہ یہ بات تو دراصل ہمارے ہی حق میں ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ملک کے محاصل پر ہمارا پورا قبضہ ہو۔ فوجی اخراجات اور غیر ممالک سے معاہدات ہمارے حسبِ منشا ہوں درآمد اور برآمد پر ہم حسبِ منشا محصول لگا سکیں۔ مجلس احرار سے بڑھ کر سیاسی آزادی کے لیے قربانی کرنے کا کس کو دعویٰ ہے۔ مجلس احرار غلامی کی زنجیریں کاٹنے کے لیے لوگوں کو بلاتی ہے۔ اگر معترض یہ کہے کہ تمہارا پروگرام گورنر اپنے منشا کے خلاف پاکر چلنے نہ دے گا تو میں جواب دوں گا کہ کیا ہمارے حریف گورنر کے حسبِ منشا کام کرنے کے لیے جا رہے ہیں؟ اگر یہ بات ہے تو انہیں بھیجا ہی کیوں جائے؟ ہمارا تو دوسری جماعتوں پر اعتراض ہی یہ ہے کہ حکومت کی مرضی کے مطابق کام کریں گی۔ ان کی ذات کو فائدہ ہوگا۔ لوگوں کو نقصان ہوگا۔

اگر آئندہ اسمبلی میں اکثریت ہمارے ہم خیال لوگوں کی ہو اور گورنر کو وزارت کی ترتیب کیلئے بلانا پڑے تو سب سے پہلے ہماری پارٹی کا لیڈر یہی کہے گا: "یور ایکسیلینسی! جیل اور اسمبلی میرے لیے برابر ہیں۔ نہ جیل کا خوف نہ وزارت میں کوئی کشش ہے، مجھے تو اپنے اہلِ وطن کی خدمت مطلوب ہے۔ میں خدمت کا جذبہ لے کر یہاں آیا ہوں۔ اگر مجھ پر کوئی ذاتی احسان کرنا چاہتے ہو۔ تو آپ کا شکریہ۔ کسی اور کو وزارت کے لیے آمادہ کرو اور مجھے رخصت دو۔" ترتیب کے بعد وہ ان سے کہے گا کہ خدا نے تمہیں خدمتِ خلق کا موقع دیا ہے اسے غنیمت سمجھو اور لوگوں کی بھلائی میں لگ جاؤ۔ اہلِ وطن مصیبت میں مبتلا ہیں۔ ان کو تکلیف میں سے نکالو۔ ہمارے وزراء کا اصولِ سیاست یہ ہوگا۔ کہ وہ برطانوی حکومت کی ناراضگی بھی برداشت کریں گے۔ لیکن وطن اور اہلِ وطن کے ساتھ غداری نہیں کریں گے۔ سب سے اول وہ اپنی توجہات افلاس، جہالت کو دور کرنے اور انصاف اور حفظانِ صحت کی طرف منعطف کریں گے۔ معاملہ سرکار وصول کرنے میں یہ امر ملحوظ رکھیں گے کہ زمیندار کا پیٹ کاٹ کر تو معاملہ خزانہ میں داخل نہیں کیا جاتا اور بتدریج اس پیداوار کو معاملہ کے قابل سمجھا جائے گا۔ جو

زمیندار کے خاندان کی پرورش کے بعد بچ رہے۔ یتیم سے معاملہ وصول کرنا بغیر اس امر کی تحقیق کے کہ اس
کی پرورش کا کیا انتظام ہے یا بیوہ سے معاملہ وصول کرنا بغیر یہ دریافت کرنے کے کہ اس کا گزارہ ہے
یا نہیں قطعاً ناقابلِ فہم ہے۔ ہم ایکٹ انتقالِ اراضی کے متعلق ضلع وار تحقیق کریں گے کہ کہیں کوئی قوم
اور فرقہ اپنی مسرفانہ عادات کی وجہ سے اراضیات کو غیر معمولی سرعت سے فروخت تو نہیں کر رہا۔ اور اس
کے انسداد کا بندوبست کیا جائے گا۔ مبادا وہ فرقہ یا قوم اور چند سالوں میں گزارے سے محروم ہو کر
حکومت کی پریشانی کا باعث بن جائے۔ محکمہ امدادِ باہمی کے متعلق ہم اپنی کونسل میں پیش کردہ تصریحات
پر قائم رہیں گے۔ یعنی سود پر قرض دینے والی سوسائٹیوں کو بتدریج کم کر کے ان کی بجائے قرضِ حسنہ
کا طریق رائج کیا جائے گا۔ ورنہ سود پر روپیہ دینے والی انجمنوں کی وجہ سے قارض اور مقروض دونوں
تباہ ہو جائیں گے۔

معترض کو میں جواب دوں گا کہ سود کے عام طور پر یہ معنی ہیں کہ ایک ایسے بھائی کی مصیبت
سے جو مشکلات میں مبتلا ہے ناجائز فائدہ اٹھایا جائے۔

غلے کی منڈیوں میں ایسے سرکاری ایجنٹ مقرر کیے جائیں گے، جو سادہ لوح زمینداروں کو چالاک
خریداروں کے ہیر پھیر اور لوٹ کھسوٹ سے بچائیں۔ اجناس کو منڈیوں میں سہولت بہم پہنچانا ہماری حکومت
کا فرض ہوگا۔ کمین کہلانے والی قوموں کے ساتھ زمینداروں کے منصفانہ تعاون پر اصرار کیا جائے گا۔ تمام
سرکاری محکموں میں دیسی مصنوعات کے استعمال پر زور دیا جائے گا۔ جو چیزیں ملک میں نہ بن سکیں ان کی
ساخت کے فوری ذرائع سوچے جائیں گے۔ ان سرمایہ داروں کو معزز و محترم سمجھا جائے گا۔ جو غیر ملکی
مصنوعات کا مقابلہ کرنے کے لیے حوصلہ مندی کا ثبوت دیں، اور ہماری حکومت انہیں ہر قسم کی سہولتیں
بہم پہنچائے گی۔

انگلستان جیسے صنعتی ملک نے زراعت کی حوصلہ افزائی شروع کر دی ہے۔ ہندوستان جیسے
زراعتی ملک کے لیے ضروری ہے کہ زراعت کو اعلیٰ پیمانے پر پہنچانے کی سعی کے ساتھ ساتھ صنعتی طور سے
دنیا کا مقابلہ کرے تا کہ خام اجناس کی کھپت بھی اس ملک میں ہو سکے۔ ہمارے بچے بھی کام پر لگے
رہیں۔ اور ہمارا ملک کسی دوسرے ملک کا محتاج بھی نہ رہے۔ پھلوں کی پیداوار کا خاص اہتمام اور
سرکاری طور پر اس کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔ لیکن صنعتی مراکز قائم کرنے کے ساتھ ساتھ ہماری حکومت

کی سب سے زیادہ توجہ مزدوروں کی بہتری پر مرکوز ہوگی۔ اور ان کے مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے اوقات اور اُجرت کا تعین کیا جائے گا۔

تفصیل پروگرام

۱۔ ہمارے وزراء قلیل ترین تنخواہ پر گذارہ کریں گے۔ تاکہ قومی اخلاق کا بہترین معیار پیش کیا جا سکے۔

۲۔ کم تنخواہ والے ملازمین کی تنخواہ کے اضافہ کا خاص خیال رہے گا۔ تاکہ جائز کمائی سے پیٹ پال سکیں

۳۔ گھریلو صنعتوں کے رواج میں بحدامکان کوشش کی جائے گی۔

۴۔ پاپندوں (جولاہوں) کو موجودہ تباہ حالی سے بچانے کی کوشش کی جائے گی۔

۵۔ گداگری کا انسداد اس ہمدردانہ طریق پر کیا جائے گا کہ ہر ایک گداگر ایک بہتر کاریگر اور شریف شہری بن جائے۔ علاوہ ازیں عمر رسیدہ، اپاہج اور لاوارث افراد کے لیے محتاج خانوں کا انتظام کیا جائے گا۔

۶۔ دریا کے کنارے پر بسنے والے لوگوں کو طغیانی سے جو نقصان پہنچتا ہے۔ ان کو فوری امداد بہم پہنچانے کا بندوبست کیا جائے گا۔

۷۔ ان تجربات کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں مدد دی جائے گی، جن کے ذریعہ رطوبت سے پیدا شدہ دلدلوں کا انسداد ہو سکے۔ اور ایسے علاقوں کی ہر گونہ امداد کی جائے گی۔

۸۔ غیر مزروعہ رقبہ جات کو زیر کاشت لانے کے اسباب مہیا کیے جائیں گے۔

و۔ کاشت کے جدید اور سائنٹفک طریقوں کی ترویج اور ایسے اسباب مہیا کرنا کہ زرعی پیداوار میں ترقی ہو۔

ب۔ محکمہ جنگلات کو کاروباری طریقہ پر چلانے کا بندوبست کیا جائے گا۔ علاوہ ازیں جنگلات کے قریب بسنے والی آبادی کی مشکلات کو رفع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

۹۔ موجودہ طریقہ تعلیم چونکہ ہماری ضروریات پوری نہیں کرتا۔ بلکہ ملک میں بیکاری کی مصیبت پیدا کرنے کی وجوہ میں سے ایک ہے۔ لہٰذا ہماری حکومت اس میں ضروری تبدیلیاں کرے گی اور ایسا نصاب تجویز کرے گی جو آزادی وحب الوطنی کا جذبہ پیدا کرے اور بیکاری کا خطرہ بھی ہمیشہ کے لیے دور ہو جائے۔

۱۰۔ جدید طریقہ تعلیم کے مطابق علم کو ملک میں فروغ دیا جائے گا۔ اور ہماری حکومت کی کامیابی اور

ناکامی تعلیم کے اسی فروغ پر موقوف ہوگی۔

(ب) جدید طریقہ تعلیم کی ایک خصوصیت یہ ہوگی کہ اس پر اخراجات کم از کم ہوں گے اور طلبار کو سہولتیں بہم پہنچانا ہماری حکومت کا فرض ہوگا۔

(ج) اس بات کا خاص طور پر اہتمام کیا جائے گا کہ بچے آوارہ نہ پھریں اور کوئی بچہ بغیر تعلیم کے نہ رہے۔

(د) علمی تحقیقات کے سلسلہ میں کام کرنے والوں کے لیے خاص سہولتیں بہم پہنچائی جائیں گی اور ان کیلئے خاص وظائف مقرر کیے جائیں گے جو کسی علمی تحقیق کے لیے اپنی زندگی وقف کر دیں۔

حفظانِ صحت

۱۰۔ صفائی کے افسوسناک فقدان کی طرف بذریعہ تقریر و تحریر لوگوں کو متوجہ کیا جائے گا اور حکومت کی طرف سے صفائی کے لیے ہر ممکن سہولت بہم پہنچائے گی۔

۱۱۔ تمام دیسی کھیلوں کی سرکاری طور پر حوصلہ افزائی کی جائے گی۔

۱۲۔ تمام دیہاتی مراکز میں ڈسپنسریاں قائم کی جائیں گی۔

۱۳۔ طب یونانی اور جدید طریقہ ہائے علاج اور ہومیوپیتھک وغیرہ کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔

حیوانات

۱۴۔ مویشیوں کے علاج کے لیے زیادہ سے زیادہ ویٹرنری ڈسپنسریاں قائم کی جائیں گی۔

۱۵۔ گائے بھینس۔ گھوڑے وغیرہ مویشیوں کی نسل افزائش کیلئے زیادہ سے زیادہ مرکز قائم کیے جائیں گے۔

محکمہ انصاف

۱۶۔ پنجاب کونسل کے ریزولیشن ۱۹۲۱ء کی بنار پر جوڈیشل اور ایگزیکٹو اختیارات کو علیحدہ رکھا جائے گا۔ تاکہ انتظامی افسر اپنی مرضی پر انصاف کو قربان نہ کر سکیں۔

۱۷۔ موجودہ پنچایت سسٹم پر نظر ثانی کی جائے گی۔ اور ایسے پنچایت افسر مقرر کیے جائیں گے، جنہیں صحیح معنوں میں اہل ملک کی تربیت کا خیال ہو۔

انسدادِ رشوت ستانی

لنگ کمیٹی اور ریڈن کمیٹی کی تحقیقات کی بنار پر ایسے آزاد بورڈ کا قیام جس میں سرکاری اور غیر سرکاری ممبر شامل ہوں، جو حکومت کے تمام محکمہ جات کا جائزہ لیں اور رشوت ستان افسروں کا سراغ لگائیں اور انہیں

محکمانہ یا عدالتی سزائیں دلوائیں۔ علاوہ ازیں ہماری گورنمنٹ بذریعہ اعلان تمام ملازمین پر یہ امر واضح کرے گی کہ رشوت رعایا کے ساتھ بدسلوکی ناقابل عفو جرم ہے۔ البتہ جھوٹے الزامات کی صورت میں حکومت کی طرف سے ملازمین کو امداد کا یقین دلایا جائے گا۔

لوکل سیلف گورنمنٹ

تمام ڈسٹرکٹ بورڈوں، میونسپل کمیٹیوں اور سمال ٹاؤن کمیٹیوں میں نامزد عنصر کو ختم کر دیا جائے گا۔ تمام ڈسٹرکٹ بورڈوں کے صدر منتخب اراکین میں سے بذریعہ انتخاب بنائے جائیں گے۔ ایگزیکٹو افسروں کی بجائے پبلک سرونٹس کا تقرر عمل میں لایا جائے گا۔ جو وقتاً فوقتاً بذریعہ تقریر و تحریر لوگوں کو بہتر شہری بننے کی ترغیب دیں۔

محکمہ پولیس

پولیس ٹریننگ سکول میں اخلاقی تعلیم کا انتظام کیا جائے گا۔ اور تین سال کی ملازمت تین ماہ کا ایک کورس مقرر کیا جائے گا۔ جس میں بلاتشدد سراغ رسانی کی تعلیم دی جائے گی۔ تاکہ تفتیش جرائم میں لاتوں اور ہاتھوں کی بجائے دماغ سے کام لیا جائے۔

پولیس حوالات کی اصلاح کی جائے گی۔ اور پولیس رولز پر نظر ثانی کی جائے گی۔

محکمہ جیل

۱۹۲۱ء کے امپیریل کمیشن اور ۱۹۲۰ء کی یوپی تحقیقاتی کمیٹی اور پنجاب کی جیل انکوائری رپورٹ کی سفارشات کو جامہ عمل پہنایا جائے گا۔ اور خصوصیت کے ساتھ جیل کا انتظام ان بنیادوں پر قائم کیا جائے گا جو اس رپورٹ کے اختلافی نوٹ کے حسب منشاء ہوں۔

بورسٹل انسٹی ٹیوشن

بورسٹل انسٹی ٹیوشن کو انگلستان کے بورسٹل انسٹی ٹیوشن کے نمونہ پر بنایا جائے گا۔ تاکہ یہ جیل صحیح معنوں میں بچوں کی تربیت گاہ بن سکے۔

سرکار کا حامی پکار اٹھے گا کہ یہ تو وہ پروگرام ہے جس کی بنیاد ۱۹۳۰ء کی اس گفت و شنید پر رکھی گئی ہے جو مہاتما گاندھی، پنڈت موتی لال اور پنڈت جواہر لال اور لارڈ اردن کے درمیان ہوئی تھی۔ سرکاری قرضوں کی چھان بین، درآمد و برآمد پر حسب منشاء پابندی اور قومی بجٹ میں حسب منشاء ترمیم، فوج کے بجٹ میں

مناسب ترمیم اور غیر ممالک سے حسب منشار معاہدات یہ تو ایسی چیزیں ہیں جس پر حکومت برطانیہ بحالت موجودہ متفق نہیں ہو سکتی۔ گویا مجلس احرار کے پروگرام کے دوسرے معنی یہ ہوئے۔ کہ یہ مجلس آئین نو کو قبول کرنا پسند نہیں کرتی ہمارا نکتہ چیں اس پروگرام کے متعلق خواہ کچھ کہے۔ مگر امر واقعہ یہی ہے کہ متذکرہ صدر چیزوں کے بغیر جو آئین ہو گا وہ مفلس کسانوں، غریب زمینداروں اور بے کس مزدوروں کی امداد کرنے سے قاصر رہے گا۔ اور جب ملک کی ۹۹ فیصدی آبادی کی بھوک کا کوئی علاج نہ ہو۔ تو آئین نو کو کون پسند کرتا ہے۔ ایک آدھ سکول اور دو چار ہسپتال کھول دینے سے ملک کی اقتصادی مشکلات میں کوئی کمی نہیں ہو سکتی۔ اور فاقہ مست لوگوں کی یہ کوئی صحیح امداد نہیں۔

محتاط لوگ مجلس احرار کو شاید احتیاط کا مشورہ دیں کہ اس دوررس پروگرام کی حقیقت کو کہیں الٹے معنی دے کر عوام الناس کو مخالفین گمراہ کرنے کی کوشش نہ کریں۔ اور کہیں کہ یہ جماعت تو عہدے قبول کرنے کے حق میں نہیں ہے اور جو وزارت قبول نہ کرے وہ عوام کا کیا کام کرے گی۔ اس کے متعلق ہمارا صاف جواب یہ ہونا چاہیے کہ جب تک یہ مبادیات طے نہ ہو جائیں، تب تک آئین نو کو کامیاب بنانے کا سوال اس لیے پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس میں ہندوستان کی عام آبادی کا کوئی بھلا نہیں۔ کوئی دیانتدار جماعت بھی آئین نو کو قبول کر کے ہندوستان کی کثیر التعداد نیم فاقہ کش آبادی کے درد کا مداوا نہیں کر سکتی۔

البتہ ملکی سیاست کے طور پر وزارتوں پر قابض ہو کر مزید اصلاحات کے لیے حکومت کو آئینی طور پر مجبور کرنے کی پالیسی کو اختیار کرنا اور بات ہے۔ یقیناً مجلس احرار کو آئندہ اسمبلی میں اکثریت حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ تاکہ گورنمنٹ کو مجبور کیا جائے کہ وہ آئین نو میں متذکرہ ترمیمیں کر کے تبدیلی کرے اور اگر خدانخواستہ کسی وجہ سے اکثریت کا حاصل ہونا ممکن نہ ہو۔ تو دوسری ترقی پسند جماعتوں سے اتحاد کرنے سے انکار نہیں کرنا چاہیئے تاکہ رجعت پسند عناصر کو ملکی سیاست سے نکال دیا جائے۔ رجعت پسند عناصر کو برسراقتدار آنے کا موقع نہیں دینا چاہیے۔ اور ۱۹۲۰ء کی طرح آئین کا بائیکاٹ نہ ہونا چاہیے۔

قادیانی جماعت اور احرار

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ حکومت قدرتی طور سے ان لوگوں کو برسراقتدار دیکھنا چاہتی

ہے جو اس کے اغراض و مقاصد میں ممد و معاون ہوں۔ مگر ملکی مفاد کا تقاضا یہ ہے کہ سرکار پرست لوگوں کی قوت کو کم کیا جائے۔

غیر ملکی حکومت اپنے استحکام و دوام کے لیے صرف خود غرض افراد کے سیاسی گروہوں ہی سے فائدہ نہیں اٹھاتی۔ بلکہ لوگوں کے مذہبی رجحانات سے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتی ہے۔ قادیانی فرقہ برطانیہ کے زیر سایہ نشوونما پاتا رہا ہے۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ اس فرقے کا بانی انگریز کی غلامی پر قانع اور چاپلوسی کا عادی تھا۔ آزادی کی تڑپ شرافت کی قومی دلیل ہے۔ اس معلم اخلاق کے بارے میں کیا کہا جائے جو غیر ملکی حکومت کی وفاداری اپنے مذہب کی ضروری شرط قرار دے۔ کیا وہ نبی مذہبی اور سیاسی طور پر قابل پیروی ہے۔ جس کے الہامات اور وحی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے حکم سے رک جائیں اور جو خود اپنی جماعت کو حکومت کا خود کاشتہ پودا کہے۔

ہمیں اس جماعت سے صرف یہی شکایت نہیں کہ وہ اسلام کے شیرازے کو بکھیرنا چاہتی ہے بلکہ یہ شکایت بھی ہے کہ وہ ان قوتوں سے ساز باز رکھتی ہے جو ملک کو دائمی طور پر غلام رکھنا پسند کرتی ہیں۔ یہ جماعت کبھی ترقی پسند لوگوں کے ساتھ مل کر کام نہیں کر سکتی۔ اس سے آزادی کی جنگ میں شرکت کی کبھی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے ہر محب وطن کا فرض ہے کہ ملک کے اس دشمن کے منصوبوں سے آگاہ رہے۔ میں ملک کی سیاسی جماعتوں کے علاوہ اسلامی جماعتوں سے بھی متوقع ہوں کہ عالم اسلام کے مخالف اس قادیانی گروہ کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھیں۔ یہ دوست بن کر مسلمانوں کی دشمنی کرتے ہیں۔ ہر اسلامی سلطنت ان کی جاسوسی سے خبردار رہنے کی کوشش کرتی ہے۔ حکومت کی کھلی حوصلہ افزائی کے باعث یہ مسلمان شمار ہو کر مسلمانوں کے حقوق پر جلد جلد قابض ہو رہے ہیں۔ مسلمانوں کو ایسے حالات پیدا کر دینے چاہئیں کہ مسلمانوں کے نام پر قادیانی فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ الحمدللہ احرار اور دوسرے متقدر مسلمانوں کی مساعی سے عامۃ المسلمین ان کی فتنہ انگیزیوں سے باخبر ہو رہے ہیں۔ اور چونکہ احرار منظم ہیں۔ اس لیے مرزا محمود کا سارا غصہ احرار کے خلاف ہے اور اس مقولہ کی بنا پر کہ جنگ میں ہر ہتھیار کا استعمال کرنا مناسب ہے۔ وہ غیر دیانت دارانہ مخالفت سے بھی نہیں چوکتا۔ قادیانی گروہ باوجودیکہ مسجد شہید گنج کے معاملہ میں حسب معمول سول نافرمانی کے مخالف تھا تاہم احرار کو بدنام کرنے کے لیے بعد میں خفیہ طریقہ پر بے دریغ روپیہ صرف کرتا رہا۔ آخر اسے صاف طور پر اعلان کرنا پڑا کہ بے شک مرزائی احرار کے

خلاف پوسٹر نکالتے رہے ہیں۔ اب بھی وہ ہماری مخالفت میں کوتاہی نہیں کر رہے۔ ہمیں ان سے گلہ نہ ہونا چاہیے۔ البتہ مسلمانوں کو بتانے کی ضرورت ہے کہ احرار کی مخالفت میں مرزائی خطیر رقم خرچ کر رہے ہیں۔ وہ مسلمان بن کر اہل ایمان کے سامنے آتے ہیں اور ان کو مجلس احرار کے خلاف ورغلاتے ہیں۔

باوجود اس کے کہ مسٹر جناح کی مساعی سے مسجد شہید گنج کے معاملہ میں عام مسلمانوں کا نقطہ نگاہ ایک ہو گیا ہے۔ اور ساری قوم نے اسی خیال کو قبول فرمانا پسند کیا ہے۔ جو مجلس احرار نے ابتدا میں ظاہر کیا تھا۔ تاہم قادیانی گروہ بدستور فتنہ انگیزی میں مصروف ہے۔ انہیں مسلمانوں کی اتحاد خیالی بھی پسند نہیں۔ وہ اب بھی چاہتا ہے کہ کوئی گروہ اٹھے اور کہے کہ احرار کا زاویہ نگاہ غلط ہے۔ سول نافرمانی کے ذریعہ ہی مسجد مل سکتی ہے۔ الحمدللہ کہ ڈاکٹر محمد عالم نے قادیانیوں کی توقع پر عدالت میں یہ کہہ کر پانی پھیر دیا کہ مدعیان اور تمام مسلمانوں کو جن کے وہ نمائندہ ہیں۔ اس آپ کے انصاف پر کامل اعتماد ہے۔ مجھے امید ہے کہ فیصلہ خواہ کچھ ہو۔ اس فیصلے کے بعد مسلمان کوئی غیر آئینی کارروائی نہیں کریں گے۔

یہ امر اور بھی موجب مسرت ہے کہ مولانا ظفر علی خاں صاحب اور دوسرے نظر بندوں نے سکوت سے ڈاکٹر عالم کی تائید کی۔ ڈاکٹر موصوف کی تصریحات کے خلاف کوئی پروٹسٹ نہیں کیا۔ حالانکہ وہ اخبارات کے مالک ہیں۔

اب قادیانیوں کی لے دے کے امید یہ رہ گئی ہے۔ کہ وہ ہمارے بعض دوستوں کی ذاتی رقابتوں سے فائدہ اٹھائیں۔ اس کا ہم نے یہ انتظام کیا ہے کہ ایسے دوستوں کی اشتعال انگیز تقریروں اور تحریروں کے باوجود ہم تحمل سے کام لیتے ہیں۔ وہ سب دشنام کر کے خود ہی تھک جائیں گے۔ ہمارے اخلاق کی شاندار فتح ہوگی۔

تعجب ہے کہ بعض بزرگ مرزائیوں کے پھندے میں پھنس کر مرزا بشیر الدین محمود کے بل بوتے پر احرار کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ لوگ جو دولت دین لٹا کر مرزائیوں کے ساتھ اس لیے شامل ہیں کہ انہیں دنیا میں کچھ فائدہ پہنچے گا۔ وہ کان کھول کر سن لیں کہ مسلمانوں کے نزدیک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بعد ہر رنگ میں نبوت کا دعویدار گروہ شیرازہ اسلامی کو پراگندہ کرنے والا سمجھا جاتا ہے۔ ایسے گروہ کی امداد پر جو دنیا میں سرفرازی چاہے گا۔ انشاءاللہ نیچا دیکھے گا۔ مرزائیوں کی اتحادی پارٹی کے خلاف مجلس احرار ہر جگہ اپنے امیدوار کھڑے کرے گی۔ مسلمانوں سے کامل توقع ہے کہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن قادیانیوں اور ان کے ساتھیوں کی آرزوؤں کو خاک میں ملا دیں گے۔

منٹو چمسفورڈ ریفارم سکیم

شہری اور دیہاتی کا سوال کھڑا کر کے ہشیار لوگوں نے خوب الو سیدھا کیا اور ملکی مناصب پر قبضہ جمائے رکھا۔ مجلس احرار کے نزدیک شہر اور دیہات کی تمیز چنداں مفید نہیں۔ پس ماندہ لوگ خواہ کسی حصہ ملک میں آباد ہوں ہماری یکساں توجہ کے محتاج ہیں۔ مصیبت زدہ شہر میں ہو یا دیہات میں حکومت کی امداد کا مستحق ہے۔ مصیبت زدہ اور پس ماندہ لوگوں میں تمیز کرنا عدل و انصاف کے منافی ہے۔ مجلس احرار میں شہری اور دیہاتی دونوں عنصر کامل اتحاد و اتفاق سے کام کر رہے ہیں۔ آئندہ بھی امید ہے کہ شہر اور دیہات کی فلاح و بہبود کے لیے وہ بدستور سابق منہمک رہیں گے۔

اسی طرح لائق شہری کے مقابلے میں دیہات کے نالائق آدمیوں کو منصب پیش کرنا بدترین پالیسی ہے۔ البتہ دیہاتی کے حقوق کو نظر انداز کر دینا بھی افسوسناک نتائج پیدا کرنے کا باعث ہوگا۔ اس لیے آئندہ آئین میں حزم و احتیاط کے ساتھ کام کرنا پڑے گا۔ مبادا کسی فریق کو جائز شکایت پیدا ہو جائے۔

مسلمان اور ملازمتیں

مسلمان ملازمتوں میں مناسب حصہ لینے کے آرزومند ہیں۔ اگرچہ مجلس احرار کے خلاف ہندو نوازی کا الزام ہے، تاہم میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ مجلس احرار کے نمائندوں نے کم سے کم ملازمتوں میں مناسب حصہ کے لیے اتنی کوشش کی ہے کہ اور مسلمان ممبر ایسا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ مسلمانوں کے ملازمت کے حصہ میں میرے اپنے سوالات باقی تمام ممبران سے زیادہ ہیں۔ میرے ذاتی تاثرات یہ ہیں کہ حکومت وقت نے اس بارے میں معنی خیز تساہل سے کام لیا۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کونسل میں ہندو اور مسلمان کی ۹! برس کی تو۔ تو۔ میں۔ میں کے باوجود مسلمانوں کو کچھ فائدہ نہ پہنچا، بلکہ بعض حالات میں الٹا نقصان پہنچا۔ مجھے امید ہے کہ مجلس احرار کے نمائندے اپنی اولین فرصت میں ملازمتوں میں مبنی برانصاف حصہ حاصل کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔

ملازمتوں میں اپنی مساعی کے ساتھ ساتھ میں مسلمان ملازموں کی توجہ بیرون ہند کی سیاسیات کی طرف مبذول کرانا بھی مناسب سمجھتا ہوں۔ بدقسمتی سے حکومت ہند جب کبھی ملازمتوں میں مسلمانوں کے ساتھ انصاف کرنے کا اعلان کرتی ہے، تو متصل ہی کسی نہ کسی اسلامی ملک پر اغیار کے جارحانہ اقدام کی خبر

آجاتی ہے، اور مسلمانانِ ہند ملازمتوں کے سبز باغ دیکھتے ہیں۔ لیکن بیرونِ ہند کے مسلمان خاک و خون میں لٹا دیے جاتے ہیں اور ہندوستان کی ۹ کروڑ مسلمان آبادی سے صدائے احتجاج تک بلند نہیں ہوتی۔ ہمیں ملازمتوں کے اس مہنگے سودے پر خاص نظر رکھنی چاہیے۔ سب باتوں پر آزادیٔ ہند کو ترجیح دینی چاہیے تاکہ ہمسایہ قوم کے ساتھ خوشگوار تعلقات پیدا کر کے ہندوستان میں اپنی پوزیشن مضبوط کر لیں اور خود آزاد ہو کر اسلام اور ممالکِ اسلامی کو غیروں کی غلامی سے آزاد کرا سکیں۔ میں پھر بھی مجلسِ احرار کے دعویٰ کا اعادہ کرتا ہوں۔ کہ ہندوستان کی آزادی پر ہی عالمِ اسلام کی آزادی منحصر ہے۔ ہر مسلمان نوجوان سے مجلسِ احرار کو یہی توقع ہے۔ کہ وہ آزادیٔ ہند کے بلند مقصد کو نظر سے کبھی اوجھل نہیں ہونے دے گا۔

خدمتِ اہلِ وطن

نئے انتخابات کا شور و شغب آئندہ سال تک ختم ہو جائے گا۔ لیکن ملک کے سیاسی اخلاق کو بلند کرنے کی سعی ہر وقت اور ہر حال میں جاری رہنی چاہیے۔ سیاستِ ملکی کا زریں اصول اور مذہب کی جان یہ ہے۔ کہ اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر اہلِ وطن اور مخلوقِ خدا کی خدمت کی جاتے۔ جس قوم کے افراد میں قربانی کی روح زیادہ ہوگی، وہی معزز اور محترم ہوگی۔ نوجوان سیاسی میدان میں آنے سے پہلے یہ سوچ لیں کہ وہ قوم کے سیاسی اخلاق کو بلند کرنے کی کہاں تک قابلیت رکھتے ہیں۔ اس قابلیت کا معیار محض علم اور سرمایہ نہیں۔ بلکہ سارا دار و مدار قربانی اور مخلوق کی خدمت کے سچے جذبے پر ہے۔ خدمت میں عظمت ہے۔ اگر ایسا کرو گے تو اطمینان کی دولت حاصل کر لو گے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے، جو سیم و زر کے انبار سے زیادہ تسلی دیتی ہے۔ وطن کی محبت کو عشق کے درجے تک پہنچاؤ۔ عشق میں سوداگری نہیں ہو سکتی۔ وہاں لینے کی توقع چھوڑ کر سب کچھ دینا ہی پڑتا ہے۔ اس لیے اہلِ وطن کی خدمت میں بہتریں آرزوں کو قربان کرنے کا ارادہ کر کے اٹھو۔ دعا کرو کہ خدا ہمیں دین اور اسلام کی خدمت کا موقع دے۔ آمین"

(چودھری) افضل حق

عبداللہ گاندھی کی مخالفت ۵ اکتوبر کو مولانا شوکت علی نے ایک بیان میں جو ہفت روزہ دہلی میں شائع ہوا۔ کہا کہ

"میرے دوستوں نے مجھ سے سوال کیا کہ میں کانپور تبلیغ کانفرنس میں کیوں شامل نہیں ہوا، جس کی صدارت عبداللہ گاندھی کر رہے تھے۔؟ اگر میرے دوست یہ بات سمجھتا

چاہتے ہیں تو میں کہتا ہوں کہ میں اس شر انگیز تحریک میں شامل ہونے کے لیے تیار نہیں ہوں، جس کا مقصد صرف یہ ہو کہ ہیرالال گاندھی کے مسلمان ہونے کی تشہیر کی جائے، جو مسلمانوں کو لوٹنے کے لیے حلقۂ اسلام میں آیا ہے۔

مسٹر فضل الحق کا جواب ۲۹۔ اکتوبر کو مسٹر محمد علی جناح نے، مسٹر فضل الحق سے جو کلکتہ کارپوریشن کے میئر اور بنگال کے مزارعوں کے صدر بھی تھے، ایک خط کے ذریعے یہ دریافت کیا ہے کہ انہوں نے مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ سے غداری کیوں کی؟۔ اس کے جواب میں فضل الحق نے کہا، کہ

"مسٹر جناح مزارعین کے حامی اور سرمایہ داروں کے شدید مخالف تھے، مگر جس وقت سے آپ نے گورنمنٹ ہاؤس میں وزیروں کی پارٹی سے ملاقات کی ہے۔ آپ کے حالات میں دفعتاً انقلاب پیدا ہو گیا ہے۔ یہی انقلاب ہے، جو مزارعین کے مفاد کو زخمی کرتا ہے۔"

آگے چل کر مسٹر فضل الحق نے مسٹر جناح کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کا اپنا طریقِ کار مسلمانوں کا اعتماد کھو چکا ہے۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے، مسلمانوں کی خواہشات کو آپ مسخ کر رہے ہیں۔ لیگ پارلیمنٹری بورڈ آپ کی ہوس کا تیار کردہ ہے۔ اور وہ مسلم طبقات میں گہری خلیج حائل کر رہا ہے۔ آپ کی پرائیویٹ گفت و شنید سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ مسلمانوں کے اتحاد کے سب سے بڑے علمبردار ہیں۔ اور مسلمانوں کے مفاد کے لیے بہت زیادہ مصروفِ عمل ہیں۔ مگر جس وقت آپ پبلک پلیٹ فارم پر کھڑے ہوتے ہیں، آپ اپنے آپ کو ہندوستانی وطن پرستی کے سخت پیروکار ظاہر کرتے ہیں۔ جیسے ہندو مسلم اتحاد کی سیاست کے سوا کچھ بھی بھلا معلوم نہیں ہوتا۔"

(روزنامہ "انقلاب" ۳۰۔ اکتوبر ۱۹۳۶ء)

قائداعظم اور روزنامہ "انقلاب" بعض دفعہ انسان ذاتی منفعت کے لیے انسانیت ضائع کر بیٹھتا ہے۔ حالانکہ یہی وہ زیور ہے، جس سے آراستہ ہو کر انسان، انسان کہلاتا ہے۔ ورنہ خالق کی مخلوق بحر و بر میں اس قدر پھیلی ہوئی ہے کہ اس کا شمار دشوار ہو رہا ہے۔

آسمان کے ستاروں سے زمین کے ذرات، حیوانات سے نباتات اور جاندار سے غیر مرئی مخلوق میں سے پروردگار نے انسان کو اشرف یا احسن مخلوق کہہ کر پکارا۔ صرف اس لیے نہیں کہ مالک الملک کو اپنی عبادت یا بندگی مقصود تھی۔ بلکہ اس لیے اور صرف اس لیے کہ کائنات میں عقل و شعور رکھتے ہوئے برے بھلے کی نشاندہی کر سکے۔ اور اپنی دانشمندی سے بھولے بھٹکوں کو سیدھی راہ پر چلنے کی ترغیب دے لیکن یہی ناخدا جب انسانیت کے پتوار توڑ کر طوفان میں الجھ جائے تو ساحل پر پہنچنے والے نہنگوں کی خوراک بن جاتے ہیں۔

اک زمانہ تھا جب پنجاب کی صحافت اس قدر بلند مقام پر فائز تھی کہ ہندوستان کے دوسرے صوبے اس کے نقش پا ڈھونڈتے تھے۔ مگر اب ؎

ایوانِ آمریت میں قلم نیلام ہوتا ہے
چھچھورے آگئے جب سے صحافت چھوڑ دی ہم نے
(جانباز مرزا)

ہزار سیاسی اختلاف کے باوجود مسٹر محمد علی جناح متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے قابلِ احترام شخصیت تھے۔ جن افراد یا جماعتوں نے ان کی رائے سے اختلاف کیا وہ اپنی جگہ درست ہوں یا غلط، لیکن یہ حقیقت ہے کہ یونینسٹ پارٹی کے آرگن روزنامہ انقلاب کے مدیران نے قلم اور ضمیر کا جس سستے بھاؤ سرکاری سودا کیا اس کی مثال اس دور میں پنجاب کی صحافت میں کم دکھائی دیتی ہے اس ضمن میں ۴۔ نومبر ۱۹۳۶ء کے اخبار انقلاب کے ایک طویل مضمون "جناح اور سیاسیات" سے چند اقتباس درج ذیل ہیں۔

"بمبئی مسٹر جناح کا وطن ہے۔ حال ہی میں جو فرقہ وارانہ فسادات (بمبئی) وہاں رونما ہوئے وہ مسٹر جناح کی عام حیثیت کو بے نقاب کرنے کے لیے کافی ہیں۔ جن کے پروان چڑھانے کے لیے وہ چند ماہ سے کوشاں ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات روز بروز زیادہ ہو رہے ہیں اور نہایت شرمناک صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ مسٹر جناح کو ان سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ ان کا سیاسی پرچار ہندوستان کے مختلف فرقوں کے درمیان حائل خلیج کو روز بروز وسیع تر کیے جا رہا ہے۔ اس بھیانک صورت حالات پر قابو پانے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ مختلف صوبوں کی غیر فرقہ وار پارٹیوں کو مضبوط بنایا جائے۔

"اپنے نام نہاد پارلیمنٹری بورڈ کو منظم کرنے کی غرض سے گذشتہ چند ماہ میں مسٹر جناح کئی دفعہ پنجاب آئے۔ مگر ان کی کوششیں ناکام رہی ہیں۔ اپنے مشن کو کامیاب بنانے میں انہوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ لیکن ان کا دعظ صدا بصحرا ثابت ہوا ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ ہندوستان میں کسی جگہ بھی مسٹر جناح کو کامیابی نہیں ہوئی تو میرے اس بیان میں ذرّہ برابر بھی مبالغہ نہ ہوگا"

•

"یہ کہہ کر مسلمانوں کی آنکھوں میں خاک ڈالنے سے کچھ فائدہ نہیں کہ مسلمانوں کو منظم کیا جا رہا ہے۔ اس کے برعکس جناح کو جب بھی موقع ملا ہے، انہوں نے مخالف فرقوں میں تفرقہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ کیا انہیں یاد نہیں کہ ۱۹۲۷ء میں انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اس وقت باوجودیکہ تمام ہندوستان کے مسلمان جداگانہ طریق انتخاب کے حامی تھے۔ مگر مسٹر جناح مخلوط انتخاب کے علمبردار تھے۔ مسلمانوں کے جذبات کا احترام نہ کرتے ہوئے انہوں نے مسلم لیگ کا اجلاس منعقد کیا۔ لیکن خوش قسمتی سے وہ اجلاس کامیاب نہ ہوا اور ان کی سکیم کو تقویت نہ پہنچ سکی۔ کیا انہیں یاد نہیں کہ ۱۹۲۰ء میں انہوں نے لیجسلیٹو اسمبلی میں سنٹرل مسلم پارٹی بنائے جانے کے راستے میں کتنے روڑے اٹکائے تھے۔ اس کے خلاف مسٹر جناح کی دلیل یہ تھی کہ میری اپنی پارٹی انڈیپنڈنٹ غیر فرقہ وارانہ جماعت ہے اور یہ کہ مجالس آئین ساز میں فرقہ وارانہ پارٹیاں نہیں بنائی چاہئیں"

•

"مسٹر جناح کو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ مدت ہوئی ان کا مشن پنجاب میں ناکام ہو چکا ہے۔ اس حقیقت کا ثبوت یہ ہے کہ حال ہی میں مسٹر جناح نے لاہور میں ایک تقریر کی تھی۔ جس میں انہوں نے اتحاد پارٹی کے لیڈر کو بہت بُری طرح کوسا۔ مسٹر جناح جیسی پوزیشن اور تجربہ رکھنے والے کے لیے یہ بات شایانِ شان نہ تھی۔ لیکن یہ ایک مشہور ضرب المثل ہے کہ سیاستدان کی آخری جائے پناہ بدزبانی ہوتی ہے"

(نوٹ) - اس مضمون کے مصنف نوابزادہ خورشید علی خاں سیکرٹری اتحاد پارٹی تھے۔ بعد میں یہ مسلم لیگ میں شامل ہو کر بڑے لیڈروں میں شمار ہونے لگے تھے۔

ایک خبر اور اُس کا عنوان

مسلم لیگ کا ڈکٹیٹر۔ مسٹر فضل الحق کو سزا۔ غداری اور سرکشی کا الزام۔

"بمبئی - ۲- نومبر آل انڈیا مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے صدر مسٹر جناح نے مسٹر فضل الحق کو بورڈ کی ممبری سے خارج کر دیا۔ اس کا سبب بیان کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے سنٹرل بورڈ کے اصولوں کی خلاف ورزی، غداری اور سرکشی کی ہے۔"

(روزنامہ "انقلاب" - ۵- نومبر ۱۹۳۶ء)

سندھ میں نئی پارٹی

۵- نومبر ۱۹۳۶ء کو کراچی کے اخبارات میں ایک نئی سیاسی جماعت کے متعلق خبر شائع ہوئی۔ یعنی سندھ مسلم پولیٹیکل پارٹی۔ یہ جماعت سندھ یونائیٹڈ فرنٹ کے خلاف ایک نیا محاذ تھی۔ اس کے رہنماؤں میں سر غلام حسین ہدایت اللہ، خان بہادر محمد ایوب کھوڑو اور سردار علی بخش تالپور نمایاں تھے۔

جرمن اور جاپان میں سمجھوتہ

۶- نومبر ۱۹۳۶ء کو جرمن اور جاپان میں باہمی معاہدہ ہو گیا۔ اس طرح برلن، ٹوکیو محور قائم ہو گیا۔ جاپان، جرمن اور اطالیہ کی یک جہتی سے بحرالکاہل، بحیرہ روم، بحیرہ احمر اور بحر اوقیانوس میں یہ محور نئے انداز سے اپنا رنگ دکھانے لگا۔

فرانس اور برطانیہ یورپ میں روسی اثر پھیلتا دیکھ کر ناک منہ چڑھا رہے تھے۔ لیکن ہٹلر اور موسولینی کے ارادوں سے تصادم بھی انہیں گوارہ نہیں تھا۔ یورپ کے ان سامراجی ملکوں کی رائے یہ تھی کہ کسی طرح جرمن اور اٹلی، روس سے دست و گریباں ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ فرانس اور برطانیہ جلبشہ کی جنگ میں شریک تھے بھی اور نہیں بھی۔ ان کی یہ دو رخی پالیسی محض اس لیے کہ کسی طرح جرمن حبشہ کے خلاف اٹلی کی امداد کو آگے بڑھے اور جرمن کی موجودہ طاقت ضائع ہو جائے۔ مگر ہٹلر دور کھڑا یہ تماشہ دیکھتا رہا۔

جاپان اور جرمن کے مابین معاہدہ پر ۱۷- نومبر کو برطانیہ کے وزیر خارجہ مسٹر ایڈن سے دارالعلوم میں ایک سوال کیا گیا، جس کے جواب میں مسٹر ایڈن نے کہا کہ حکومت جرمن نے معاہدہ دارسائی پر یک طرفہ کارروائی کی ہے۔ اگرچہ گذشتہ ۱۴- مئی کو ہٹلر نے اعلان کیا تھا کہ بعض بین الاقوامی دریاؤں کے متعلق گفتگو کی جائے۔ چنانچہ کچھ بات چیت طے بھی ہو گئی تھی۔ لیکن بعض ممالک کے اس پر دستخط نہ

ہونے کے باعث اس پر عمل نہ ہو سکا۔

مسٹر ایڈن کے اس بیان سے ایک روز پیشتر ۱۶۔ نومبر کو ہٹلر نے معاہدہ وارسائی کی آخری شق جس کے ذریعے یورپ کے دریاؤں کو (جرمن کے بغیر) بین الاقوامی محوری طاقتوں کو ہی استعمال کا حق دیا گیا تھا اپنے کو (جرمن) اس شق سے آزاد کر لیا۔

ہٹلر کے اس اعلان سے چیکوسلواکیہ اور ہالینڈ کو جہاز رانی کے لیے اب جرمن کا تابع ہونا پڑے گا۔ ان حالات سے سب سے زیادہ مشکلات برطانیہ کے لیے تھیں۔ چنانچہ وہ ہٹلر سے ترکی ابرطانیہ معاہدہ کی طرح پر کوئی معاہدہ کرنا چاہتا تھا۔

اگرچہ ہٹلر نے ۱۶۔ مارچ ۱۹۳۵ء کو ہی معاہدہ وارسائی کی تمام پابندیوں سے اپنے کو آزاد کر لیا تھا لیکن فرانس اور برطانیہ نے ہٹلر کے اس اعلان کا خاص اثر نہ لیا۔ لیکن جیسے ہی ۱۶۔ نومبر کو معاہدہ وارسائی سے اپنے کو کلیتاً آزاد کر لیا تو محوری طاقتیں سوچ میں پڑ گئیں۔

انہی دنوں ۱۶۔ نومبر کو یہ خبر بھی شائع ہوگئی کہ جرمن اور جاپان کے درمیان جنگی معاہدہ طے پا گیا۔ جس کی رو سے سوویٹ روس کے طرز عمل کے خلاف اور اس کی روک تھام کے لیے کوشش کی جائے۔ نیز اگر کسی ملک پر حملہ کیا گیا تو دوسری جنگ عظیم کی ذمہ داری سوویٹ روس پر ہوگی۔ یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ حبشہ کو بھی اس معاہدے میں شامل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

مسجد شاہ چراغ

یوں تو برطانوی حکومت کا ہر وعدہ مٹی کے کھلونے کی طرح ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے، لیکن مسجد شاہ چراغ کا وعدہ تو ایسا نہیں تھا جسے وہ روایتی وعدوں کی طرح توڑ دیتا۔ جولائی ۱۹۳۵ء سے حکومت پنجاب مسلمانوں کو جن وعدوں پر ٹال رہی تھی۔ آخر ۶ نومبر ۱۹۳۶ء کو پنجاب کونسل میں چودھری افضل حق نے ایک سوال کے دوران پنجاب کے وزیر خزانہ سے یہ پوچھ لیا۔

"کیا یہ حقیقت ہے کہ مسجد شاہ چراغ کی واپسی کے لیے حکومت نے کوئی شرط عائد کی ہے؟"

جواب میں وزیر خزانہ نے کہا کہ شرط واپس لے لی گئی ہے۔

یو پی کونسل میں تحریک مدح صحابہ

گذشتہ کئی ماہ سے لکھنؤ میں تحریک مدح صحابہ کے باعث یو پی اور پنجاب کے شیعہ اور سنیوں کے دل منافرت

کی میل سے اس قدر داغدار ہو چکے تھے کہ ہر فرقہ ایک دوسرے کے خون کا تمنائی تھا۔ جیسا کہ زیر نظر کتاب کے گذشتہ اوراق میں اس تحریک کا سیاسی اور خاندانی پس منظر بیان ہو چکا ہے۔ مگر اس ڈرامہ کے شیعہ کرداروں اور ان کے ہدایت کاروں نے سارا ڈرامہ اس انداز سے کھیلا کہ ساری برائی میں شیعہ قوم ملوث ہو کے رہ گئی۔

انتخاب کے دنوں گڑے مردے کیوں اکھاڑے؟ اس کے لیے ۱۰۔ نومبر ۱۹۳۶ء کا دن تاریخ کے لیے بڑا اہم اور قابلِ ذکر دن ہے کہ اس روز مسلم لیگ کے سابق جنرل سیکرٹری اور یو پی کونسل کے ممبر نوابزادہ لیاقت علی خاں نے بیس سوالات پر مشتمل تحریک التوا، یو پی کونسل میں پیش کی تا کہ لکھنؤ میں مدح صحابہ کی بندش کے سلسلہ میں تمام سیاق و اسباب سامنے آسکیں اور اس پر بحث کی اجازت چاہی۔

سوالات ۱۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ حکومت نے، جنوری ۱۹۰۹ء کو ایسے احکام (جی او ۱۴۱ III ۵۹۱) نافذ کیے۔ جن کی رو سے لکھنؤ میں عشرہ، چہلم اور اکیس رمضان کو اسلام کے پہلے تین خلفاء کی علی اعلان تعریف ممنوع قرار دی گئی؟

۲۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ حکومت نے متذکرہ بالا حکم نامے میں یہ ظاہر کر دیا تھا کہ سال کے متذکرہ صدر تین دنوں کے علاوہ اور کسی روز خلفائے ثلاثہ کی علی الاعلان تعریف کرنا ممنوع قرار نہیں دے سکتی اور اس کے مقابلہ کو معمولی قانون کے تحت چھوڑ دیا؟

۳۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ سنی مسلمانوں نے، ان پابندیوں پر جو حکومت کے اس حکمنامے کے ذریعے سے عائد کی گئی تھیں، سخت اظہارِ ناراضگی کیا۔ اور ان میں کسی کثیر تعداد نے اس حکم نامے کو نفاذ پذیر کرانے کے لیے حکام مقامی سے جو احکامات نافذ کیے گئے تھے، ان کی خلاف ورزی کے سلسلے میں اپنے آپ کو گرفتار کرایا اور قید ہوئے؟

۴۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ مسٹر ریڈلیبی نے، جو اس وقت لکھنؤ کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ شہر میں ایک اعلان مورخہ ۲۶۔ مارچ ۱۹۰۹ء کو شائع کیا، جس میں اس چیز کی تشریح کی گئی تھی کہ خلفائے ثلاثہ یا رسول اللہ کے دیگر اصحاب کی علی الاعلان تعریف یعنی مدح صحابہ بالکل ممنوع قرار نہیں دی گئی ہے۔ بلکہ صرف ان دنوں یعنی عشرہ، چہلم اور اکیس رمضان کے روز، پبلک سڑکوں، پبلک گلیوں اور پبلک مقامات پر مدح صحابہ پر کچھ پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ اور یہ کہ بقیہ دنوں میں پولیس آمکیٹ کے

تحت لائسنس حاصل کر کے اسے شارع عام پر پبلک گلیوں اور پبلک مقامات پر بھی پڑھا جا سکتا ہے۔

۵۔ (ا) کیا یہ واقعہ ہے کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لکھنؤ نے یکم جون ۱۹۳۶ء کو زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری ایک حکم نافذ کیا، جس کی رو سے ۲۔جون ۱۹۳۶ء کو جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے موقعہ پران کے اعزاز میں شہر کے اندر ایک جلوس نکلنے والا تھا، مدح صحابہ پڑھنا ممنوع قرار دے دیا گیا۔

(ب) اگر یہ واقعہ ہے تو اس قسم کے حکم نافذ کرنے کے کیا وجوہات تھے؟

۶۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے اس حکم کے خلاف بطور احتجاج وہ جلوس نہیں نکالا گیا۔؟

۷۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ ۳۔جون ۱۹۳۶ء کے فوراً بعد سنی مسلمانان لکھنؤ کا ایک وفد لکھنؤ کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے پاس ان سے یہ کہنے کے لیے حاضر ہوا کہ سنیوں کا ایک جلوس رسول اللہ کے اعزاز میں شہر کی عام سڑکوں پر ۱۲۔جون کو نکالا جانے والا ہے۔ جس میں خود رسول اللہ کی شان میں نظمیں پڑھی جائیں گی۔ اور ان کے اصحاب کی (بشمول ان کے چاروں جانشین یعنی خلفاء) شان میں بھی۔

۸۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ اس قسم کا جلوس نکالنے کے لیے زیر دفعہ ۳۰ پولیس ایکٹ شہر کے پانچ مختلف محلوں کی پانچ مقامی سنی انجمنوں کی طرف سے سپرنٹنڈنٹ پولیس لکھنؤ، کو ایک باضابطہ درخواست دی گئی۔

۹۔ (ا)۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ ۹۔جون کو سپرنٹنڈنٹ پولیس نے جلوس کے متعلق اپنے احکامات سے اطلاع دی، جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ جلوس کے راستے یا اس کی سماعت میں کسی شخص یا کسی جماعت کی طرف سے شارع عام پر کسی قسم کی ایسی نظم یا اشعار یا ایسے الفاظ نہ نکالے جائیں، جس سے خلفاء ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ کی تعریف مقصود ہو۔؟

(ب)۔ اگر یہ واقعہ ہے تو ان پابندیوں کو عائد کرنے کے کیا وجوہات تھے؟

(ج) کیا یہ واقعہ ہے کہ ان پابندیوں کے عائد کرنے کے خلاف بطور احتجاج جلوس نہیں نکالا گیا۔

۱۰۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ بعض سنی مسلمانوں نے زیر دفعہ ۳۰ پولیس ایکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کو ایک دوسری درخواست اس امر کی دی کہ انہیں ۲۸ جون ۱۹۳۶ء کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پہلے جانشین ابوبکر صدیق رضؓ کے اعزاز میں شہر میں ایک جلوس نکالنے کا لائسنس دیا جائے، جس میں خلیفہ مذکور اور دوسرے خلفاؓ کی مدح میں نظمیں بھی پڑھی جا سکیں۔

۱۱۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے یہ عرضداشت لکھنؤ کے سٹی مجسٹریٹ کے پاس اس سفارش کے ساتھ بھیجی کہ جلوس کی اجازت نہ دی جائے۔

۱۲۔(الف) کیا یہ واقعہ ہے کہ سٹی مجسٹریٹ نے جلوس نکالنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔

(ب) اگر ایسا ہوا تو اجازت نہ دینے کے وجوہات کیا تھے۔؟

۱۳۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ مقامی حکام کی طرف سے شارع عام پر یا پبلک مقام پر علی الاعلان مدح صحابہ پڑھنا ممنوع ہے۔

۱۴۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ گذشتہ جون سے حکام لکھنؤ کی طرف سے ایک حکم زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری اس امر کی ممانعت میں دیا جاتا ہے کہ مسجد ٹیلا لکھنؤ کے نصف میل کے رقبہ کے اندر پانچ آدمیوں سے زائد نہ جمع ہوں۔

۱۵۔(الف) کیا یہ واقعہ ہے کہ کئی آدمیوں پر جن کو حکومت لکھنؤ کے احکامات کے خلاف مظاہروں سے منسلک بتایا جاتا ہے زیر دفعہ ۱۰۷ فوجداری مقدمہ چلایا گیا۔ اور ان کی سرسری سماعت ہوئی؟

(ب) کیا یہ واقعہ ہے کہ ان لوگوں سے زیر دفعہ ۱۰۷ ضابطہ فوجداری بڑی بڑی ضمانت کی رقمیں طلب کی گئیں۔ ورنہ بصورت عدم ادائیگی طویل مدت کی سزائیں مقرر کی گئیں۔

۱۶(الف) کیا یہ واقعہ ہے کہ لکھنؤ میں بہت سے مسلمانوں پر مدح صحابہ کے مسئلے پر زیر دفعہ ۱۸۸ مقدمہ چلایا گیا اور انہیں قید کی سزا دی گئی۔

(ب) اگر ایسا ہوا تو ان کی تعداد کیا ہے۔

۱۷۔ کیا حکومت کو معلوم ہے کہ مسلمانوں کے ایک کثیر طبقہ میں لکھنؤ کے مقامی حکام کے احکام کے خلاف جن کے ذریعے سے مدح صحابہ ایک غیر مضرت رساں مذہبی فعل کی مسلسل ممانعت کی جا رہی ہے، سخت ناراضگی پھیل گئی ہے۔

۱۸۔ کیا حکومت اس امر سے واقف ہے کہ مدح صحابہ کے علی الاعلان پڑھنے پر پابندی مسلمانوں کے ایک کثیر طبقہ کے نزدیک ان کے شہری اور مذہبی حقوق میں مداخلت ہے۔

۱۹۔ کیا حکومت لکھنؤ حکام کو مدح صحابہ کے علی الاعلان پڑھنے پر مزید احکام نافذ کرنے سے منع کرنے کو تیار ہے۔؟

۲۰۔ کیا حکومت اس کے لیے تیار ہے کہ ان تمام لوگوں کو جو مدح صحابہ کے سلسلہ میں قید ہیں یا زیر حراست ہیں، رہا کر دے اور حکومت نے اس سلسلہ میں جو جرمانے وصول کیے ہیں، ان کی رقمیں واپس کر دے۔

ہوم ممبر کے جواب نوابزادہ لیاقت علی خاں کے جواب میں ہوم ممبر۔ یو۔ پی نے جو تقریر کی اس کا اردو ترجمہ حسب ذیل ہے۔

۱۔ ہاں۔

۲۔ ہاں۔

۳۔ ہاں۔

۴۔ ہاں، اس قسم کا نوٹس مسٹر ریڈیسی نے شہر لکھنؤ میں تقسیم کیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض سُنّیوں کی طرف سے ایک درخواست وصول ہوئی کہ جلوس نکالنے کی اجازت دی جائے جس میں مدح صحابہ علی الاعلان پڑھی جائے گی۔ اس درخواست کے مقابلہ میں بعض دوسرے آدمیوں کی تعریف علی الاعلان پڑھنے کی درخواست کی تھی چونکہ نقص امن کا اندیشہ تھا اس لیے نامنظور ہوئی۔

۵ (ا) ہاں۔

(ب) وجوہات یہ تھیں کہ پیغمبر اسلام کی پیدائش کے موقع پر یہ جلوس حال ہی میں نکلنا شروع ہوا تھا۔ چند برس ہوئے جب یہ جلوس پہلی مرتبہ نکالا گیا تو وہ ایک مشترک شیعہ سنی جلوس تھا جس میں علی الاعلان مدح صحابہ پڑھنے کا کوئی سوال نہ تھا۔ گذشتہ دو سال سے دونوں فرقوں کے تعلقات کشیدہ ہونے کی وجہ سے چند شیعہ جلوس میں حصہ لیتے ہیں۔ مگر اس جلوس کی مخلوط صورت نہیں بدلی اور اس سال بھی شیعوں نے جلوس میں پھر اسی شرکت کا اعلان کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نقص امن کا شدید اندیشہ پیدا ہو گیا۔ علاوہ اس کے مقامی حکام نے عام پالیسی کے مطابق یہ فیصلہ کیا کہ وہ

ان دنوں میں جب کہ گذشتہ زمانہ میں اس قسم کا کوئی جلوس نہ نکلا ہو۔ کوئی ایسا جلوس جس میں علی الاعلان مدح صحابہ پڑھی جائے نکالنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ سنیوں کو بھی مطلع کر دیا گیا تھا کہ اگر وہ علی الاعلان مدح صحابہ پڑھنے کے حق کے عام سوال کا پچیس برس کی خاموشی کے بعد احیاء کرنا چاہتے ہیں تو انہیں چاہیے کہ وہ آئینی طریقہ سے حکومت کے پاس اپنی معروضات پیش کریں اور یہ کہ اس وقت تک کسی نئے جلوس کی اجازت نہیں دی جا سکتی، جب تک پالیسی کا عام سوال نہ طے ہو جائے۔

۶۔ ہاں۔

۷۔ ہاں۔ ڈپٹی کمشنر کے پاس سُنّی مسلمانوں کا ایک وفد گیا تھا۔ ان سے یہ کہا گیا کہ اس نئی چیز کی اجازت ان وجوہات کی بناء پر نہیں دی جا سکتی، جو کہ سوال نمبر ۵ ب کے آخر حصہ میں لکھی گئی ہیں۔

۸۔ ہاں۔

۹ (ا) ہاں۔

(ب) سوال ۵ ب کے جواب کے آخر میں وجوہات لکھے گئے ہیں۔

(ج)۔ نہیں ۱۲۔ جون کو ایک جلوس نکالا گیا تھا۔

۱۰۔ ہاں۔

۱۱۔ ہاں۔

۱۲ (ا) ہاں۔

(ب) سوال نمبر ۵ (ب) کے جواب کے آخری حصے میں وجوہات بتا دیے گئے ہیں۔

۱۳۔ ہاں۔ لکھنؤ میں مقامی حکام نے علی الاعلان مدح صحابہ پڑھنے کی ممانعت کر دی ہے۔

۱۴۔ ہاں اس قسم کے حکم کے نفاذ کی اس لیے ضرورت محسوس کی گئی کہ جمعہ کے دن ایک خیر آئین پسند مجمع ٹیلا کی مسجد کے گرد جمع ہو جایا کرتا تھا۔

۱۵۔ (ا) ہاں زیر دفعہ ۱۰۷ ضابطہ فوجداری بہت سے آدمیوں پر مقدمہ چلا ہے۔ ان کی سماعت سرسری طور سے نہیں ہوئی ہے۔

(ب) دفعہ ۱۵۱ ضابطہ فوجداری کے ماتحت لوگ پکڑے گئے۔ ان سے غیر معمولی ضمانت

نہیں طلب کی گئیں۔ عدم ادائیگی کی صورت میں ان لوگوں کو ایک برس قید محض کی سزا دی گئی۔

۱۶۔(و) ہاں زیر دفعہ ۱۵۳ تعزیرات ہند ایک سو ساٹھ آدمیوں کے مقدمات عدالت میں پیش ہوئے ہیں۔ ایک سو پچاس آدمیوں کو سزا دی گئی۔ نو آدمیوں کو معافی مانگ لینے پر چھوڑ دیا گیا۔ ایک کا مقدمہ زیر سماعت ہے۔

۱۷۔ حکومت کو معلوم ہے کہ لکھنؤ کے مقامی حکام کے احکام کے خلاف سنیوں میں سخت بے اطمینانی پھیلی ہوئی ہے۔

۱۸۔ گورنمنٹ کو یہ معلوم ہے کہ مدح صحابہ کے علی الاعلان پڑھنے کی ممانعت اکثر سنیوں کے نزدیک ان کے مذہب میں مداخلت ہے۔

۱۹۔ حکومت اس کے لیے تیار ہے۔ اور ہمیشہ تیار تھی کہ ایک آئینی طریقہ سے لکھنؤ کے سنیوں کا ایک وفد اس سے ملے۔ اس قسم کی درخواست حال ہی میں وصول ہوئی ہے۔ اور ہز ایکسی لنسی گورنر نے ۱۴۔ نومبر کو اس وفد سے ملنا منظور کیا ہے۔ جو ان کے سامنے اپنے معروضات پیش کریگا۔

۲۰۔ حکومت اس درخواست پر غور کرے گی۔

ان سوالات اور جوابات کے بعد نوابزادہ لیاقت علی خاں اور دوسرے مسلمان ممبران نے اس پر تقریریں کیں۔

تشدد کی نئی تحریک

کاریں جلانے اور لیٹر بکسوں میں تیزاب ڈالنے کی تحریکات بالآخر ظاہری طور پر ختم ہو گئیں۔ کچھ دن لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ امراء کی کاریں سر عام کھڑی ہونے لگیں۔ عوام کی ڈاک متعلقین تک پہنچنے لگی۔ پولیس اور محکمہ انتظامیہ نے سکھ کا سانس لیا۔ ہر کوئی آرام کی نیند سونے لگا۔ لیکن سکون کے ان دنوں کی عمر بہت کم نکلی۔

۱۷۔ نومبر کو لاہور میں ایک انیسر کی کار جلا دی گئی۔ اس سے اگلے روز ریلوے روڈ پر ایک دستی پوسٹر چسپاں پایا گیا کہ سینما کے باہر اپنی کاریں کھڑی نہ کریں۔ اگر ایسا ہوا تو اس کی ذمہ داری آپ پر ہوگی۔ ابھی لوگ کاریں سنبھال ہی رہے تھے کہ شہر کے امراء کی کوٹھیاں جلنا شروع ہو گئیں۔ آج ایک محلہ کی کوٹھی کو آگ لگی، کل دوسرے کا مکان جلا۔ کبھی شہر سے باہر کسی امیر کی رہائش گاہ کو آگ لگا دی گئی۔ پولیس موقعہ واردات پر پہنچتی تو وہاں سے انہیں دستی لکھے ہوئے سرخ پوسٹر ملتے۔ آخر لاہور کی پولیس

نے مختلف مقامات پر چھاپے مار کر سابق بدنام سیاسی کارکنوں کے گھروں پر رات کے وقت شبخون مارے اور چند نوجوانوں کو گرفتار کر لیا۔ ان میں روپی دت، ودیا ساگر، اوم پرکاش اور راجے سنگھ شامل تھے۔

ہندو مسلم فساد

الیکشن سے قریب تر غیر ملکی حکمرانوں نے غلامی کی زنجیروں میں مزید کڑیاں جوڑنے کے لیے کئی بہانے سوچے۔ لیکن جب خزاں کے دن آجائیں تو پہاڑوں کے سبزہ زاروں کا چہرہ بھی زرد پڑ جاتا ہے۔ دریاؤں کے پانی خشک ہو جاتے ہیں۔ آب جو ریت کے ڈھیر کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتی۔ درختوں کے آوارہ پتے اپنی رونق کھو بیٹھتے ہیں۔ ہرے بھرے باغ ویران صحرا کی طرح بہار کے دن یاد کر کے روتے ہیں۔ شبنم کے آنسو بھی پھولوں کی دلجوئی نہیں کر سکتے۔ باغبان انہی دنوں بہار کے انتظار میں وقت گذار دیتا ہے۔

اسی طرح زوالِ سلطنت کے دن آتے ہیں تو تقدیر اور تدبیر آمنے سامنے ایک دوسرے کے خلاف آگ اگلنا شروع کر دیتی ہیں۔ شاہی قلعے سے غریب کی جھونپڑی تک آگ کی ایک لمبی لکیر پھیل جاتی ہے، جس کا دھواں ایوانِ سلطنت کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

ان دنوں جب سارا ہندوستان ایکٹ ۱۹۳۵ء کے آئین پر آزادیٔ وطن کی راہ سے گذر رہا تھا۔ ہندو، مسلمان اور سکھ اپنے اپنے ذہن اور اطوار سے غلامی کی زنجیریں توڑنے میں مصروف تھے۔ کسی قوم کے دل و دماغ میں اس کے سوا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ عین اسی موسم میں فرنگی شاطروں نے پرانی بساط پر نئے مہرے چنے۔ یعنی ہندو مسلم فساد کی آگ کو از سرِ نو ہوا دی۔ چنانچہ ۱۱۔ نومبر کو بمبئی میں ہندو مسلم فساد ہوا۔ اور اس کے بعد اورنگ آباد (پٹنہ) میں ایک مسجد کو شہید کر دیا گیا۔ کئی نمازی زخمی ہوئے۔ اس کے جواب میں پونا میں ایک مندر کو آگ لگا دی گئی۔ اس کے برابر مسجد تھی اسے گرا دیا گیا۔ راولپنڈی میں سکھ اور مسلمان کے درمیان فساد ہوا۔ الٰہ آباد میں بھی فرقہ وارانہ جھگڑا اس قدر بڑھا کہ کئی دن شہر کا کاروبار معطل رہا۔ اس طرح مختلف شہروں سے اطلاعات آئیں۔ ان فسادات پر رہنمایانِ ملک نے دوڑ دھوپ کے بعد جلد قابو پا لیا۔ مگر انہوں نے کوئی کمی نہ کی جو کچھ بھی ان سے ہو سکا کیا گیا۔

آل انڈیا شہید گنج کانفرنس

۱۲-نومبر کو لاہور میں مولانا شوکت علی کی زیرِ صدارت آل انڈیا شہید گنج کانفرنس منعقد ہوئی۔ چونکہ انتخابات قریب آ رہے تھے اور اس ڈرامے کا پردہ بھی اٹھ چکا تھا۔ لہٰذا مولانا شوکت علی کے علاوہ پنجاب سے باہر کا کوئی معروف اور قابلِ ذکر رہنما کانفرنس میں شریک نہیں تھا۔ پنجاب کے وہ نوجوان جنہوں نے گذشتہ تحریک میں جانفشانی سے حصہ لیا تھا اس کارروائی سے نہ صرف الگ رہے بلکہ دورانِ اجلاس انہوں نے ہنگامہ بھی کیا۔ جس پر کافی دیر اجلاس کی کارروائی معطّل رہی۔ کانفرنس کے آخری اجلاس میں مولانا ظفر علی خاں کی طرف سے حسب ذیل قرارداد پیش ہوئی۔

"مسجد شہید گنج کانفرنس کا یہ اجلاس تمام اسلامی دوستوں سے اسلام کی عزت کے نام پر اپیل کرتا ہے کہ وہ دوستانہ تعلقات کی بنا پر جوان کے دولت برطانیہ کے ساتھ ہیں۔ مسجد شہید گنج کے متعلق مسلمانانِ ہند کے جذبات کا احترام کرنے پر آمادہ کریں۔ اگر اس کوشش میں انہیں کامیابی نہ ہو تو وہ اسلامی عزت کی خاطر انجمنِ اقوام سے علیحدہ ہو جائیں۔ اور یورپ کی دوسری اقوام پر ثابت کریں کہ اسلامی اخوت اب بھی ایک زندہ حقیقت ہے۔"

اس قرارداد کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کا محرک تو تھا لیکن موید کوئی نہیں تھا اس طرح دونوں فرائض مولانا ظفر علیخاں نے ادا کئے۔

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

مسلمان من حیث القوم حقیقت سے بیگانہ ہو کر جب سے انسانوں کے رنگ و روغن میں کھو گیا ہے اس کا دامن جذبات اور ہنگاموں کی خاطر رچھا ڑیوں میں الجھ کر رہ گیا ہے۔ ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی اور جنہوں نے ایسا سمجھا وہ گرہ کٹوں سے ایسے لٹے کہ پھر خالی جھولی لے کر گھر لوٹے۔

مہاتما گاندھی کا بیٹا ہیرالال گاندھی مسلمان ہوا تو مسلمانوں نے اسے سر آنکھوں پر جگہ دی اس پران کے والد نے ایک پریس بیان میں کہا۔

"اگر ہیرالال اسلام کو سمجھ کر مسلمان ہوتا تو مجھے خوشی ہوتی لیکن وہ اپنی ذاتی اور بری عادتوں کے تحت مسلمان ہوا ہے۔"

مولانا شوکت علی نے حال ہی میں کہا، کہ

"میں ہیرالال گاندھی کی تشہیر کے لیے تیار نہیں، جو مسلمانوں کو لوٹنے کے لیے اسلام کے حلقے میں آیا ہے"

مولانا شوکت علی کا یہ بیان مسلمان پریس نے شائع نہیں کیا اور نہ مناسب سمجھا بلکہ ایک کمیونسٹ اخبار ہفت روزہ دہلی نے اسے شائع کیا۔ ہنوز اس بیان کی سیاہی خشک نہیں ہوئی تھی کہ نومبر کے آخری دنوں پریس میں یہ خبر شائع ہوئی کہ:

"مہاتما گاندھی کا بیٹا ہیرالال گاندھی پھر سے ہندو دھرم میں واپس چلا گیا۔ اخبارات کی اطلاع کے مطابق بمبئی کے بعض سیٹھوں نے اسے ایک لاکھ تیس ہزار روپیہ دیا کہ وہ اسلام چھوڑ کر دوبارہ ہندو ہو جائے۔ چنانچہ اس نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ ہندو دھرم میں وہ سارا کچھ موجود ہے جو اسلام میں ہے"

تحریکِ مدحِ صحابہ ملتوی کر دی گئی

امسال ۱۰ جولائی کو حالات سے مجبور ہو کر لکھنؤ میں صحابہ کرام کی عزت و احترام کے لیے جو سول نافرمانی شروع کی تھی نومبر کے وسط تک یو پی کی جیلوں میں ایک ہزار سے زائد رضاکار جا چکے تھے۔ رہنماان کے علاوہ بھی جو تحریک کی رہنمائی کرتے رہے، جیل حکام نے ان پر جو سختی روا رکھی اس کی تفصیل الگ ہے۔ رضاکاروں کی قربانی اور کونسل کی کارروائی پر جس انداز سے بحث ہوئی۔

۱۴۔ نومبر ۱۹۳۶ء کو گورنر یو۔پی نے صحابہ کمیٹی کا ایک وفد حالات کے لیے بلا بھیجا۔ کافی دیر گفتگو کے بعد گورنر نے ارکانِ وفد کو یقین دلایا کہ اہلِ سنت کی شکایت پر وہ غور کریں گے بشرطیکہ سول نافرمانی کی تحریک بند کر دی جائے۔

گورنر سے ملاقات کے بعد لکھنؤ کے مسلم اکابر نے احرار رہنماؤں سے درخواست کی کہ آپ ہماری گذارشات مان کر اپنی تحریک عارضی طور پر ملتوی کر دیں۔ چنانچہ ۱۹۔ نومبر کو احرار رہنماؤں نے سول نافرمانی کی تحریک کچھ دنوں کے لیے ملتوی کر دی۔

۲۰۔ نومبر کو یوپی مجلس احرار نے مسٹر محمد احمد کاظمی کی صدارت میں اس فیصلے کی توثیق کر دی۔

کارسوز کی گرفتاری

دہشت پسندوں کی ہر روز کی کارروائیوں نے لاہور میں کافی بے چینی اور افراتفری پیدا کر دی۔ سرمایہ دار طبقہ اپنی زندگی تنگ سے مایوس نظر آنے لگا۔ گو پولیس اور دوسری انتظامیہ غافل نہیں تھی اس پر بھی آئے دن کہیں نہ کہیں حادثہ کی اطلاع ملتی رہی۔ کاروں اور کوٹھیوں کو آگ لگنے کی کارروائی بازیچۂ اطفال بن کر رہ گئی۔ اس پر ۲۲۔نومبر کو پنجاب پولیس نے اعلان کیا کہ اگر کہیں کسی قسم کی کوئی کارروائی ہو تو ۲۱ پر فون کریں اس وقت تک لاہور میں اکیس کاریں نذرِ آتش ہو چکی تھیں۔ ۲۴۔نومبر کو گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل کی کار بھی جلا دی گئی۔

اسی دوران لاہور میں آتش زنی کے بڑھتے ہوئے واقعات پر روزنامہ "انقلاب" نے ایک اداری نوٹ لکھا، جس میں اس نے اس تحریک کی مذمت کی۔ اس پر ۲۳۔نومبر کو مدیرانِ انقلاب کے نام ایک بیرنگ لفافہ آیا، جس کی عبارت تھی، کہ

"اخبار انقلاب مورخہ ۲۱۔نومبر میں کارسوزی کی وبا کے عنوان سے جو کچھ لکھا گیا ہے، اسے پڑھ کر بہت تعجب ہوا۔ آپ جیسے حضرات نے بھی ہماری مخالفت کی ٹھان لی ہے۔ کیا غریبوں اور بے کاروں کی حمایت یہی ہے؟۔ جو لوگ خودکشی کر لے اور بھوکے مرنے سے ایسے اقدام کو بہتر سمجھتے ہیں گورنمنٹ کو ہمارا کھلا چیلنج ہے کہ اگر وہ بیکاری کا انسداد نہ کرے گی تو نتیجہ غدر کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ ہم لوگ سرمایہ داروں کی کاریں جلا کر ان سے ایک بل پاس کروانا چاہتے ہیں، جس سے بے روزگاروں کو الاؤنس دلانے کا انتظام کیا جائے۔ کارسوزی کے بند کرانے کا بہتر طریقہ یہی ہے کہ بے کاروں کے لیے الاؤنس مقرر کیا جائے۔"

(خط کے آخر میں لکھا تھا۔)

آپ کا بھاگ سنگھ

بھاگ سٹریٹ، نسبت روڈ۔ لاہور۔ راولپنڈی

آخر بڑی دوڑ دھوپ کے بعد ۲۵۔نومبر کو رات نو بجے فیروز پور روڈ لاہور سے ایک بیرسٹر کی کوٹھی کے قریب سے ایک نوجوان کو گرفتار کیا گیا۔ اس کے قبضے سے بوتل پٹرول، چند انقلابی اشتہار، ایک لمبا چاقو اور دیا سلائی کی ڈبی برآمد ہوگئی۔ گرفتاری کے وقت اس شخص نے سوٹ،

بوٹ اور ہیٹ پہنا ہوا تھا۔ وہ کسی سرکاری دفتر میں ملازم تھا۔ اس کا نام بھی سابق کارسوز کی طرح ہیرالال ہے۔ گرفتاری کے وقت اس نے بتایا کہ اس کے ساتھ اس کام میں کوئی دوسرا آدمی شریک نہیں وہ اکیلا ہی تمام کارروائی کا ذمہ دار ہے۔ اس سے پیشتر کے گرفتار شدگاں کو رہا کر دیا گیا۔

انتخاب کی تیاریاں

۲۲۔ نومبر کے اخبارات میں پنجاب کی ۱۷۵ نشستوں کے لیے یونینسٹ پارٹی نے ایک سو گیارہ امیدواروں کا اعلان کر دیا۔ اسی روز مجلس احرار نے صرف پنجاب کے لیے چوبیس امیدواروں کا اعلان کیا۔ لیکن فی الحال دونوں پارٹیوں نے اپنے اپنے امیدواروں کے نام ظاہر نہیں کیے۔

پنجاب شیعہ پولیٹیکل کانفرنس کی قرارداد

لاہور ۲۹۔ نومبر کو پنجاب شیعہ کانفرنس کا اجلاس میر باقر حسین رئیس مالیر کوٹلہ کی صدارت میں ہوا۔ ابتدا میں اس انجمن کے اغراض و مقاصد بیان کیے گئے۔

۱۔ پنجاب شیعہ پولیٹیکل کانفرنس کا نصب العین آزادئ وطن قرار دیا گیا۔

۲۔ تمام اسلامی فرقوں سے رابطۂ اتحاد قائم کرنے کو نصب العین قرار دیا گیا۔

آل انڈیا شیعہ پولیٹیکل کانفرنس کے نمائندے نامزد کیے گئے اور آخر میں حسب ذیل قرارداد منظور ہوئی۔

"پنجاب شیعہ پولیٹیکل کانفرنس کا یہ اجلاس گورنمنٹ یوپی کی توجہ اس تحریک (مدح صحابہ) کی طرف دلاتا ہے، جو پولیٹیکل اغراض کی بنا پر فساد برپا کرنے کے لیے جاری کی گئی ہے۔ (حکومت) اس تحریک کے متعلق فیصلہ کرتے وقت شیعان ہند کے جذبات کا خیال رکھے۔ تاکہ مسلمانوں میں اس سے افتراق پیدا نہ ہو۔ اور مسلمان باہم فساد سے محفوظ رہیں۔"

یہ قرارداد ۳۔ دسمبر ۱۹۳۶ء کے روزنامہ انقلاب میں شائع ہوئی۔

برطانیہ کے شاہی خاندان میں انقلاب

محبت کی نہیں جاتی ہو جاتی ہے۔ دو دلوں کا یہ طوفان جب ساحل سے ٹکرا کر آپے سے باہر ہو جائے تو دیوارِ چین بھی اس کا راستہ نہیں روک سکتی۔ ہمالہ اپنی پوری بلندی اور سمندر اپنی ساری

گہرائی اگر داؤ پر لگا کر کسی دل و نظر کے سفینے کا راستہ بدلنا چاہیں تو خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں گے۔ یہ آگ سلگتے سلگتے جب شعلہ جوالہ بن جاتی ہے تو شہنشاہوں کے محل اور غریب کی جھونپڑی ایک ساتھ جلتے دکھائی دیتے ہیں۔

عشق کی دنیا دوسری ہے۔ یہاں مندر و مسجد کے لیے کوئی مقام نہیں۔ یہ صرف انسانوں کا جہاں ہوتا ہے یہاں کا مذہب محبت ہے اور بس۔ اس الزام کے مجرم کبھی آرے سے چیرے جاتے ہیں، تو کبھی سولی ان کی آخری آرام گاہ ہوتی ہے۔ وہ لوگ صحراؤں میں اپنا جہان آپ آباد کرتے ہیں۔ قیس ہو، فرہاد ہو، وامق ہو، رومیو ہو، مہینوال ہو کہ رانجھا یا مکران کا شہزادہ پنوں۔ ان سب نے رسم زمانہ سے بغاوت کر کے اپنے لیے ایسی راہ تجویز کی، جو انسان کی زندگی کی سب سے عزیز متاع ہے اور اسے محبت کے پھولوں سے سجایا۔ ان کے باعث جب انسان کانٹوں پر لیٹتا ہے تو ابلیس اسے مجنون کہہ کر پکارتا ہے۔

بلخ بخارے کا شہزادہ عزت بیگ مہینوال کہلاتا ہے۔ جو جھنگ چوہدری کا بیٹا دھیدو سیال خاندان کا چرواہا بن جاتا ہے۔ چناب کا پانی، بالو ریت کے ٹیلے اور ایران کے بیلے، ایران کے سلطان خسرو کی طرح گواہ ہیں کہ محبت کے باسی انسان اس جنس سے نہیں کسی اور جنس کے لوگ ہوتے ہیں تاکہ میں جل جاتے ہیں، پہاڑ کاٹتے ہیں، صحراؤں میں پڑے پڑے سوکھ جاتے ہیں، دریا کے طوفانوں میں کچے گھڑے پر تیرتے ہیں، چاہے موت ہی کیوں نہ آجائے لیکن قول و قرار سے نہیں ہارتے۔

گو اب یہ جنس ناپید ہو چکی ہے، تاہم ۱۹۳۶ء کے آخری پہرے میں برطانوی سلطنت کے شاہی خاندان کے شہزادہ ایڈورڈ ہشتم نے ایک عوامی عورت کی محبت میں ایک ایسی سلطنت کو ٹھوکر مار دی جس کی شاہی میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔

شاہ جارج پنجم کی موت کے بعد ان کا بیٹا ایڈورڈ ہشتم کے نام سے تخت کا وارث تھا لیکن ساتھ ہی اپنے خاندان سے باہر کی ایک عورت مسز سمپسن سے انہیں محبت ہو گئی۔ دونوں ازدواجی زندگی گذارنا چاہتے تھے لیکن برطانیہ کا شاہی خاندان اور برطانوی پارلیمنٹ ان دونوں کے راستے کی دیوار بن گئی۔ اس پر مسٹر بالڈن وزیر اعظم سے اختلاف شروع ہوا۔ اول تو آرچ بشپ کنٹربری نے گرجا میں ایک مطلقہ عورت کی شادی کرنے سے انکار کیا۔ دوسرے ملکہ میری نے جو بادشاہ کی والدہ ہیں، اور نہایت

پرانے خیالات کی۔ انہوں نے ایسی شادی کو منظور کرنے سے اور ایسی عورت کو ملکہ ماننے سے انکار کردیا، جو پیشتر سے ایک شوہر سے طلاق لے چکی ہے اور عوامی خاندان کی ہے۔ یہ نہ کسی شاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور نہ کسی ڈیوک یا لارڈ کی بیٹی ہے۔ اس کو ملکہ میری، جو خود پچیس سال ملکہ رہ چکی ہیں، کس طرح نذر پیش کرسکتی ہیں اور اب اس سے نیچے درجے پر مادر ملکہ کی حیثیت لے بیٹھیں۔

مسٹر بالڈون نے کہا کہ بادشاہ کے نیچے بہت سے ہندوستانی والیان ملک ہیں۔ وہ اس کو کس طرح ملکہ مانیں گے۔ اس پر کچھ دن خفیہ گفتگو اور خط وکتابت ہوتی رہی۔ جب ایڈورڈ اس پر مصر ہوا کہ اس کی خوشی کا دارومدار اس پر ہے کو مسز سمپسن سے شادی کرے، تو یہ تجویز ہوئی کہ وہ رجسٹریشن کے ذریعے شادی کرلے لیکن اس کو ملکہ کا اعزاز حاصل نہ ہوگا اور نہ وہ شاہی خاندان کے گروہ میں شمار ہوگی، نہ شاہی خاندان کے اجتماع میں شریک کی جائے گی۔ نہ اس کی اولاد آئندہ بادشاہت کی حقدار ہوگی۔ ایڈورڈ نے کہا کہ یہ باتیں اس عورت کو ذلیل کرنے کے لیے کہی گئی ہیں، جس سے میں محبت کرتا ہوں اور میں یہ ذلت گوارہ نہیں کرسکتا اور اس کو چھوڑ بھی نہیں سکتا، لیکن سلطنت سے استعفیٰ دے سکتا ہوں، جو میرے اور میری محبوبہ کے درمیان حائل ہے۔ چنانچہ قصر ونڈسر میں مسٹر چرچل کے مشورے سے اعلان بنا، جو وزیراعظم کو دکھا کر منظور کرلیا گیا اور ۱۲ دسمبر ۱۹۳۶ء کو ریڈیو پر اعلان ہوگیا اور اسی دن پارلیمنٹ کی منظوری سے استعفیٰ منظور ہوا اور شاہ جارج ششم کو بادشاہ مقرر کردیا گیا۔

آل انڈیا کانگرس کی قرارداد

ہر صاحب شعور جانتا ہے کہ یورپ کے افق پر بادلوں کے آوارہ ٹکڑے محوگشت ہیں۔ بہت جلد یہ مہیب گھٹاؤں کی صورت اختیار کرسکتے ہیں۔ انہی حالات کو دیکھتے اور سمجھتے ہوئے ۲۴ ستمبر کو واردھا میں آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے دوسری جنگ عظیم کے متعلق حسب ذیل قرارداد منظور کی۔

"کانگریس خود کو ہندوستان کی آزادی حاصل کرنے ملوکیت کے کنٹرول کو ملک سے خارج کرنے اور اہل ہند سے ناجائز نفع اٹھانے نہ دینے کا پابند بنا چکی ہے۔ اور کئی سال سے اس پالیسی پر عامل ہے اور اس سلسلے میں ہندوستان کی تقریب

تاج پوشی میں شریک نہیں ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی اعلان کیا گیا کہ اگر اقوام یورپ میں کوئی بڑی لڑائی ہوئی جس کا امکان بڑھتا جا رہا ہے تو کانگریس کا کوئی کارکن اس جنگ میں برطانیہ کے ساتھ شریک نہیں ہوگا۔"

مجلسِ احرار نے اپنے امیدواروں کا اعلان کر دیا امرتسر سے شیخ حسام الدین، گڑھ شنکر ضلع ہوشیار پور سے چودھری افضل حق سیالکوٹ سے مولانا مظہر علی اظہر، راہوں ضلع ہوشیار پور سے چودھری عبدالرحمٰن، خواجہ غلام حسین ایڈووکیٹ، لائلپور اور جھنگ سے چودھری غلام حیدر فیروز پور اور جالندھر سے۔ چودھری غلام رسول ستراہ ڈسکہ سے، سردار محمد شفیع چونیاں تحصیل قصور سے، خان مظہر نواز ملتان سے۔ خواجہ محمد یوسف لدھیانہ سے۔

سید حبیب کو براہ راست ٹکٹ نہیں دیا گیا تھا۔ بلکہ اس کی حمایت کا اعلان کر دیا گیا۔

جدید دستور کو مسترد کر دیا آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اپنے پچاسویں سالانہ اجلاس منعقدہ فیض پور میں ۳۰۔ دسمبر کو جدید دستور کو مسترد کرتے ہوئے ہندوستان کے لیے از سر نو دستور کا مطالبہ کر دیا۔

پنجاب اہلِ حدیث کا فیصلہ ۳۰۔ دسمبر کو لاہور میں پنجاب اہلِ حدیث حضرات نے فیصلہ کیا کہ

"اہلِ حدیث کسی ایسے امیدوار کو ووٹ نہ دیں جو کمیونل ایوارڈ کے خلاف رائے رکھتا ہو۔ نیز اہلِ حدیث حضرات کو تاکید کی گئی کہ وہ کسی ایسے امیدوار کو ووٹ نہ دیں، جو یونینسٹ پارٹی کا ہمدرد یا اس کے ٹکٹ پر الیکشن لڑ رہا ہو کیونکہ وہ حکومت کی جماعت ہے۔"

ہندو مسلم اتحاد کراچی۔ ۳۰۔ دسمبر سندھ یونائیٹڈ پارٹی کے لیڈر سیٹھ عبداللہ ہارون ایم ایل اے نے پریس بیان میں کہا کہ

"ماضی میں ہم سے کئی فروگذاشتیں ہو چکی ہیں۔ لیکن اب کے بار سندھ یونائیٹڈ پارٹی کے ہر رکن نے اپنے کو صوبے کی خدمت کے لیے وقف کر دیا ہے۔ یہ امید

رکھنا دراصل ایک قسم کی زیادتی ہوگی کہ سندھ اسمبلی کے ایک سو ساٹھ ارکان جو چھ لاکھ رائے دہندگاں کے نمائندے ہوں گے۔ اپنے صوبے کی بڑھتی ہوئی غربت اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بے کاری کا کوئی حل ان کے پاس نہیں ہوگا۔ اس کے علاوہ کوئی دیہاتی یا شہری مسئلہ اس وقت تک حل نہیں ہو سکتا، جب تک ہندو مسلمان کونسل یا اسمبلیوں کے اندر یا باہر باہم اتفاق نہیں کریں گے"

تحریک مدح صحابہ شیعوں کے خلاف ہے لکھنو۔ ۲۹۔ دسمبر پانچویں شیعہ پولیٹیکل کانفرنس نے رحیس کی صدارت اودھ کے آخری بادشاہ کے فرزند شہزادہ اکرام حسین ملے کی) اپنے سالانہ اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعے حکومت اور سُنیّوں کو متنبہ کیا گیا کہ وہ شیعوں کے جذبات اور حقوق کا خیال رکھیں کیونکہ ہماری حیثیت کو عمداً نظر انداز کیا جا رہا ہے اور تحریک مدح صحابہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، جو شیعوں کے خلاف ہے اور اس طرح ان کی سیاسی حیثیت کو ختم کرنے کے لیے چلائی گئی ہے۔

صدر مجلس احرار کا جواب مندرجہ بالا قرارداد کے جواب میں مولانا حبیب الرحمٰن صدر آل انڈیا مجلس احرار نے ۳۱۔ دسمبر کو لدھیانہ سے پریس بیان میں کہا:

"یہ قطعاً غلط ہے کہ تحریک مدح صحابہ کی سیاسی حیثیت کو ختم کرنے یا انہیں آئندہ الیکشن میں نقصان پہنچانے کے لیے شروع کی گئی ہے۔ اس قسم کی الزام تراشی خود شیعہ امیدواروں کے حق میں مفید نہیں ہوگی۔ بلکہ اس سے ان کے مفاد کو زیادہ نقصان پہنچے گا۔ پنجاب اور یوپی میں احرار خود شیعہ امیدواروں کی حمایت کر رہی ہے اور احرار کا جنرل سیکرٹری مولانا مظہر علی اظہر، جو ہمیشہ بلا مقابلہ منتخب ہو رہا ہے، حالانکہ جس حلقے سے وہ انتخاب لڑتے ہیں وہ تمام کا تمام سُنیّوں کا ہے اور ان کا مدمقابل سُنّی تھا۔ مجلس احرار نے کبھی کسی شیعہ یا سنی کا خیال کیے بغیر ہمیشہ حق کی لڑائی لڑی ہے۔ اس طرح تحریک مدح صحابہ کا مقصد یہ بھی ہے کہ ایک ناجائز قانون کا خاتمہ کیا جا سکے۔ کیونکہ اس قانون کے تحت سُنّی اور شیعہ کے درمیان ہمیشہ فساد رہتا ہے۔" مولانا نے آخر میں کہا: "انصاف پسند شیعہ حضرات علیحدہ نیابت کا خیال اپنے ذہنوں سے نکال دیں اور مدح صحابہ پر غیر ضروری پابندیوں کے خلاف ہمارا ساتھ دیں"

۱۹۳۷ء

۱۹۳۶ء کے دامن پر گذشتہ سالوں کی نسبت غلام ہندوستان کے خون کا کوئی چھینٹا نہیں۔ ڈوبتے سورج کی آخری کرنیں ۱۹۳۶ء اس سال کو مغرب کی تہرائیوں میں جب الوداع کہہ رہی تھیں تو ان کے چہرے پر بکھرتی ہوئی سُرخی دُلہن کی مانگ کے سندور کی طرح چمک رہی تھی۔ اس پر شفق کی لالہ گوں مہاروں نے جب اپنا آنچل ڈالا تو آسمان کے ستارے اپنی قندیلیں روشن کرنے لگ پڑے کہ اندھیروں کے سائے میں ۱۹۳۷ء اپنا راستہ نہ کھو جائے۔

نئی اصلاحات کی آمد اور اس کے نفاذ کی تیاریوں میں دانشور اور سیاستدان غیر ملکی حکمرانوں سے کوئی الجھاؤ پسند نہیں کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ سال ۱۹۳۶ء میں نہ تو کانگریس نے حکومت سے بگاڑ مناسب سمجھا اور نہ ہی غلام باہم دست و گریباں ہوئے۔ اگر کہیں اس کی نوبت آئی تو وہ بہت جلد دم توڑ کر رہ گئی۔ البتہ مجلس احرار کو اس سال ایسی سنگلاخ وادیوں سے گذرنا پڑا، جہاں تدبر اور ایثار منہ تکتے رہ گئے۔ مسلمان کے جذبات میں ایسا زہر گھول دیا گیا کہ کوئی ترشی بھی اس نشہ کو اتار نہ سکی۔ جب اس کا اثر زائل ہوا تو شمس اپنی منزل کے قریب پہنچ چکا تھا۔

مسجد شہید گنج کے سوداگروں نے اپنے ضمیر کے بھاؤ اس قدر ہلکے رکھے کہ خریدار نے کوئی دقت محسوس نہ کی۔ لیکن اس بگڈنڈی پر لٹنے والا قافلہ حریت آسمان کے سوا اپنی ساری پونجی کھو چکا تھا۔ ہنوز اس خارزار وادی کے سبب ان کے تلووں سے خون بہہ رہا تھا کہ لکھنؤ میں یارانِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ناموس پر کیچڑ اچھلنے لگا۔ احرار ایمان کی رہی سہی دولت لے کر وہاں جا پہنچے۔ یہ قضیہ ابھی طے نہیں ہوا تھا کہ ۱۹۳۶ء رخصت ہو گیا۔

نیا سال اپنے ساتھ کس قدر نیکیوں اور برائیوں کا پشتارا اٹھائے چلا آ رہا ہے۔ یہ دیکھنا مستقبل کے سپرد ہے۔ مگر جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے وہ بہتے پانی کی طرح صاف واقعات

کے تمام خدوخال کو سمیٹتے جا رہی ہے بشرطیکہ دل ودماغ میں کوئی خلل نہ ہو۔ ورنہ سیدھی لکیریں بھی ٹیڑھی نظر آنے لگتی ہیں۔

صدر کانگریس کا خط الیکشن کے دنوں ہندوستان کی سیاسی جماعتیں غلامی کے خلاف ذہن رکھتے ہوئے بھی انفرادی فکر سے باز نہیں تھیں۔ کانگریس ایسی پوٹیکل پارٹی کے دل ودماغ بھی الٹی سیدھی سوچ میں تھے۔ انہی دنوں مولانا حبیب الرحمٰن صدر آل انڈیا مجلس احرار اور کانگریس پریذیڈنٹ پنڈت جواہر لال نہرو کے مابین خط وکتابت ہوئی جس سے کانگریس کی اندرونی پالیسی واضح ہو کر سامنے آگئی۔

"مولانا حبیب الرحمٰن صاحب صدر مجلس احرار اسلام۔ لاہور

مکرمی! آپ کا خط مجھے بمبئی سے واپسی پر کل ملا۔ اس کا جواب انگریزی میں بھیجتا ہوں۔ لیکن آپ کی آسانی کے لیے یہ مختصر اردو ترجمہ بھی ساتھ ہے۔

میں نے اپنے پہلے خط میں آپ کی توجہ چند سوالوں کی طرف دلائی تھی۔ ان سوالوں کا ذکر آپ نے اپنے جواب میں نہیں کیا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس پر غور کریں اور مجھے مشورہ دیں۔ مجھے اس بات سے مطلب نہیں کہ ہندو مہاسبھا یا سوشلسٹ پارٹی کی اس مسئلہ میں کیا رائے ہے۔ مجھے تو کانگریس کی رائے سے مطلب ہے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کو اس سے کیا شکایت ہے۔ کانگریس کی رائے یہ ہے۔

فرقہ وارانہ فیصلہ ایکٹ ۱۹۳۵ء ہندوستان کی آزادی کے لیے نقصان دہ ہے۔ وہ ہندوستان کے ٹکڑے ٹکڑے کرتا ہے اور ہمارے اصل سوال غریبی اور بے کاری کے ہیں۔ ان کو پیچھے کر دیتا ہے۔ یاد رکھیے کہ یہ فیصلہ ہندو مسلمانوں کی نسبت نہیں ہے۔ اس میں بہت سی قومیں اور فرقے شامل کیے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ انگریز بھی اس کے ذریعے سے ہندوستان میں آٹھ نو ٹکڑے ہو گئے ہیں۔ بنگال میں، جو یورپین ہیں، انہیں خاص اہمیت ہو گئی ہے۔ ان کی رضامندی کے بغیر کسی گروہ کے لیے کام کرنا مشکل ہوگا۔ اس لیے یہ فرقہ وارانہ

فیصلہ ہندو مسلمانوں کا نہیں ہے۔ بلکہ اس میں اور بھی بہت سی پیچیدگیاں ہیں۔ جو ہمیں آگے بڑھنے سے روکتی ہیں۔ ایک اور بات غور طلب ہے کہ اس فیصلے کا اثر کچھ اوپر ہی لوگوں پر ہوتا ہے۔ چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان یا کوئی اور۔ عام لوگوں پر ان کے سوالوں کا کوئی اثر نہیں۔ غریبی یا ہندوستان کی بڑھتی ہوئی بے کاری سے کوئی مطلب نہیں۔ جو شخص ملک کی آزادی چاہتا ہے، یا جو شخص عام لوگوں کی غریبی دور کرنا چاہتا ہے اس کو ان دوہری باتوں سے دلچسپی نہیں ہو سکتی اور جو رکاوٹیں ان کے راستے میں آئیں ان کو ہٹانا چاہتا ہے۔ لہذا فرقہ وارانہ فیصلہ ایک بنیادی طور سے ہماری قومیت اور آزادی کے خلاف ہے۔ اس لیے اس کو اٹھانا ہی ہے۔ کیونکہ آزادی اور یہ فیصلہ ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔

یہ کانگریس کی رائے ہے۔ جہاں تک اصول کا سوال ہے کانگریس کا یہ بھی یقین ہے کہ اس پر کوئی مناسب فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ جب تک مختلف فرقے رضامندی سے کسی فیصلے پر نہ پہنچیں۔ اس لیے کانگریس کوئی قدم بغیر اس رضامندی کے نہیں اٹھا سکتی۔ علاوہ اپنی رائے کے وہ یہ کوشش کرنا چاہتی ہے کہ ہم سب مل کر فیصلہ پر پہنچیں۔ آپ ان دونوں باتوں میں فرق دیکھیے گا۔ کانگریس کی رائے بالکل صاف ہے۔ وہ فرقہ وارانہ فیصلے کے بالکل خلاف ہے۔ لیکن عملی طور پر وہ کچھ کرنا نہیں چاہتی۔ جب تک کہ آپس کا فیصلہ نہ ہو جائے۔ اس کی رائے کہیں لی جائے تو وہ رائے تو ضرور دے گی۔ اگر نئی نسلوں میں یہ بات پیش ہو۔ (کانگریس والے پیش نہیں کریں گے۔) تب کانگریس اپنی رائے ضرور دے گی۔ کہ فرقہ وارانہ فیصلہ غلط اور نقصان دہ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اس بات کو صاف کرنا چاہے گی کہ اس میں ترمیم آپ کے سمجھوتے کے ساتھ ہونی چاہیے۔ اس کے لیے ایسے مسئلہ پر کوئی رائے نہ دکھانا یا خاموش رہنا ایک فضول اور نکمی بات ہو جاتی ہے۔

مہربانی کر کے آپ مجھے بتائیں کہ کانگریس کی رائے سے آپ کیوں

اتفاق نہیں کرتے۔ آپ اور احرار لوگ ہندوستان کی مکمل آزادی چاہتے ہیں آپ کیا سمجھتے ہیں کہ فرقہ وارانہ فیصلے کے ہوتے ہوئے ایسی آزادی ہم حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر آپ اس کو ایک رکاوٹ سمجھتے ہیں تو وہ ایک غلط چیز ہے اس کو ہٹانا چاہیے۔ سوال یہ نہیں کہ ہندوؤں کو کیا ملے اور مسلمانوں کو کیا ملے۔ جو بھی کچھ کسی کو ملے یہ فیصلہ غلامی کا فیصلہ ہے اور کوئی قوم جو آزادی چاہتی ہے اس کو منظور نہیں کر سکتی۔ یہ ممکن ہے کہ مسلمانوں کو جو کچھ ملا ہے وہ کسی اور ذرائع سے بھی محفوظ رہ سکے۔ لیکن اس فیصلے کی بنیاد ہر صورت سے بدلنی پڑے گی اور عام مسلمانوں کو ملا کر آگے بڑھا جا سکتا ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ آپ ان مسئلوں پر غور کر کے مجھے اپنی رائے بھیجیں۔ میرا خیال ہے کہ اس فیصلے سے مسلمانوں کو زیادہ نقصان ہے بہ نسبت اوروں کے۔ اگر کسی کو فائدہ ہے تو وہ مٹھی بھر اوپر کے آدمیوں کو۔ عام لوگوں کو نہیں۔

(فقط نیاز مند۔ جواہر لال نہرو۔ سوراج بھون الٰہ آباد ۴؍ دسمبر ۱۹۳۶ء)

جواب۔ پیارے پنڈت جی!

تسلیم۔ آپ کا گرامی نامہ پہنچا۔ یاد آوری کا شکریہ۔

آپ نے مجھ سے دریافت کیا ہے کہ مجھے آپ کے کس طرز عمل سے شکایت ہے۔ مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں۔ البتہ جب آپ ایسے حضرات جو ہندوستان کی آزادی کے علمبردار ہیں، بے ضرورت غلطیاں کرتے ہیں تو مجھے دکھ ضرور ہوتا ہے۔ ہندوستان میں یہ غوغا مچایا جا رہا ہے کہ مسلمان کانگریس میں شریک نہیں ہیں۔ اگرچہ یہ بات سرے سے ہی غلط ہے مگر نیشنلسٹ ہندو اور انگریز اپنے اپنے مفاد کے لیے پروپیگنڈا کرتے ہیں۔ اس پروپیگنڈا سے دونوں کا مقصد جدا جدا ہے۔ انگریز یہ چاہتا ہے کہ وہ دنیا پر ظاہر کرے کہ کانگریس صرف ہندوؤں کی جماعت ہے۔ اس میں مسلمان شریک نہیں اور ہندو اس لیے پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ مسلمانوں سے کانگریس کے جھنڈے تلے وطن کی

آزادی کے لیے قربانی اور آزادی کا کام تو لیں لیکن ملکی حقوق کی تقسیم کا وقت آئے تو ہم مسلمانوں سے یہ کہہ کر انہیں محروم کر دیں کہ تم نے وطن کی آزادی میں کوئی حصہ نہیں لیا۔

آج بھی مسلمان اس تعداد سے شریک ہیں، جو ہندو کی تناسب آبادی سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ میرا یہ بھی یقین ہے کہ ننانوے فیصد ہندو نیشنلسٹ زبان سے یہ کہتے ہیں کہ مسلمان کانگریس میں آئیں اور دل سے یہ چاہتے ہیں کہ نہ آئیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ مولانا شفیع داؤدی، سید مرتضیٰ بہادر وغیرہ وغیرہ ۱۹۲۴ء تک کانگریسی تھے۔ لیکن جب سوراج پارٹی نے اسمبلی میں سرحد کی اصلاحات کے متعلق ہندو ذہنیت کا ثبوت دیا اور واک آؤٹ کر گئی تو یہ لوگ کانگریس سے الگ ہو گئے۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں، جن کا جذبہ یہ ہے کہ ہندوؤں کی تمام غلط کاریوں کے باوجود آزادی وطن کے لیے مسلمانوں کو کانگریس میں شریک رہنا چاہیے۔ مجھے وطن کی آزادی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے۔

فرقہ وارانہ تصفیہ کے متعلق جو پروپیگنڈا ہندوستان میں ہو رہا ہے مجھے پڑھ کر بے حد حیرت ہوتی ہے۔ ہم کیسی احمق دنیا میں آباد ہیں۔ جو چیز ہمارے اپنے تصفیے کی ہے اور جس کا تصفیہ محض خود غرض اور وطن دشمن ہندوؤں نے خود نہیں ہونے دیا۔ اس کا الزام دوسروں پر کیوں دیتے ہیں۔ (یعنی وزیر اعظم برطانیہ پر) لکھنؤ میں نہرو رپورٹ کی شکل میں فرقہ وارانہ تصفیہ ہوا مگر گاندھی جی نے سکھوں کو خوش کرنے کے لیے اسے دریائے راوی میں غرق کر دیا۔ جن لوگوں نے نہرو رپورٹ کے لیے اپنی قوم سے بازاروں میں پتھر کھائے ان سے اس کے غرق کرنے کے وقت مشورہ بھی نہ لیا گیا۔ اس کے بعد گاندھی جی مکمل آزادی، راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں لینے کے لیے گئے۔ ان دنوں میں بمبئی میں موجود تھا۔ میں نے ان سے مل کر کہا کہ آپ لندن نہ جائیے۔ جب تک ہندوستان کی قومیں آپس میں تصفیہ نہ کریں۔ مگر گاندھی جی دنیا میں کسی کی سننے والے نہیں۔ نہ ماننے والے گاندھی جی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں لندن گئے اور ملک کو اس سے جو نقصان پہنچنا تھا، پہنچ گیا۔

ملک کے بدترین دشمن فرقہ پرست ہندو اور مسلمان کانفرنس میں بلائے گئے تھے، جنہوں نے وزیر اعظم کو دیکھ کر لکھ دیا کہ ہمارے فرقہ وارانہ معاملات کے متعلق جو فیصلہ آپ کر دیں گے وہ ہمیں منظور ہوگا۔ جب وہ تصفیہ ان لوگوں کے ارادے کے خلاف آیا تو انہی لوگوں نے اس کو فرقہ وارانہ دقار کا مسئلہ بنا کر اس کے خلاف پروپیگنڈا کیا۔ سردار پٹیل نے ایک تقریر میں جو انہوں نے لدھیانہ میں کی تھی، کہا تھا کہ:

مالویہ جی خود وزیر اعظم برطانیہ سے فرقہ وارانہ فیصلہ لے کر آئے ہیں اور خود ہی اس کے خلاف پروپیگنڈا کر رہے ہیں۔ سردار پٹیل نے مالویہ جی کے بارے میں سخت الفاظ کہے تھے۔ مگر میں انہیں نقل کرنا نہیں چاہتا۔

کاش! یہ پارٹی اس فرقہ وارانہ فیصلے کے خلاف اگر اس بنیاد پر پروپیگنڈہ کرتی کہ فیصلہ ہندوستانی قومیت کے منافی ہے تو یہ بات معقول ہوتی۔ لیکن پنڈت مالویہ جی سے لے کر ان کی پارٹی کے تمام اراکین اور ہندو اخبارات نے یہ کہا کہ پنجاب اور بنگال میں اسلامی راج قائم ہوگیا ہے۔

میرا یقین تھا کہ آپ اس خیال سے علیحدہ رہیں گے۔ کیونکہ جو شخص ہندوستان کی مکمل آزادی چاہتا ہے، اس کا اس بات سے کیا تعلق ہے کہ انگریز ہندوستانیوں کو کیا دیتا ہے۔ اس کا تو ایک ہی کام ہے کہ وہ بدیشی طاقت کو کہے کہ میرا گھر خالی کرو اور بس۔

لالہ لاجپت رائے نے مجھے دھرم سالہ جیل میں کہا تھا کہ اگر کانگریس نے ہندوستان کے لیے کوئی آئین تیار کیا، یا وہ کسی آئین کے رد و قبول کی بحث میں پڑ گئی تو تمام اقوام ہند آپس میں لڑنے لگ جائیں گی اور ہندوستان کی آزادی بہت دور ہو جائے گی۔

یہ بات کتنی سچ نکلی —

آپ سے یہ دکھ پہنچا ہے کہ آپ نے کیمونل ایوارڈ کے سلسلے میں کانگریس

میں تبدیلی پیدا کی اور آپ اس پارٹی کے سامنے جھک گئے جو وطن کی آزادی کے
ساتھ ہندو راج کے خواب دیکھ رہی ہے۔ کیا آپ مجھے سمجھا سکتے ہیں کہ کمیونل ایوارڈ
کے مسترد کرنے کے کیا معنی ہیں۔ کیا ہم پھر انگریز سے کہیں گے کہ وہ دوبارہ ہمارے
لیے فیصلہ دے۔ اگر اس سے یہ مراد نہیں تو پھر فرقہ وارانہ فیصلے کو مسترد کرنے کا
ایک ہی طریقہ ہے کہ ہندوستان کی تمام فرقہ وارانہ ملتیں خود کوئی باہمی تصفیہ کر لیں
اگر پہلی بات ہے تو بدیشی حکومت جو فیصلہ کرے گی وہ ہندوستانی مفاد
کے خلاف ہوگا۔ اور اگر ہم خود کوئی فیصلہ کرنا چاہتے ہیں تو یہ فیصلہ ہو جانا
چاہیے۔ باہمی فیصلے سے فرقہ وارانہ فیصلہ خود بخود مسترد ہو جائے گا۔ میں آپ کو یقین
دلاتا ہوں کہ پنجاب کے سکھ اور ہندو، بنگال کے ہندو ہرگز کسی ایسے فیصلے
کو ماننے کے لیے تیار نہیں، خواہ وہ خالص قوم پرستی کی بنیادوں پر ہی کیوں نہ ہو
کہ جس سے ان کو خطرہ پڑ جائے۔ کہ اس تصفیے سے پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں
کی اکثریت ہو جائے گی۔

آپ کے موجودہ طرز عمل سے کانگریس کے وقار کو [illegible]
پنجاب میں اول تو پہلے ہی کانگریس کا کوئی خاص وقار نہیں کیونکہ [illegible]
آپ نے چار ڈاکٹروں (ڈاکٹر گوپی چند بھارگو، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، ڈاکٹر [illegible]
ڈاکٹر ستیہ پال) کے ہاتھوں میں دے رکھی ہے۔

پندرہ برس سے میں دیکھ رہا ہوں کہ ان ڈاکٹروں کو لڑنے کے سوا کوئی
کام نہیں۔ دو ڈاکٹر تو علانیہ کانگریس سے الگ ہو گئے ہیں۔ ان میں سے
ایک تو مسجد شہید گنج کے ٹکٹ پر کام کر رہا ہے اور دوسرے ڈاکٹر صاحب
امرتسر کی مسجد کے حوض میں نماز تراویح کے بعد مسلمانوں سے کہہ رہے ہیں کہ
پنجاب اسمبلی میں میں اس لیے جا رہا ہوں کہ پنجاب اسمبلی میں مسلمانوں کو تیس
فیصد سیٹیں ملیں۔ باقی دو ڈاکٹر جو ہیں انہیں لڑنے سے فرصت نہیں۔ اس جھگڑے
نے ایک مخلص کانگریسی ڈاکٹر [illegible]

گئی۔ مجھے اندیشہ ہے کہ مالویہ جی کی پارٹی پنجاب الیکشن میں کامیاب ہو گی۔
مکمل آزادی کے ریزولیشن کے بعد کانگریس کا یہ کام ہے کہ وہ انگریزی حکومت
کے ہر عطیے سے بے نیاز رہے اور انگریزی حکومت کے ہر فیصلے کو فرقہ پرستوں کے
حوالے کر دے اور ہر کانگریسی کا ایک ہی فرض ہے کہ وہ ہندوستان کے عوام میں آزادی
کی سچی تڑپ پیدا کرے ۔ میرے نزدیک نہ اب ہندوستان میں اسلامی حکومت ہے
نہ آئندہ ہو گی۔ اس لیے فرقہ وارانہ فیصلے کو ماننے اور تبدیل کرنے سے کوئی دلچسپی
نہیں۔ لیکن نہ معلوم آپ جیسے آدمی کو کیوں دلچسپی ہے۔

(آپ کا حبیب الرحمٰن ۔حبیب روڈ ۔لدھیانہ ۔۲۔جنوری ۱۹۳۷ء)

مندرجہ بالا خطوط سے ظاہر ہے کہ مجلس احرار اور کانگریس میں کس قدر بُعد موجود ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ نئے آئین کے مصنفین کی نیتیں درست نہیں تھیں ورنہ ایک ڈگر کے مسافروں میں بعد کیوں ؟ — جبکہ منزل بھی جدا نہیں۔

ظاہر ہے کہ غیر ملکی مقننہ کے ممبران کی تمام تر کدو کاوش میں خلوص مفقود تھا۔ وہ پیتل کو سونا اور کوئلے کو ہیرا بنا کر لانے تھے ۔ تاکہ اقوام افرنگ کا سورج کچھ دیر مزید غلاموں کی آنکھوں کو خیرہ کر سکے ۔ مگر تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔

ان دنوں کانگریسی حلقوں میں یہ بحث زور پکڑ رہی تھی کہ اسمبلی میں جا کر وزارتیں قبول کی جائیں یا نہ ۔ کیونکہ نئے آئین میں صوبائی خود مختاری کے باوجود تمام تر اختیارات گورنروں کے پاس تھے اور وزراء محض ایک کھلونا تھے ۔ جس سے یہ شبہ مزید پختہ ہو چکا تھا کہ ایکٹ ۱۹۳۵ء کوئی جاندار چیز نہیں ۔ انگریز صرف اپنے غلاموں کو بہلانا چاہتا ہے اور بس ۔

مولانا شوکت علی ان دنوں مسلم لیگ کے امیدواروں کی حمایت کے لیے پنجاب کا دورہ کر رہے تھے ۔ انہوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ اگر اسمبلیوں میں وزارتیں قبول نہیں کرنی تو پھر اسمبلیوں میں جانے کی کیا ضرورت ہے ۔ ہمیں وزارتیں قبول کر لینی چاہیں ، تاکہ حکمرانی کی ٹریننگ ہو سکے ۔ ہمیں چاہیے کہ رجعت پسندوں کو اقتدار پر نہ آنے دیا جائے ۔
ہمیں چاہیے آئین کو تباہ کرنے کے خلاف ہوں ۔ بلکہ ہمیں اس آئین کو کامیاب بنانا چاہیے ۔

اور اصلاحات کی مزید مشق حاصل کرنی چاہیے۔ آپ نے ترقی پسند مسلمانوں سے آبرومندانہ سمجھوتہ کرنے کی درخواست کی۔

(۳- جنوری ۱۹۳۷ء روزنامہ انقلاب لاہور)

احرار امیدواروں کا اعلان

حالات کی ناسازگاری کے باوجود ۸ جنوری کو مرکزی احرار رہنماؤں نے بڑی احتیاط سے اپنے مندرجہ ذیل مختصر امیدواروں کا اعلان کیا۔

۱۔ چودھری افضل حق گڑھ شنکر تحصیل ہوشیارپور۔ ۲۔ چودھری عبدالرحمٰن تحصیل جالندھر ۳۔ شیخ حسام الدین امرتسر شہر۔ ۴۔ مولانا مظہر علی اظہر سیالکوٹ، گوجرانوالہ اور جنڈیالہ گورو تحصیل امرتسر ۵۔ خواجہ محمد یوسف لدھیانہ شہر۔ ۶۔ خواجہ غلام حسین ایڈووکیٹ لائلپور، جھنگ وغیرہ کا شہری حلقہ ۷۔ شیخ غلام حیدر فیروزپور، جالندھر وغیرہ کا شہری حلقہ۔ ۸۔ سردار محمد شفیع قصور ضلع لاہور۔ ۹ چوہدری غلام رسول تتراڈ سکہ ضلع سیالکوٹ۔

ڈاکٹر عالم کے مقابل راولپنڈی کی سیٹ پر [illegible] صاحب کی حمایت کا فیصلہ کیا گیا

احرار امیدواروں کے مقابل سوائے [illegible] شہری سیٹ کے باقی تمام [illegible] سے مقابلہ تھا۔

احرار امیدواروں کا اعلان ہوتے ہی روزنامہ انقلاب نے ایک ایک احرار امیدوار کا نام لے کر ان کی مخالفت شروع کر دی [illegible] کا نام لے لے کر اسے شکست دینا ضروری [illegible] شکست ضروری ہونی چاہیے۔ [illegible]

کوچہ ککے زئیاں لاہور کے ایک شخص [illegible] کا بائیکاٹ [illegible] لگنے سے [illegible] کوئی چلوی تھی اس طرح کی اوچھی حرکتیں کی گئیں۔

تیسری پارٹی بھی ہے

کانگریسی پریذیڈنٹ پنڈت جواہر لال نہرو نے کلکتہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ:

"اس وقت ہندوستان میں صرف دو پارٹیاں ہیں - ایک حکومت برطانیہ اور دوسری کانگریس - اگر آئندہ کوئی بات چیت ملکی اصلاحات پر ہوتی ہے تو وہ صرف انہی کے درمیان ہوگی"

اس کے جواب میں مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح نے مولانا محمد علی جوہر کے یوم وصال کے موقعہ پر ۵ - جنوری کو کلکتہ میں کہا کہ

"کانگریس کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ ہندوستان میں صرف دو جماعتیں ہیں - میں کہتا ہوں دو نہیں تین جماعتیں ہیں - یعنی حکومت، کانگریس جو ہندوؤں کی نمائندہ ہے اور اس کے علاوہ تیسری جماعت مسلمان ہیں - ان کے مشورے کے بغیر ہندوستان کی آزادی کی گفتگو نامکمل ہوگی"

جواہر لال کانگریس پریذیڈنٹ نے ۶ - جنوری کو بانکی پور (پٹنہ) میں ایک تقریر کے دوران کہا کہ "جس مقصد کے لیے ہم سب لڑ رہے ہیں اگر اس کے حصول کے لیے کونسلوں اور مجالس وضع قوانین سے امداد نہ ملی تو مجھے ان کی کوئی ضرورت نہیں - کونسلوں کے اندر سوراج کے لیے اتنی جد و جہد نہیں ہو سکتی، جتنی باہر رہ کر ہو سکتی ہے - اس کے باوجود ہم کونسلوں میں جائیں گے اور اس ملک کی بہتری کے لیے جس قدر فائدہ ہو سکے گا، حاصل کریں گے"

بنگال کا مسئلہ طے ہوگیا وزارتوں کی ترتیب اور الیکشن سے پیشتر ہر پارٹی جوڑ توڑ میں مصروف تھی - بنگال اور پنجاب ایسے صوبے تھے، جہاں مسلمانوں کو اقلیت کی کسی پارٹی سے نہ تو خوف تھا - نہ ہی ان دو صوبوں میں جوڑ توڑ کی ضرورت تھی - لیکن اس پر بھی بنگال کے مسٹر اے ایچ - غزنوی نے بغیر کسی مشورہ کے بنگال کے ہندوؤں سے فیصلہ کر لیا - ۷ - جنوری کو ہندوؤں کی طرف سے مہاراجہ دھیرج راج آف بردوان نے مسٹر اے ایچ غزنوی سے بات چیت کر کے بنگال کا قضیہ ختم کر دیا - مسٹر غزنوی نے بنگال کے فرقہ وارانہ مناقشات کو رفع کرنے کے لیے مندرجہ ذیل تجاویز مہاراجہ بردوان کو پیش کیں -

ا - کمیونل ایوارڈ دس سال تک بحال رہے گا - اور اس کے بعد اس پر نظر ثانی کی

جائے گی۔ یا اس وقت تک بحال رہے گا۔ جب تک متعلقہ قوموں کے باہمی فیصلہ سے کیمونل ایوارڈ میں ترمیم نہ ہو جائے۔

۲۔ بنگال کی کابینہ میں ہندو اور مسلمان کی تعداد مساوی ہوگی۔

۳۔ سرکاری ملازمتوں میں ہندو اور مسلمانوں کا تناسب یکساں رہے گا۔ یعنی یورپین اینگلو انڈین اور ہندوستانی عیسائیوں کے مقررہ تناسب کے بعد دونوں قوموں کا تناسب یکساں ہوگا۔"

مہاراجہ بردوان نے بحیثیت انٹی کیمونل ایوارڈ کے صدر۔ ان تجاویز پر دستخط کر دیے۔

(کلکتہ ایسوسی ایٹڈ پریس)

ظاہر ہے کہ اے ایچ غزنوی کی مندرجہ بالا تجاویز بنگالی مسلمانوں کے لیے ضرر رساں تھیں مگر اس پر بھی ۱۰۔ جنوری کے روزنامہ انقلاب نے اپنے اداریے میں خوشی کا اظہار کیا۔ کیونکہ اس سے یونینسٹ ذہن کی تائید ہوتی تھی۔

منشی احمد دین کو سزا مشہور سوشلسٹ لیڈر منشی احمد دین احمد جنہوں نے اپنی تقریر میں [illegible] مسجد شہید گنج کی ذمہ داری حکومت پنجاب پر عائد کی تھی۔ انہیں دفعہ ۱۲۴ الف کے تحت راولپنڈی سے واپسی پر جہلم کے پل پر گرفتار کر لیا گیا۔ ۱۰۔ جنوری کو [illegible] ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ جالندھر نے منشی صاحب کو دو سال قید بامشقت کی سزا دی۔

سر سکندر حیات کی تقریر ہوشیار پور میں ۱۱۔ جنوری کو سر سکندر حیات نے اپنی انتخابی تقریر کے دوران کہا۔ اگر مجھے کابینہ بنانے کا موقعہ ملا تو میں اتحاد پارٹی کے علاوہ دیگر سیاسی جماعتوں کے ممبران کو بھی کابینہ میں شامل کروں گا۔ تو اسمبلی میں اتحاد پارٹی کے ارکان کی اکثریت ہوگی۔ اس کے باوجود اتحاد پارٹی ایک سیاسی جماعت ہے جس میں کسی فرقہ وارانہ تمیز کے بغیر ہندو، سکھ اور مسلمان شامل ہیں۔ یہ کہنا غلط ہے کہ یونینسٹ پارٹی صرف مسلمانوں کی سیاسی جماعت ہے۔

آپ نے کہا دستور اساسی کو چلانے کے لیے ہندو پروگریسو پارٹی (ہندو مہا سبھا) کے ساتھ تعاون کرنے میں مجھے انتہائی خوشی ہوگی، کیونکہ اتحاد پارٹی کوئی مذہبی جماعت

نہیں ، جس کا مقصد کسی خاص مذہب کی حفاظت کرنا ہو۔ بلکہ یہ امیر اور غریب اور صوبہ کے درمیانہ طبقہ کی نمائندگی کرتی ہے ۔ تقریر کے آخر میں آپ نے میثاقِ بنگال کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ

"میں پنجاب میں بھی اس قسم کی تجویز کا خیر مقدم کروں گا۔"

(روزنامہ "انقلاب" لاہور ۔ ۱۴۔ جنوری ۱۹۳۷ء)

مولانا شوکت علی کی ناراضگی

۱۲۔ جنوری کو الٰہ آباد سے ایسوسی ایٹڈ پریس کو ایک بیان دیتے ہوئے مولانا شوکت علی نے کہا کہ :

"اے۔ ایچ۔ غزنوی اور مہاراجہ بردوان کو کوئی سیاسی حیثیت حاصل نہیں اور نہ ہی غزنوی کی مسلم قوم میں کوئی حیثیت ہے ۔ لہٰذا میثاقِ بنگال سے بنگال کا کوئی مسئلہ حل نہیں کیا جا سکتا ۔ اس میثاق کی حیثیت ایک مذاق کے سوا کچھ نہیں۔"

مرزائی اور سکندر حیات

جیسے کہ سر سکندر حیات نے ۱۱۔ جنوری کو ہوشیار پور میں اپنی تقریر کے دوران کہا کہ یونینسٹ پارٹی کوئی مذہبی جماعت نہیں ۔ اس پر روزنامہ "احسان" لاہور نے اپنی ۱۵۔ جنوری کی اشاعت میں ایک ادارتی نوٹ لکھا کہ :

"یونینسٹ پارٹی کا لیڈر اگر مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا وعدہ کرے تو ہم احرار رہنماؤں کو مشورہ دیں گے کہ وہ یونینسٹ پارٹی کے ساتھ تعاون کریں۔"

جعلی چٹھیوں کی اشاعت

الیکشن کے دوران احرار کے خلاف باضابطہ پروپیگنڈہ کی مہم چل رہی تھی ۔ اس سلسلے میں عاشق حسین بٹالوی اپنی کتاب "اقبال کے آخری دو سال" کے صفحہ ۳۷ اور صفحہ ۳۷۱ پر لکھتے ہیں ۔

"امرتسر سے دو آدمیوں نے کھڑے ہونے کا اعلان کیا تھا ۔ ایک یونینسٹ پارٹی کے امیدوار شیخ محمد صادق اور دوسرے احرار کے امیدوار شیخ حسام الدین اس مقابلے میں شیخ محمد صادق کا پلڑا بھاری نظر آتا تھا ۔ اور اندیشہ تھا کہ کہیں یونینسٹ پارٹی کامیاب نہ ہو جائے ۔ اس موقعہ پر علامہ اقبال نے ڈاکٹر سیف الدین کچلو

کو کھڑا ہونے پر آمادہ کیا جو ۱۹۳۰ء کی تحریک سول نافرمانی میں تین سال قید کاٹ کر رہا ہوئے تھے۔ اور اب امرتسر کی بجائے لاہور میں پریکٹس کر رہے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ امرتسر میں ڈاکٹر کچلو کے سامنے کسی بڑے سے بڑے آدمی کا چراغ نہ جل سکتا تھا۔ لیکن وقت یہ تھی کہ کچلو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہونے کو تیار نہ تھے۔ ادھر کانگریسی ٹکٹ پر ان کی کامیابی کے امکانات قطعاً نہیں تھے علامہ اقبال نے ایک درمیانی راستہ تلاش کیا اور ڈاکٹر کچلو کو انڈیپنڈنٹ کھڑا ہونے پر آمادہ کر لیا۔ جب انہوں نے امرتسر کے شہری حلقہ سے کھڑے ہونے کا اعلان کیا تو ایک پبلک جلسے میں لوگوں نے پوچھا کہ آپ کس ٹکٹ پر کھڑے ہوئے ہیں تو انہوں نے جواب دیا۔ کچلو ٹکٹ"

ڈاکٹر اقبال کے اس مشورہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ نیشلسٹ مسلمانوں کے ووٹ باہم تقسیم ہو گئے۔ جس سے احرار اور یونینسٹ پارٹی دونوں شکست کھا گئے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مجلس احرار کا نمائندہ کامیاب ہو جاتا۔

ان دنوں احرار کے خلاف سابقہ شائع شدہ جعلی چٹھیاں بھی از سر نو شائع کی گئیں چنانچہ ۲۔ جنوری کے روزنامہ انقلاب نے ان جعلی چٹھیوں کو اپنے اخبار کے صفحہ اوّل پر جلی عنوانات شائع کیا۔ حالانکہ گذشتہ سال تحریک مسجد شہید گنج میں یہ چٹھیاں اور بعد میں ان کے مصنف کا حلفی بیان شائع ہو چکا تھا۔ لیکن یونینسٹ پارٹی کا حق نمک ادا کرنے کے لیے جعلی چٹھیاں کو شائع کرنا مناسب سمجھا۔ بعد میں ان چٹھیوں کے بڑے بڑے پوسٹر شائع ہوئے جو پنجاب بھر میں تقسیم ہوئے۔ اس پر مولانا مظہر علی اظہر کا حسب ذیل بیان ۱۱۔ جنوری کے روزنامہ احسان میں شائع ہوا۔

"کسی شخص کامریڈ محمد حسین امرتسری نے ایک اشتہار کے ذریعے میری ایک فرضی چٹھی شائع کی ہے۔ جس میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ میں نے چودھری افضل حق کو مسجد شہید گنج کے متعلق کچھ باتیں لکھی ہیں۔

میں پہلے ہی اعلان کر چکا ہوں کہ جعلی چٹھیاں میرے اور احباب کے نام

پر شائع کی جائیں گی۔ چنانچہ یہ پہلی چٹھی ہے، جو شائع کی گئی ہے۔ بالکل فرضی اور بے بنیاد ہے۔

اس چٹھی پر ۲۴۔ جولائی ۱۹۳۵ء کی تاریخ ہے۔ اور ظاہر کیا گیا کہ یہ چٹھی گورداسپور سے لکھی گئی ہے۔ اس کا پہلا فقرہ یہ ہے کہ

میں دورے سے واپسی پر دفتر پہنچا لیکن آپ موجود نہ تھے۔ زبانی طور پر تمام واقعات مولوی محمد شفیع سے کہہ آیا ہوں۔ غالباً انہوں نے تمام نشیب و فراز بیان کر دیئے ہوں گے۔ احتیاطاً دوبارہ عرض کرتا ہوں۔

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ میں ۲۴۔ جولائی ۱۹۳۵ء کو گورداسپور میں تھا اور لاہور سے گورداسپور گیا تھا اور اس سے پہلے لاہور سے باہر دورے پر تھا اور دورہ کرتا ہوا لاہور پہنچا۔ لیکن چودھری افضل حق ۲۴ سے پہلے لاہور میں نہ تھے۔

کیا آج کوئی واقف حال شخص اس عظیم غلطی میں مبتلا ہو سکتا ہے کہ شائع کردہ چٹھی میری لکھی ہوئی ہے۔ کس کو معلوم نہیں کہ ڈیڑھ سال تک ہمارے خلاف یہ پروپیگنڈہ کیا گیا کہ جب گولیاں چل رہی تھیں ہم دفتر میں بیٹھے پلاؤ اور کباب کھا رہے تھے۔ گولیاں ۲۰-۲۱۔ جولائی ۱۹۳۵ء کو چلیں اور سب کو علم ہے کہ چودھری افضل حق ان دنوں لاہور میں تھے۔ ۲۲۔ جولائی کو ہم سب مسجد وزیر خان میں گئے، جہاں سید عطاء اللہ شاہ بخاری بھی موجود تھے ۲۲ جولائی کو ہم نے سول نافرمانی کے خلاف اپنا پہلا بیان دیا، جو "زمیندار" لاہور میں مورخہ ۲۶۔ جولائی میں شائع ہوا۔ اس کے بعد اور بھی اعلان شائع ہوتے اور چودھری افضل حق اور میں لاہور میں رہے۔ حتیٰ کہ ۲۷ اور ۲۸۔ جولائی کو برکت علی ہال لاہور میں احرار کارکنوں کے اجلاس ہوئے۔ پنجاب اور سرحد کے زعما کے اجلاس ہوتے تو ہم لاہور میں تھے۔

۱۲۔ جولائی کو پنجاب کونسل کے ارکان کا اجلاس ہوا، اس میں شامل ہوا

اور ۱۸-۱۹ جولائی کی گفتگوئے مصالحت کے سلسلہ میں لاہور میں مقیم رہے۔
الغرض ۱۰ جولائی سے ۲۹ جولائی تک چودھری افضل حق اور میں
لاہور میں رہے۔ لیکن اس مفروضہ چٹھی سے ظاہر ہوتا ہے کہ میں اور
چودھری صاحب دونوں دورے پر تھے۔ کیا اس سے زیادہ بھی کوئی بدکرداری
ہو سکتی ہے کہ الیکشن کے دروغ یا ایجنٹ یہ جعلی خط شائع کر کے مجھے اور
احرار کو بدنام کرنے کی کوشش کریں۔
میں ان اخبارات سے، جنہوں نے اس جعلی چٹھی کو شائع کیا ہے امید
رکھتا ہوں کہ وہ میرے اس بیان کو شائع کر کے اس پر تنقید کرنے کی تکلیف
گوارہ فرمائیں گے۔"

ملک برکت علی پر الزام

انہی دنوں پنجاب اسمبلی کے مسلم لیگی امیدوار ملک برکت علی کے خلاف ایک اشتہار شائع ہوا، جو مسلم ایک پارلیمنٹری سیکرٹری غلام محمد خاں بیرسٹر کے نام بھیجا گیا اور اس کی نقل اخبارات میں شائع ہوئی۔ اس اشتہار میں ملک برکت علی پر دو الزام لگائے گئے تھے۔
"۱۔ کیا ملک برکت علی نے مسجد شہید گنج میں بحث کرنے کے لیے مبلغ تین صد
روپیہ شہید گنج ڈیفنس کمیٹی سے حاصل نہیں کیے اور اس رقم کا تحریری سرٹیفکیٹ
انہوں نے عدالت میں داخل نہیں کیا۔؟
۲۔ کیا اس مسلم رئیس اور نواب سے جن کی طرف سے متذکرہ بالا اشتہار میں
اشارہ ہے۔ انہوں نے معائنہ مثل اور حصول نقل کے لیے مبلغ ایک صد
روپیہ چیک نمبر ۱۵۲۱۲۶ مورخہ ۲۴ فروری ۱۹۳۶ء کو حاصل نہیں کیے"؟

(روزنامہ انقلاب - لاہور - ۲۱ جنوری ۱۹۳۷ء)

پنڈت مالوی پنجاب میں

۱۹۔ جنوری کو پنڈت مدن موہن مالوی کانگریسی امیدواروں کی مخالفت کے لیے پنجاب کے دورے پر لاہور پہنچے۔ مگر وہ جس جگہ گئے وہاں کے ہندو عوام نے ان کی مخالفت کی اور ان کی تقریر سننے سے انکار کر دیا۔

آخر وہ ایک ہفتہ کے بعد واپس چلے گئے۔

حلف نامہ آزادی خلافِ قانون قرار دے دیا گیا

۲۲۔جنوری کو مدراس گورنمنٹ نے ۲۶۔جنوری یوم آزادی کے موقعہ پر پڑھا جانے والا حلف نامہ خلافِ قانون قرار دے دیا۔اس کے بعد بمبئی سی پی اور پنجاب کی صوبائی حکومتوں نے بھی یہ حلف نامہ ممنوع قرار دے دیا۔

۱۹۳۰ء میں آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اپنے ریزولیشن کے مطابق ہر سال ۲۶۔جنوری کو یوم آزادی منائے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔جس میں اس ریزولیشن کا اعادہ کیا جاتا اور اسے بطورِ حلف نامہ کے ہر سال پڑھا جاتا تھا۔لیکن امسال صوبائی حکومتوں نے ایمر جنسی پاور ایکٹ ۱۹۳۱ء کی دفعہ ۱۹ کے تحت بحکم ملکِ معظم اس حلف نامے کو خلافِ قانون قرار دے دیا۔چنانچہ پولیس نے اس ریزولیشن کی تمام کاپیاں سارے ملک میں کانگریس کے دفاتروں پر چھاپہ مار کر ضبط کریں۔

مجلسِ احرار کا اعلان

۲۳۔جنوری کو مجلسِ احرار ہند کے سالارِ اعظم سردار محمد شفیع نے اعلان کیا کہ

"احرار وطن عزیز کی آزادی کے لیے کانگریس سے پورا پورا تعاون کریں گے کیونکہ ہندوستان کی آزادی سے وسطِ ایشیا کے مسلمان ممالک کی آزادی وابستہ ہے"

مولانا عبیداللہ سندھی کی صدائے بازگشت

سیٹھ عبداللہ ہارون نے ۲۷۔جنوری ۱۹۳۷ء کو اسمبلی کے اجلاس میں حکومتِ ہند سے دریافت کیا کہ:

"آیا حکومت نے عبیداللہ سندھی کے ہندوستان میں داخلے کو منسوخ قرار دے دیا ہے۔کیا حکومت کو یہ علم ہے کہ مولانا عبیداللہ سندھی ہندوستان واپس آنا چاہتے ہیں"؟

جواب میں سر ہنری برگ نے کہا، کہ

"مولانا نے خود اپنے آنے کی تفصیل سے حکومت کو ابھی تک آگاہ نہیں کیا اور نہ ہی کوئی درخواست کی ہے"

مولانا عبید اللہ سندھی ۱۵۔ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو ہندوستان سے کابل گئے تھے اور سات برس کے بعد ۱۳۔ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو افغانستان سے روس پہنچے۔ ایک سال یہاں رہنے کے بعد مولانا عبید اللہ سندھی ترکی چلے گئے اور ابھی تک وطن سے باہر ہیں۔

انتخابات شروع ہو گئے

ایکٹ ۱۹۳۵ء جس کی رو سے ہندوستان کو نئی اصلاحات مل رہی تھیں۔ جس کے لیے گذشتہ سال سے سیاسی جماعتیں مصروف تھیں۔ آخروہ دن، وہ گھڑی، اور وہ وقت آن پہنچا۔ جب ہندوستان کی پولیٹیکل پارٹیز اپنے منشور اور اس کے حصول میں عوام کے سامنے پہنچ گئیں۔

کانگریس، مسلم لیگ اور مجلس احرار کے علاوہ پنجاب میں یونینسٹ پارٹی، سندھ میں سندھ یونائیٹڈ اس طرح یوپی، بہار، سی پی، اڑیسہ، بنگال، آسام اور شمال مغربی سرحدی صوبہ میں مختلف عنوانات اور ناموں سے جدا جدا جماعتیں الیکشن کے میدان میں اتر چکی تھیں۔

لاہور کے ڈپٹی کمشنر نے ۱۸ سے ۲۵ جنوری تک لاہور میں الیکشن کی تاریخوں کا اعلان کر دیا۔ فروری کے شروع میں دوسرے صوبوں میں بھی انتخابات شروع ہو چکے تھے۔ ہر روز طلوع ہونے والا آفتاب اخبارات کو نئی اطلاعیں فراہم کرتا۔ جس سے قیاس آرائیوں نے جنم لینا شروع کیا۔ کبھی کانگریس، کبھی مسلم لیگ اپنے خیالی گھوڑے دوڑا رہی تھیں لیکن سرکاری اعلان کا انتظار تھا جو آخری اور حتمی تھا۔

اس دوران ۲۔ فروری کو ڈاکٹر محمد عالم نے جو شہید گنج کے ٹکٹ پر راولپنڈی سے انتخاب لڑ رہے تھے، اپنی کامیابی کے گمان میں اعلان کر دیا کہ

"وہ کانگریس کے خادم ہیں اور کامیاب ہو کر کانگریس میں کام کریں گے"

اس پر اتحاد ملت کے کارکنوں نے اعتراض کیا کہ آپ شہید گنج کے لیے الیکشن لڑ رہے تھے۔ اب آپ نے کانگریس کی پناہ لے لی۔

اس پر ڈاکٹر عالم نے کہا کہ:

"میں اسمبلی میں کانگریس کی مدد سے مسجد کے لیے لڑوں گا۔ جواہر لال کی امداد بھی مجھے حاصل ہوگی۔ میں صرف حصولِ مسجد کے لیے کانگریس میں جا رہا ہوں۔"

پنجاب میں مسلم لیگ کے دو امیدوار تھے۔ ملک برکت علی اور راجہ غضنفر علی۔ اوّل الذکر نے مجلس اتحاد ملّت کا ٹکٹ بھی برائے کامیابی حاصل کر لیا تھا۔ جس پر مسلم لیگی حلقوں میں تعجب کیا گیا۔ ۹ر فروری کے اعلان کے مطابق مسلم لیگ کے دو ممبر کامیاب ہوئے۔ ملک برکت علی اور راجہ غضنفر علی۔ لیکن آخر الذکر کامیاب ہو کر یونینسٹ پارٹی میں جا ملے۔ راجہ صاحب کا استقبال کرتے ہوئے سر سکندر حیات نے کہا

"راجہ صاحب میری مرضی اور میرے ایماء پر مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے شروع ہی سے میرے ساتھ وعدہ کر لیا تھا کہ وہ کامیاب ہونے کے فوراً بعد یونینسٹ پارٹی میں شریک ہو جائیں گے۔"

(اقبال کے آخری دو سال ص۳۷۷)

راجہ صاحب کے اس فعل پر ہفت روزہ نیو ٹائمز نے اپنی ۲۲ فروری کی اشاعت میں لکھا

"یہ صاف سیدھا فریب اور دھوکہ ہے۔ اگر مسلم لیگ کو معلوم ہوتا کہ راجہ غضنفر علی اور سر سکندر کے درمیان کوئی عہد و پیمان قائم ہے تو پارلیمنٹری بورڈ کبھی ایسے شخص کو ٹکٹ نہ دیتا، جو فریق مخالف کے لیڈر کے ساتھ خفیہ ساز باز میں شریک تھا۔"

(اقبال کے آخری دو سال ص۳۷۷)

یکم فروری کو صوبہ سرحد میں الیکشن کے دوران سارے صوبے میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی جس کے تحت صوبہ بھر میں جلوس اور جلسے خلافِ قانون قرار دے دیئے گئے۔

یوپی میں بھی اسی قسم کا کھیل تماشہ ہوا۔ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہونے کے بعد حافظ اسماعیل، حافظ ابراہیم اور سعید الدین کانگریس میں جا شامل ہوئے۔

وسطِ فروری تک مسلم لیگ اور کانگریس کو اپنی اپنی پوزیشن کا واضح علم ہو چکا تھا۔ اس بناء پر بابو راجندر پرشاد نے ایک اخباری بیان میں کہا کہ کانگریس کسی دوسری جماعت سے اسمبلی کے اندر وزارت کے سلسلے میں مفاہمت نہیں کرے گی۔

کانگریس رہنما کا یہ بیان یوپی کے چودھری خلیق الزمان کے لیے پریشانی کا باعث ہوا۔ چنانچہ رہ کہتے ہیں۔ آخر اس بیان کی اتنی جلدی کیا تھی۔ جب کہ ابھی تک اکثر صوبوں کے انتخابات کے نتائج بھی معلوم نہیں ہوئے تھے۔ علاوہ ازیں گو الیکشن کے دوران لیگ اور کانگریس کا کوئی باقاعدہ تحریری سمجھوتہ بھی نہ تھا۔ پھر بھی دونوں ادارے ایک دوسرے کی مدد کرتے رہے تھے۔ اس سے مجھے خوف ہوا کہ راجن بابو کا یہ بیان بہت خطرناک مستقبل کی دعوت دے گا۔ اور اسی وقت میں نے ایک مجمع کے سامنے کہہ دیا کہ کانگریس کی اس پالیسی کا میں پورا مقابلہ کروں گا۔

(شاہراہ پاکستان مصنف چودھری خلیق الزمان ص۶۲۳)

برطانیہ کی جنگی تیاریاں

لندن۔ ۱۲ فروری کو دارالعلوم میں برطانیہ کے وزیر اعظم نے اعلان کیا کہ جنگی تیاریوں کے پیش نظر حکومت کو چالیس کروڑ پونڈ قرض لینا پڑے گا۔

راجہ غضنفر علی کا بیان

۱۸ فروری کے روزنامہ "انقلاب" لاہور میں راجہ غضنفر علی کا ایک بیان شائع ہوا۔

"میں ہمیشہ سے ہندو مسلم اتحاد کا حامی رہا ہوں۔ چنانچہ یونینسٹ پارٹی میں شامل ہونا اس کا زندہ ثبوت ہے۔ اسی سلسلہ میں زمینداروں کی خدمت زیادہ ضروری سمجھتا ہوں۔ اتحاد پارٹی کے [illegible] افراد کو [illegible] زیادہ [illegible] ہے جو پارٹی کا نصب العین بھی مسلم لیگ کی طرح [illegible] اور [illegible] ہے۔ اتحاد پارٹی کے لیڈروں سے مجھے مدت سے نیاز مندی حاصل ہے۔ [illegible] میں اگر کوئی شخص زیادہ سے زیادہ مخلص ہے تو وہ سر سکندر حیات ہے۔ جب وہ وزیر ہوئے تو [illegible] حالات بہت خراب تھے۔ لیکن ان کے وزیر بنتے ہی حالات درست ہو گئے۔ اس پر تمام اخبارات نے انہیں مبارک باد دی [illegible] منصب سے بالاتر ہیں۔"

ہٹلر کا اعلان

برلن۔ ۱۹ فروری کو ہٹلر نے جرمنی کے تمام سابق [illegible] فوجی سپاہیوں اور افسران کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ

"جرمن قوم کسی قوم سے جنگ نہیں چاہتی ۔ اس وقت ہمارے دل میں اپنے قدیم مخالفین کے سوائے احترام کے اور کچھ نہیں ۔ آج تک جنگیں کسی قوم کے لیے مفید نہیں رہیں، بلکہ تباہی لائی ہیں ۔

جس حالت میں جرمن حالات سے برہم ہو جائیں گے یا ہمارے امن میں خلل وارد ہو گا اور جرمن کے حالات بگڑ جانے کا خدشہ ہو گا تو جرمن مجبور ہو گا کہ وہ اپنا دفاع کرے اور اس کی تمام تر ذمہ داری ہم پر نہیں ہو گی"

(روزنامہ "انقلاب" لاہور ۱۲۔فروری ۱۹۳۷ء)

انتخاب کے نتائج

فروری کے آخر تک تمام صوبوں کے نتائج نکھر کر سامنے آ چکے تھے اس کے نتیجے میں کانگریس کی پوزیشن حسب ذیل تھی ۔

مدراس	کل دو سو پندرہ نشستیں	کانگریس	ایک سو اکیاون
بمبئی	کل ایک سو پچھتر "	"	اٹھاسی
اڑیسہ	کل ساٹھ "	"	چھتیس
یوپی	دو سو اٹھارہ "	"	ایک سو بارہ
سی پی	ایک سو بارہ "	"	اکہتر
بہار	ایک سو باون "	"	ستانوے
شمالی مغربی صوبہ سرحد	پچاس	"	انیس
آسام	ایک سو اٹھ "	"	پینتیس
بنگال	دو سو پچاس "	"	بیالیس
پنجاب	ایک سو پچھتر "	"	اٹھارہ
سندھ	ساٹھ "	"	سات

اس کے مقابل آل انڈیا مسلم لیگ کسی جگہ بھی ایسی پوزیشن حاصل نہ کر سکی کہ وہ اپنی وزارت بنا سکتی ۔ مثلاً بنگال میں مسلمانوں نے ایک سو تئیس نشستیں حاصل کیں ۔ یہاں کا لیڈر فضل الحق تھا اور وہ پرجا پارٹی بنا کر بیٹھا ہوا تھا ۔ گو اس کا اتحاد مسلم لیگ سے تھا مگر وزارت

فضل الحق نے ترتیب دی اسے لیگی وزارت نہیں کہا جا سکتا۔ پنجاب میں مسلم لیگ کے ناعاقبت اندیش کارکنوں کی وجہ سے مسلم لیگ کو شکست ہوئی۔ البتہ صوبجات متحدہ میں مسلم لیگ نے انیس نشستیں حاصل کیں یعنی اسی فیصد کامیاب رہے۔ لیکن یہاں وزارت بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ یہ علاقہ یوپی میں شامل تھا۔

مختصراً نتائج یہ ٹھہرے کہ مسلمانوں کے چار سو اکانوے حلقوں میں مسلم لیگ نے ایک سو چار نشستیں حاصل کیں۔ جبکہ کانگریس مدراس، یوپی، سی پی، بہار اور اڑیسہ میں واضح اکثریت سے کامیاب ہوئیں۔

مجلسِ احرار مجلس احرار نے پنجاب اور دیگر صوبوں میں بری طرح شکست کھائی پنجاب میں اس کے ۱۰ نمائندے کامیاب ہوئے۔ لیکن پارٹی لیڈر چودھری افضل حق کے شکست کھا جانے کے باعث صرف تین آدمی جماعت کے ساتھ رہے۔ مولانا مظہر علی اظہر ایڈووکیٹ (لاہور) خواجہ غلام حسین ایڈووکیٹ (لائلپور) چودھری عبدالرحمن [illegible] (ضلع جالندھر) اس کی کئی وجوہات تھیں۔ اول مسجد شہید گنج کا غلط پروپیگنڈہ۔ دوسرے درجے پر یونینسٹ پارٹی اور حکومت کا گٹھ جوڑ۔ تیسری وجہ یہ کہ مجلس احرار کا اپنا کوئی اخبار نہیں تھا اس وجہ سے پنجاب کا غیر مسلم پریس احرار امیدواروں کی مخالفت کرتا رہا۔ مسلم لیگ کے کارکنوں کی مخالفت [illegible] کے ساتھ احرار کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئی۔ حقیقت میں مسلم لیگ کے [illegible] یونینسٹ پارٹی کے رکن تھے۔ وہ سر فضل حسین کے اشارے پر مسٹر جناح کو فریب دے رہے تھے۔

یوپی میں جمعیۃ علمائے ہند نے مسلم لیگ سے ناطہ جوڑ لیا تو [illegible] الیکشن میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا اور تحریک مدح صحابہ کے [illegible] سے اجتناب برتا۔ سرحد کے احرار کو ان کی صوابدید پر چھوڑ دیا تھا [illegible] لیا۔ حافظ علی بہادر مدیر اعلیٰ "روزنامہ ایمان" بمبئی کے علاوہ عورتوں کی ایک سیٹ پر احرار نے حصہ لیا یہاں بھی دونوں سیٹوں پر شکست ہوئی۔ بہر حال مجلس احرار ۱۹۴۰ء کے الیکشن میں مات کھا گئی

یونینسٹ پارٹی پہلی جنگ عظیم کے شروع [illegible] سال سے [illegible] بیرونی [illegible]

تھیں پنجاب کے دیہاتی سکھ نوجوان جوان دنوں ہندوستان سے باہر کاروبار کے لیے گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے انگریزوں کے خلاف اپنے وطن کے لیے ایک عظیم سازش کی (جس کی تفصیل زیر نظر کتاب کی دوسری جلدوں میں آگے چل کر آئے گی) جب یہ لوگ واپس وطن آئے توان کے گاؤں برطانیہ کے خلاف بغاوت کا مرکز بن گئے۔ شہروں میں تو آگ روشن تھی جب دیہاتی عوام بھی فرنگی سامراج کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تو حکومت کی حکمت عملی سے شہری اور دیہاتی کی تمیز اور اس افتراق کو ہوا دینے کے لیے ۱۹۲۴ء میں سر فضل حسین کی سرپرستی میں یونینسٹ پارٹی قائم کی گئی تاکہ انگریز کے خلاف اٹھنے والی آواز بگڑ کر رہ جائے۔ اور شہروں کی طرح گاؤں بھی فرقہ وارانہ فضائیں جلنے لگے۔ گو یہ سکیم کامیاب نہ ہو سکی تاہم ۱۹۳۷ء کے انتخابات سے پیشتر اس لاش کو جس میں بدبو پڑ چکی تھی قبر سے نکالا گیا۔ حکومت کی خواہش پر رائے بہادروں، خان بہادروں اور سروں کا یہ ٹولہ ہندو مسلم اتحاد اور شہری، دیہاتی کے عنوان سے پنجاب میں کامیاب ہوا۔

پنجاب میں ناکامی پر مسٹر جناح کا بیان

پنجاب میں مسلم لیگ کی شکست پر ۲۸ فروری کو بمبئی میں مسٹر محمد علی جناح نے حسب ذیل بیان دیا۔

"یہ پہلا موقعہ ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ نے کسی مؤثر صوبائی یا ڈسٹرکٹ اداروں کے بغیر انتخاب میں حصہ لیا۔ اگرچہ یہ ابتدائی کوشش ہے، تاہم میں اس کے نتائج سے مطمئن ہوں۔ بنگال میں مسلم لیگ نے پچاس فیصد مسلم نشستوں پر قبضہ کر لیا ہے یوپی مسلم لیگ کے چھتالیس امیدواروں میں انتیس کامیاب ہوئے ہیں۔
مدراس میں گیارہ امیدوار تھے، دس کامیاب ہوئے ہیں۔ بمبئی میں دو تہائی مسلم نشستیں لیگ کے حصہ میں آئی ہیں۔"

پنجاب کا ذکر کرتے ہوئے قائد اعظم نے پنجاب میں مسلم لیگ کی ناکامی کا افسوس ناک لہجے میں اعتراف کیا۔

لیگ کی طرف سے بہار، صوبہ سرحد، اڑیسہ اور سندھ میں پارلیمنٹری بورڈ قائم نہیں

کیئے گئے تھے۔ آسام میں چوبیس مسلم نشستوں میں سے لیگ کو صرف ایک نشست ملی ہے اس جگہ مسلم لیگ کے دو دھڑوں کی قیادت میں باہم بازی تھا۔"

(روزنامہ "انقلاب" لاہور ۲۔ مارچ ۱۹۴۶ء)

سیکرٹری انجمن اسلامیہ

یکم مارچ کو سیکرٹری انجمن اسلامیہ نے کہا کہ روزنامہ "احسان" کی یہ خبر غلط ہے کہ انجمن اسلامیہ لاہور نے مرزائیوں پر اپنے دروازے کھول دیئے ہیں۔ انجمن اسلامیہ کا ممبر صرف مسلمان ہو سکتا ہے۔

سیاسی قیدیوں کی رہائی

امرتسر یکم مارچ کو ایک سرکاری اعلان کے ذریعے کہا گیا کہ ۱۵-۱۹۱۴ء کے وہ قیدی جنہیں ایک سازش کے تحت عمر قید کی سزا دی گئی۔ وہ رنگون جیل سے رہا کر دیئے گئے ہیں۔ ان قیدیوں میں بابا امر سنگھ نامی شخص گرفتاری سے پہلے ملایا میں انجینئر تھا۔

ان لوگوں نے انگریزوں کے خلاف عسکری جنگ لڑنے کے لیے جاپان سے کاماگاٹا مارو جہاز خریدا تھا۔ یہ بحری جہاز جب بج بج کے گھاٹ پہ پہنچا تو انگریزوں سے اس کا مقابلہ ہوا جس سے بہت سے ہندوستانی مارے گئے، جو بچے وہ گرفتار کر لیے گئے۔ سردار گوردت سنگھ اس جہاز کا لیڈر تھا۔

گرفتاری کے وقت ان لوگوں کی عمریں بیس تیس سال کے درمیان تھیں اور جب رہا ہوئے تو ان کی ڈاڑھیاں سفید ہو چکی تھیں۔ پھر یہ لوگ بابے کہلائے۔ ہر ہندوستانی انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔

حکومت پنجاب کا اعلان

چار مارچ کے اخبارات میں حکومت پنجاب نے اعلان کیا کہ نئے آئین میں پنجاب کے وزراء کون کون ہوں گے۔ سر سکندر چودھری چھوٹو رام، خضر حیات ٹوانہ، میاں عبدالحئی، سر منوہر لعل، سر سندر سنگھ مجیٹھیہ، پنجاب وزراء کے متعلق آخری فیصلہ یکم اپریل ۱۹۳۷ء تک کوئی اعلان یا نوٹیفکیشن نہیں ہوگا تاہم یہ امر قطعی طور پر معلوم ہو چکا ہے کہ گورنر پنجاب نے سر سکندر حیات کے مشورے سے مندرجہ بالا اصحاب کو کابینہ میں لے لیا ہے۔

وزیر اعظم پنجاب کا اعلان سرکاری اعلان کے دوسرے روز پنجاب کے وزیر اعظم (نئے آئین کے تحت ہر صوبے کا وزیر اعلیٰ وزیر اعظم کہلاتا تھا) سر سکندر حیات نے اپنی پارٹی کی ایک میٹنگ میں اخبارات کے نمائندوں کو چائے پر بلایا۔ ان کے سامنے تقریر کرتے ہوئے وزیر اعظم نے کہا کہ

"آئندہ حکومت پریس کے متعلق قوانین بنانے میں ایک نئی پالیسی کا اعلان کرے گی۔ نئی حکومت کی نگاہ میں کسی اخبار کے جرائم میں سب سے بڑا جرم ایسی تحریریں ہوں گی جو مختلف اقوام کے درمیان نفرت پھیلانے والی ہوں گی"

(روزنامہ "انقلاب" لاہور ۹۔ مارچ ۱۹۳۷ء)

روزنامہ "پرتاپ" کی ایک خبر ۱۰۔ مارچ کے روزنامہ "پرتاپ" لاہور میں یہ خبر صفحہ اول پر شائع ہوئی۔

"سر سندر سنگھ مجیٹھیہ نے یونینسٹ پارٹی سے اس شرط پر اتحاد کیا ہے کہ اسمبلی کے اندر مسجد شہید گنج کے متعلق کوئی سوال نہیں اٹھایا جائے گا۔ اگر کسی ممبر نے یہ سوال اٹھایا تو حکومت اس کی مخالفت کرے گی"

مسٹر جناح کا ایک اور بیان ۹ مارچ کو نئی دہلی سے ایک اخباری نمائندے کے سوال کے جواب میں مسٹر جناح نے کہا۔

"ہماری پوزیشن بالکل واضح ہے۔ ہم ہر اس ترقی پسند پارٹی سے تعاون کریں گے جس کا پروگرام ہمارے بنیادی اصولوں کے مطابق ہوگا۔

ہماری اور راجگوپال اچاریہ کی پالیسی میں کوئی فرق نہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ وزراء اور ممبران مجالس وضع قوانین میں جانے کے مسئلہ پر غور کریں۔ اور اپنی ذمہ داریاں انجام دیں اور اصولوں پر حکومت چلائیں"

مرکزی مجلس احرار کا اجلاس لدھیانہ ۱۱۔ مارچ مرکزی مجلس احرار کا اجلاس ہوا جس میں احرار امیدواروں کی شکست پر غور کیا گیا۔ اس ضمن میں سرمائے کی کمی، غیر مناسب سرکاری مداخلت اور پارٹی کا آرگن نہ ہونے کو شکست کا موجب قرار

دیا گیا۔

سرحد میں وزارت کا قیام جیسے ہی انتخابات ختم ہوئے گورنروں نے اکثریتی پارٹیوں کو دعوت دی کہ وہ وزارت قائم کریں۔ اس سلسلے میں ۱۶۔ مارچ کو شمال مغربی صوبہ سرحد کے گورنر نے نواب سر عبدالقیوم کو بحیثیت صدر یونائیٹڈ پارٹی کو دعوت دی کہ وہ وزارت قائم کریں۔ ان دنوں صوبہ سرحد میں مختلف پارٹیوں کی پوزیشن یہ تھی۔

یونائیٹڈ پارٹی۔ ۲۱ ارکان، کانگریس۔ ۱۹، ہندو سکھ نیشلسٹ۔ ۸، مسلم انڈیپنڈنٹ۔ ۱

اس طرح سرحد میں پہلے وزیر اعظم سر عبدالقیوم مقرر ہوئے۔

سبھاش بابو کی رہائی کلکتہ ۱۷۔ مارچ مسٹر سبھاش چندر بوس جنہیں گذشتہ سال دفعہ ۱۸ کے تحت نظر بند کیا گیا تھا۔ آج شام رہا کر دیا گیا۔

کانگریس کی قرارداد جب سے ملک میں انتخابات ختم ہوئے ہیں۔ حکومت ایک نئی الجھن میں پھنسی ہوئی ہے۔ کیونکہ اس الیکشن میں کانگریس پانچ صوبوں میں کامیاب ہو چکی ہے اور وہ کسی دوسری پارٹی سے کولیشن پر آمادہ نہیں۔ اس کے علاوہ کانگریس میں مختلف عناصر اپنے اپنے ذہن اور خیال کے مطابق سوچ رہے ہیں۔ ایک گروہ کی رائے ہے کہ ہمیں وزارتیں قبول کرنی چاہیں۔ دوسرا طبقہ مشروط وزارتیں قبول کرنے کے حق میں ہے۔ ایک پارٹی کا کہنا ہے کہ ہمیں گورنروں سے اختیارات کے استعمال کی ضمانت حاصل کر لینی چاہیے۔

انہی حالات میں ۱۸ مارچ کو دہلی میں آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی نے کانگریس کے ٹکٹ پر کامیاب آٹھ سو ممبران کی موجودگی میں دو روز بحث کے بعد حسب ذیل ریزولیشن پاس کیا۔

"جس صورت میں حکومت برطانیہ و حکومت ہند کی واضح اور غیر مبہم رائے کے اعلان کرنے کے باوجود جدید دستور اساسی بدستور ہے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی مجلس آئین ساز کے ارکان کو تاکید کرتی ہے کہ اس صورت میں مجالس آئین ساز کے

اندر اور اس کے باہر ان کے اقدامات کانگریس کی بنیادی پالیسی پر مبنی ہونے چاہییں۔ تاکہ وہ جدید دستور سازی کا مقابلہ کر سکیں اور اسے ختم کر دینے کے قابل بن سکیں۔

یہ وہی پالیسی ہے، جس کے تحت کانگریس نے لوگوں سے ووٹ حاصل کیے ہیں اور انتخابات میں اسے فتح نصیب ہوئی ہے۔ یہ پالیسی اس مرحلے تک پہنچنی چاہیے، جس راستے سے برطانیہ حکومت کی راہ میں رکاوٹیں حائل کی جا سکیں اور برطانوی استعماریت اور ہندوستانی نیشنلزم کے درمیان ایک دائمی تنازعہ پیدا کیا جا سکے۔ اور جدید دستور کے خلاف جمہوریت کی دفعات کو طشت از بام کیا جا سکے۔

آل انڈیا کانگریس اپنے اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ان ریزولیشنوں کی تصدیق کرتی ہے جو ۲۰ اور ۲۸ فروری کو واردھا میں منظور ہوئے تھے۔ ان قراردادوں میں مجالس آئین ساز کے کانگریسی ارکان۔ اقدامات مجالس آئین ساز کے اندر اور باہر ان کی کوششیں، عوام الناس سے ان کا میل جول اور مجالس آئین ساز میں کانگریس پالیسی کی وضاحت کی گئی تھی۔

آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی کا یہ اجلاس مجالس آئین ساز کے کانگریسی ارکان سے ملتجی ہے کہ وہ انہی ریزولیشنوں کو اپنا دستور العمل بنائیں۔ وزارتوں کی قبولیت یا عدم قبولیت کے تصفیہ شدہ موضوع کے بارے میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی۔ مجالس آئین ساز کے کانگریسی ارکان کو مجاز قرار دیتی ہے کہ وہ کانگریس کی اکثریت والے صوبوں میں وزارتیں قبول کر لیں۔ بشرطیکہ کوئی وزارت اس وقت تک قبول نہ کی جائے جب تک مجلس آئین ساز کی کانگریس پارٹی کا لیڈر مطمئن نہ ہو جائے اور عوام الناس کے سامنے اعلان کرنے کے قابل نہ ہو جائے کہ جس وقت تک وہ یا اس کی کابینہ دستور اساسی کی حدود میں کام کریں گے گورنر اپنے اختیارات خصوصی کو استعمال نہیں کریں گے۔ اور نہ ہی وزراء کی رائے کو

نظر انداز کریں گے۔"

(روزنامہ "انقلاب" لاہور۔ ۱۸ مارچ ۱۹۳۷ء)

مندرجہ بالا قرارداد کانگریس کے سالانہ اجلاس ۱۹۔ مارچ کو زیرِ صدارت جواہر لعل نہرو زیرِ بحث آئی اور چند لفظی ترمیمات کے ساتھ اسے منظور کر لیا گیا۔

علامہ اقبال کا خط مسٹر جناح کے نام

کانگریس کی قرارداد کے بعد ڈاکٹر سر محمد اقبال نے ۲۰۔ مارچ کو مسٹر جناح کے نام حسبِ ذیل خط لکھا۔

"میرا خیال ہے، آپ نے پنڈت جواہر لعل نہرو کا خطبۂ صدارت ملاحظہ فرمایا ہوگا، جو انھوں نے آل انڈیا نیشنل کنونشن میں دیا ہے۔ اس خطبہ میں مسلمانانِ ہند کے بارے میں جس پالیسی کا اعلان کیا گیا ہے، اس کو بھی آپ نے بخوبی محسوس کیا ہوگا۔ آپ یقیناً اس بات سے بھی آگاہ ہوں گے کہ نئے آئین نے ہندوستان کے مسلمانوں کو اس بات کا نادر موقعہ ضرور دیا ہے کہ وہ ہندوستان اور اسلامی ایشیا میں رونما ہونے والے سیاسی حالات کے پیش نظر اپنی تنظیم کر سکیں۔ بلاشبہ ہم ملک کی دیگر ترقی پسند جماعتوں کے ساتھ اشتراک و تعاون کرنے پر تیار ہیں۔ لیکن ہمیں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ ایشیا میں اسلام کی اخلاقی اور سیاسی طاقت کے مستقبل کا انحصار بہت بڑی حد تک ہندوستان کے مسلمانوں کی مکمل قومی تنظیم پر ہے۔ اس لیے میری رائے ہے کہ آل انڈیا نیشنل کنونشن کو ایک مؤثر جواب دینا بے حد ضروری ہے۔ آپ کو چاہیے کہ فوراً دہلی میں ایک آل انڈیا مسلم کنونشن منعقد کریں۔ جس میں شرکت کے لیے نئی صوبائی اسمبلیوں کے ممبروں کے علاوہ دیگر بڑے بڑے مسلمان رہنماؤں کو بھی مدعو کریں۔ اس کنونشن میں آپ پوری صفائی اور تندہی کے ساتھ حقیقت بیان کیجیے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک جداگانہ سیاسی ہستی کے مالک ہیں اور اس حیثیت سے ان کا سیاسی مطمح نظر کیا ہے۔

یہ امر بے حد ضروری ہے کہ اندرون و بیرونِ ہند کی تمام دنیا کو بتا دیا جائے۔

کہ ملک میں محض اقتصادی مسئلہ ہی تنہا ایک مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ مسلمانوں کے نکتۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو مسلمانانِ ہند کے لیے ثقافت اور کلچر کا مسئلہ اپنے اندر زیادہ اہم نتائج رکھتا ہے۔ بہرحال کلچر کا مسئلہ کسی طرح بھی اقتصادی مسئلہ سے کم اہم نہیں ہے۔

اگر آپ نے اس قسم کی کنونشن منعقد کی تو ایک فائدہ یہ ہوگا کہ اس طرح ان مسلمان ممبروں کی نیتوں کا بھی امتحان ہو جائے گا، جنہوں نے مسلمانانِ ہند کے اغراض و مقاصد کے خلاف اپنی الگ جماعتیں قائم کر رکھی ہیں۔ اور دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ ہندوؤں پر یہ حقیقت اچھی طرح منکشف ہو جائے گی کہ باریک سے باریک سیاسی چال بھی مسلمانوں کو فریب نہیں دے سکتی۔ اور اپنی جداگانہ تمدنی حیثیت کو کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے۔

میں چند روز میں دہلی آ رہا ہوں۔ پھر اس موضوع پر آپ سے زبانی گفتگو ہوگی۔

("اقبال کے خطوط جناح کے نام" پبلشر شیخ محمد اشرف)

یوپی میں لیڈر شپ کا جھگڑا

یوپی کے چودھری خلیق الزمان عجیب و غریب طبیعت کے آدمی تھے۔ سیاسی سوجھ بوجھ کے علاوہ عملی دوڑ دھوپ میں بھی کافی مہارت رکھتے تھے۔ چار پیسے بھی پاس تھے۔ اس بل بوتے پر اقتدار کے محاذ کی کمان کرنے کو بھی جی چاہتا تھا۔ اگرچہ آل انڈیا شہرت کے آدمی نہیں تھے۔ تاہم اپنے صوبے میں انہیں کافی وقار حاصل تھا۔

نئے انتخاب میں کامیابی کے بعد انہیں ایک آدھ وزارت ملنے کا امکان تھا۔ اس بنا پر انہوں نے باغبان اور صیاد، دونوں کو راضی رکھنے کی کوشش کی۔ ان کا ارادہ تھا کہ کانگریس اور مسلم لیگ میں کسی طرح مفاہمت ہو جائے۔ اس ملاپ میں وہ پیش پیش تھے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو ظاہر ہے کہ چودھری خلیق الزمان کو کانگریس مسلمانوں کی طرف سے وزارت میں لے لیتی۔ لیکن راجندر بابو نے یہ کہہ کر کہ کانگریس وزارت بنانے میں کسی دوسری پارٹی سے تعاون نہیں کرے گی، چودھری خلیق الزمان کی تمام خیالی عمارت دھڑام سے نیچے گرا دی اور چودھری صاحب

کو افسوس کے لہجے میں کہنا پڑا کہ راجندر پرشاد کو ایسا بیان دینے میں اتنی جلدی کیا تھی۔ ان کا یہ بیان بہت خطرناک مستقبل کو دعوت دے گا۔

اگر کانگریس کے سابق صدر راجندر بابو یہ غلطی نہ کرتے اور کانگریس اپنے طور پر ہی مسٹر خلیق الزمان کو وزارت میں شامل کر لیتی تو آگے چل کر تحریک پاکستان کو یوپی میں یہ کامیابی حاصل نہ ہوتی جو کانگریس کی اس غلطی سے ہوئی۔

کانگریس سے مایوس ہونے کے بعد چودھری خلیق الزمان نے مسلم لیگ کی طرف رجوع کیا۔ پھر کیا ہوا یہ کہانی سر محمد یامین خاں کی زبانی سنیے۔

یوپی میں مسلم لیگ کے پارلیمنٹری بورڈ کا اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ اس میں پارٹی کا لیڈر چنا جانا تھا۔ ظاہر ہے کہ ماسوائے دو تین مسلم لیگ کے ممبروں کے سب نواب اسماعیل کے طرفدار تھے۔ اور چودھری خلیق الزمان کے طرفدار صرف دو تین تھے۔ نواب اسماعیل خاں کی وجہ سے بہت مسلم لیگی کامیاب ہوئے۔ لیکن خلیق الزمان اس کو کیسے گوارا کرتے کہ وہ کچھ نہ ہوں۔ چونکہ انہوں نے ہی نواب اسماعیل خاں کی مدد سے مسٹر جناح کو لیگ ٹکٹ پر الیکشن لڑانے پر تیار کیا تھا اور کانگریس سے سارا درونِ خانہ سمجھوتہ کر رکھا تھا کہ ڈیکائے ڈک (DECOY DUCK) بن کر لیگ کو کانگریس سے ملا دیں گے اور وزارت حاصل کریں گے۔ اب اگر یہ لیڈر منتخب نہ ہوتے تو وزارت کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ اس لیے یہ ترکیب کھیلی گئی کہ بجائے ممبران اسمبلی کے پارلیمنٹری بورڈ یہ انتخاب کرے اور چونکہ پارلیمنٹری بورڈ کو پورا اختیار نہ تھا۔ لہٰذا مسٹر جناح کو مدعو کیا گیا۔ اور ان کو خفیہ طور پر سمجھایا گیا کہ نواب اسماعیل خاں فوری طور پر لکھ ہوئے ہو کر تقریر نہیں کر سکتے اور پہلے جب مرکزی اسمبلی میں تھے، تو کوئی تقریر چھ سال کے عرصے میں نہیں کی تھی۔ اس لیے اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کا لیڈر خلیق الزمان کو کر دیا جائے جو وہاں لڑائی لڑتے رہیں اور یہ دبائی لیگ کے صدر نواب اسماعیل خاں رہیں۔ چونکہ صوبہ میں ان کی عزت و قعت ہے اور خلیق الزمان کو اودھ کے باہر کوئی نہیں جانتا۔

مسٹر جناح اس پر تیار ہو گئے۔ تب پارلیمنٹری بورڈ میں یہ تجویز کی گئی کہ مسٹر جناح پر چھوڑ دیا جائے۔ جس کو چاہیں منتخب کریں۔ نواب اسماعیل خاں اس اندرونی سازش سے قطعی ناواقف

تھے۔ وہ رضا مند ہو گئے۔ مسٹر جناح نے بھی فیصلہ دیا کہ نواب اسماعیل خاں صوبائی لیگ کے صدر رہوں اور چودھری خلیق الزمان صوبائی اسمبلی میں مسلم لیگ کے لیڈر رہوں۔ اس طرح چودھری خلیق الزمان منسٹری کے مستحق بنے۔ چونکہ اب وہ اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر ہو گئے۔ اگرچہ مسلم لیگی ممبران کی اکثریت نواب اسماعیل خاں کے ساتھ تھی۔

یوپی کے گورنر سر ہنری ہیگ نے عارضی وزارت بنانے کے لیے نواب چھتاری کو مدعو کیا۔ چونکہ کانگریس کے بعد ایگریکلچرسٹ پارٹی سب سے بڑی تھی۔ نواب چھتاری نے مسلم لیگ کا تعاون حاصل کرنا چاہا کہ ایک منسٹر لیگ کا بھی لے لیں۔ چودھری خلیق الزمان سے مشورہ کیا۔ انہوں نے اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ لیکن نواب چھتاری کو معلوم تھا کہ نواب اسماعیل خاں کے طرفدار زیادہ ممبر تھے۔ اس لیے بغیر ان کی مدد کے کام نہ چلے گا۔ اور نواب اسماعیل خاں کی ریاست جہانگیر آباد ضلع بلند شہر میں ہے۔ جس ضلع سے نواب چھتاری ممبر ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کو نظر انداز کرنا مصلحت کے خلاف ہے۔ اس لیے انہوں نے دونوں کو چھوڑ کر راجہ سلیم پور کو وزارت میں لے لیا۔ راجہ سلیم پور کو بھی نیشنلسٹ مسلمانوں نے ۱۹۳۴ء میں یونٹی بورڈ کا لیڈر بنایا تھا اور ان کے روپے اور نام سے فائدہ اٹھایا تھا۔ اب یہ گروہ لیگ میں آگیا۔ راجہ سلیم پور کو رد نہیں کر سکتے۔ لیکن ان لوگوں کا اصل مقصد تو کانگریس سے مل کر مستقبل کی وزارت میں شامل ہونے کا ہے۔ اس لیے کانگریس سے ساز باز جاری ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ خلیق الزمان اکیلے کانگریس وزارت میں جائیں تو مسلم لیگ کے سب ممبر منحرف ہو جائیں گے۔ اور نواب اسماعیل خاں کو لیڈر اسمبلی مسلم لیگ پارٹی کا منتخب کریں گے۔ اور خلیق الزمان کا سارا پول کھل جائے گا۔ اور اگر تنہا اسماعیل خاں کو وزارت میں لے لیا جائے۔ جس کے لیے جواہر لال وغیرہ تیار ہو جائیں گے تو خلیق الزمان کانگریس کے خلاف سازش شروع کر دیں گے۔ اس لیے اگر وزارت میں جائیں تو دونوں ورنہ کوئی نہ جائے گا۔ (نامہ اعمال مصنفہ یامین خان ص ۶۶۲-۶۶۳)

اس کے برعکس چودھری خلیق الزمان اپنی کتاب "شاہراہ پاکستان" کے ص ۶۲۲-۶۲۳ میں لکھتے ہیں۔

۱۹ مارچ کو شاہ محمد حسین عثمانی کے ذریعے نواب چھتاری نے مجھے اپنے مکان پر بلایا۔

اور کہا کہ گورنر ہنری ہیگ نے ان سے کانپور اسٹیشن پر کہا کہ میں یوپی میں ایک انٹیرم گورنمنٹ بنا رہا ہوں اور میرا ارادہ ہے کہ میں آپ کو اپنی کیبنٹ میں شامل کروں۔ آپ میرے ساتھ شریک ہو کر میرا ہاتھ بٹائیں۔ میں نے جواب میں کہا میں اس عزت کو جو آپ مجھے دینے والے ہیں، قبول نہیں کر سکتا (اس عبارت کے آخر میں چودھری صاحب کہتے ہیں۔)

راجہ سلیم پور کی چھتاری وزارت میں شرکت کے متعلق دن میں مجھے خبریں ملتی رہیں کہ نواب چھتاری کے ساتھ شریک ہو جائیں گے۔ دوسرے روز اعلان ہوا کہ راجہ سلیم پور انٹیرم گورنمنٹ میں وزیر تعلیم ہو گئے۔ اس واقعہ کا میرے دل پر بہت اثر ہوا اور سال دو برس میں راجہ سلیم پور سے نہیں ملا۔ اور ان کو پارٹی سے خارج کر دیا۔"

(نوٹ) - چودھری خلیق الزمان کو اگر وزارت کی خواہش نہیں تھی۔ نیز ان کے انکار پر نواب چھتاری نے راجہ سلیم پور کو عارضی وزارت میں شامل کر لیا تو اس پر چودھری صاحب کو افسوس کیوں ہوا؟
(مصنف)

وزارتیں قائم ہو گئیں

نئے آئین میں گورنروں کے ناجائز اختیارات کے باعث کانگریس نے اپنی اکثریت کے صوبوں میں وزارتیں بنانے سے انکار کر دیا۔ اگرچہ بطور حجت گورنروں نے کانگریس کے رہنماؤں کو وزارت ترتیب دینے کی دعوت دی۔ جیسے کہ یوپی میں پنڈت پنتھ کو، بہار میں شری کرشن سنہا، اڑیسہ میں مہاراجہ کھیڈی، مدراس میں شری نواز شاستری کو۔ لیکن ان سب نے کانگریس ریزولیشن کے تحت وزارت بنانے سے انکار کر دیا۔ مسلم اکثریت والے صوبوں میں کسی خاص پارٹی کو اکثریت حاصل نہیں تھی۔ لہٰذا گورنروں نے اقلیتی پارٹیوں کو وزارت بنانے کی دعوت دی۔ چنانچہ سرحد میں نواب سر عبدالقیوم، سندھ میں غلام حسین ہدایت اللہ۔ آسام میں سر سعد اللہ اور یوپی میں نواب چھتاری نے انٹیرم گورنمنٹ بنا لی۔ پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کو اکثریت حاصل تھی لہٰذا اس کے سوا جس قدر صوبوں میں حکومتیں بنیں، ان کی پائیداری مشکوک رہی۔

کانگریس کے رویے پر صدر مجلس احرار کا اظہار افسوس

"مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کانگریس کے

ذمہ دار رہنما عارضی فتح کے نشہ میں اس قسم کے تلخ بیانات دے رہے ہیں، جس سے ملک میں بجائے اس کے کہ کانگریس کا وقار بڑھے ایسے بیانات سے اس کے وقار کو سخت صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ ہر کانگریسی کی زبان سے یہی صدا بلند ہو رہی ہے کہ ہم مسلم لیگ یا کسی دوسری جماعت سے تعاون کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر شخص کانگریس سے بدظن ہو کر بدیشی حکومت کی پناہ ڈھونڈنے لگے گا۔ ہر ہندوستانی کانگریس سے محبت رکھتا ہے۔ لیکن کانگریس کے طرز عمل نے قریب آنے والوں کو بھی دور کر دیا ہے "

کانگریسی ارکان کیلئے حلف نامہ

ہم موتمر ہند کے ارکان انفرادی اور اجتماعی طور پر حلف اٹھاتے ہیں اور وعدہ کرتے ہیں کہ ہم ہندوستان کی خدمت کرتے رہیں گے۔ مجالس آئین ساز اور اس کے باہر ہندوستان کی آزادی کے لیے کوشاں رہیں گے۔ اس کے لیے جو حکم کیا جائے گا۔ ہم پوری جدوجہد کریں گے۔ نیز عوام الناس کے افلاس کو دور کرنے کے لیے پوری کوشش کریں گے۔

ہم عہد کرتے ہیں کہ کانگریس کے تحت رہتے ہوئے کانگریس کے نظریے کو تقویت پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ ہندوستان کی آزادی کا حصول، کروڑوں انسانوں کو غلامی کی مصیبت سے نجات دلانا ہمارا منتہائے مقصود ہوگا۔

مسٹر محمد علی جناح کا اعلان

نئی دہلی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی ایگزیکٹو کونسل میں انتخابات کے دوران مسلم لیگ کی کارگذاریوں پر تبصرہ کرتے ہوئے مسٹر جناح نے کہا: کہ

"ہندوستان میں اس وقت ایک بھی ذی شعور آدمی ایسا نہیں جس کے دل میں آزادی کی تڑپ نہ ہو۔ اس موضوع پر رائے کا اختلاف ہو سکتا ہے مگر اس کا سبب یہ نہیں کہ مسلمانوں میں قوم پرستی کا جذبہ مفقود ہے۔ اس کے اسباب کچھ اور ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہندو اور مسلمانوں کے لیے ایک دوسرے میں مدغم ہو جانا ممکن نہیں۔ کیونکہ ان دونوں قوموں کی

تہذیب اور معاشرت اصولی طور پر علیحدہ علیحدہ ہیں۔ لیکن دونوں قوموں کے لیے لازم ہے کہ وہ شانہ بشانہ ہو کر آزادی کی منزلِ مقصود کی طرف پیش قدمی کریں۔ یہ نصب العین سیلف گورنمنٹ کا ہے۔ اگر مسلمانوں نے آزادی کی منزل کی طرف پیش قدمی کرنے کا فیصلہ کیا تو میری دلی تائید اور حمایت انہیں حاصل ہوگی مگر میں یہ نہیں چاہتا کہ مسلمان یہ اقدام کسی خاص شخص یا جماعت کو خوش کرنے کے لیے اختیار کریں۔ میں نہیں چاہتا کہ مسلمان مؤخر الجیش ہو کر رہ جائیں۔ میں انہیں ہراول دستہ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ مسلمان گاؤں گاؤں میں مسلمانوں کی تنظیم کا پیغام لے کر جائیں۔ میرا منشا یہی ہے، خواہ بڈھو یا ترہ جنو یا مرد۔ مگر متحد قوم کی طرح رہو۔

(روزنامہ "انقلاب" لاہور۔ ۲۴ مارچ ۱۹۴۷ء)

ایک نظم کی ضبطی

یونینسٹ پارٹی نے اپنی وزارت قائم کرتے ہی سب سے پہلے ۱۹ مارچ کو مجلسِ احرار کے شاعر ابراہیم خادم کی پنجابی نظم (مرزے دی بول گئی گگڑوں کڑوں) جو مرزا غلام احمد کے خلاف تھی، ضبط کر لی۔

ابراہیم خادم نانڈلیانوالہ ضلع لائلپور کے رہنے والے تھے اور ان کی زندگی کا اکثر حصہ مجلسِ احرار کے ساتھ وطن کی جدوجہد میں گزرا۔ مرحوم کی موت دریا میں ڈوب جانے کے باعث ہوئی۔ وہ کہیں دوسرے گاؤں میں نماز پڑھانے جا رہے تھے۔

پنڈت نہرو کا اعترافِ شکست

کانگریس کنونشن میں تقریر کرتے ہوئے کانگریس کے صدر پنڈت نہرو نے کہا کہ

"ہم مسلم نشستوں کے متعلق بری طرح ناکام رہے ہیں۔ اور اس ناکامی نے ہمیں بتا دیا کہ یہ ہماری دسترس میں نہ تھا۔ کیونکہ مسلم عوام کانگریس کی طرف زیادہ متوجہ ہیں۔ اور ہم ناکام اس لیے ہوئے ہیں کہ ہم نے مسلم عوام میں کام کرنے کی طرف سے بے توجہی برتی اور ہم ان کے پاس نہ پہنچ سکے۔ جہاں ہم پہنچ سکے وہاں کے عوام بالخصوص دیہاتی حلقوں میں ہمیں ویسی ہی آزادی کی لہر نظر آئی

ہم نے ہندو، سکھ اور مسلمان دیہاتیوں سے باتیں کیں تو وہاں فرقہ وارانہ مسائل بالکل بے وجود معلوم ہوئے جن کی نسبت ہم بہت کچھ سنتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر ہم مسلم عوام پر زیادہ توجہ کرتے تو ان مشکلات کے باوجود ہمیں اچھی خاصی کامیابی ہوتی۔"

یکم اپریل کو ہڑتال برطانوی آئین ۱۹۳۵ء کے نفاذ پر کوئی ہندوستانی مطمئن نہیں تھا۔ من حیث القوم مسلمانوں کے تمام گروہوں، جماعتوں اور فرقوں نے اسے بہر طور قبول کر لیا تھا اور نہیں تو اس سے حکمرانی کی ٹریننگ ہوگی۔ یہاں تک کہ آل انڈیا کانگرس نے بھی اسے بادلِ نخواستہ قبول کر لیا۔ ورنہ وہ انتخاب میں شامل نہ ہوتی۔ اس کے باوجود یکم اپریل کو جس روز سے اس آئین کا نفاذ ہونے والا تھا۔ کانگرس نے تمام ہندوستان میں اس آئین کے خلاف بطورِ احتجاج ہڑتال کا اعلان کیا۔ لیکن جب مسلم لیگ کے پریذیڈنٹ سے اس کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے ۲۰۔ مارچ کو بمبئی سے ایسوسی ایٹڈ پریس کے نام ایک پیغام ارسال کیا۔ جس میں انہوں نے مسلمانانِ ہند سے التماس کی کہ وہ یکم اپریل کو ہڑتال نہ کریں۔ اس بیان کی وضاحت کرتے ہوئے مسٹر جناح نے کہا کہ

"مجھے ہندوستان کے مختلف حصوں سے مسلمانوں کے پیغامات وصول ہو رہے ہیں کہ یکم اپریل کو ہڑتال کی جائے یا نہ۔

میں نے اس سلسلہ میں ٹھنڈے دل سے غور کر کے فیصلہ کیا ہے، کہ مسلمانوں کو اس ہڑتال میں شامل نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ آل انڈیا مسلم لیگ فیصلہ کر چکی ہے کہ جدید دستورِ اساسی سے جس قدر امکان ہو استفادہ کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی ہڑتال کی وجہ سے تاجروں، مزدوروں اور دیگر کاروباری لوگوں کو نقصان ہوگا۔ لہٰذا ہڑتال میں شامل ہونا مسلمانوں کیلئے مضر ہے۔"

مدح صحابہ کمیٹی ۲۱۔ مارچ کو ایک سرکاری اعلان کیا گیا کہ سنیوں اور شیعوں کے تنازعہ کو حل کرنے کے لیے جو غیر سرکاری کمیٹی قائم کی گئی تھی وہ مسلسل کوششوں کے باوجود اپنے مقصد میں ناکام رہی ہے لہٰذا اب گورنر نے تمام معاملات کو حکومت کے سپرد کر دیا ہے اور جسٹس آنسپ اس کمیٹی کے صدر ہوں گے۔ اور وہ تمام واقعات کی از سرِ نو تحقیق

کریں گے۔

مسلم ماس کنٹیکٹ

کانگریس میں ہندو مہاسبھائی ذہنیت کے آتے ہی ہندوستان کی یہ منظم، غیر مذہبی اور آزادیٔ ہند کی دعویدار پولیٹیکل جماعت اپنے متعیّنہ راستے سے ایسی بھٹکی یا اسے غیر ملکی حکومت کی حکمتِ عملی کہیے کہ اس نے کانگریس میں ایسے عناصر کو داخل کیا کہ کانگریس صرف ایک قوم کی نمائندہ ہو کر رہ گئی۔ اس پر مجلس احرار نے ۱۹۳۱ء میں اور مسلم لیگ نے ۱۹۲۰ء میں سنبھالا اور مسلمانوں کو اپنی علیحدہ تنظیم کا احساس دلایا۔ کانگریس کو اس کا پتہ حالیہ انتخاب میں چلا، جب کانگریس کے ٹکٹ پر کوئی مسلمان امیدوار کامیاب نہ ہو سکا۔

آخر کانگریس نے ۳۱۔ مارچ کو الٰہ آباد میں فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کو مجبور کیا جائے کہ وہ کانگریس میں شامل ہوں۔ اس کے لیے کانگریس نے مسلم ماس کنٹیکٹ (مسلم عوام سے رابطہ کی جماعت) کے نام سے ایک علیحدہ شعبہ قائم کیا جس کے صدر علیگڑھ کالج کے پروفیسر ڈاکٹر محمد اشرف اور جنرل سیکرٹری منشی احمد دین مقرر ہوئے۔ پنجاب میں اس کے انچارج میاں افتخار الدین تھے۔

اس سلسلے میں اشتہارات، پمفلٹ وغیرہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا نیز اخبارات میں مضامین لکھنے کی تجویز بھی کی گئی۔ اس کے ساتھ ہی کانگریس کے صدر پنڈت نہرو نے تمام کانگریس کمیٹیوں کو ہدایت کی کہ وہ اپنی دلچسپی پر مسلمانوں کو کانگریس میں شامل کرنے کیلئے کام کریں۔

ایکٹ ۱۹۳۵ء کا نفاذ

یکم اپریل ۱۹۳۷ء کو ایکٹ ۱۹۳۵ء کا عملی طور پر نفاذ کر دیا گیا۔ اس کے تحت تمام صوبوں میں وزارتیں قائم کر دی گئیں۔ اس موقعہ پر ملکِ معظم نے گورنر جنرل کے نام حسب ذیل پیغام ارسال کیا۔

"آج دستورِ اساسی کا پہلا حصہ نافذ ہو گیا ہے۔ جس کی تیاری کے لیے برطانیہ اور ہندوستان کے بہترین دماغوں نے متحدہ طور پر کام کیا تھا۔ اس موقعہ پر میں اپنی ہندوستانی رعایا کو یقین دلاتا ہوں کہ میری دعائیں ان کے ساتھ ہوں گی۔

آج ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔ مجھے کامل امید ہے اور میری دعا ہے کہ جدید دستورِ اساسی کے پیدا کردہ مواقع سے فائدہ

اٹھانے میں بصیرت سے کام لیں کیونکہ اس سے میری ہندوستانی رعایا کو پورا فائدہ پہنچے گا۔"

برما علیحدہ کر دیا گیا رنگون۔ یکم اپریل ۱۹۳۷ء نصف رات سے نئے آئین کے تحت صوبہ برما ہندوستان سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اس اعتبار سے برما اب برطانیہ کے زیر سایہ ایک الگ ملک قرار دیا گیا ہے۔ ایک تقریب میں غیر سرکاری افراد اور ملک کے اہم مندوبین کے روبرو برما کی علیحدگی کا اعلان کیا گیا اور تاج برطانیہ سے وفادار رہنے کا حلف لیا گیا۔

وزیر اعظم بنگال کا اعلان کلکتہ یکم اپریل کو وزیر اعظم بنگال مسٹر فضل الحق نے اعلان کیا کہ میں اخباروں میں دیکھتا ہوں کہ کہیں ہندو راج اور کہیں مسلم راج کے متعلق خوف و ہراس کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ میں اس موقعہ پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ بنگال میں مسلم راج اسی طرح نہیں ہو گا جس طرح بہار میں اور یوپی میں ہندو راج کا امکان نہیں۔ ہر جگہ برطانوی راج ہو گا۔ مختلف صوبوں میں یہ نمایاں خصوصیت ہو گی کہ کسی صوبے میں نظم و نسق چلانے والے زیادہ تر ہندو ہوں گے اور کسی صوبے میں یہ کام زیادہ تر مسلمانوں کے ذمہ ہو گا۔ لیکن حکومت کا تخیل اور نصب العین ہر جگہ برطانوی ہو گا۔

(روزنامہ "انقلاب" لاہور ۳۔ اپریل ۱۹۳۷ء)

جدید دستور تقریباً ایک سو سال غلامی کے بعد غیر ملکی آقاؤں کا ۱۹۰۹ء میں اپنے غلاموں پر پہلی دفعہ دست کرم دراز ہوا اور اسے آزادی کی پہلی قسط کہا گیا، جس کی رو سے قانون ساز کونسلوں کے ارکان کی تعداد میں قدرے اضافہ کر دیا گیا۔ گورنر جنرل کی کونسل کے ارکان کی تعداد بڑھا دی گئی۔ لیکن کونسلوں میں سرکاری اکثریت برقرار رکھی گئی۔ مرکزی قانون ساز کونسل میں سرکاری ارکان کی تعداد سینتیس (۳۷) اور غیر سرکاری ارکان کی تعداد تیئیس (۲۳) مقرر کی گئی۔ سینتیس (۳۷) سرکاری ارکان میں سے اٹھائیس (۲۸) کو گورنر نے نامزد کرنا تھا اور باقی بلحاظ عہدہ مقرر کیے جانے تھے۔ تیئیس غیر سرکاری ارکان میں سے پانچ کو گورنر جنرل نے منتخب کرنا تھا اور باقی ارکان کا انتخاب ہونا قرار پایا۔ یہ تھا حکومت ہند کا قانون مجریہ ۱۹۰۹ء۔

۱۹۰۹ء کی اصلاحات سے ہندوستان کے عوام مطمئن نہیں تھے۔ لہٰذا پہلی جنگ عظیم کے بعد برطانیہ نے ہندوستان پر ایک اور احسان کیا۔ یعنی ہندوستان کو آزادی کی دوسری قسط دی۔ اب مرکزی اسمبلی میں امپیریل لیجسلیٹو کونسل کی جگہ دو ایوانی مقننہ قائم کی گئی۔ ایوانِ بالا کا نام کونسل آف سٹیٹ اور ایوانِ زیریں کا نام سنٹرل لیجسلیٹو اسمبلی رکھا گیا۔

کونسل آف سٹیٹ ایک سو پینتالیس (۱۴۵) ارکان پر مشتمل تھی۔ اس میں ایک سو تین (۱۰۳) ارکان منتخب کیے جاتے تھے۔ باقی بیالیس ارکان کو گورنر جنرل نامزد کرتا تھا۔ ایک سو تین ارکان کی تقسیم اس طرح تھی۔ عمومی حلقہ ہائے انتخاب سے اکیاون (۵۱)۔ مسلمان تیس (۳۰)۔ سکھ دو (۲)۔

خاص حلقہ ہائے انتخاب سے بیس (۲۰) ارکان۔ ان کی تقسیم اس طرح تھی۔

زمیندار۔ سات، یوروپین۔ نو، ایوانِ تجارت۔ چار۔ نامزد ارکان میں پچیس (۲۵) سرکاری اور باقی غیر سرکاری۔

ظاہر ہے کہ انگریز کا یہ قانون بھی ہندوستان کے لیے مفید نہیں تھا۔ چنانچہ ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کا حادثہ جلیانوالہ باغ بھی اسی بے چینی کا نتیجہ تھا۔ تحریک خلافت بھی یہیں سے آگے بڑھی اور ترک موالات کے ہنگامے بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھے۔

آخر برطانیہ نے سر جان سائمن کی صدارت میں ایک کمیشن قائم کیا جو ۱۹۲۸ء میں ہندوستان آیا۔ اس کمیشن میں ہندوستان کا کوئی نمائندہ شامل نہیں تھا۔ جس میں بطور ناراضگی کانگریس اور مسلم لیگ نے اس کمیشن کا بائیکاٹ کیا۔ اس کے باوجود کمیشن نے ہندوستان کا دورہ کیا اور اپنی رپورٹ برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے پیش کر دی۔ مارچ ۱۹۳۳ء میں حکومت نے ایک قرطاس ابیض شائع کیا۔ جس پر ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں نے تنقید کی۔ برطانوی حکومت نے ان تمام باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے دسمبر ۱۹۳۵ء کو ایک مسودہ بل تیار کر کے پارلیمنٹ میں پیش کیا جسے ۲۔ اگست ۱۹۳۵ء کو منظور کر لیا گیا یہی وہ قانون ہے جو ایکٹ ۱۹۳۵ء کہلاتا ہے اور یکم اپریل ۱۹۳۷ء کو اس کا نفاذ ہندوستان میں ہو گیا۔

ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں ——— (بہارش)

(جانباز مرزا)

تاریخِ آزادیٔ برِّصغیر پر تقسیم کے بعد پہلی مستند کتاب

چند عنوان

- کانگریس نے وزارتیں قبول کرلیں
- یوپی مسلم لیگ اور کانگریس وزارت
- جمعیۃ علمائے ہند اور مسلم لیگ کے مابین معاہدے کا خاتمہ
- شیعوں کی طرف سے لکھنؤ میں تبرّہ ایجی ٹیشن
- قائد اعظم کا خطاب
- حضرت مولانا حسین احمد مدنی اور حضرت امیر شریعت کے مابین تلخی کا خاتمہ
- خاکسار تحریک ۔ بیلچہ اور کلہاڑی
- قائد اعظم اور مہاتما گاندھی کے مابین خط و کتابت
- دوسری جنگ عظیم اور مجلس احرار کی قرارداد
- کانگریس مسلم لیگ اور خاکساروں کی دوسری جنگ عظیم کے متعلق قراردادیں
- قراردادِ لاہور
- پاکستان کا بانی کون تمام پس منظر کے ساتھ
- کانگریس وزارت اور تحریک مدح صحابہ
- چودھری افضل حق کا پشاور میں خطبۂ صدارت
- پاکستان کے متعلق مجلس احرار کی پالیسی
- لکھنؤ مسلم لیگ کی قرارداد اور تحریک شہید گنج
- شہید گنج اور مجلس احرار کی سول نافرمانی

اور

- دیگر عنوان

(جلد سوم)

کاروانِ احرار